تلامذۂ غالب

بیاضِ غزل

تلامذۂ غالب

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110002

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

بار دوم مئی ۱۹۸۴ء　　تعداد 500　　قیمت ۔/350

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

دیباچہ طبعِ دوم

"ذکرِ غالب" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد میں لاہور چلا گیا۔ ایک دن کمرے پر بیٹھا تھا کہ ایک صاحب دو قلمی کتابیں لے کر آئے۔ کہنے لگے: انھیں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں ایک قتیل کا فارسی دیوان تھا، دوسرا واقف بٹالوی کا۔ بادامی رنگ کے مضبوط سیالکوٹی کاغذ پر پختہ نستعلیق خط میں لکھے ہوئے یہ دونوں نسخے بہت اچھی حالت میں تھے۔ بدقسمتی سے انھوں نے جو قیمت طلب کی، وہ میری مقدرت سے زیادہ تھی، اس لیے معاملہ نہ ہو سکا۔ لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ قتیل کا کچھ کھوج نکالنا چاہیے؛ غالب نے اسے بار بار فرید آبادی لکھا ہے، اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے بعض اور شہروں کے نام لیے ہیں۔ بہرحال چند ماہ کی تگ و دو کے بعد میں نے معلوم کر لیا کہ قتیل کا خاندان دراصل بٹالہ کا رہنے والا تھا؛ اور اسی اثنا میں ان کا شجرۂ نسب بھی مل گیا۔

لیکن اب مجھے ایک اور خیال آیا کہ کیوں نہ غالب کے شاگردوں کے حالات جمع کیے جائیں! چند ایک کے سوا دوسروں کے نام تک معلوم نہیں تھے؛ اور جن کے معلوم تھے، ان کے بھی حالات پردۂ خفا میں تھے۔ میں نے تذکرے جمع کرنا شروع کیے۔ اور کوئی سال بھر میں ان کا اچھا خاصا ذخیرہ یکجا کر لیا؛ کچھ اور متعلقہ کتابیں بھی دستیاب ہو گئیں۔

وسط ۱۹۳۹ء میں مجھے بسلسلۂ ملازمت ہندستان سے باہر بھیج دیا گیا۔ میں ۳۱ جولائی ۱۹۳۹ء کو اسکندریہ (مصر) پہنچا۔ یکم اگست کو میں نے اپنے عہدے کا چارج لیا تھا اور عین ایک ماہ بعد یکم ستمبر کو دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ میں صرف تین سال کے لیے گیا تھا، لیکن دانہ پانی کی بات، میں اگلے پندرہ برس ملک سے باہر رہا۔ اور اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ہندستان واپس آیا۔ اس دوران میں دو دو تین تین مہینے کی رخصت پر دو مرتبہ وطن آنے کا موقع ملا، لیکن بقیہ

وقت باہر ہی گذرا۔ یہ سارا زمانہ مغربی ایشیا کے ملکوں میں بسر ہوا: اور میں مصر، عراق اور ترکیا کی مثلّث میں ہرزہ گردی کرتا رہا۔

یہ تمہیدی داستان میں نے اس لیے بیان کی کہ میں اپنا مختصر کتابخانہ اس سفر میں ساتھ لیتا گیا تھا؛ میں جہاں بھی گیا، یہ میرے ساتھ رہا۔ "تلامذۂ غالب" کی ترتیب و تدوین اسی زمانے میں ہوئی۔ ترتیب و تدوین تو کیا، سچ یہ ہے کہ یہ بھی جنون کا ایک انداز تھا۔ نہ تمام ضروری کتابیں مہیا تھیں، نہ کوئی ایسا شخص قریب، جس سے مشورہ یا تبادلۂ خیالات کیا جا سکتا۔ بہر حال میں ہمت نہیں ہارا؛ جب کبھی فرائضِ منصبی سے کچھ فرصت ملتی، میں موضوع کے لیے مواد جمع کرتا رہا۔

۱۹۵۴ میں جب دلّی پہنچا تو مکان تلاش کرنے اور سامان کھلنے میں کچھ وقت لگا۔ ۱۹۵۵ء کے وسط میں ان منتشر یادداشتوں کو جمع کیا اور اب کتاب کا ڈول ڈالا۔ دوست احباب سے کتابیں مستعار لیں۔ حذف و اضافہ کا کام جاری تھا کہ ایک دن عرش ملسیانی مرحوم ملنے آ گئے۔ انھوں نے کاغذات دیکھے تو اصرار کیا کہ اسے جوں کا توں شائع کر دیا جائے۔ بات دراصل یہ تھی، کہ میرے قیامِ دلّی کی میعاد غیر یقینی تھی۔ خدا معلوم کب پھر بیرونِ ملک جانے کے احکام صادر ہو جائیں! وہ چاہتے تھے کہ میری موجودگی میں کتاب چھپ جائے۔ غرض مجھے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور رِشتم پِشتم جو کچھ جمع ہو سکا، میں نے ان کے حوالے کیا، اور انھوں نے اسے کاتب کو دے دیا۔ یہ ۱۹۵۶ء کے اواخر کی بات ہے۔

کاتب نے روایتی آہستہ روی سے کام لیا۔ دراصل حسبِ سنّت اُس کے پاس اور کتابیں بھی لکھنے کو تھیں۔ وہ ہر ایک کو چند ہفتوں کے بعد کچھ صفحے لکھ کر دے دیتا، اور اُجرت لے لیتا۔ یوں کام جاری رہا۔ اور بالآخر وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا، یعنی اکتوبر ۱۹۵۷ء میں میرے تبادلے کے احکام جاری ہو گئے۔ بعض نجی مجبوریوں کے باعث میرے لیے فوری طور پر باہر جانا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے چند مہینے کی مہلت طلب کی، جو منظور ہو گئی۔ ادھر عرش نے کاتب کو کچھ ڈرایا دھمکایا اور یوں کتاب ۱۹۵۸ء کے شروع میں شائع ہوئی۔ ہمارا قافلہ ۲۷ فروری کی شام کی گاڑی سے بمبئی روانہ ہوا تھا۔ عرش مرحوم نے اس کا نسخہ مجھے لا کر ریلوے اسٹیشن پر دیا تھا۔ اب کا گیا ہوا میں ۱۹۶۴ء میں وطن واپس آیا۔

ان ۲۵ برسوں میں "تلامذۂ غالب" سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس کتاب سے متعلق بھی، اور بعض شاگردوں سے متعلق انفرادی طور پر بھی۔ ان میں سب سے مفید اور مفصّل مضمون ڈاکٹر

حنیف نقوی (بنارس ہندو یونیورسٹی) کا تھا۔ میں نے کم وبیش سب مضامین سے استفادہ کیا ہے اور میں ان احباب کا احسان مند ہوں، اگرچہ افسوس ہے کہ سب کے سب مشورے قبول نہ کر سکا۔

اب کے شاگردوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوا ہے؛ پہلے ایڈیشن کے دو ایک نام حذف کرنا پڑے کیونکہ مزید غور کرنے پر ان کے تلمّذ کے لیے کافی ثقہ شہادت موجود نہیں۔

بعض حضرات نے کچھ شاگردوں کے تلمّذ پر شبہے کا اظہار کیا ہے؛ انھوں نے اس کے لیے کسی دلیل یا ثبوت کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر کسی تذکرہ نگار یا ثقہ راوی نے تلمّذ کا ذکر کیا ہے، تو اسے تسلیم کرنا ہی پڑیگا۔ تاریخ وسیرت میں راوی کی ثقاہت بہت اہم ہے۔ اگر آپ اس کی تغلیط کرتے ہیں، تو اپنے نظریے کی تصدیق کے لیے دلیل پیش کیجیے۔ آپ کی دلیل مضبوط ہوئی، تو ہم تذکرہ نگار یا راوی کے بیان کو رد کر دینگے۔ لیکن محض یہ دعویٰ کر دینا کہ یہ بات "میری نظر میں مشکوک ہے"، یہ تو کسی عنوان کافی خیال نہیں کیا جا سکتا۔

جو نام اضافہ ہوئے ہیں، ان میں دو تین "مستانیں" بھی ہیں، اور اتفاق یہ ہے کہ سب کلکتے کی۔ غالب اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتے گئے ہیں، تو ان کی عمر یہی ۳۰ برس کے لگ بھگ تھی۔ جوانی "دِوانی" تو ہے ہی، خدا معلوم وہاں ان پر کیا بیتی! ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ بعد کو یہ کہتے سُنے گئے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے، ہمنشیں!

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے، ہائے

تلامذہ کے لیے ایک بہت اچھا ماخذ گلدستے بھی ہیں۔ افسوس، کہ مجھے بہت دیر سے اس کا خیال آیا۔ اس میں جناب عبدالصمد خان (اردو ریسرچ سنٹر، حیدرآباد) نے بہت مدد کی۔ ان کے پاس پرانے رسائل کا بہت اچھا اور بہت قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔ افسوس کہ بوجوہ میں اس سے پورے طور پر استفادہ نہ کر سکا۔ تاہم جو کچھ ہوگیا، میں اس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دور کے گلدستوں کو بغور دیکھا جائے تو ضرور کچھ اور نام مل جائینگے۔

اس سلسلے میں ایک بات یاد آ گئی:

میرزا غالب کی زندگی میں بعض اصحاب، جو انھیں مہمل گو خیال کرتے تھے، اس بات کا یوں

اظہار کرتے تھے کہ شاندار اور بلند آہنگ الفاظ شعر میں جمع کر دیتے، جس کے کوئی معنی نہیں ہوتے تھے، یعنی دیکھنے کو شعر ہے، وزن ہے، الفاظ سب بامعنی، لیکن غور کیجیے تو معلوم ہو کہ شعر صرف لفظوں کا مجموعہ ہے، اور معنوں سے عاری ہے۔ حالی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے ایک دن میرزا سے کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آیا، اور یہ شعر پڑھا:

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے، کُل بھینس کے انڈے سے نکال

اس پردے میں مولوی عبدالقادر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ تمھارے دیوان میں اس طرح کے بےمعنی شعر ملتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالقادر کی ذرّیت ختم نہیں ہوئی۔ میں نے درخواست کی تھی، کہ جن اصحاب کے پاس پرانے گلدستے ہوں، وہ ان میں سے غالب کے شاگردوں کے نام اور کلام تلاش کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اس پر جناب اشفاق انجم نے مالیگاؤں سے لکھا کہ ان کے پاس ماہانہ گلدستہ "ترقیِ سخن" بمبئی کا شمارہ نومبر ۱۹۱۴ ہے؛ اس میں طرح: "ہم تو ہر وقت تجھے یاد کیا کرتے ہیں" پر "جناب ڈاکٹر فدا حسین صاحب ارشد تلامذۂ حضرت غالب خلد آشیان مقیم بمبئی" کی یہ غزل ملتی ہے:

ظلِّ میموں لبِ صیّاد کیا کرتے ہیں — برقِ وارفتہ کو جلّاد کیا کرتے ہیں
بخیۂ سوزنِ دل چاکِ گریبان ہنوز — شادیِ مرگ کو ناشاد کیا کرتے ہیں
آرزو خانۂ غم مجمرِ الفت لبِ بام — روز آرائشِ صیّاد کیا کرتے ہیں
اخگرِ آہنِ فولادِ شکیبائیِ قلب — کس تمنّا سے تجھے یاد کیا کرتے ہیں
آہ مینا گرِ صد دیدۂ نقّاشِ ازل — رندیوں سرو کو آزاد کیا کرتے ہیں
میر سامانیِ الفت سے سبکساری ہے — دادگر دیکھ کے بیداد کیا کرتے ہیں
قبلۂ معنیٔ و ہم معنیٔ میراثِ ازل — کس تصوّر میں تجھے یاد کیا کرتے ہیں
آستیں چاک، گریباں طرف جیب و گلو — وحشتِ دل مجھے برباد کیا کرتے ہیں
دولتِ نالہ و رفتۂ سنجابِ جنوں — پیش آئینۂ صیّاد کیا کرتے ہیں
وہ فدائی ہیں فدا ہوتے ہیں زلفوں پہ صنم — نقدِ دل ہدیۂ بیداد کیا کرتے ہیں

آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوں اور داد دیں:

بعض اصحاب کا اس پر اصرار ہے کہ الگزنڈر ہیدرلی آزاد (عرف الک صاحب) کو تلامذۂ غالب میں شمار کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک وہ غالب کے نہیں، بلکہ میرزا زین العابدین خان عارف کے شاگرد تھے۔ اسی لیے میں نے انھیں "تلامذۂ غالب" میں شامل نہیں کیا تھا۔

الک کا دیوان ان کی وفات (۷، یا ۲۷ جولائی ۱۸۶۱ء) کے بعد ان کے بھائی ٹامس ہیدرلی نے شائع کیا تھا (مطبع احمدی، آگرہ: ۱۸۶۳ء)۔ اسے شوکت علی صاحب ساکن شاہ پور (فتحپور) نے مرتب کیا تھا، جو ان دونوں بھائیوں کے دوست تھے۔ دیوان کے شروع میں ان کا فارسی میں دیباچہ بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

> الگزنڈر ہیدرلی کہ ذہن و ذکا را دخل نقش خمیر بود، و سعادت و مروّت در ضمیرش جاپذیر، در سن ہیزدہ سالگی بشنیدن اشعارات اساتذہ و متقدمین و متاخرین طبع وقادش در تحصیل کمالش توجہ نمود۔ گاہ گاہ ہنگام فرصت بمطالعۂ تصانیف او ستادان پرداختے و با محتشم الدولہ، امیر الملک محمد اسد اللہ خان بہادر سہراب جنگ غالب تخلص و نواب زین العابدین خان بہادر متخلص بہ عارف کہ ہر دو حضرات از اکابر امرائے والا دودمان دہلی بودند، بذریعۂ مراسلات و مکاتبات استمدادِ سخن داشتے۔

جناب شوکت علی کی باخبری کا یہ عالم ہے کہ وہ غالب کی زندگی میں ان کے خطاب سے بیخبر ہیں: نجم الدولہ کو محتشم الدولہ، دبیر الملک کو امیر الملک اور نظام جنگ کو سہراب جنگ لکھتے ہیں۔ بیشک الک کے غالب سے مراسم تھے؛ ممکن ہے، دونوں میں خط و کتابت بھی رہی ہو۔ غالب نے ان کی وفات پر اپنے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ مجروح کو لکھتے ہیں:

> الور میں بھی وبا ہے۔ الگزنڈر ہڈرلی مشتہر بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بتکلّف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسّط تھا۔ اس جُرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ (اردوے معلیٰ: ۱۳۹)

کیا وہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ میرا شاگرد تھا، یا اچھا شاعر تھا! نہیں، انھیں اگر غم ہے، تو اس کا کہ الور راج میں میرا متوسّط مر گیا۔ شوکت علی صاحب اسی دیباچے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

بیشتر تصانیف نتائجِ افکارِ خویش بنظرم در آورد و بمزید مہر و محبت خاطر را عزیز داشتے وہمت بر خوشدلی و کامرانیم گماشتے ..... چنداں کہ مرا بپروانۂ جمالِ جانفزاء اے خود کردہ، ہر روز از ابکارِ افکارِ خویش محوِ نظارہ ام می ساخت۔

عارف کا ۱۲۶۸ھ میں انتقال ہوا، اور غالب کا سترہ برس بعد ۱۲۸۵ھ میں شاید خیال ہو سکتا تھا کہ عارف کے بعد الک نے غالب سے مشورہ کیا ہو، لیکن شوکت علی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ اپنا کلام مجھے دکھاتے رہے۔ اس صورت میں غالب سے اصلاح لینے کا کونسا محل تھا!

لیکن اس سلسلے میں فیصلہ کن الک کے بڑے بھائی ٹامس ہیڈر لی کا بیان ہے۔ صاحب البیت ادری مافیہ (گھر کا مالک جانتا ہے کہ اس کے گھر میں کیا ہے) کے مصداق ان سے زیادہ کسے معلوم ہوگا کہ ان کا چھوٹا بھائی کس کا شاگرد ہے۔ (یاد رہے کہ خود ٹامس ہیڈر لی بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا کلام کا مختصر مجموعہ (قلمی) دلّی یونیورسٹی کے کتابخانے میں موجود ہے) ٹامس ہیڈر لی کا اُردو دیباچہ بھی الک کے دیوان کے شروع میں موجود ہے۔ لکھتے ہیں:

> نواب زین العابدین خان دہلی کے امیرزادۂ عالی خاندان جو عارف تخلص کرتے تھے، اور جناب نجم الدولہ اسد اللہ خان بہادر غالب کے شاگرد تھے، وہ اس کے (یعنی الگزنڈر ہیڈر لی کے) اوستاد تھے؛ اور اوس نوجوان کو اپنے اُستاد اور اپنے اوستاد کے اوستاد کے انداز پیش نظر تھے اور اکثر اون کے اشعار یاد تھے۔

کیا اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت درکار ہے کہ الک کے اُستاد کون تھے! "ارمغان گوکل پرشاد" میں بھی انھیں عارف کا شاگرد لکھا ہے۔ غرض میرے نزدیک الک غالب کے شاگرد نہیں۔

اب چونکہ الک سے متعلق بات ہو رہی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور بات بھی کہہ دوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ زین العابدین خان عارف پہلے شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ انھوں نے تھوڑی سی مدت میں شاہ نصیر کے رنگ میں ایک دیوان (مطلعِ مہرِ سعادت) مرتب کر لیا تھا۔ نصیر کے دکن چلے جانے کے بعد انھوں نے غالب سے مشورہ کرنا شروع کیا۔ اب رنگِ سخن بدل گیا۔ انھوں نے پہلا دیوان نظری کر دیا اور غالب کی پیروی کرنے لگے۔ سوال یہ ہے کہ ان کا وہ پہلا دیوان (مطلع مہر سعادت) کہاں گیا؟

الک کے دیوان میں ۱۶۴ غزلیں ہیں۔ صرف ردیف الف کے چند مطلعے دیکھیے:

صدف سے بہرِ ہمچشمی گہر نکلا تو کیا نکلا ‏ ‏ ‏ ترے دنداں کو کب پہنچا، اگر نکلا تو کیا نکلا

پلکوں پہ مرے لختِ جگر آئے ہیں کیا کیا
بے برگ درختوں میں ثمر آئے ہیں کیا کیا

زلفوں کا ترے جو ہمیں مائل نظر آیا
زنداں میں سراپا بسلاسل نظر آیا

آج جو تیغا ترا کھڑکا، تھڑک کر رہ گیا
ڈر کے دل قاتل مرا دھڑکا، دھڑک کر رہ گیا

ہر کسی کو تو بقدرِ طاقت و ہمّت جگا
اپنی راحت کے لیے مت طالبِ راحت جگا

چل گیا ہے کوئی شاید کہ عمل تھوڑا سا
مہرباں اپنے پہ پایا انھیں کل تھوڑا سا

بحرِ جیب شرمِ گدائی کا پسینہ بن گیا
تیر کر کچکول قسمت سے سفینہ بن گیا

نوید اے دل! کہ رفتہ رفتہ گیا ہے اون کا حجاب آدھا
ہزار مشکل سے ہارے الٹا انھوں نے رُخ سے نقاب آدھا

کفشِ زرّیں کا نہیں ہے نعلِ آہن زیرِ پا
ماہِ نو کا ہے گماں اے شوخِ پُرفن زیرِ پا

اگر ان غزلوں کو دیوانِ شاہ نصیر میں شامل کر دیا جائے، تو کسی کو وہم بھی نہیں گذریگا کہ یہ کسی اور کا کلام ہے! بعض شکوک و شبہات گناہ کے درجے میں آجاتے ہیں۔ اس علم کے باوجود میں یہ پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ کہیں عارف نے اپنا دیوان (یا اس کا بیشتر حصّہ) الک کے حوالے تو نہیں کر دیا تھا؟

تلامذۂ غالب کے شائع کرنے سے ایک فایدہ یہ ہوا کہ ان میں سے جن اصحاب کے ورثا یا نام لیوا اب موجود ہیں، ان میں سے بعض نے از خود لکھا، اور پھر میری درخواست پر حتی الوسع حالات مکمل کرنے میں دستِ تعاون بڑھایا؛ بعض نے کلام بھیجا؛ ایک آدھ کے پاس تصویر تھی، وہ مہیا کی۔ میں ان سب کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔ انھوں نے بقولِ استاد نامِ نیکِ رفتگاں کو ضائع ہونے سے بچایا، اور علم و ادب کی خدمت کی ہے۔ ان میں سے مندرجۂ ذیل حضرات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

جناب کرار احمد کرار نوری، کراچی (آگاہ)
جناب زبیر حسین رضوی، کراچی (زکی رضوی بدایونی)
جناب شہاب دہلوی، بہاولپور (زکی رضوی بدایونی)
جناب سیّد مصطفےٰ میرزا شریر دہلوی (سجاد میرزا)

جناب خواجہ منہاج الدین حسین (سخن)

میں ان سب کا ممنونِ احسان ہوں۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری (کراچی) جناب سردار علی احمد خان (لاہور)، جناب ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس) ڈاکٹر نجم الاسلام (حیدر آباد۔ سندھ) جناب زبیر حسین رضوی (کراچی) پروفیسر مختار الدین احمد (علی گڑھ)، جناب محمد مشتاق شارق (میرٹھ)، جناب ضیاء الدین انصاری (علی گڑھ)، جناب ایم حبیب خان (نئی دلی) حکیم سیف الدین احمد (میرٹھ) ڈاکٹر لطیف حسین ادیب (بریلی) جناب شمس بدایونی (بدایوں) جناب راج نرائن راز (نئی دلی) نے کتابیں مہیا کیں، یا اور طرح سے معاونت فرمائی۔ ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

طبع اوّل میں شائع شدہ ذکا کی تصویر خارج کرنا پڑی۔ اصلی تصویر بہت مدھم تھی۔ ایک فوٹو گرافر نے اسے ٹھیک کر دینے کا ذمہ لیا۔ لیکن اس نے جو کچھ کیا، اب کیا کہوں! اس کی بنائی ہوئی تصویر کی اصل سے مشابہت ہی نہیں تھی۔ اگر چھپنے سے پہلے میں نے اسے دیکھا ہوتا، تو کبھی اسے شاملِ کتاب نہ کرتا۔ بہرحال اب اسے خارج کر رہا ہوں۔

بعض تلامذہ ایسے ہیں، جنھوں نے ایک سے زیادہ تخلّص اختیار کیے۔ ایک طبقہ تو ان حضرات کا ہے جنھوں نے پہلے ایک تخلّص کے تحت شاعری کی، بعد کو اسے ترک کر دیا اور دوسرا تخلّص اختیار کر لیا۔ ایسے حضرات کا متروک تخلّص بریکٹ میں دیا گیا ہے۔ مثلاً فراق (رشکی)، جس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کا ابتدائی تخلّص رشکی تھا، جسے ترک کر کے وہ فراق کے تحت لکھنے لگے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے، جہاں شاعر بیک وقت آخر تک ایک سے زیادہ تخلّص کے تحت لکھتے رہے۔ ایسی صورت میں تمام تخلّص یکے بعد دیگرے درج عنوان ہیں مثلاً ذکا و بیباک۔ اس سے مدّعا یہ ہے کہ شاعر نے آخر تک دونوں تخلّص استعمال کیے۔

اب کے سات نئی تصویریں شاملِ تذکرہ ہو رہی ہیں۔ وفا کی تصویر کے علاوہ اور سب پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہیں۔ یہ مندرجۂ ذیل ذرائع سے حاصل ہوئی ہیں۔

(۱) آگاہ، سید محمد رضا دہلوی (احمد مرزا خان) جناب کرار نوری، کراچی (آگاہ کے پرپوتے)

(۲) فراق (رشکی)، قاضی محمد عنایت حسین بدایونی۔ جناب شمس بدایونی، ایڈیٹر "روشن" (تماہی) بدایوں

(۳) علی، نواب علی بہادر (باندہ)۔ ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (فروری، ۱۹۵۸ء)

(۴) راضی، جانی بہاری لال ماہنامہ زمانہ (کانپور) ستمبر ۱۹۳۷ء (بشکریہ جناب فرخ جلالی۔ علی گڑھ)

(۵) ہوشیار (بیمار) محمد مراد علی گلدستۂ ہوشیار

(۶) مدہوش، محمد سخاوت حسین بدایونی جناب شمس بدایونی، ایڈیٹر "روشن" (ماہی)، بدایوں

(۷) وفا و اختر، خواجہ عبدالغفّار جہانگیرنگری پروفیسر کلیم سہسرامی راجشاہی یونیورسٹی، بنگلادیش

پروفیسر کلیم سہسرامی نے وفا کی تصویر اپنے ایک مضمون کے ساتھ ماہی "غالب نامہ"، نئی دلّی کے شمارہ (۴ : ۲) میں شائع کی ہے۔

میں ان اصحاب کا شکر گزار ہوں کہ ان کی بدولت قارئین ان تلامذۂ غالب سے بھی روشناس ہو گئے۔

یہاں ایک امر کی نشاندہی غالباً بیمحل نہیں ہوگی۔ حیدر آباد سے "ذکرِ سالک" کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں سالک کی تصویر بھی شامل ہے۔ لیکن اس میں مصنّفِ کتاب کو سہو ہوا، یہ سالک کی نہیں، بلکہ میرزا سراج الدّین احمد خان سائل دہلوی کے عہدِ شباب کی تصویر ہے۔

مالک رام

نئی دلّی

یکم جنوری ۱۹۸۴ء

دیباچۂ طبع اوّل

کلام دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے: خیال اور اس کا لباس یعنی وہ الفاظ جن میں اسے ادا کیا گیا ہے۔ جب تک یہ الفاظ صرف بامعنی ہیں اور ان کی ترتیب میں سُر تال کا لحاظ نہیں رکھا گیا، یہ نثر کہلاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ موسیقی کے اصول پر یعنی کسی خاص وزن کے مطابق ہوں، تو ایسے کلام کو شعر کہتے ہیں۔

جب کسی نے کہا تھا: الشعراء تلامیذ الرحمٰن، تو اس کا مقصود صرف اتنا تھا، کہ شاعرانہ صلاحیت اور شعری ذوق انسان پیدائش سے ساتھ لاتا ہے، یا یوں کہیے کہ جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے یہ بھی نبوت کی طرح ایک وہبی چیز ہے اور اسے اکتساب سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ رہا اس کا خارجی لباس یعنی الفاظ، تو ظاہر ہے کہ، یہ چیز علم و فن سے تعلق رکھتی ہے اور دوسرے علوم و فنون کی طرح اسے بھی باقاعدہ حاصل کرنا پڑے گا۔

کلام موزوں، عروض کے بغیر ناممکن ہے۔ عروض ایک وسیع اور پیچدار فن ہے، ایسا وسیع اور پیچدار کہ بعض اوقات بڑے بڑے پختہ کار اور مشّاق شاعروں سے بھی عروض کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح معانی و بیان، محاورہ و روزمرّہ، فصاحت و بلاغت کے ایسے بیسیوں باریک نکتے ہیں کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے وہ ذہن نشین نہیں ہو سکتے۔ ان تمام علوم میں مہارت پیدا کرنے کے لیے کسی استاد کے سامنے زانوے ادب تہ کرنا صرف مناسب ہی نہیں، اشد ضروری بھی ہے۔

شاعری میں باقاعدہ استادی شاگردی کا سلسلہ فارسی زبان کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ اُردو نے جہاں

اور کئی چیزیں فارسی سے مستعار لیں، وہیں یہ رسم بھی لے لی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اسے مناسب حدود کے اندر رکھا جائے تو یہ بات بہت مفید ہو سکتی ہے۔ اگر استاد، شاگرد کے کلام پر فنی پہلو سے اصلاح دے، اسے عروض کے نکات بتائے، زبان کی انوٹوں اور نزاکتوں سے آگاہ کرے، فصاحت کے مدارج کی تعلیم دے، دوسرے لفظوں میں اگر وہ اپنے خیالات اور رجحانات شاگرد پر نہ ٹھونسے، بلکہ صرف اس کی ذاتی صلاحیتوں کی تربیت کرے اور اس کی مخفی شاعرانہ قوتوں کے ابھارنے میں اس کی مدد کرے، تو ایسا شاگرد استاد سے استفادہ کرنے کے بعد ماہرِ فن ہو جائیگا؛ اور اگر واقعی فطرت نے اس میں صحیح شاعرانہ ذوق ودیعت کیا ہے، تو اس کی شاعری غیر معمولی طور پر کامل عیار ہو جائیگی۔

آپ دیکھینگے کہ غالب کے شاگردوں میں بہت کم اپنے استاد کے رنگ میں کہنے والے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ غالب اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے، کہ چہرے مہرے کی طرح ہر شخص اپنا مزاج اور مذاق بھی قدرت کی طرف سے لے کر آتا ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی بدلنے کی کوشش کرنا، اسے مسخ کرنے کے مرادف ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ شاگرد کے کلام کے ظاہری دروبست اور فنی ولغوی اسقام کی اصلاح کی جائے، لیکن اس کے طرزِ سخن کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے، تاکہ اس کی انفرادیت پختہ ہو جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمیں غالب کے شاگردوں میں اتنے زیادہ صاحبِ طرز شاعر ملتے ہیں۔ انور، تفتہ، ثاقب، حالی، رشکی، ذکی، سالک، سخن، شاداں، شیفتہ، عارف، عرشی، مجروح، ناظم؛ ان میں سے ہر ایک کا رنگ الگ ہے۔ اپنی اپنی جگہ ہر ایک پختہ کار اور صاحبِ فن استاد ہے۔

بعض تذکرہ نویسوں نے غالب کے شاگردوں میں کچھ ایسے اصحاب کا ذکر کیا ہے، جو میرے نزدیک درست نہیں۔ اس لیے میں نے انھیں اس تذکرے میں شامل نہیں کیا۔ مثلاً نساخ نے مرزا باقر علی خاں کامل کو غالب کا شاگرد لکھا ہے، حال آنکہ وہ قربان علی خان سالک کے شاگرد تھے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت نے نظام رامپوری کو غالب کا شاگرد بیان کیا ہے؛ وہ شیخ علی بخش بیمار کے تلامذہ میں سے تھے۔ ضیغم حیدرآبادی اور حسرت موہانی نے منشی ہنواری لال شعلہ کو تلامذۂ غالب میں شامل کر لیا ہے؛ وہ تفتہ اور بیصبر کے شاگرد تھے۔ ایک جدید تذکرہ (مشرقی بنگال میں اردو) کے مصنف نے سید محمود آزاد (سید محمد آزاد "نوابی دربار" والے کے بڑے بھائی) کو غالب کا شاگرد لکھا ہے (ص ۷۲ - ۷۳)؛ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کسی تذکرہ نویس نے آج تک اس کا ذکر نہیں کیا، منجملہ اور باتوں کے صرف ایک ہی بات اس کی تغلیط کے لیے کافی ہے۔ قاطع برہان کے معرکے میں آغا احمد علی احمد نے جو کتاب "مؤید برہان" کے نام سے لکھی تھی، اس کے آخر میں "برادر عزیزم سید محمود المتخلص بہ شید اسلمہ اللہ تعالیٰ"

کی منظوم تقریظ اور تاریخ موجود ہے (اُن دنوں وہ شیدا تخلّص کرتے تھے)۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ آزاد اپنے اُستاد کے خلاف ایک کتاب اور اس کے مصنّف کے ساتھ اس طرح علانیہ اپنی عقیدت اور دوستی کا اظہار کرتے! پھر مزید ستم یہ کیا ہے کہ غالب کے سفر کلکتہ کے دوران میں سیّد محمود کی ان سے ملاقات بیان کی ہے۔ سیّد محمود ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے اور غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس بھی آچکے تھے۔ اسی طرح بعض اور اصحاب کو بھی غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔

نواب کلب علی خاں خلد آشیاں نے ابتدا میں ایک فارسی نثر غالب کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔ بدقسمتی سے اس پہلی اصلاح ہی پر ایک ناخوشگوار بحث چھڑ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے کوئی اور چیز میرزا کے پاس نہیں بھیجی۔ اسی طرح دربار رام پور کے میر منشی سیل چند نے بھی ایک خاص موقع پر چند شعر کہے اور غالب ان پر غالب سے اصلاح بھی لی؛ لیکن نہ وہ شاعر تھے، نہ یہ اصلاح کا تعلق ہی کوئی چیز تھی۔ انھوں نے تفننِ طبع سے چند شعر کہے اور غالب نے بھی اسی طرح اصلاح دے دی۔ اس لیے میں نے یہ دونوں نام بھی اس تذکرے میں شامل نہیں کیے۔

اب بھی میں اس تذکرے کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ ایسے بھی شاعر تھے کہ اُن کا صرف تخلص ہی معلوم ہوسکا، نام اور کلام تک رسائی نہ ہوئی۔ مثلاً آزردہ وغیرہ۔ میں نے دانستہ اس سلسلے میں اُن کا ذکر نہیں کیا کیونکہ محض فہرست کو لمبا کرنا مقصود نہیں تھا۔ بعض اصحاب ایسے تھے کہ اُن کا نام اور تخلص دونوں معلوم ہو گئے، اگرچہ نہ مفصّل حالات ملے، نہ زیادہ کلام ہی ہاتھ لگا۔ مثلاً حسام، درد، طالب، رابط، سالم وغیرہ۔ انھیں البتہ میں نے سلسلہ میں درج کر لیا ہے۔ میری موجودہ مشغولیتوں کے پیشِ نظر غیر معمولی تاخیر کے بغیر اس کام کی کماحقہ تکمیل ناممکن تھی۔ اس لیے میں نے فی الحال اسی پر قناعت کی۔ اگر بعد کو مزید حالات مل سکے یا کلام تک دسترس ہوگئی، تو طبعِ ثانی میں اضافہ کردوں گا۔ ان شاء اللہ۔

انتخابِ اشعار کا معاملہ ذاتی ذوق اور پسند پر منحصر ہے۔ اس لیے جہاں تک کیفیت کا سوال ہے، اس کے لیے "رسوائی" کے شدید اندیشے کے باوجود مجھے کسی عذر کی ضرورت نہیں۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ جو شعر انتخاب میں آئے ہیں، ان کے علاوہ اور کلام میسّر ہی نہیں ہوا۔ اس لیے لینے اور ترک کردینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ بعض شعرا کے انتخاب سے متعلق یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ بہت طولانی ہے۔ تو اس سے غرض یہ ہے کہ ان لوگوں کے دیوان رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ اگر ان کے اچھے کلام کا معتدبہ حصّہ اسی طرح ایک

جگہ محفوظ کر دیا جائے، تو شاید مفید ثابت ہو۔

اب مجھے ایک خوش گوار فرض ادا کرنا ہے یعنی جن اصحاب سے اس تذکرے کی تکمیل میں کسی نہ کسی طرح مدد ملی، ان کا شکریہ۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر (پٹنہ) اور مولانا امتیاز علی خان عرشی (رامپور) اور ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) نے نہ صرف کتابیں مستعار دیں، بلکہ اپنے مشوروں سے بھی مستفید فرماتے رہے۔ کتابیں مہیا کرنے میں متعدد دوسرے احباب نے بھی مدد فرمائی۔ ان میں سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور (حیدر آباد) اور سید جمیل الدین (بمبئی) مولانا امداد صابری (دہلی) اور جناب رحمت قطبی (دہلی) اور جناب فرخ کنول (علی گڑھ) کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علائی کا کلام ان کی غیر مطبوعہ بیاض سے لیا گیا ہے، جو ہز ہائینس نواب مرزا امین الدین احمد خان بہادر ثانی (لوہارو) بالقابہم کی نوازش سے دیکھنے کو ملی۔ میں نے منشی مہیش پرشاد مرحوم کی یادداشتوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ تفتہ کے حالات کی تحقیق کے لیے سکندر آباد گیا تو وہاں کی کوچہ گردی میں جناب شیو راج بہادر مرحوم (دہلی) میرے شریکِ غالب رہے تھے۔

یہاں آپ کو نہ صرف کئی نئے شعرا کے نام اور حالات ملینگے، بلکہ بعض ایسے شعراء کے حالات بھی مکمل اور مفصل نظر آئینگے، جن کے نام پہلے سے تذکروں میں موجود ہیں؛ آپ کو ان میں بہت سی نئی باتیں ملینگی۔ میں نے ہر ایک ترجمے کے آخر میں اپنے مآخذ کا ذکر کر دیا ہے۔ مثلاً جوہر شاہجہانپوری کا تذکرہ؛ یہ ان کے عزیزوں سے لے کر اعتبار الملک حکیم ضمیر حسن خان دل نے لکھ کر بھیجا۔ اسی طرح آرام کے حالات اور تصویر ان کے پوتے بابو بیج ناتھ صاحب آگرہ سے دستیاب ہوئی، اور نشاط کے ان کے پوتے جناب شیام نرائن سربر (دیرہ دون) سے۔ طرزی و ثاقب کے مفصل حالات جناب سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی مرحوم نے مرحمت فرمائے تھے؛ اس سلسلے میں کچھ معلومات سید محمد جلیل ہاپوڑی مرحوم سے بھی دستیاب ہوئیں۔ رنج میرٹھی کی تصویر اور حالات ان کے پرپوتے حکیم سیف الدین احمد سلمہ (میرٹھ) کا عطیہ ہیں۔ جناب قاضی عنایت حسین رشکی کے حالات اور کلام جناب قاضی غلام سجاد بسمل بدایونی نے عنایت فرمائے۔ شاکر کے حالات ان کے صاحبزادے جناب ہادی مچھلی شہری (کراچی) نے ارسال فرمائے۔ بعض معلومات جناب احترام الدین احمد شاغل (رجےپور) نے مہیا فرمائیں۔ بھوپال کے بعض شاگردوں سے متعلق کچھ تفاصیل اور رفعت اور شوکت کی تصویریں جناب محمد اظہر نادم سیتاپوری کے طفیل دستیاب ہوئیں۔

تصاویر: کتاب میں جن اصحاب کی تصویریں شامل ہیں، ان میں سے بعض کے ہم پہلے سے روشناس

ہیں، لیکن اگر ان کی بھی کوئی نئی تصویر ملی، تو اسے ترجیح دی گئی ہے، تاکہ ایک نئی چیز منظرِ عام پر آجائے۔ بعض شعراء کی تصویریں بالکل نئی ہیں اور پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہیں۔ مثلاً نفتہ، زکی، رشکی، رمز، رفعت، رنج، شوکت، وفا وغیرہ۔ یہ سب تصویریں مجھے مندرجۂ ذیل ذرائع سے دستیاب ہوئی ہیں:

آرام — جناب بابو پرتھی ناتھ صاحب، آگرہ (آرام کے پوتے)

ادیب — مخزن (لاہور) مئی ۱۹۰۵ء

اسمٰعیل — جناب خان بہادر محمد اسلم سیفی، میرٹھ (اسمٰعیل کے صاحبزادے)

تفتہ — جناب پرتھی ناتھ صاحب، آگرہ (آرام کے پوتے) اصل فوٹو غالباً آرام کا کھینچا ہوا ہے۔

حالی — جناب خواجہ غلام السیدین مدظلہٗ (بوساطت جناب حامد علی خان (جامعی)۔

حیدر — یادگارِ ضیغم

راقم — اُردو (سہ ماہی)، اپریل ۱۹۳۱ء

رشکی — نواب محمد اسمٰعیل خان بالقابہ، میرٹھ (نواب محمد اسحاق خان مرحوم کے صاحبزادے اور رشکی کے بھتیجے)۔

رفعت — سیف بھوپالی: مرزا ابوالقاسم محتشم (خلف رفعت) کے نواسے (بوساطت جناب نادم سیتاپوری)۔

رمز — عجائب گھر، لال قلعہ، دہلی (بشکریۂ محکمۂ آثارِ قدیمہ، حکومتِ ہند)۔

رنج و طبیب — حکیم سیف الدین احمد، میرٹھ (رنج کے پرپوتے)۔

زکی — شاملِ دیوان

سخن — احوالِ غالب (بشکریۂ انجمن ترقیِ اُردو، علی گڑھ) یہ تصویر قاضی عبدالودود بیرسٹر کو سیّد فصیح الدین بلخی سے ملی اور انھیں سخن کے صاحبزادے خواجہ معین الدین حسین نے دی تھی۔

سیّاح — شاملِ دیوان (بشکریہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو، حیدرآباد)۔

شوکت — جناب میاں محمد مکرم خان بھوپال (شوکت کے پوتے)، (بوساطت جناب نادم سیتاپوری)۔

صفیر — آج کل (ماہانہ) فروری ۱۹۵۶ء (بشکریۂ پبلی کیشنز ڈویژن، حکومتِ ہند)۔

طالب — تاریخِ ادبِ اُردو مؤلفہ جناب ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

ظفرؔ	عجائب گھر، لال قلعہ، دہلی (بشکریۂ محکمۂ آثارِ قدیمہ، حکومتِ ہند)۔
علائیؔ	اردو (سہ ماہی) جنوری ۱۹۴۴ء
مجروحؔ	تاریخ ادب اُردو۔ مؤلفہ جناب ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
محمودؔ	یادگارِ ضیغم
مشتاقؔ	شاملِ دیوان
ناظمؔ	رضا لائبریری رامپور
نشاطؔ	آج کل (ماہنامہ) فروری ۱۹۵۵ء (بشکریۂ پبلیکیشن ڈویژن، حکومتِ ہند)۔
نظامؔ	کلیاتِ نظام
نیّرؔ رخشاں	مرزا ناصر الدّین احمد خان (خسرو مرزا)، باقر علی خان کامل کے نواسے)۔
وفاؔ	ذخیرۂ منشی مہیش پرشاد مرحوم (بشکریۂ انجمن ترقی اُردو۔ علی گڑھ)۔

میں ان تمام حضرات کا ممنونِ احسان ہوں اور اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے کتب یا حالات یا تصاویر مہیا کر کے اس کتاب کی تکمیل میں اعانت فرمائی۔

نئی دلی — مالک رام

۱۵ دسمبر ۱۹۵۷ء

فہرست

فہرست حواشی

اثرؔ ـــــ سیّد شاہ امام الدّین علی خان چشتی اجمیری

اثرؔ خواجہ معین الدّین چشتی سلطان الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے چشم و چراغ، اور قاضی سیّد منیر الدّین کے بیٹے تھے۔ حضرت خواجہ غریب نواز ان سے بیس پشت اوپر ہیں۔ ۱۴ شوال ۱۲۶۳ھ (۲۵ دسمبر ۱۸۴۷ء) کو اجمیر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم نجی انتظام میں پائی، فارسی میں اعلیٰ اور عربی میں متوسّط استعداد تھی۔ مولوی مظفّر حسین شوخی خیر آبادی اور حکیم محمد حسن امروہوی آپ کے اساتذہ میں تھے۔ خود شوخی بھی غالب کے شاگرد تھے۔

پندرہ سال کی عمر میں تعلیم ختم کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ پہلے اجمیر ہی میں بمشاہرہ پچاس روپے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ترقی ہوئی، تو تحصیلدار بن کر مدّتوں اضلاع میں تعینات رہے۔ جب بست سالہ بندوبست کا انتظام ہوا، تو اس میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے اور رفتہ رفتہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (E. A. C.) درجۂ اول تک ترقی کرکے بمشاہرہ ۴۰۰ روپے اجمیر میں مقیم رہے۔ اپنی دیانت داری اور فرض شناسی سے نیک نام اور اقران و اماثل میں ممتاز رہے۔ ۱۹۰۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے؟ ۲۰۰ روپے ماہانہ پنشن مقرر ہوئی۔

جب سیّد غیاث الدّین علی خان سجّادہ نشین درگاہِ اجمیر نے انتقال کیا، تو ۲۰ جمادی الاوّل ۱۳۲۷ھ (۱۰ جون ۱۹۰۹ء) کو اس بلند مقام کے لیے اثرؔ کا انتخاب ہوا۔ تاریخ ہوئی: مسند نشین خواجۂ ہند اولی ہوئے (۱۳۲۷ھ)۔ تین سال بعد ۱۱ جمادی الثّانی ۱۳۳۰ھ (۲۹ مئی ۱۹۱۲ء) کو اجمیر ہی میں رحلت کی۔ ان کے شاگرد خواجہ اکبر حسین چشتی اجمیری اکبرؔ نے تاریخ کہی:

نورِ چشمِ معیں کا ماتم ہے ۔۔۔ جتنا غم کیجیے، وہ ہے تھوڑا
جس سے رونق تھی بزمِ خواجہ کی ۔۔۔ وہی دستِ اجل نے گل توڑا

گئے سوئے عدم امام الدّین | ہم کو رونے کے واسطے چھوڑا
مصرعۂ سالِ موت لکھ، اکبر! | آج بے وقت تو نے منھ موڑا
(۱۳۳۰ھ)

لاولد فوت ہوئے۔ اس لیے ان کے بعد سیّد شرف الدّین علی خان سجّادہ نشینِ درگاہ ہوئے؛ یہ مرحوم کے پھوپی زاد بھائی تھے۔ شاعری کا شوق ۱۳-۱۴ سال کی عمر میں ہوا اور اس میں اولاً مشورہ مظفرؔ حسین شوخی خیر آبادی سے رہا، بعد کو غالب سے رجوع کیا۔ افسوس، دیوان ان کی زندگی میں نہیں چھپا۔ نواب شیر محمد خاں بہادر والیِ ریاست پالن پور (گجرات) کو حضرت خواجہ معین الدّین چشتی سے بہت عقیدت تھی اور وہ اکثر زیارت کے لیے اجمیر آیا کرتے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے اثر کا کلام سنا تو اس کے جمع کرنے اور چھپوانے کا ایما فرمایا۔ چنانچہ اثر نے اسے مرتّب کر کے نواب صاحب بالقابہ کے پاس بھیج دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ دیوان زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا اور اثر کا انتقال ہو گیا؛ اور اس کے بعد نواب صاحب موصوف بھی رہ گرائے عالمِ جاودانی ہو گئے۔ بالآخر ان کے جانشین نواب سر طالع محمد خان بہادر کے زمانے میں یہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا (مطبع زبان پریس، آگرہ)۔ کتاب کے نام "دیوان اثر المسمیٰ باسمِ تاریخی چراغ چشت" (۱۹۰۷ء) سے غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے۔ بیشک، یہ ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ) میں مرتّب ہو گیا تھا۔ لیکن چھپنے کی نوبت تیرہ برس بعد آئی۔ ان کی ایک کتاب "معین الاولیا" (حالات خواجہ غریب نوازؒ) ان کی زندگی میں شائع ہوئی (۱۳۱۳ھ)۔ کلام بہت پختہ ہے۔ ہر شعر سے شاعر کی قدرتِ زبان ظاہر ہے۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے اس میں کوئی خاص بات نہیں ملتی۔ حضرت سلطان الہند سے جابجا اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ بعض پوری کی پوری غزلیں ان کی مدح میں کہی ہیں۔ اُردو کے علاوہ فارسی اور ہندی سے بھی شغف تھا۔ ان دونوں زبانوں کا کلام شاملِ دیوان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی سے بھی خاص واقفیت تھی۔

ہم نہ کہتے تھے اثرؔ اس بُتِ ناداں سے نہ مل | چار ہی دن میں یہ کیا ہو گیا نقشا تیرا

وصل کی خواہش، وفا کا حوصلہ جاتا رہا | دل لگانے کا مزا، او بے وفا! جاتا رہا
اب ستم پر بھی نہیں مائل طبیعت یار کی | دوستی کیا، دشمنی کا بھی مزا جاتا رہا
بیخودی کا ہو برا، یہ بھی خبر ہم کو نہیں | دل گیا یا جاں گئی، کیا جانے کیا جاتا رہا
رنج کا یا رشک کا باقی نہیں اب دل میں نام | تم گلے سے آ ملے، سارا گلا جاتا رہا
اے اثرؔ دل کے چلے جانے کا کیا اتنا ملال | ایک دن جانا ہی تھا، جاتا رہا، جاتا رہا

غایتِ بندگی، عشقِ خداوندی ہے
اک جہاں بندۂ بے دام ہمارا نکلا

بے پردہ جلوہ گر ہے وہ مہرِ سپہرِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

ہم کریں ضبط، محبّت میں یہ امید نہ تھی
کام مشکل تھا، پہ اللہ نے آسان کیا

بعد مدّت کے ملی آج ملاقات کی رات
اب کہاں جاؤ گے، رہ جاؤ یہیں رات کی رات

قسمت جدا جدا ہے، مقدّر جدا جدا
ناکامِ عیش ہم ہیں، عدو کامگارِ عیش

یہ تو مانا کہ محبّت میں اثر کچھ بھی نہیں
پھر یہ کس بات کے جھگڑے ہیں، اگر کچھ بھی نہیں

دیکھنا اب یہ نئی چھیڑ نکالی ہے، اثرؔ!
مجھ سے جب ملتے ہیں، غیروں کا گِلا کرتے ہیں

ہے باعثِ حجاب، فقط عالمِ حجاب
پردہ نہ ہو تو کوئی بھی پردہ نشیں نہیں

ہیں اور انھیں لوگ سمجھا رہے ہیں
محبّت میں کیا کیا مزے آ رہے ہیں

تغافل کب تلک، غفلت کہاں تک، کچھ خبر بھی ہے
تمھیں جو دیکھ کر جیتے تھے، اب وہ تم پہ مرتے ہیں

دل بہت بیقرار رہتا ہے
آپ کا انتظار رہتا ہے

نشۂ حسن کیا قیامت ہے
اس کا برسوں خمار رہتا ہے

دیدۂ دل بشکلِ آئینہ
محوِ دیدارِ یار رہتا ہے

کچھ نہیں سوجھتا محبت میں
بھوت سر پر سوار رہتا ہے

آج کل وہ ہیں، اور ہم ہیں اثرؔ!
لطفِ بوس و کنار رہتا ہے

جان پر آن بنی ضبطِ محبت میں اثرؔ!
ایسی کمبخت محبت سے عداوت اچھی

خدا بچائے، محبّت بُری بلا ہے، اثرؔ!
بتوں سے دل نہ لگانا کہیں خدا کے لیے!

علاوہ جان کے، ایمان کا بھی ہے نقصان
اثرؔ بتوں سے نہ ملنا کہیں خدا کے لیے!

جان جائے گی محبت میں کسی روز، اثرؔ!
سوجھتا ہے یہ اس آغاز کا انجام مجھے

ہجر میں جان بھی نہیں جاتی
اب یہ آفت سہی نہیں جاتی

اس دل کا اثرؔ! ہم کو کچھ بھید نہیں کھلتا
یہ نالۂ شب کیوں ہے، آہِ سحری کیوں ہے!

صورت سے اثرؔ کے ہیں عیاں عشق کے آثار
منھ زرد ہے، لب خشک ہیں، آنکھوں میں نمی ہے

کبھی بیچین ہے دل، اور کبھی بیتاب ہے جان
بیٹھے بیٹھے نہیں معلوم، یہ کیا ہوتا ہے

نہ کرے وہ اگر وفا نہ کرے — ہم شکایت کریں، خدا نہ کرے
آخر کار دل دیے ہی بنی — کوئی کب تک ترا کہا نہ کرے
نہ کرے، وہ اگر وفا، نہ سہی — کہیں ایسا نہ ہو جفا نہ کرے
تیری چاہت سے موت بہتر ہے — تجھ کو چاہے کوئی، خدا نہ کرے

[دیباچۂ دیوانِ اثر، اُردو ادب (سہ ماہی)، ۱۹۶۴ء، ۱: ۸۰-۱۲۷؛
خمخانۂ جاوید، ۱: ۱۳۵-۱۳۷]

احسان ــــ حاجی احسان اللہ ڈیرہ دونی

(تذکرہ "یادگارِ ضیغم" میں نام احسان علی خان دیا ہے؛ یہ غالباً غلط ہے) حجِ بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے۔ تجارت ذریعۂ معاش تھی۔

میں نے کہا کہ غیر کے کوچے میں کیوں گئے — کہتے ہیں کس ڈھٹائی سے، پھر تم کو کیا غرض!

کھینچا اگر خیال میں تصویرِ یار کو — ٹوٹیگا رنگ تار کے زنار کی طرح

ہاتھ میں شانہ ہے، اور پیشِ نظر آئینہ — بڑے سامان سے ہیں گیسو سنورنے والے
ساتوں افلاک جلا کر ابھی کر ڈالیں خاک — ہم سے دو ایک ہوں گر آہوں کے بھرنے والے

توجہ وہ جو بھولے سے ہمارے حال پر کرتے — تو ممکن تھا تسلی میں ہم اپنے دن بسر کرتے
نہ اتنا ہو سکا احباب سے، افسوس، اے احساںؔ! — کبھی جا کر ہمارے حال کی ان کو خبر کرتے

[یادگارِ ضیغم: ۱۴؛ خم خانۂ جاوید، ۱: ۱۰-۱۶؛ پیامِ یار (جولائی ۱۸۸۴ء) ۳:]

احسنؔ ___ حکیم مظہر احسن خان رامپوری

حکیم محمد مجتبیٰ کے بیٹے اور حکیم محمود خان کے پوتے تھے۔ رام پور میں تقریباً ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ خاندانی پیشہ طبابت تھا، لیکن اس کے ساتھ تجارت کو بھی کسبِ معاش کا وسیلہ بنایا، لکڑی کا کاروبار کرتے تھے۔ ماہر خوشنویس بھی تھے۔ عہدِ کلب علی خانی کا رام پور مختلف علوم وفنون کے ماہرین کا ملجا وماوا تھا۔ انھوں نے رام پور کے تمام اساتذہ خصوصاً میر عوض علی عدیل سے نستعلیق میں اور منشی عطا حسین سے شکستہ میں استفادہ کیا اور "ہفت قلم کہلائے"۔ اس کے علاوہ فارسی اور عربی مولوی عبدالمجید خان اور سید علی حسین اور مولوی نورالنبی سے پڑھی۔ عروض کی تعلیم مولوی جمال شاہ اور منشی مظفر علی اسیرؔ سے حاصل کی۔ عروضِ سیفی کا اردو میں ترجمہ کیا تھا غالب کی وفات کے بعد اسیرؔ سے اصلاح بھی لیتے رہے۔ ایک مختصر قرابادین بھی ان سے یادگار ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے، اور دونوں میں صاحبِ دیوان تھے۔ افسوس! کچھ شائع نہ ہوسکا۔

آخر زمانۂ حیات میں پیلی بھیت میں قیام اختیار کرلیا اور وہاں کچھ تجارت اور زمینداری بھی کر لی تھی۔ ۱۳۰۲ھ میں یہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار "خورشیدِ آفاق" نکالا، اسے اپنے ذاتی "مطبع مظہری" میں چھاپتے تھے۔ پیلی بھیت میں ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی۔

۱۵ مارچ ۱۸۹۱ء کو ۴۷ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اور پیلی بھیت ہی میں دفن ہوئے؛

یارب! ہوئی ہے عمر اسی شغل میں بسر ___ کوثر پہ اہتمام ہو مجھ بادہ خوار کا

نامہربانیوں پہ تو مرتا ہے اک جہاں ___ کہیے کہ کیا غضب ہو، اگر مہرباں ہوں آپ!

بات کرنے میں تو شرماتے ہو تم! ___ ظلم کرنے میں نہیں آتا لحاظ؟

ایک ہیں غیر کہ رہتے ہیں وفا پر ناخوش! ___ ایک ہم ہیں کہ جفا پر بھی تری شاد رہے

کبھی زندہ، کبھی مردہ ہیں جب سے تیری فرقت میں
قیامت ایک سنتے تھے، یہاں ہر دم قیامت ہے

پیشِ نگاہ چہرۂ پُرنورِ یار ہے
موسیٰ ہیں ہم، یہ جلوۂ پروردگار ہے
آنکھیں اُٹھا کے دیکھ تو للہ اک نظر
بندہ بھی چشمِ لطف کا اُمیدوار ہے
اتنا تو میرے عشق نے آخر اثر کیا
مضطر ہوں میں یہاں، وہ وہاں بیقرار ہے
ہر دم ہے جاں کنی ترے عاشق کے واسطے
کہتے ہیں جس کو مرگ، غمِ انتظار ہے
روے تو بینم و از فرطِ نزاکت ترسم
کہ نظر نیز نہ گردد بتو بارِ عارض

[تذکرۂ کاملانِ رامپور: ۳۹۳-۳۹۴؛ خم خانۂ جاوید ۱: ۱۷۲-۱۷۳؛
انتخابِ یادگار، ۲: ۷-۸؛ یادگارِ ضیغم ۱: ۵۳-۵۴]

اخترؔ ــــ حکیم جمشید علی خان

گلدستہ "نشو و نما"، بریلی کے شمارۂ ستمبر ۱۹۰۳ء (ص ۳) پر یہ طرحی غزل ملتی ہے۔

لِللہ باز آئیں نہ جور و جفا سے آپ
مرتے ہیں مرنے والے تو اپنی قضا سے آپ
دو دن میں انقلاب طبیعت میں ہو گیا
کل آشنا تھے، آج ہیں نا آشنا سے آپ
بچپن کا عُذر، مانا کہ تھا مانعِ وصال
ق اب نوجوان ہو گئے فضلِ خدا سے آپ
پھر بھی ہے وہ ہی ندِّ نظر ہم سے دور باش
ایسے ہی ننھے بچے ہیں گویا ذرا سے آپ
فرمائیے تو حضرتِ دل کی بساط کیا
اور اس پہ بل کی لیتے ہیں زلفِ دوتا سے آپ
اخترؔ، یہ کیا غضب ہے کہ کل خانقاہ میں
ق بیٹھے تھے لو لگائے ہوئے کبریا سے آپ
مسواک و خرقہ، سُبحہ و دستار و جبہ ہے
معلوم سب کو ہوتے تھے اک پارسا سے آپ
یا آج میکدے میں یہ سر ہے، پیالے خم
سرخوش ہیں دورِ بادۂ عشرت فزا سے آپ
بیٹھے ہو آہ، بیعتِ دستِ سُبو کیے
ایسے تو منحرف نہ تھے راہِ ہدیٰ سے آپ
کچھ خوف بھی تو چاہیے روزِ شمار کا
کچھ شرم بھی تو کیجیے حضرت، خدا سے آپ
ہم کو بھی دیکھنی ہے رعونت حضور کی
کب تک کھنچینگے اخترؔ جادو نوا سے آپ

[بحوالۂ سہ ماہی اُردو، کراچی - ۴۵: ۲: ۲۳۳ - ۲۳۴]

اخگر — حکیم فتحیاب خان رامپوری

قوم کے پٹھان تھے۔ شاعری گویا ورثے میں پائی۔ ان کے دادا محمد خان عَلَم (ف: ۱۲۶۸ھ) تھے؛ اور والد ظفریاب خان جو مظفر خان کے نام سے مشہور ہوئے، اُن کا زیادہ تر زمانہ نواب عبداللہ خان بہادر (نواب محمد سعید خان والی رامپور کے بھائی اور نواب ناظم فردوس مکان کے چچا) کی رفاقت میں بحیثیت ناظر دلّی اور میرٹھ میں بسر ہوا۔ یہ بھی شاعر تھے، گرم تخلص تھا اور بقول امیر مینائی طبیعت بھی گرم پائی تھی۔ عربی فارسی کے فاضل عالم اور صاحبِ دیوان تھے، جس میں ۳۰۔ ۴۰ ہزار شعر سے کم نہیں ہونگے۔ ذوق سے اصلاح لیتے تھے۔ ۶۰ برس کی عمر میں ۱۰ ر جمادی الثّانی ۱۲۸۵ھ (۲۸ ستمبر ۱۸۶۸ء) کو جے پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

اخگر ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ رسمی تعلیم مختلف استادوں سے ہندستان کے طول و عرض میں پھر کر حاصل کی۔ بڑے سیلانی آدمی تھے۔ طبابت میں بھی دسترس تھی اور اس فن میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر خان بہادر مولوی فدا علی خان، ایم، اے انھیں اخگر کے بیٹے تھے۔ یہ بھی شاعر تھے، پہلے گرم اور اخگر کی مناسبت سے شعلہ تخلص کرتے رہے، پھر اسے بدل کر فدا کر لیا تھا۔ بنکم چندر چٹرجی کا ایک مشہور ناول بشا برکھا ہے، فدا نے اس کا ترجمہ "بس کا رُوکھ" کے نام سے کیا تھا۔ یہ چھپا ہوا موجود ہے۔

اخگر کا انتقال ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں خسرہ (رھوگلی) میں ہوا تھا، اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:

قابو نہ تھا جو دل پہ، تو اخگر! بتائیے — جانا ہی اس کے پاس تمھیں کیا ضرور تھا؟

دلِ ناکام کو پھر اُن نگاہوں کی تمنّا ہے — جگر میں ڈوب جانا، پھر وہ یاد آتا ہے نشتر کا

قاتل تھا تو تو گرچہ نہ بندہ تھا کُشتنی — ظالم کیا نہ پاس، کچھ اپنے بھی نام کا!

نہ آئے تم، تو نہ گھر سے مرے سدھاری رات مری طرح ہے، مگر منتظر تمھاری رات
سیاہی دونوں میں ٹھیری موافقت کا سبب ہمارے بخت کی دمساز ہے ہماری رات

حشر کہنے سے کھٹکتا ہوں، خدا خیر کرے ہے قیامت، نہ ہوا واں بھی جو پرساں کوئی
طرفگی حسن کی اور عشق کی نیرنگی، واہ! دیکھے آئینہ کوئی، اور ہو حیراں کوئی
عمر گو صحبتِ انساں ہی میں گذری اپنی پر تماشا ہے، کہ دیکھا نہیں انساں کوئی

جاؤ کوے غیر میں، اے نالہ ہاے نارسا! اپنے ہی سر پر تھے تم، محشر اٹھانے کے لیے

[انتخابِ یادگار، ۲: ۱۲؛ تذکرۂ کاملانِ رامپور: ۳۲۴؛ معارف (۷۱): ۲۸۳ - ۲۹۹؛ ایضاً (۷۷) ۳۰۸ - ۳۱۳؛ مشرقی بنگال میں اردو: ۱۳۹]

اخگر ـــــ مولوی فرزند علی عظیم آبادی

موضعِ یوسف پور کے رہنے والے تھے جو عظیم آباد کے نواح میں ہے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد مرزاپور میں سکونت اختیار کر لی؛ یہیں مدتوں وکیلِ عدالت رہے۔ ان کے خاندان کے لوگ اب تک وہاں مقیم ہیں۔

خود نما تھا سب حسینانِ زمن میں آئینہ ہے مگر حیران تری انجمن میں آئینہ
گرمیِ آہِ شرربارِ دلِ مغموم سے شعلۂ جوّالہ ہے بیت الحزن میں آئینہ
عکسِ عارض جلوہ افزا ہے جو طشت آب میں صاف یہ آیا تصوّر، ہے لگن میں آئینہ
لاکھوں وعدے اے خود آرا! آہ عاشق سے کیجے پر کسی دن بھی تو اس کی انجمن میں آئی نہ
رخ کی شاگردی جو اے اخگر ہوئی مدِ نظر
ہو گیا استاد محجوبی کے فن میں آئینہ

[مرقعِ ادب، ۲: ۲۰ - ۲۲؛ سخنِ شعرا: ۱۹؛ تذکرۂ نادر: ۲۲ (دیوانِ غریب)۔ ہماری زبان، ۲۲ مئی ۱۹۶۳ء: ۸]

آدیب ـــــ مولوی محمد سیف الحق دہلوی

ان کے والد مولوی احسان الحق، مفتی محمد اکرام الدین خان بہادر صدر امین دہلی کے بیٹے تھے۔
سلسلۂ نسب ان کا شیخ عبدالحق محدث دہلوی تک پہنچتا ہے۔
شیخ محدث دہلوی کا نام نامی محتاجِ تعارف نہیں۔ ہندستان میں علم حدیث کو رواج دینے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ آقا محمد سب سے پہلے بخارا سے واردِ ہندستان ہوئے۔ یہ علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ - ۱۳۱۶ء) کا زمانہ تھا۔ مولوی احسان الحق ان آقا محمد کی نویں پشت میں تھے۔ ان کے چار صاحبزادے ہوئے۔ خان بہادر مولوی محمد انوار الحق (۱۳۲۰ھ) یہ مدتوں راجپوتانہ ریذیڈنسی میں میر منشی رہے۔ ان سے چھوٹے مولوی محمد وحید الحق تھے۔ مولوی محمد سیف الحق ادیب تیسرے تھے۔ سب سے چھوٹے خان بہادر مولوی محمد شرف الحق تھے جو حیدر آباد دکن میں مہتمم بندوبست رہے؛ اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ ان کی اولاد اب بھی وہاں موجود ہے۔
مولوی سیف الحق ادیب ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ دِلّی کے علما کی خدمت میں رہ کر علوم متعارفہ حاصل کیے۔ نہایت ذہین اور ذکی الفہم تھے؛ بہت جلد طاق ہو گئے۔ جولانیِ طبع نے شاعری کی طرف مائل کیا اور اصلاح کے لیے غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کلام کی اُپج دیکھ کر میرزا نے فرمایا: "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ میرزا غالب کے بعد چندے میرزا یوسف علی خان عزیز (اور شاید قربان علی بیگ سالک) سے بھی مشورہ کیا۔
شروع میں عدالت منصفی دہلی میں بہ عہدۂ نائب ناظر ملازم ہوئے، لیکن طبیعت نہ جمی۔ نوکری چھوڑ، ایک اخبار "میوگزٹ" چھاپنے لگے۔ جب یہ اخبار بند ہو گیا تو مختلف پرچوں اور رسالوں میں مضمون لکھتے رہے۔ ۱۸۷۴ء میں انجمن مفیدِ عام قصور (ضلع لاہور) میں سکرٹری کا عہدہ قبول کر لیا اور انجمن کے ماہانہ رسالے کی ادارت کا کام بھی کرتے رہے لیکن جلد ہی یہ سب کچھ

چھوڑ چھاڑ کے سررشتۂ تعلیم میں ملازم ہو کر لاہور آ گئے اور اس کے بعد یہاں کے اخبار "کوہِ نور" کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ چند دن کے لیے "رفیقِ ہند" کے جواب میں ایک ماہانہ رسالہ "شفیقِ ہند" بھی نکالا۔ جس کے ساتھ دو ضمیمے "نسیمِ صبح" اور "شامِ وصال" بھی چھپتے تھے۔ جب یہاں سے طبیعت بالکل اُچاٹ ہو گئی تو حیدر آباد دکن پہنچے اور ساڑھے چار سو روپیہ ماہانہ پر پریس رپورٹر مقرر ہو گئے۔ داغ جب پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد گئے ہیں، تو انھیں کے ہاں ٹھہرے تھے۔ ان دنوں ادیب بازار شیدی عنبر میں رہتے تھے۔ بازار شیدی عنبر آج بھی اسی نام سے موجود ہے، اس مکان کی ہیئت البتہ بہت کچھ بدل چکی ہے۔

صرف ۴۵ برس کی عمر تھی جب کثرتِ شراب نوشی کی علت میں ۸ ستمبر ۱۸۹۱ء (۳۱ صفر ۱۳۰۹ھ) کو دہلی میں انتقال کیا۔ قطب میں اپنے جدِ اعلیٰ محدث دہلوی کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔[1]

ادیب کا نکاح سید امیر علی کی صاحبزادی حمیدی بیگم سے ہوا تھا۔ اس بیوی سے انھوں نے چار جسمانی یادگاریں باقی چھوڑیں۔ تین لڑکے: محمد اکرام الحق، محمد اسلام الحق اور (خان بہادر) محمد انعام الحق اور ایک لڑکی فہمیدی بیگم۔ محمد اکرام الحق کا تخلص عجیب تھا۔ پھر ظفر کیا۔ ظفر حق ان کا تاریخی نام تھا، یعنی ان کی پیدایش (۱۹ رجب) ۱۲۸۸ھ (۵ اکتوبر ۱۸۷۱ء) کو ہوئی۔ وہ مدتوں ریاستِ حیدر آباد میں محکمہ کروڑ گیری میں ملازم رہے۔ ان کے صاحبزادے اظہر حق صاحب ۱۹۵۷ء میں حیدر آباد میں موجود تھے۔ محمد اسلام الحق بھی شعر کہتے تھے، سلیم تخلص تھا۔

ادیب بہت اچھے خوشنویس[2] تھے فنِ تاریخ گوئی میں بھی اچھی مہارت تھی۔ تحقیقِ لفظی کا بہت خیال رہتا تھا؛ اس موضوع پر بلند پایہ مضامین ان کے قلم سے نکلے۔ مزاج میں ظرافت تھی، اس لیے

---

[1] مولوی محمد عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے تذکرۂ شعرائے دکن (۴۰-۲) میں لکھا ہے کہ "حیدر آباد دکن میں مسافرِ عدم ہوئے"۔ یہ ٹھیک نہیں۔ انتقال دہلی میں ہوا تھا، اور وہیں دفن ہوئے۔

[2] تذکرۂ شعرای فارسی "منتخب اللطائف" تالیف رحم علی خان ایمان، تہران سے باہتمام سید محمد رضا جلالی نائینی و دکتر سید امیر حسن عابدی شائع ہوا ہے (۱۳۴۹ شمسی) اس کا اصلی خطی نسخہ دلی یونیورسٹی کے کتابخانے میں محفوظ ہے، جس کا عکس یہ مطبوعہ نسخہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کسی زمانے میں ادیب کے پاس رہا ہے؛ اس کے حاشیے میں جا بجا ادیب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں محفوظ ہو گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں خطِ نستعلیق میں پوری مہارت حاصل تھی۔



مولوی محمد سیف الحقؔ ادیب دہلوی

مجلس میں خوب چمکتے تھے۔ تقریر بھی بہت اچھی کرتے تھے، اسی سبب جلسوں میں ان کی مانگ رہتی تھی۔ اُن کے ترقی پسند رجحان کا ثبوت اِس سے ملتا ہے، کہ جب آزاد اور حالی انجمن پنجاب، لاہور میں نئی شاعری کی بنیاد ڈال رہے تھے، تو ادیبؔ کی کوشش سے دہلی سوسائٹی کی سرپرستی میں بھی مناظمے ہونے لگے، جن میں مصرعِ طرح کی جگہ کسی خاص موضوع پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔

نسّاخ کے تذکرے "سخن شعرا" کا جو نسخہ شاہ بہاء الدّین دہلوی معروف بہ عبداللہ شاہ بشیر (شاہ نصیر دہلوی کے چھوٹے بیٹے شاہ نجم الدّین صغیر کے حقیقی نواسے) کے پاس تھا، اس کے حاشیے پر انھوں نے بہت قیمتی اضافے کیے، اور کئی شعرا کے حالات کا اپنی طرف سے اضافہ کیا تھا۔ یہ نسخہ حسنِ اتفاق سے محفوظ رہ گیا؛ اس پر جناب مشفق خواجہ، کراچی نے مفصّل مقالہ قلمبند کیا جو سہ ماہی اُردو، کراچی کے 'غالب نمبر' (۴۵ : ۱ - جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء) بعنوان "غالب اور تلامذۂ غالب" شائع ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادیبؔ نے ایک تذکرہ شعرا بھی مرتّب کیا تھا۔ بشیر نے اس تذکرے کے لیے متعدد قطعات تاریخ کہے تھے، مثلاً

مرتّب ساخت در ایامِ نیکو ادیبِ افسانۂ شیریں مقالاں
بُجستم سالِ اتمامش ز ہاتف کہ ہست ایں قصّۂ صاحب کمالاں
بگفتا: کاے بشیرِ خستہ خاطر بگو: "گلدستۂ نازک خیالاں"
(۱۲۸۹)

گویا یہ تذکرہ ۱۲۸۹ھ میں مکمّل ہوا؛ ہنوز اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔

ادیب کا کلام دلّی کے روزمرّہ اور محاورہ کی جان ہے، معاملہ بندی اور بیباختگی اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ افسوس وارستہ مزاجی اور لاأبالی طبیعت نے انھیں اپنا کلام مرتّب کرنے کی فرصت نہ دی، ورنہ کام کی چیز ہوتا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

یوں ہوا حال ستم سے ترے سودائی کا آپ ہی شوق ہے گویا تجھے رسوائی کا

موت آگئی مجھے، سرِ شامِ فراق میں دشمن نے آج کام کیا، دوست دار کا

ہو جان پر جو ایک مصیبت تو رو دیئے دل بھی یہاں ملا، تو ترے اختیار کا

راہِ وفا پہ گر نہیں آتے ہیں وہ، نہ آئیں دل ہی کہیں ہو کاش، مرے اختیار کا

کر چشم و دل کی خیر، خدا سے طلب ادیبؔ! لپکا بُرا پڑا ہے تجھے انتظار کا

جس کو مارا، وہ اُف نہیں کرتا ہاتھ ہلکا ہے میرے قاتل کا

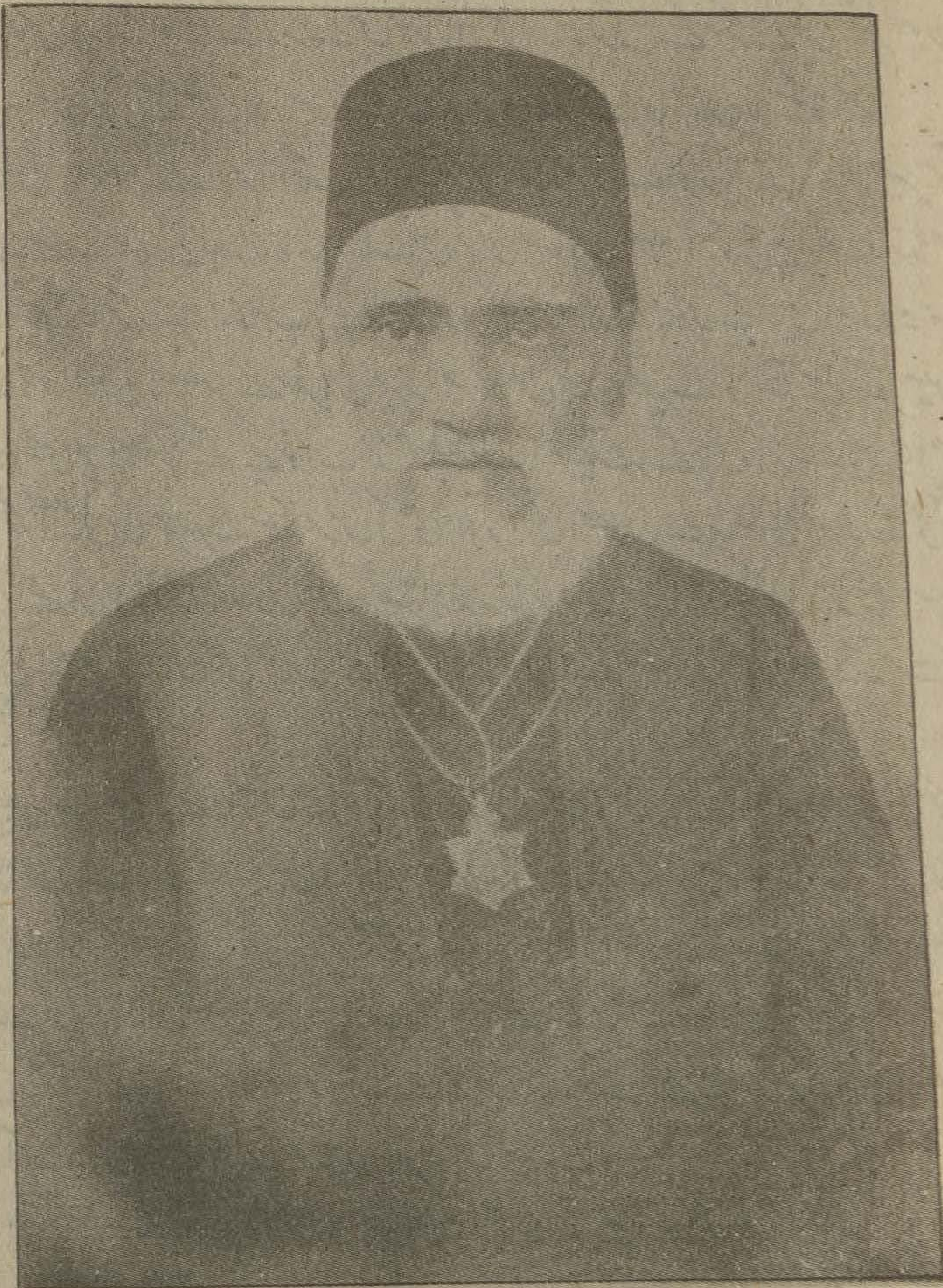
اسمٰعیل ـــــ مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں اپنے خاندانی مکان واقع محلہ مشائخان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ پیر بخش تھا، جن کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن ابوبکر صدیق سے ملتا ہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ قاضی حمید الدین خجندی مغلیہ خاندان کے بانی بابر بادشاہ کے ہمراہ ۱۵۲۶ء میں ہندستان آئے۔ فتحِ ہند کے بعد بابر نے انھیں یک ہزاری منصب دے کر قصبۂ سیکری کا چودھری بنا دیا۔

مولانا اسمٰعیل کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دس برس کی عمر میں قرآن ناظرہ ختم کیا۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو مرزا رحیم بیگ رحیم کے مدرسے میں فارسی کی مزید تعلیم کے لیے داخل ہوئے۔ یہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا واقعہ ہے۔ خان بہادر مولانا محمد اسلم سیفی (مولانا اسمٰعیل کے خلفِ اصغر) "حیاتِ اسمٰعیل" میں لکھتے ہیں:

> اس زمانے کا ذکر ہے کہ مرزا غالب نے قاطع برہان کے نام سے ایک رسالہ برہان قاطع کے خلاف شائع کیا تھا۔ یہی وقت تھا کہ مرزا رحیم بیگ کے مکتب میں مولانا (محمد اسمٰعیل) متعلّم تھے۔ مرزا رحیم بیگ نے مرزا غالب کی قاطع برہان کے جواب میں ایک رسالہ ساطع برہان تصنیف کیا تھا۔ مولانا کے سپرد یہ خدمت تھی کہ مختلف کتبِ لغات سے الفاظ تلاش کرتے اور ان کے معانی سُناتے رہیں اور کبھی کبھی مسودات بھی تحریر کیا کریں۔ (ص ۹)

یہاں حضرت سیفی کو غلط فہمی یا سہو ہوا ہے۔ جس زمانے میں مولانا اسمٰعیل، مرزا رحیم بیگ کے مدرسے میں طالبعلم تھے، اس وقت تک مرزا غالب کی قاطع برہان عالمِ وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں مرتب ہوئی اور پہلی دفعہ ۱۸۶۲ء میں چھپی، جب کہ مولانا کی عمر ۱۸ برس کی ہو چکی تھی۔ خود جناب سیفی کے بیان کے مطابق مولانا محمد اسمٰعیل اس سے دو برس پہلے ۱۸۶۰ء میں انسپکٹر مدارس کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے ملازم ہو چکے تھے۔ ظاہر



مولانا محمد اسمٰعیلؒ اسمٰعیل میرٹھی

ہے کہ قاطعِ برہان کی اشاعت کے زمانے میں مولانا اسمٰعیل، رحیم بیگ کے مکتب میں متعلّم نہیں تھے، اس لیے وہ الفاظ کی تلاش اور مسودات کی تحریر کی خدمت بجا نہیں لا سکتے تھے۔
مولانا محمد اسمٰعیل ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۷ء تک اس دفتر میں ملازم رہے اور یہ سارا زمانہ میرٹھ سے باہر نہیں گئے۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء تک تین برس سہارنپور ضلع اسکول میں صدر مدرّس فارسی کے عہدے پر فائز رہے۔ غالب پہلے جنوری ۱۸۶۰ء میں رامپور گئے ہیں اور دوسری مرتبہ اپریل ۱۸۶۵ء میں۔ دوسرے سفر میں میرزا میرٹھ میں نہیں ٹھیرے۔ البتّہ پہلے سفر میں رامپور سے واپسی پر دو دن کے لیے نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ کے ہاں اُترے ہیں؛ اس وقت مولانا محمد اسمٰعیل کی عمر صرف سولہ برس کی تھی، اور ابھی انھوں نے شاعری شروع بھی نہیں کی تھی۔ اس لیے ان دونوں سفروں میں اُستاد اور شاگرد کی ملاقات کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کبھی نہیں ملے، اس لیے مولانا نے مشورۂ سخن خط و کتابت ہی سے کیا ہوگا۔[✻]
مولانا ۱۸۷۱ء میں سہارنپور سے واپس میرٹھ آئے اور پہلے ضلع اسکول میں اور پھر نارمل اسکول میں فارسی کے معلّم رہے۔ ۱۸۸۷ء میں وہ اسی عہدے پر آگرہ نارمل اسکول میں منتقل ہو گئے اور اس کے بعد بارہ برس تک آگرے میں مقیم رہے۔ مولانا کی شہرت بحیثیت شاعر اسی زمانے میں ہوئی، جب اُن کی بعض نظمیں مولانا وحیدالدین سلیم کے پرچے معارف (علی گڑھ) میں شائع ہوئیں۔ آگرے ہی سے وہ ۱۸۹۹ء کے اواخر میں ملازمت سے پنشن لے کر اپنے وطنِ مالوف واپس آئے اور عمر کے باقی ایام یہیں میرٹھ میں بسر کیے۔
انھوں نے قیامِ آگرہ کے زمانے ہی میں ابتدائی درجوں کے لیے کتابوں کا ایک سلسلہ لکھا، جو مدتوں یوپی کے مدارس میں داخلِ نصاب رہا اور اہلِ نظر کی رائے ہے کہ آج تک ان سے بہتر کتابیں

✻ بعض حضرات کو اسمٰعیل کے تلمذِ غالب میں بھی شبہہ ہے۔ میں جن ایام میں تلامذۂ غالب کی تدوین کے سلسلے میں سرگرداں تھا، میرا میرٹھ بھی جانا ہوا تھا۔ میں بارہا اسمٰعیل کے صاحبزادے جناب محمد اسلم سیفی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ ایک دن ہم دونوں گھر سے باہر نکل رہے تھے کہ وہ صحن میں رُک گئے اور کہا: ابّا مرحوم نے اسی جگہ کھڑے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے مرزا غالب سے اصلاح لی ہے۔
حسرت موہانی نے بھی اسمٰعیل کو غالب کا شاگرد لکھا ہے؛ اور حسرت کے اسمٰعیل سے ذاتی تعلقات تھے۔

بچوں کے لیے نہیں لکھی گئیں۔

۱۹۱۲ء میں انھیں حکومتِ ہند کی طرف سے اپنی علمی خدمات کے اعتراف میں خان صاحب کا خطاب ملا تھا۔

۱۹۱۴ء میں نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی تحریک پر طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو کے تمام کلام کی تصحیح و طباعت کا کام شروع ہوا تھا۔ ملک کے مختلف اصحابِ قلم حضرات کے ذمے ایک ایک کتاب لگائی گئی تھی۔ مثنوی "قران السعدین"، جو حاکمِ بنگالہ نصیر الدین محمود بغرا خان اور معز الدین کیقباد شاہِ دہلی کی ملاقات کے حال پر مشتمل ہے، مولانا کے حصے میں آئی۔ افسوس کہ انھیں اس کا مطبوعہ نسخہ دیکھنا نصیب نہ ہوا؛ یہ ان کی وفات کے چند ماہ بعد ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ لیکن جو محنت اور جگر کاوی انھوں نے اس کی تصحیح اور تنقید میں کی ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آخری ایام میں وہ حضرت امیر خسرو کی سوانحعمری مرتب کر رہے تھے کہ موت کا بلاوا آ گیا۔

معمولی علالت کے بعد یکم نومبر ۱۹۱۷ء (۱۴ محرم الحرام ۱۳۳۶ھ) کو جمعرات کے دن عصر کے وقت وفات پائی۔ اسی دن مغرب کے قریب جنازہ اٹھا اور شہر کے باہر ایک خاص قطعۂ زمین میں دفن ہوئے، جو باغپت اور غازی آباد سے آنے والی سڑکوں کے چوراہے کے قریب پڑتا ہے۔ لوحِ مزار پر حسبِ ذیل کتبہ ہے:

پیدائش : ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء

وفات : یکم نومبر ۱۹۱۷ء

اے ادیبِ علم و دانش، بانیِ فضل و کمال
اے خطیبِ خطبۂ خلق و ادب حلم و حیا
پیشوائے قوم مولانا محمد اسمٰعیل
ماہتابِ برجِ حکمت، آفتابِ فلسفہ

یہ دونوں اشعار اس مرثیے سے ماخوذ ہیں جو منشی عنایت نبی ارشد نے مولانا کی وفات پر کہا تھا۔

وفات کے وقت عمر چند دن کم ۷۳ برس کی تھی۔ اپنے پیچھے اولاد میں دو لڑکے محمد محمود اور محمد اسلم اور ایک صاحبزادی قیوم النساء یادگار چھوڑی۔

کلیاتِ اسمٰعیل کا پہلا ایڈیشن ان کی زندگی میں (۱۹۱۱ء) چھپا۔ لیکن یہ بہت ناقص تھا۔ دوسرا ایڈیشن ان کے صاحبزادے جناب محمد اسلم سیفی نے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا اور اس کے شروع میں "حیاتِ اسمٰعیل" کا اضافہ کیا۔

مولانا اسمٰعیل نے اُردو، فارسی نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا۔ میں نے کلام میں صرف ان کی غزلوں کا انتخاب لیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا اصلی کارنامہ ان کی وہ نظمیں ہیں، جو انھوں نے اپنی ناقابلِ تقلید اور عدیم المثال طرز میں بچّوں کے لیے لکھی ہیں۔ بچوں کے لیے کوئی چیز لکھنا کس قدر مشکل ہے، اس کا اندازہ کچھ اسی کو ہو سکتا ہے جس نے کبھی یہ کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے بچّوں کی ذہنیت اور نفسیات کا گہرا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ محض پند و نصائح اور آسان زبان اس کے لیے کافی نہیں، بلکہ موضوع کو ایسے طریقے سے پیش کرنا کہ بچے کی سادہ طبیعت خود بخود اس کی طرف مائل ہو اور نصیحت اس کے دل پر نقش ہو جائے، یہ اصل بات ہے۔ مولانا محمد اسمٰعیل اس مقصد میں غیر معمولی طور پر کامیاب رہے ہیں۔

ان کی غزلوں اور نظموں کا دل پسند موضوع تصوّف اور اخلاق ہے۔ ایک تو طبیعت فطری طور پر نیک تھی، اس پر دورِ آخر کے مشہور ولی اللہ حضرت سیّد غوث علی شاہ پانی پتی کی بیعت

۵ حضرت سیّد غوث علی شاہ۔ خورشید علی نام، ابوالحسن کنیت اور سیّد غوث علی شاہ عرف تھا۔ سلسلۂ نسب ۱۸ پشتوں میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ آپ کے اجداد میں حضرت سیّد محمد غوث سب سے پہلے ہندستان آئے۔ وہ روم سے خراسان اور وہاں سے ملتان پہنچے (اخبار الاخیار) ملتان سے نقل مکان کر کے اوچھ تشریف لے گئے، اور وہیں انتقال فرمایا۔ ان کے پوتے سیّد مصلح الدّین ناصر الحسن عرف میر میران لاہور میں بس گئے۔ ان کی اولاد میں سے ایک بزرگ ۱۸۵۷ء سے پہلے مونگیر ضلع بہار کے قصبۂ استھاوان چلے گئے۔ سیّد غوث علی شاہ یہیں استھاوان میں، ۴ ستمبر ۱۸۰۴ء (یکم جمادی الآخر ۱۲۱۹ھ) کو عالمِ وجود میں آئے۔ ۱۲ برس کی عمر تھی جب اپنے والد سیّد احمد علی رسالدار کی معیت میں لاہور گئے اور تعلیم کی غرض سے مختلف اکابر کی خدمت میں رہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی اور مولانا فضل امام خیر آبادی ان کے استادوں میں تھے، اور یہ خود مولانا فضلِ حق کے ہم سبق تھے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد مختلف مقامات کی سیر کر کے علومِ باطنی حاصل کیے۔ اور ۶۰ برس کی عمر میں مستقلاً پانی پت میں مقیم ہو گئے۔ یہیں ۶ مارچ ۱۸۸۰ء (۲۶۔ ربیع الاوّل ۱۲۹۷ھ) کو وصال ہوا۔ مزار شہر کے باہر ہے، جہاں سالانہ عُرس ہوتا ہے "او بود شہنشہِ حقیقت" تاریخ ہے۔ یہ غالب کے دوستوں میں سے تھے اور آپس میں دید و باز دید کے تعلّقات تھے (تذکرۂ غوثیہ)

نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کے حالات نثر میں "تذکرۂ غوثیہ" کے عنوان سے لکھے ہیں۔[۵] اس کتاب کی دلکشی کی کماحقّہٗ تعریف نہیں ہو سکتی۔ زبان کے لحاظ سے ایسی بیساختہ اور موضوع کے لحاظ سے ایسی پُرخلوص کتابیں اُردو میں بہت کم تصنیف ہوئی ہیں۔

جن اصحاب نے اُردو شاعری کو اپنے ڈگر پر ڈالا، اُن میں مولانا اسمٰعیل صفِ اوّل کے لوگوں میں سے ہیں۔ جب ۱۸۷۴ء میں محمد حسین آزاد لاہور میں انجمنِ پنجاب کی قیادت میں نئے رنگ کے مشاعروں کی بنیاد رکھ رہے تھے، اسی زمانے میں اسمٰعیل بھی نئے نئے مضمونوں پر نظمیں تصنیف کر رہے تھے، جیسا کہ ان کے مجموعۂ کلام "ریزۂ جواہر" (مطبوعہ ۱۸۸۰ء) سے ظاہر ہے۔ قادر الکلامی، محاورہ بندی، برجستگی اور آمد، کسی بات میں وہ اپنے معاصرین سے پیچھے نہیں، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ بہت ہی کم اس میں اُن کی برابری بھی کر سکتے ہیں۔

اُردو غزلوں کا مختصر انتخاب یہ ہے:

میرے سوا حریفِ ستم کوئی بھی نہ تھا   اب مہربان ہو گئے یہ کیا غضب ہوا!

ہے بے لب و زبان بھی غل تیرے نام کا   محرم نہیں ہے گوش، مگر اس پیام کا
ہیں بیقرار، منزلِ مقصود بے نشاں   رستے کی انتہا، نہ ٹھکانا مقام کا

اس انجمن میں جائیے، اب کس اُمید پر؟   ہم بیٹھنے نہ پائے کہ وہ بدگماں اُٹھا
وصل و فراق وہم سہی، دل لگی تو ہے   پھر ہم کہاں جو پردۂ رازِ نہاں اُٹھا

پروانے کی تپش نے خدا جانے، کان میں   کیا کہہ دیا کہ شمع کے سر سے دھواں اُٹھا

بنائیں بگڑیں ہوئی کو تو ایک بات بھی ہے   بگاڑنا نہیں مشکل، بنی بنائی کا
اٹھا حجاب، تو بس دین و دل دیے ہی بنی   جنابِ شیخ کو دعویٰ تھا پارسائی کا

کام اگر حسبِ مُدّعا نہ ہوا   تیرا چاہا ہوا، بُرا نہ ہوا
سخت فتنہ جہاں میں اُٹھتا   کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا

۵ یہ کتاب سیّد گل حسن شاہ صاحب کی تصنیف خیال کی جاتی ہے کیونکہ انھیں کا نام مُصنّف کی حیثیت سے سرِ ورق پر لکھا ملتا ہے۔ قطعِ نظر اس سے کہ سیّد گل حسن شاہ جس خطّۂ ملک کے رہنے والے تھے، وہاں کی زبان کا اس سے کیا تعلق، جو کتاب میں استعمال ہوئی ہے، میں نے کتاب کا اصلی مسودہ خود مولانا اسمٰعیل مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے صاحبزادے جناب سیفی صاحب کے پاس دیکھا تھا۔ جس کے بعد کوئی شبہہ باقی نہیں رہ سکتا کہ کتاب مولانا اسمٰعیل کی لکھی ہوئی ہے۔

نقابِ جور میں رُوپوش، اک لطفِ نہاں نکلا
وہ میرے حال پر مجھ سے بھی زیادہ مہرباں نکلا

نہ تھا بزمِ احبا ہی میں تیرا ذکر دشمن بھی
بیاں کرتا سرِ بازار، تیری داستاں نکلا

حجابِ شاہدِ مطلق نہ اٹھا ہے، نہ اُٹھیگا
جسے ہم لامکاں سمجھے تھے، وہ بھی اک مکاں نکلا

میں کبھی کا مر بھی رہتا، نہ غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا

یہ جو عشق جانستاں ہے، وہ بحرِ بیکراں ہے
نہ سنا کوئی سفینہ کبھی اس سے پار ہوتا

کبھی بھول کر کسی سے، نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا، تمھیں ناگوار ہوتا

ساقی ادھر تو دیکھ کہ ہم دیر مست ہیں
کچھ مستیِ نگہ بھی ملا دے شراب میں

بس، اے رنگ و بُو! تو نہ کر ناز بیجا
خدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

جو تشریف لاؤ، تو ہے کون مانع!
مگر خوئے بد کو بہانے بہت ہیں

کرو دل کے ویرانے کی کنج کاوی
دبے اس کھنڈر میں خزانے بہت ہیں

نہ اے شمع! رو رو کے مر شام ہی سے
ابھی تجھ کو آنسو بہانے بہت ہیں

بس اک آستانہ، ہے سجدے کے قابل
زمانے میں گو آستانے بہت ہیں

اتنا تو جانتے ہیں کہ بندے خدا کے ہیں
آگے حواس گم، خردِ نارسا کے ہیں

کھٹکا بھی کچھ ہوا نہیں، اور دل اڑا لیا
یہ سارے ہتھکنڈے تری زلفِ دوتا کے ہیں

تو ہی نہیں ہے رمزِ محبت سے آشنا
ورنہ دیارِ حُسن میں رسمِ ستم نہیں

سر ہی کے بل گئے ہیں سدا رہروانِ عشق
حیرت زدہ نہ بن، کہ نشانِ قدم نہیں

کیسی طلب، کہاں کی طلب، کس لیے طلب
ہم ہیں، تو وہ نہیں ہے، وہ ہے، تو ہم نہیں

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں
ہم سے پوچھو، تو آدمی ہی نہیں

یا وفا ہی نہ تھی زمانے میں
یا مگر دوستوں نے کی ہی نہیں

بندگی کا شعور ہے جب تک
بندہ پرور! وہ بندگی ہی نہیں

خوفِ ناکامی ہے جب تک کامیابی ہے محال
مشکلیں، جب بندھ گئی ہمت، سب آساں ہو گئیں

کیا انھیں اندوہِ ہنگامِ سحر، یاد آگیا!
شام ہی سے بزم میں شمعیں جو گریاں ہو گئیں

اک فرشتے بھی تو ہیں، جن کو نہ محنت ہے نہ رنج
خواہشیں دل کی بلائے جانِ انساں ہو گئیں

تھی وہ توفیقِ الٰہی، میں نے سمجھا اپنا فعل
طاعتیں بھی میرے حق میں عینِ عصیاں ہو گئیں

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں
ہے یہ تیری ہی صدا، غیر کی آواز نہیں

بے حوصلگی ہے گلۂ تلخیٔ دوراں
جو دیں اسے پی جائیے، گو زہر ملا ہو

تنگی سے نہ دل تنگ ہو، جا شکرِ خدا کر
اے خوش! وہ دل تنگ کہ راضی برضا ہو

گاہک ہی نہ ہو کوئی، تو ہے عرضِ ہنر ہیچ
اے وائے! گلِ تازہ جو صحرا میں کھلا ہو

پھر کچھ کچھ ان کے وعدے پہ اب اعتبار ہے
مایوسِ مرگ پھر دلِ امید وار ہے

چل میکدے کو، بیٹھ نہ گوشے میں تنگ دل
زاہد! وسیع رحمتِ پروردگار ہے

البتہ اس کے فضل پہ موقوف ہے نجات
کچھ زہدِ خشک میں ہے، نہ دامانِ تر میں ہے

ہے رگِ ہر برگ میں رنگِ بہار
دیکھنے کو چشمِ بینا چاہیے

ہے تو اغیار سے خطاب مگر
میری ہر بات کا جواب بھی ہے

واں برابر ہے خلوت و جلوت
اس کی بے پردگی حجاب بھی ہے

اب فارسی کی دو غزلوں کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

اے رُوے تو بے نقاب تا کے
برخود تپد آفتاب تا کے

بشکن سرِ زلفِ تابدارت
دلہا ہمہ پیچ و تاب تا کے

در روزِ شمار کس مپرسم
گیرم ز غمت حساب تا کے

حسنِ تو نقاب در نتابد
شوخیِ تو در حجاب تا کے

صد قفل زدم درِ تمنا
دل بستۂ فتحِ باب تا کے

زاہد! بہ نوائے خارج آہنگ
دل برکنی از رباب تا کے

ہر چند مرا نیست بتو ہیچ کلامے
ہر دم ز تو صد بار پیامے و سلامے

گفتم بتو، از لب نہ بروں آمدہ حرفے
رفتم بتو، از جائے نہ برداشتہ گامے

آنگاہ کہ ناگاہ، بہ بے گاہ رسیدیم
سالیست، نہ ماہیست، نہ صبحیست، نہ شامے

منزل گہِ ما را، نہ سلوکیست، نہ رسمے
نے ہم سفرے ہست، نہ میلے، نہ مقامے

آں مے کہ بخوردیم، نہ در خوردِ عوام ست
خمخانہ، مارا، نہ خمے ہست، نہ جامے

صد فتنہ برانگیختہ، ناکردہ نگاہے
صد مرحلہ طے ساختہ، ناکردہ خرامے

(حیاتِ اسمٰعیل)

اشرف ــــ مولوی مرزا اشرف بیگ دہلوی

دلّی کے ایک شریف اور معزّز خاندان کے فرد تھے۔ ان کا تاریخی نام "اشرف بیگ خان" تھا، جس سے ان کی تاریخِ ولادت ۱۲۶۴ھ (مطابق ۱۸۴۷ - ۱۸۴۸ء) برآمد ہوتی ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی۔ بدقسمتی سے والد ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے میں کام آئے۔ اس وقت تک وہ قرآن ختم کر چکے تھے، اور فارسی کا ابتدائی نصاب بھی مکمل ہو چکا تھا۔ جب شہر میں امن و امان بحال ہوا، تو اُن کے اعزّہ نے انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔

ان کے دادا مرزا فاضل بیگ جموں میں ملازم تھے۔ انھیں شاہی میں مونس الدّولہ اساس المُلک، مثبت جنگ خطاب عطا ہوا تھا۔ اس ہنگامے کے دوران میں بھی وہ جموں ہی میں مقیم رہے۔ دلّی میں حالات معمول پر آ گئے، تو وہ وطن کوٹے۔ یہاں آ کے دیکھا کہ لوگوں نے ان کے پوتے کو مشنری اسکول میں بٹھا دیا ہے۔ اس پر وہ کچھ ناراض ہوئے، اور پہلا کام یہ کیا کہ اشرف بیگ کو وہاں سے اٹھا کے دوبارہ ان کی عربی فارسی تعلیم کا انتظام کیا۔

اشرف نے فارسی کی تکمیل اپنے دادا مرزا فاضل بیگ سے کی۔ ابتدائی عربی مفتی صدر الدّین خان آزردہ سے، اور اعلیٰ نصاب مدرسہ عرب سرائے کے مولوی اسمٰعیل سے پڑھی۔ فاضل بیگ آخری زمانے میں دلّی کی سکونت ترک کر کے بستی حضرت نظام الدّین میں منتقل ہو گئے تھے۔ انھیں ایّام میں عرب سرائے کا مدرسہ بھی وہاں سے اُٹھ کر بستی نظام الدّین میں آ گیا؛ اس سے اشرف بیگ کو مولوی اسمٰعیل سے استفادہ کرنے کا موقع میسّر آ گیا۔

جب یہ عربی فارسی کی تحصیل کر چکے، تو مولوی اسمٰعیل نے مرزا فاضل بیگ پر زور ڈالا کہ وہ

اشرف بیگ کو سرکاری مدرسے بھیج دیں، تاکہ یہ انگریزی بھی پڑھ سکیں۔ یہاں انھوں نے بہت ترقی کی؛ وہ اپنے دور کے کامیاب طالب علم گردانے جاتے تھے۔
عنفوان شباب ہی میں اشرف بیگ کی حالی سے ملاقات ہوئی۔ غالباً حالی کے زیر اثر ہی انھوں نے شعر گوئی شروع کی، اور غالب کا تلمّذ اختیار کیا۔ غالب کے انتقال پر وہ چندے شیفتہ سے بھی مشورہ کرتے رہے۔ لیکن شیفتہ بھی غالب کے بعد زیادہ نہیں جیے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے بعد انھوں نے کسی اور سے اصلاح لی یا نہیں!
انھوں نے اس کے بعد ثریا جاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے نام پر "اشرف الاخبار" جاری کیا۔ ۱۸۷۱ء میں ثریا جاہ ٹونک چلے گئے اور اشرف بیگ کو بھی ان کے ہمراہ جانا پڑا۔ اس پر انھوں نے "اشرف الاخبار" مشہور مطبع محمدی کے مالک ریاض الدولہ محمد مرزا خاں کے حوالے کر دیا۔ مطبع محمدی کا نام غالب کے کئی خطوط میں آیا ہے۔ "قاطع بُرہان" کے مناقشے میں انھوں نے جو اُردو خط ساطع برہان کے مصنّف مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی کو لکھا تھا، یہ "نامۂ غالب" کے عنوان سے مطبع محمدی ہی میں چھپا تھا۔ اشرف الاخبار کا نام بھی غالب کے خطوط میں ملتا ہے۔ جب وہ بہت کمزور ہو گئے اور بیمار رہنے لگے، تو انھوں نے ایک اعلان بطور اعتذار اکمل الاخبار کے علاوہ اشرف الاخبار میں بھی شائع کرایا تھا۔ اشرف الاخبار میں وہ کبھی کبھار مراسلے اور مضمون بھی چھپواتے رہتے تھے
محمد مرزا خاں کو انھوں نے ایک جگہ اپنے سببی بھائی کا نواسہ" کہا ہے؛ لیکن یہ رشتہ ٹھیک سے متعین نہیں کیا جا سکا۔
ٹونک کے سفر سے واپسی کے بعد اشرف نے شادی کی۔ انھیں ایّام میں انھوں نے حکیم محمد علی خاں سے طب کی باقاعدہ تعلیم پائی اور انھیں کے ساتھ مطب بھی کیا۔
۱۸۷۹ء میں اشرف کو سررشتۂ تعلیم پنجاب کے بک ڈپو میں اسسٹنٹ مترجم کی اسامی کی پیشکش ہوئی جس پر وہ لاہور چلے گئے۔ یہاں انھیں ترجمہ شدہ کتابوں پر نظر ثانی کر کے ان کی زبان درست کرنا پڑتی تھی۔ اسی زمانے میں وہ محکمۂ تعلیم کے مشرقی علوم والسنہ کے امتحانوں کے ممتحن بھی رہے۔
لیکن لاہور کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی، اور وہ بیمار رہنے لگے۔ اس پر بادلِ ناخواستہ وہ اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے؛ لاہور کو خیرباد کہا اور دلّی واپس آ گئے۔ اب انھوں نے

درس و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا، اور گورنمنٹ اسکول میں فارسی کے مدرسِ دوم مقرر ہو گئے۔ وہ اسی عہدے پر تھے، جب ان کا اکتوبر ۱۸۸۲ء میں انتقال ہوا۔

[اکمل الاخبار، دلّی، ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۲ء (مضمون "مولوی مرزا اشرف بیگ خان مرحوم" از مولوی محمد سعید) بحوالۂ پگڈنڈی امرتسر، سالنامہ ۱۹۵۹ء "مضمون: مرزا اشرف بیگ اور اشرف الاخبار" از عتیق صدیقی]

اشرف ــــ اشرف حسین خان الٰہ آبادی

غالب ایک خط میں میاں داد خان سیّاح کو لکھتے ہیں:

بھائی، بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے؛ ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے، اور "چراغِ دیر" اس کا نام رکھا ہے؛ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے، اس کو دیکھنا۔

اشرف حسین خان صاحب میرے دوست ہیں فتنہ و فساد کے زمانے سے بہت پہلے ان کا خط اور کچھ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے؛ تم ان کو میرا سلام کہنا ... الخ (دوشنبہ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء)۔

غالب نے جب یہ خط سیّاح کو لکھا ہے، تو وہ بنارس میں تھے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ سیّاح نے اپنے خط میں اشرف حسین خان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا (اور ممکن ہے کہ اشرف نے ان سے غالب سے اپنے پرانے تعلق کی طرف اشارہ کیا ہو) جس پر غالب کو یہ پرانا قصّہ یاد آ گیا۔ "گلستانِ سخن" میں ان کا ذکر بالفاظِ ذیل ملتا ہے:

اشرف تخلص نواب اشرف حسین خاں، نوابزادہ شہر الٰہ آباد، بفعلِ انقلابِ روزگار سے محکمۂ عدالتِ دیوانی بنارس میں عہدۂ نظارت پر مامور ہے۔ مشورۂ سخن کا مہدی حسین خان تصدیق تخلّص سے کرتا ہے، لیکن طرزِ سخن سے ہنوز نومشقی نمایاں ہے۔

تھمتا نہیں ہے اشک مری چشمِ زار کا
مشکل ہے ٹوٹنا مرے اشکوں کے تار کا

ہے چرخ پر کبھی، تو کبھی کوہ و دشت میں
اک جا نہیں مقام ہمارے غبار کا

برامیدِ وصل حیرانِ عالم تا سحر
داغِ دل شمعیست، اشرف! در شبِ ہجرانِ ما

تا دستِ من بدامنِ جاناں نمی رسد
دردِ شبِ فراق بدا ماں نمی رسد

پاسخ نمی رسد چو زیاران رفتہ باز
افغانِ ما بشہرِ خموشاں نمی رسد

[اردوئے معلّیٰ: ۱۰؛ گلستانِ سخن: ۱۴۲ نیز ۱۷۳]

افضل ـــــ میر افضل علی لکھنوی عرف سیّد صاحب

نسّاخ اپنے "تذکرے "سخن شعرا" میں لکھتے ہیں:

افضل تخلّص سیّد افضل علی خان عرف سیّد صاحب خلف الرّشید سیّد قاسم علی خان قاسم باشندۂ لکھنؤ اپنے والدِ ماجد سے کسبِ سخن کیا ہے۔ راقم کے دوستوں میں ہیں۔

"سخن شعرا" کے مطبوعہ نسخے کے حاشیے میں شاہ بہاء الدّین دہلوی معروف بہ عبداللہ شاہ بشیر لکھتے ہیں:

افضل تخلّص، میر افضل علی خلف میر قاسم، سکنۂ لکھنؤ۔ دلّی میں بھی رہتے ہیں، شاگرد غالب۔ ۱۲۹۴ھ میں عُمران حضرت کی قریب چالیس کے ہے۔ آدمی عاشق مزاج، فارسی دان ہیں۔ اکثر فارسی اشعار کہتے ہیں، گاہ گاہ ریختہ بھی لکھتے ہیں۔

دونوں متفق ہیں کہ وہ سیّد تھے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اگر انھیں یا ان کے والد کو "خانی" کا خطاب نہیں ملا تھا، تو اُن کے نام کے ساتھ لفظ "خان" کا اضافہ جیسا کہ نسّاخ نے کیا، درست نہیں ہوگا۔

قاسم سے متعلق نسّاخ کہتے ہیں کہ وہ بہت روز تک تحصیلداری پر مامور رہے، اور کریم الدین لکھتے ہیں کہ "تحصیلِ محالاتِ سرکارِ انگریزی" پر مامور تھے۔ دونوں متفق ہیں کہ انھیں موسیقی میں اچھّی مہارت حاصل تھی۔

غالباً افضل نے اوّلاً اپنے والد میر قاسم علی قاسم سے استفادہ کیا اور بعد کو غالب کی شاگردی اختیار کرلی۔

افضل کو شاعری ورثے میں ملی؛ ان کے والد میر قاسم علی کا تخلّص قاسم تھا، اور دادا

میر حیدر علی کا حیدر۔ یہ خاندان دراصل لاہور کا رہنے والا تھا اور یہ لوگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی نسل سے تھے۔ افضل کی ولادت بشیر کے اندازے کے مطابق تقریباً ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴-۱۸۳۵ء میں ہوئی ہو گی۔

ان کا فارسی کلام دستیاب نہیں ہوا۔ نساخ نے ان کے مندرجۂ ذیل چند اردو شعر اپنے تذکرے میں دیے ہیں، جو افضل نے خود انھیں مہیا کیے تھے:

ہے وصفِ رُوئے یار، نہ لو نام ماہ کا — کیا ذکر اس مقام پر اس رُوسیاہ کا

روشن ہمارا نام زمانے میں کب ہوا — یہاں گُل چراغِ زیست سرِ شام ہو گیا

اوس وقت اپنے بام پہ آیا وہ رشکِ ماہ — افضل! جب آفتاب لبِ بام ہو گیا

مانی نہ ایک بات، نہ ٹھیرے وہ دو گھڑی — منّت کی لاکھ ہم نے، خوشامد ہزار، رات

اتنے خط بھیجے ہیں لکھ لکھ کر کہ ہیں یکدست شل — نامہ بر کے پانو، مجھ خستہ جگر کی اونگلیاں

افضل! میں کیونکہ زانو نہ پیٹوں کہ یاد ہے — باتیں وہ کرنا یار کا، زانو پہ دھر کے ہاتھ

جھانکتے ہیں وہ روزنِ در سے — نقشِ دیوار ہم ہیں ششدر سے

دل سے شکوہ زبان تک آ کر — بن گیا شکر آپ کے ڈر سے

ہم وہ رندِ بادہ کش ہیں، ساقیا! تو دیکھ لے — مے ٹپکتی ہے ہمارے زخم کے انگور سے

کل سے بیکل ہوں، بھلا خاک مجھے کل آئے — کل سے وعدہ تھا، نہ آج آئے نہ وہ کل آئے

کیا مزہ ہو کہ وہ دربان سے اپنے کہہ دیں — کوئی یہاں آنے نہ پائے، مگر افضل آئے

شوخی غضب اس شوخ کی خلقت میں بھری ہے
بجلی ہے، شرارہ ہے، چھلاوہ ہے، پَری ہے۔

[تذکرۂ بشیر بحوالہ "غالب اور تلامذۂ غالب" از مشفق خواجہ مشمولہ سہ ماہی اردو، کراچی (غالب نمبر ۱۹۶۹ء؛ جنوری تا مارچ): ۲۳۳؛ سخن شعرا: ۴۰-۴۱، ۱۴۲، ۳۷۸؛ طبقات الشعرائے ہند: ۳۸۰؛ خمخانۂ جاوید، ۱: ۳۶۱]

انجمؔ ـــــ محمد علی خان شیخپوری

ضلع مونگیر (بہار) کے قصبے شیخ پورہ کے رہنے والے تھے چہارشنبہ ۲۵ شوال ۱۳۰۸ھ (۳ جون ۱۸۹۱ء) کو وفات پائی ؛ "آہ غروب انجم" سے تاریخ نکلتی ہے۔

افسوس کہ ان کا کلام نہیں ملا۔ اپنے استاد بھائی ہرگوپال تفتہ کی وفات پر دو قطعات تاریخ کہے تھے ، جو اودھ اخبار، لکھنؤ میں چھپے تھے ؛ وہی درج ذیل ہیں :

انتقالِ از تپِ وبائی کرد
تفتہ شاگردِ حضرتِ غالب
گفت سالِ وفاتِ او انجم
"وائے صد حیف نائبِ غالب"
(۱۲۹۶)

ہاں مگر تفتہ مُرد در دہلی
مرد و زن اشک ریز می آیند
سالِ او ریخت از لبِ انجم
"مُردہ نام سخنوری از ہند"(۱)
(۱۲۹۶=۱۲۹۵)

[بیاضِ جابر علی خان بحوالۂ معاصر (۱۸) ۱۴۷/۱ اودھ اخبار ۱۳ دسمبر ۱۸۷۹ء (بشکریۂ ڈاکٹر حنیف نقوی ، بنارس ہندو یونیورسٹی]

انور — سید شجاع الدّین عرف امراؤ مرزا دہلوی

ان کے والد مشہور خوشنویس یاقوت رقم ثانی میر جلال الدّین حیدر تھے۔ انور راقم الدّولہ سید ظہیر الدین عرف نواب مرزا ظہیر کے چھوٹے بھائی تھے۔ نواب سعید الدّین احمد خاں صاحب نے اپنے والد نیّر رخشاں سے ان کی شاگردی کے سلسلے میں ایک عجیب روایت نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

جب مرزا زین العابدین خان عارف کو خطِ نسخ سیکھنے کا شوق ہوا تو وہ سید جلال الدین یاقوت رقم ثانی استادِ ظلِّ سبحانی بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان دنوں عارف کی شاعری کا عام شہرہ تھا۔ اِدھر میر جلال الدّین کے اِن دونوں صاحبزادوں کو شاعری کی چیٹک تھی اور وہ ایک اچھے استاد کی ٹوہ میں تھے۔ میر جلال الدّین کو یہ اچھا موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے عارف سے کہا کہ میں آپ کو یوں تو شاگرد کرتا نہیں، ہاں تبادلہ کرتا ہوں۔ یعنی میں آپ کو نسخ کی تعلیم دونگا اور اس کے اصول بتاؤنگا۔ آپ میرے دونوں لڑکوں کو شاعری کے رموز بتائیں اور شاعر بنادیں۔ عارف مرحوم نے منظور کرلیا اور معاملہ اس پر طے ہوگیا۔ اگرچہ عارف نے ایک سال کے بعد سلسلۂ تعلیم ختم کردیا اور استاد نے سند لکھ دی، لیکن ظہیر اور انور مدتوں عارف سے اصلاح لیتے رہے۔ چونکہ دونوں جوہر قابل تھے تھوڑے ہی دنوں کی مشق سے کچھ کا کچھ ہوگئے۔ جب بہادر شاہ ظفر کو ان کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے ان دونوں کو استاد ذوق کے سپرد کردیا۔

لیکن طالب کا یہ بیان کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ انور کی ولادت تقریباً ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷-۱۸۴۸ء) میں ہوئی۔ عارف کا انتقال اپریل ۱۸۵۲ء میں اور ذوق کا نومبر ۱۸۵۴ء میں ہوا؛ گویا عارف

کی وفات کے وقت انور کی عمر پانچ برس سے زیادہ کی نہیں تھی، اور ذوق کی رحلت کے وقت وہ تقریباً سات برس کے ہونگے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ان کا شعر کہنا اور ان دونوں اساتذہ سے اصلاح لینا محال ہے۔

طالب ہی کی روایت ہے کہ داغ بھی شروع میں کامل تین برس تک عارف سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ اس زمانے میں ان کا تخلص مرزا تھا جو نیر درخشاں کا دیا ہوا تھا۔ بعد کو ولی عہد مرزا فخرو نے ان کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم سے نکاح کیا تو یہ بھی اپنی والدہ کے ساتھ قلعے میں اٹھ گئے۔ مرزا فخرو نے انھیں بھی ذوق کے حوالے کر دیا۔ داغ تخلص بھی ذوق نے دیا تھا، یہ گویا مرزا فخرو پر چوٹ ہے۔ خدا معلوم، اس میں کتنی سچائی ہے!

دیوانِ ذوق کا جو ایڈیشن ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں شائع ہوا تھا[1]۔ اس کی ترتیب میں غلام رسول ویران اور ظہیر کے ساتھ انور بھی شریک تھے۔ اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد نے بہت کچھ تصرف کر کے بلکہ اپنی طرف سے اضافے کر کے وہ دیوان شائع کیا جو متداول ہے[2]۔

اگرچہ ظہیر نے بھی انور کے دیوان کے آخر میں انور کے تلمذِ ذوق و غالب کا ذکر کیا ہے، لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا، انور کا تلمذِ ذوق محال ہے۔ وہ دراصل غالب ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ نہایت ذہین اور طبّاع تھے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی، ورنہ یقیناً بہت ترقی کرتے۔

---

[1] یہ امر مسلّمہ ہے کہ دیوانِ ذوق کا یہ پہلا ایڈیشن تھا، لیکن میرے اپنے کتاب خانے میں دیوان کا ایک ایسا نسخہ موجود ہے جو مطبع محمدی، دہلی (محمد مرزا خان) سے مارچ ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اور لطف یہ کہ اس میں ویران و ظہیر والے نسخے سے ایک شعر زیادہ نہیں۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ ترتیب اس میں بالعکس ہے یعنی ویران کے ۱۸۶۳ء والے نسخے میں پہلے قصائد ہیں اور پھر غزلیات؛ ۱۸۵۹ء کی اس اشاعت میں پہلے غزلیات ہیں پھر قصائد آخر میں۔ مجھے شبہہ گزرتا ہے کہ ۱۸۵۹ء کی تاریخ جعلی ہے۔ یعنی چونکہ ویران وغیرہ نے اپنا دیوان رجسٹری کرالیا تھا، اس لیے مطبع محمدی کے نسخے کے ناشر نے قانونی گرفت سے بچنے کے لیے ترتیب بدل دی اور تاریخ پہلے کی ڈال دی، ورنہ یہ نسخہ ۱۸۶۳ء کے بعد چھپا تھا۔

واللہ اعلم

[2] آزاد کے مرتبہ دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۱ء میں مطبع اسلامیہ، لاہور سے باہتمام مولوی کرم بخش صاحب مالک و مہتمم طبع ہوا؛ اس کے آخری صفحے پر اُن کے صاحبزادے محمد ابراہیم کے دستخط ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد پہلے رامپور اور وہاں سے جے پور گئے۔ وہیں ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲ھ) میں ۳۸ برس کی عمر میں خدا کو پیارے ہوئے۔ بقول لالہ سری رام ان کے دو مکمّل دیوان ضائع ہو گئے۔ جن میں سے ایک خاص حمد و نعت اور تصوّف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ خدا مغفرت کرے لالہ سری رام موصوف کو، انھوں نے بڑی محنت سے ایک دیوان مرتّب کر کے "نظمِ دلفروز معروف بہ دیوانِ انورؔ" کے نام سے مطبع رفاہِ عام لاہور سے شائع کرایا۔ (۱۳۱۶ھ ۱۸۹۹ء)، ورنہ ان کا کلام دیکھنے کو آنکھیں ترستیں۔ بہت پُرگو تھے۔ دیوان میں شاید ہی کوئی زمین ایسی ہو، جس میں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ تک موجود نہیں۔ زبان پر قدرت، روزمرہ اور آمد، معاملہ بندی اور لطیف طنز ان کے کلام کا جوہر ہیں۔

انتخاب ملاحظہ ہو:

وہ آنکھیں نہیں، ہائے کیا ہو گیا
وہ کافر تو اب کچھ نیا ہو گیا

تمھیں یاں تک آنا قیامت سہی
ہمیں جی سے جانے میں کیا ہو گیا؟

—

نظر ملتے ہی وہ کچھ ہو گیا، جو کچھ کہ ہونا تھا
پشیماں ہو رہا ہے دیدۂ انجام بیں کیا کیا

—

کہیں سرِ طُور جلوہ افگن، کہیں دَیراں سے روشن
وہاں تو ہے جائے سخن، ہمیں تو رکھا نہیں کہیں کا

—

تھک کے بیٹھے ہو درِ صومعہ پر کیا انورؔ!
دو قدم اور کہ یہ خانۂ خمّار رہا

—

کیسی حیا، کہاں کی وفا، پاسِ خلق کیا
ہاں یہ سہی، کہ آپ کو آنا یہاں نہ تھا

کچھ اپنے دل کے ولولے کچھ زاہدوں کی ضد
سر پھوڑنے کو ورنہ وہی آستاں نہ تھا

میں اور روزِ وصل، عدو اور شبِ فراق
یہاں آسماں نہ تھا، کہ وہاں آسماں نہ تھا

—

جان سننے والوں کی واعظ لبوں پر آ گئی
واہ، کیا کہنا ہے حضرت، آپ کی گفتار کا!

—

تم آج ہی چل پھر کے، مٹا دو نہ یہ جھگڑا
کیوں کل پہ رکھو شورشِ غوغائے قیامت!

—

وہ دن گئے، کہ مصر کو پہنچا کوئی بخبر!
تم ورنہ آفتِ رہِ صد کارواں ہو آج

ہاں رودادِ بزمِ عدو، کیوں کہو، مگر
یہ تو کہو، کہ شب کو کہاں تھے، کہاں ہو آج

—

کوئی تڑپے نہ کیوں، تاب و تواں تک
نہ پوچھینگے، نہ دیکھینگے کہاں تک!

—

کچھ کچھ جو چھیڑ لطف کی، کم کم عتاب میں
جی ہے امید و یاس سے کس کس عذاب میں

یہ مستیوں کا رنگ ہے جوشِ شباب میں
گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

—

جو کہے سچ ہے، نہ مے پی، نہ کہیں دل اٹکا
گفتگو کچھ سخنِ ناصحِ ناداں میں نہیں

ہے تذبذب کہ انھیں دیکھ کے کچھ کہہ نہ اٹھوں
گرچہ اب تک کوئی لغزش مرے ایمان میں نہیں

نظر ہو، تو نظر آتی ہے، کیفیتِ دو عالم کی
چلو انور! تماشا دیکھ آئیں بزمِ رنداں میں

گویا کہ سب غلط ہیں مری بدگمانیاں
دیکھے تو کوئی شکل تمھاری حیا کے ساتھ

ہر ہر قدم پہ بیٹھتا آتا ہے، راہ میں
لایا ہوں کس کی بزم سے دل کو لگا کے ساتھ

کچھ ہم رُکے رُکے رہے، کچھ وہ کھچے کھچے
ارمان جی کے جی ہی میں، کیا کیا یہاں رہے

کچھ تو مل جائے لبِ شیریں سے
زہر کھانے کی اجازت ہی سہی

دل میں یاں آکے نکلنا کیسا
اے، وہ ارمانِ شہادت ہی سہی

بے طرح پڑتی ہے نظر اُن کی
خیر، دل کی نظر نہیں آتی

ربط بڑھ جائے تو حسن و عشق کی ہے شان ایک
جو نفس ہے سینۂ عاشق میں شمعِ طور ہے

نہ میں سمجھا، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

میں اس برہم مزاجی کے تصدق
اُلجھتے ہیں وہ زلفِ عنبریں سے

کہاں کی دل لگی، کیسی محبت!
مجھے اک لاگ ہے جانِ حزیں سے

وہ کچھ بیتابیاں، بگڑے سے تیور
لڑائی میں مزا ہے اس حسیں سے

اِدھر لاؤ ذرا دستِ حنائی
پکڑ دیں چور ہم دل کا یہیں سے

قہر ہیں مستی میں وہ انگڑائیاں
خالی ہاتھوں لڑتے ہیں تلوار سے

شکایت کی تمھارے آستاں کی
زمیں بھی سوچتی ہے آسماں کی

یہ حالت ہے مرے دردِ نہاں کی
کہ صورت دیکھتے ہو رازداں کی

جاں بخش ہے گفتار، تو لب چشمۂ حیواں
پھر کہیے کہ اُن پر کوئی کس بات پہ مر جائے

یہ خوشی کم ہے کہ ہم اس بزم میں
اک طرف بیٹھے تو ہیں ناشاد سے

[نظمِ دلفروز (دیباچہ) خم خانۂ جاوید، ۱: ۴۸۱-۴۸۹؛ قاموس المشاہیر ۱: ۱۱۲]

آرام ــــــ رائے بہادر منشی شیونراین اکبر آبادی

خاندان کے کائستھ اور ماتھر ذات کی مانک بھنڈاری اَل کے چشم و چراغ تھے ۔ ان کے بزرگ اصل میں اجمیر کے رہنے والے تھے، جہاں سے ۱۷۸۴ء کے لگ بھگ اُن کے پرداد ا رائے اُجاگر چند نقلِ مکان کر کے آگرے آئے اور یہاں اپنی قابلیت سے بنارس کے جلا وطن راجہ چیت سنگھ کے وزیر بن گئے ۔ رائے اُجاگر چند کے صاحبزادے رائے بنسی دھر نے بھی آگرے میں نام پیدا کیا۔ وہ بالترتیب داروغۂ پولیس، ناظر، محکمۂ نمک کے سپرنٹنڈنٹ اور آخر میں کوتوال شہر رہے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر غالبؔ کے نانا میرزا غلام حسین خاں کمیدان کی جاداد کے منصرم بن گئے۔ انھوں نے خود بھی خاصی بڑی جاداد پیدا کر لی تھی، جس سے وہ امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ رائے بنسی دھر کے بیٹے آرام کے والد منشی نند لال بھی پہلے آگرہ منصفی میں ناظر رہے، پھر راجہ جوتی پرشاد کی سرکار میں مختارِ عام مقرر ہوئے ۔ اُن کی وفات پر تفتہؔ نے مرثیہ لکھا تھا، جو اُن کے دیوان میں موجود ہے۔

منشی شیونرائن آگرے ہی میں ۱۰ ستمبر ۱۸۳۳ء کو پیدا ہوئے ۔ بہت صغر سنی میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی پرورش اور تربیت زیادہ طور پر منشی کنھیا لال کے ہاتھوں ہوئی جو اُن کے دادا رائے بنسی دھر کے چھوٹے بھائی تھے۔[٥] آرام کی تعلیم بہت اچھے پیمانے پر ہوئی ۔ وہ ابتدائی مدارج طے کر کے ۱۸۴۷ء میں آگرہ کالج میں داخل ہو گئے ۔ یہاں انھوں نے انگریزی اور فارسی کی تکمیل کی ۔ انگریزی میں وہ مشہور انگریز اُردو لغت نویس س۔ و۔ فیلن صاحب کے شاگرد تھے۔ کالج سے تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۸۵۶ء میں وہ اُسی جگہ ۳۵ روپے مشاہرے پر انگریزی کے مدرس

---

٥ انھیں سے متعلق حالیؔ نے یہ واقعہ "یادگار غالب" میں لکھا ہے:

"منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنھیا لال ایک صاحب آگرے کے رہنے والے، جو میرزا صاحب کے



رائے بہادر منشی شیونراین آرام اکبرآبادی

مقرر ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے میں انھوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ جہاں تک بن سکا، حکام کی مدد کرتے رہے؛ اس کے صلے میں انھیں بعد میں دو مہینے کی تنخواہ بطورِ انعام عطا کی گئی۔ تھی

۱۸۵۸ء میں وہ کالج کی نوکری ترک کر کے آبکاری کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ یہاں سے دل اکھڑا تو محکمۂ انکم ٹیکس میں پہنچے اور اس کے بعد منصفی میں۔ دو ایک سال میں وہ سو روپیہ درماہہ پر چنگی کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ یہاں انھوں نے بہت قابلِ تعریف کام کیا، جس سے محکمہ کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا۔ اسی تجربے کا نتیجہ تھا کہ بعد میں دھول پور اور قرولی کی ریاستوں نے بھی انھیں اپنے ہاں اس محکمے کی تنظیم کے لیے طلب کیا۔

لیکن ان کے اصلی جوہر آگرہ میونسپلٹی کی سکتری کے زمانے میں کھلے۔ یہاں انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کیا اور کمیٹی کا سارا انتظام ایسی مضبوط بنیادوں پر رکھ دیا کہ اس سے کمیٹی کی آمدنی میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ اسی زمانے میں رفاہِ عام کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کے حصہ لیا، جس سے شہر کے باشندے اُن کے شیدا ہو گئے۔ ۱۸۶۸ء اور پھر ۱۸۷۸ء کے قحط کے دنوں میں انھوں نے مختلف امدادی کام شروع کر کے لوگوں کے لیے روزی کا سامان مہیا کیا، اور اس طرح ہزاروں آدمیوں کو موت کے منہ سے بچا لیا۔ سکتری کے زمانے کی نمایاں خدمات کا اعتراف حکومتِ وقت کی طرف سے بھی ہوا۔ اوّل ۱۸۷۷ء کے دہلی دربار میں انھیں خلعت اور سندِ خوشنودی عطا ہوئی اور اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں جب ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی منائی گئی تو انھیں رائے بہادر کے خطاب اور دربار میں کرسی نشینی کے اعزاز سے نوازا گیا۔

رائے بہادر منشی شیو نراین کی ہر دلعزیزی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ وہ شہر بھر میں "منشی جی" کے نام سے مشہور تھے۔ کمہار اُن کے مٹی کے کھلونے بنا کے بیچتے تھے، اور یہ "منشی جی" کے نام سے بکتے تھے۔

ہمعمر تھے، ایک بار دلی آئے اور جب مرزا سے ملے تو اثنائے کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی، وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا، وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے چنانچہ انھوں نے وہ مثنوی میرزا کو لا کر دی اور وہ اُس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے آخر میں یہ فارسی شعر کسی استاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا:

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست   می کشد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

لالہ صاحب کا بیان تھا کہ میرزا صاحب کی عمر جب کہ یہ مثنوی لکھی تھی، آٹھ نو برس کی تھی۔" (یادگارِ غالب ۱۲)

منشی شیونراین کی علمی سرگرمیاں بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں ۔ ۱۸۵۸ء میں جب وہ ابھی مشکل سے ملازمت میں داخل ہوئے ہی تھے، انھوں نے اپنے خرچ پر مفید عام اسکول جاری کیا۔ وہ نہ صرف اس کی مالی امداد ہی کرتے، بلکہ خود یہاں پڑھاتے بھی تھے۔ اُن کی نیک نیتی اور خلوص کی برکت کہ یہ مدرسہ آج تک جاری ہے اور اب اس میں ترقی ہو کر دسویں درجے تک تعلیم کا انتظام ہے۔ انھیں فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ فوٹوگرافی میں کامل دستگاہ تھی اور اس سلسلے میں انھوں نے کئی نمایشوں میں انعام حاصل کیا۔ وہ اچھے نقشہ نویس بھی تھے۔ ہیئت اور نجوم میں بھی خاصا دخل تھا اور زائچہ بنانے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کی علمی سرگرمیوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ایک مطبع مفید خلائق کے نام سے قائم کیا۔ غالب کی دو کتابیں۔ دستنبو فارسی (۱۸۵۸ء) اور دیوانِ اُردو (۱۸۶۳ء) بھی اس مطبع سے شائع ہوئیں۔ دو پرچے بھی اسی مطبع سے شائع ہوتے تھے۔ ایک پندرہ روزہ گلدستہ "معیار الشعرا" اور دوسرا ماہانہ "مفید خلائق"۔ "معیار الشعرا" کے مدیر مولوی محمد ابوالحسن (مدرّس مدرسۂ عالیہ، آگرہ) تھے، اور "مفید خلائق" کی ادارت کے فرائض آرام کے ذمّے تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو "مفید خلائق" کے ساتھ ہندی زبان کا ضمیمہ "سروپ کارک" کے عنوان سے چھپتا رہا۔ گلدستہ کے لیے کبھی کبھی غالب بھی اپنا کلام بھیجتے رہے۔ اسی مطبع سے ۱۸۵۸ء میں ایک ماہانہ پرچہ "رسالۂ بغاوتِ ہند" کے عنوان سے شائع ہوتا رہا؛ اس کے اڈیٹر آرام کے دوست ڈاکٹر مکندلال تھے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی تحریک کے حالات قسط وار چھپتے رہے تھے۔

آرام کا کلام زیادہ دستیاب نہیں ہوا۔ ایک غزل کے علاوہ جو حسنِ اتفاق سے محفوظ رہ گئی، صرف چند متفرق شعر ملے۔ یا تو زیادہ کہتے نہیں تھے، یا پھر اُسے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی، اور جو کچھ کہا ضائع ہو گیا۔ انھوں نے ایک انگریزی کتاب (Four Messengers) کا ترجمہ "قاصدانِ شاہی" کے عنوان سے مسٹر کین کی مدد سے ۱۸۵۹ء میں چھپا تھا۔ اس کی زبان کی اصلاح غالب نے کی تھی۔ اسی زمانے میں اس کا ہندی ترجمہ بھی "راج دوتوں کی کتھا" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اُردو کتاب کے کئی اڈیشن شائع ہوئے۔ میرے پاس اس کے پانچویں اڈیشن (۱۸۹۲ء) کا نسخہ ہے۔ آرام ۱۸۹۸ء میں کمیٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے؛ دو سو ماہانہ پنشن مقرر ہوئی؛ لیکن اس کے بعد وہ زیادہ جیے نہیں۔ ۱۸۹۶ء سے انھیں گُردے میں پتھری کی شکایت تھی؛ یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا؛ اور وہ یکشنبہ ۴ ستمبر ۱۸۹۸ء کو دن کے ساڑھے گیارہ بجے اپنے

خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اپنی یادگار سات لڑکیاں اور دو لڑکے (بابو رگھوناتھ پرشاد اور بابو راجچند) چھوڑے۔ دونوں سرکاری ملازمت میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے تک پہنچے، ان کی اولاد آگرے میں موجود ہے۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں، تصوّف کی طرف میلان پایا جاتا ہے:

غضب ہے مدّعی ہے جو، وہی پھر مدّعا ٹھہرے
جو اپنا دشمنِ دل ہو، وہی دل کی دوا ٹھہرے

نہ ٹھہرے ناامیدی اس کے، دل میں اور کیا ٹھہرے
کہ جس کا بعد مرنے کے حصولِ مدّعا ٹھہرے

یہ دنیا اک سرا ہے آخر اس کو چھوڑ جانا ہے
اگر دو چار دن آ کر یہاں ٹھہرے تو کیا ٹھہرے

کٹے ہیں سر بہت، تیغِ جفا سے بےگناہوں کے
عجب کیا ہے، اگر قاتل کا کوچہ کربلا ٹھہرے

جا نقشہ ترے عشّاق کا اس خاکساری سے
ترے کوچہ میں جو ٹھہرے مثالِ نقشِ پا ٹھہرے

ادھر وہ آنے کو ہیں، اور ادھر وقتِ سفر آیا
عجب مشکل، نہ وہ آئیں نہ دم بھر کو قضا ٹھہرے

اُسی کو زندگی کا لطف ہے اس دہرِ فانی میں
کہ جو نزدیک اچھوں کے بھلا اور با خدا ٹھہرے

قیام اپنا ہو، اس محنت سرائے دہر میں کیونکر
جہاں آفت ہی آفت ہو، وہاں آرام کیا ٹھہرے

آرامِ دل کا چین گیا، اب سکوں گیا
ہم تو بلا میں پھنس گئے، جب سے جنوں گیا

اندازِ جلوہ سازیِ سینا ندیدہ اَم
غش کردہ اَم، فروغِ تجلّی ندیدہ اَم

سوگوارِ دلِ مرحوم منم، اے آرام!
باعثِ گریہ چہ گویم، بہ چرا می نالم

کسے از قلقلِ مینا نہ پرسد
چرا تو گریۂ مستانہ کردی.

[شعر و سخن: ۱۵ - ۱۶؛ ماتھر پترکا (انگریزی) دسمبر ۱۹۲۵ء، نیز جنوری و فروری ۱۹۲۶ء خطباتِ گارساں دُتاسی: ۲۷۶، ۳۰۶، ۴۶۹؛ خم خانۂ جاوید' ۱: ۷۱]

آزر ــــ نواب ذوالفقار علی خان دہلوی

نواب حیات علی کے بیٹے اور معتمد الدّولہ نواب احمد علی خان خلف یعقوب علی خان کے پوتے تھے۔ آخر الذکر کے بھائی (شاہ ولی خان) احمد شاہ ابدالی کے وزیر تھے، اور وہ خود دلّی کے قلعدار تھے۔

شکر یزداں زبان کٹتی ہے
شکوہ کرنے کی کیا مجال ہمیں

ہوئے ناخوش، تیاں دیکھا جو مجھ کو
خدنگِ غمزہ نے گویا خطا کی

مرے ستانے نے کام اس سے اک جہاں کے لیے
جو میں نہ ہوں، تو نہ ہو گردشِ آسماں کے لیے

[تذکرۂ اہلِ دہلی: ۱۳۰؛ سخن شعرا: ۱۹؛ خمخانۂ جاوید، ۱: ۵۲]

آگاہ ــــ نواب سیّد محمد رضا دہلوی ملقّب بہ احمد مرزا خان

ان کے والد امیر میرزا تھے، اور دادا نواب معظم الدولہ محمد علی خان۔ ان کے جدِ اعلیٰ نواب روشن الدولہ سیّد مظفر علی خان عہدِ محمد شاہ میں بخشی تھے۔ آگاہ ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء میں دِلّی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے مشہور "غدر" تک وہ بہادر شاہ ظفر کے چھوٹے صاحبزادے خضر سلطان کے مصاحب رہے۔ ان کی دادی کو حکومت کی طرف سے ضلع میرٹھ میں دو گانو صدر پور اور رئیس پور جاگیر میں ملے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ جاگیر ضبط ہوگئی؛ ادھر خضر سلطان انگریز کی گولی کا نشانہ بنے۔ غرض کہ اب آگاہ کے لیے بسراوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔

اب دلّی میں زندگی دشوار ہوگئی تھی۔ تلاشِ روزگار میں یہاں سے نکلے، تو جے پور پہنچے۔ ظہیر و انور پہلے سے آچکے تھے۔ ظہیر ان کے برادرِ نسبتی بھی تھے، یعنی آگاہ کی ہمشیر ظہیر کے حبالۂ عقد میں تھیں، انھوں نے بھی کچھ مدد کی۔ مہاراجا سوائی رام سنگھ نے آگاہ کا وظیفہ مقرر کردیا اور یوں زندگی قدرے آسان ہوگئی۔ جوہرِ قابل تھا، رفتہ رفتہ ان کا سکّہ بیٹھ گیا؛ امرا و عوام سب حلقوں میں مقبول ہوگئے۔

جمعہ قبلِ فجر ۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۳۶ھ (۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء) جے پور ہی میں انتقال کیا۔ گھاٹ دروازے کے باہر کے قبرستان میں دفن ہوئے تھے؛ اب قبر کا نشان نہیں ملتا۔ (وفات، قاموس المشاہیر: ۱۹۱۱؛ ادبِ عزیز: ۱۹۱۶ء غلط)

آگاہ بڑے پُرگو تھے۔ ان کے دو دیوان تھے، ایک غزلیات کا، دوسرا نعتیہ کلام کا۔ دونوں کے قلمی نسخے ان کے پرپوتے سیّد کرار میرزا، کرّار نوری (کراچی) کے پاس تھے۔ نعتیہ دیوان ایک صاحب نے ان سے لے کر امریکا پہنچا دیا۔ دیوانِ غزلیات ہنوز ان کی تحویل میں ہے، اور ان کی عنایت سے مجھے اسے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

یہ دیوان فل اسکیپ سائز کے ۲۸۵ صفحات کو محیط ہے۔ (درمیان سے چند صفحات ساقط ہو گئے ہیں) ایک صفحہ پر ۱۹۔ ۲۰ شعر ہیں۔ اس میں سے نعتیہ غزلیں قلمزد کر دی گئی ہیں، اور حاشیے میں لکھا ہے: "دیوانِ نعت میں درج ہے"، لیکن ایسی غزلیں کم ہیں۔ پورے دیوان میں تقریباً ۵۵۰۰ اشعار ہوں گے۔ بعض زمینوں میں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ تک ہے: ایک جگہ چہار غزلہ بھی ہے۔ بہت سی غزلیں غالب کی زمینوں میں ہیں۔ دیوان لکھا ہوا تو کسی اور کا ہے، بلکہ ایک سے زیادہ شخصوں کے قلم سے ہے، لیکن کلام میں ردّ و بدل اور اصلاحوں کا انداز بتاتا ہے کہ اسے آگاہ نے خود دیکھا ہے کیونکہ اس طرح کی تبدیلیاں بلکہ شعروں کو حذف تک کر دینا کسی اور سے ممکن نہ تھا۔

یہ انتخاب اسی دیوان سے لیا گیا ہے چونکہ مذاقِ سخن یکسر بدل گیا ہے۔ اب اس کے شائع ہونے کا امکان بہت کم رہ گیا ہے۔ اسی لیے میں نے معتد بہ انتخاب شاملِ تذکرہ کر لیا ہے۔

اب کہاں آگاہ غالب سا شفیق — روئیے دل کھول کر اُستاد کو

جو کہہ نہ سکے غیر، وہ میری ہے کہانی — جو آ نہ سکے لب پہ، وہ افسانہ ہے اوس کا

ہم تو ہلاکِ بادۂ الفت ہوئے، مگر — تو بھی نہیں رہا دلِ ناشاد کام کا

ہنگامِ عرضِ حال یہاں عجز و انکسار — اک خامشی جواب وہاں ہر پیام کا

رہ گئی واماندگی میں آبروئے بیکسی — ہو گیا سایہ مجھے کافی تری دیوار کا

حشر پر رکھیے نہ موقوف تلافیِ جفا — یاں کب انصاف ہوا ہے کہ مداواں ہوگا

خاکِ پائے اسد اللہ سے ہوں میں آگاہ — بسترِ قالیں بھی مرا، بسترِ نیستاں ہوگا

مجھ تک بھی نوبت آئیگی، ہوتی ہے کچھ امید — اچھا ہوا، جو غیر سے وعدہ وفا ہوا

گھر غیر کا ہو راہ میں، یہ بھی مری قسمت — لایا تو اسے کل جذبِ محبّت کا یہیں تھا

پوچھو نہ شبِ غم کے تم اندوہ کا عالم — ہر بار مرے لب پہ دمِ بازپسیں تھا

اب غیر کے جو حال پہ ہے وعدہ فراموش — مجھ پر بھی وہ تھا لطف، پر اتنا تو نہیں تھا

ہجر کے ہاتھوں کچھ ایسا زیست سے بیزار تھا — غیر کے بدلے بھی، کل مرنے پہ میں تیار تھا

حضرتِ دل! بزم میں وہ وعدہ کرتا اس طرح! — مصلحت سے غیر کی یہ بھی قریب یار تھا

کیا جب عرضِ حال اپنا، تو بولے وہ خفا ہو کر
تمھاری تو ذرا سی بات کا دفتر نکل آیا



سیّد محمد رضا ملقّب بہ احمد مرزا خان آگاہؔ دہلوی

بیوفا و بیمروت، سنگدل، نا آشنا
جس کے یہ انداز ہوں، اے دل وہ کس کا آشنا

کب وفا کرتے ہو وعدہ، یہ بھی تھی اک دل لگی
بن گئے جو تم مرے وقت تقاضا آشنا

آج بزمِ غیر میں ملتی نہیں کیوں مجھ سے آنکھ
بندہ پرور آپ کا میں بھی کبھی تھا آشنا

یا الٰہی! کوئی بر آئی نہ غم میں آرزو
یوں ہی اچھا ہے، رہے گر دل تمنا آشنا

اس زمانے میں نہ دیکھا کوئی بھی آگاہ صاف
جس کو دیکھا، اپنے مطلب کا ہی دیکھا آشنا

اک تم کہ باز آئے جفا سے نہ ایک روز
اک ہم کہ آپ سے نہ کبھی داد کی طلب

ہونگے اچھے عدو، تو اپنے لیے
ہم بُرے ہی سہی، بھلا صاحب!

گر "نہیں" ہے، تو سمجھ لے کہ یہاں جان نہیں
اور جینے کے لیے ایک تری "ہاں" ہے بہت

دل میں تو حشر کی ٹھوکر سے نہ ڈر نا آگاہ!
دستگیری کو مری شاہِ خراساں ہے بہت

جب چھٹ گیا وہ کوچہ، تو پھر کیا جہاں کی قید
یہ پوچھنا ہی دل سے کہ جاوں کہاں عبث

مخفی رہیگا بوالہوس و شیفتہ کا حال
دشمن سے پہلے آج مرا امتحاں عبث

ڈرتا ہوں اس خوشی میں کہیں دم نکل نہ جائے
پھر ان کو التفات ہے اور کس قدر ہے آج

ان بتان ہند سے، اللہ ہر اک کو بچائے
طرفہ کرتے ہیں ستم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ دیتے ہیں یہ بوسہ ڈال کر گردن میں ہاتھ
گاہ لیتے ہیں قسم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ کہتے ہیں خدا الفت کی آفت سے بچائے
ہو گئے پابندِ غم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ دکھاتے ہیں یہ عاشق کو برائے دلکشی
جلوۂ رقص و نغم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ بھر کر سانس ٹھنڈا کہتے ہیں یہ کیا ہوا
پھنس گئے آفت میں ہم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ اس اندازِ الفت سے یہ دیتے ہیں فریب
آپ پر مرتے ہیں ہم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ کرتے ہیں گریز ایسے کہ خالق کی پناہ
گاہ جاتے ہیں یہ تھم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ روتے ہیں یہ ہنگامِ سحر وقتِ وداع
چلتے ہیں ایک اک قدم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ ان کے جی میں آجائے، تو شامِ وصل سے
ناک میں کرتے ہیں دم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ کرتے ہیں تنفر بادہ و مینا سے یہ
اور کبھی ہم بزمِ جم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

گاہ اپنی ہر ادا سے کرتے ہیں عاشق کو رام
اور کبھی کرتے ہیں دم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

الغرض دیکھو ہمیں آگاہ! ہم کیا چیز ہیں
دیتے ہیں ایسوں کو دم، باتیں بنا کر جھوٹ سچ

ناکام ایک ہم ہی رہے، ورنہ بزم میں
تھے لطف بار بار نہ کس کس کے حال پر

ہجر میں موت بھی نہیں آتی
اور نہ ان پر ہے اختیار افسوس
پھر کسی بیوفا کے کوچے میں
ہو کے جاتے ہیں بیقرار افسوس

پیشِ دشمن چاہتے ہیں وہ خطاؤں کا ثبوت
پوچھتے یوں ہیں کہ گویا میں کہوں: ہاں ہوگئیں
جو نگاہیں اوٹھ نہ سکتی تھیں خدایا! شرم سے
بے حجابانہ وہ کیونکر دل میں پنہاں ہوگئیں
ہم نہ کرتے عشق پر آگاہ اُس کو کیا کریں
وہ ادائیں دلفریبِ جان وایماں ہوگئیں

دور تر کچھ رہِ الفت سے نہیں راہِ عدم
منزلِ عشق کے دو چار قدم ہوتے ہیں
بیخودی کا تو بھلا ذکر ہی کیا ہے، اے دوست!
تم ہی تم ہوتے ہو آپے میں جو ہم ہوتے ہیں

شکر ہے لگ گئی ٹھکانے سے
ہم ہوئے خاکِ کوئے جاناں میں
کس کی توبہ، کہاں کا زہد، آگاہ!
آؤ چل بیٹھو، بزمِ رنداں میں

ہیں جرعہ خوارِ ساغرِ صہبائے حق پسند
بیخود سدا ہیں بندگیِ بوتراب میں
پہلے فنا سے ہو کے فنا، دیکھ اپنا رنگ
کیا کچھ نہیں ہے قطرہ و موج و حباب میں
دی ہو خدا نے آنکھ جو بینا، تو دیکھ لے
حیرت بھری ہوئی ہے نگاہِ حباب میں
آگاہ اک چھٹا درِ شاہنشہِ نجف
جنت ہمیں ملی قدمِ بوتراب میں

غیر اوس انجمنِ ناز سے ٹلتا ہی نہیں
یہ بھی کیا دم ہے ہمارا کہ نکلتا ہی نہیں
ایک ہم ہیں کہ گھلے جاتے ہیں یوں شمع صفت
اور اک دل ہے تمھارا کہ پگھلتا ہی نہیں
دیکھ کر ضبط مرا، کل یہ کہا ساقی نہیں
ہے عجب طرح کا انساں کہ اوبلتا ہی نہیں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ نہ آؤگے کبھی
دم کچھ ارماں تو نہیں ہے کہ نکلتا ہی نہیں

مرتا ہِن آئی کیونکہ ہے کوئی "یہ نکلا موںھ سے تھا
ابرو کے اک اشارے سے اوس نے کہا کہ یوں
ابرِ سیہ سے ماہ کا پوچھے نکلنا گر کوئی
زلف کو اپنے چہرہ پر ڈال کے پھر بتا کہ یوں

ہر ادا میں ہے نہاں جو کرشمہ میں ستم
ایسے دیکھے ہی نہیں بے سبب آزار کہیں

جب کھلے دردِ محبت کی حقیقت، ظالم! کاش ہو میری طرح تو بھی گرفتار کہیں
شیخ جی! سوچئے کیا ہو کہ پئے جامِ شراب رہن مے جبّہ و دستار کروں یا نہ کروں
جب نہیں اوس میں کچھ وفا، ایسے سے دل لگائے کیوں
آپ سے آپ آدمی موت کے موٗنھ میں جائے کیوں؟
جب نہیں تم میں کچھ وفا، کس کو ہے پاس وضع کا
دل کو ہے کیا غرض پڑی، صدمۂ غم اٹھائے کیوں؟
اون سے ہے کیا بگڑ گئی! مجھ کو بتاؤ تو سہی
آگے غصہ آج تم کرتے ہو ہائے ہائے کیوں؟
کی ہے یاں ترکِ وفا کس نے، جو یوں کہتے ہو
"دل میں جس کے نہ ہو الفت، وہ بشر کچھ بھی نہیں"
دارِ فانی نفسِ چند کا اک وقفہ ہے
غافل! اس کو نہ سمجھ گھر کہ یہ گھر کچھ بھی نہیں
کر دیا خاک تپِ ہجر نے، کیا دیکھتے ہو!
اب تو اس راکھ میں آتش نہ شرر کچھ بھی نہیں
تھا مگر خواب ایک افسانۂ الفت، اے دل!
کہ تصوّر کے سوا شام و سحر کچھ بھی نہیں
اس طرح پوچھتے ہیں حال وہ دل کا، گویا
مجھ کو معلوم ہے، اور ان کو خبر کچھ بھی نہیں
داغِ دل، دردِ جگر، نالۂ پیہم، غمِ یار
اب بھی سب کچھ ہے مرے پاس، اگر کچھ بھی نہیں
ہے کہاں ہستیٔ موہوم کو آگاہ ثبات
تم تو کہتے تھے، بہت کچھ ہے، مگر کچھ بھی نہیں
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے فرحت دل میں
ہنس کے کہتے ہیں "اسے رنج و الم کچھ بھی نہیں
جگر میں آبلہ، ناسور دل میں، سینہ میں زخم کرشمے سب یہ تمھاری نگاہِ ناز کے ہیں

کبھی خفا، کبھی راضی، کبھی خوشی، کبھی چپکے — نئے نئے ترے انداز اب تو ناز کے ہیں

وہ اب آئے، وہ اب آتے ہیں، شب ہجر میں ہم — دل کو اس طرح سے تسکین دیا کرتے ہیں

تھا کبھی جلوہ دہ بزم ملایک اور اب — گلشن دہر کے شامل خس و خاشاک میں ہوں

آرزوے دل ناکام بر آئے کیونکر! — واں تو اقرار میں انکار ہے اور ہاں میں نہیں

تھیں ظلمتیں فراق سے پہلے کہاں نصیب — یہ تیرہ روزیاں مرے بخت سیاہ کو

دیتی پتا کہیں کا یہ چشم شرمگیں ہے — وہ آ گیا پسینہ، پونچھو ذرا جبیں کو

ہو جائے ان سے صلح، تو جی میں ہے ہمنشیں! — اب اس زمین پہ رہیے جہاں آسماں نہ ہو

بیکار وہ ادا ہے، نہ ہو جس میں دلکشی — بے لطف ہے وہ عمر، اگر جانستاں نہ ہو

آئینۂ صفات سے پیدا ہو عکس ذات — گر دل میں رنگ کشمکش این و آں نہ ہو

پھر دل لگی ہے اس بت نامہرباں کے ساتھ
پھر دشمنی سی ہو گئی اپنی جہاں کے ساتھ

آگاہ! ترک عشق ہی جب کر چکے، تو پھر
کیوں مہربانیاں بت نامہرباں کے ساتھ

کیا فرق کریں قہر و ترحم میں جب اون کی — دم بھر میں نظر کچھ ہے، تو دم بھر میں نظر کچھ

عدو کے قتل نے کیسے مٹا دیے دل سے — وہ ولولے کہ جو تھے اپنے امتحاں کے لیے

قابو میں نہ پایا اسے جس دل پہ نظر کی — تاثیر یہ دیکھی نگہ سحر اثر کی

جینے سے سروکار، نہ مرنے سے تعلق — کچھ عمر عجب طرح سے فرقت میں بسر کی

بیمہر فلک کا نہ کرو شکوہ تم آگاہ! — مر مر کے ہوئی شام، تو رو رو کے سحر کی

پوچھو نہ کچھ ایام جدائی کی حقیقت — گنتی میں سمجھتا ہے تمھیں اہل ہنر کی

نہ گذری لطف سے گر ایک دم بھی حضرت خضر! — تو کہیے، خاک مزا عمر جاوداں کا ہے

جواب نامہ کی امید نے کیا ہے یہ محو — ہر آدمی کو سمجھتا ہوں یہ وہاں کا ہے

[خمخانۂ جاوید، ۱: ۱۰۹ ۔ ۱۱۰؛ گلستان سخن: ۱۲۷؛ بزم سخن: ۸ ۔ ۹؛ یادگار ضیغم: ۳۸۵؛ قاموس المشاہیر، ۱: ۱۱؛ تذکرہ شعراے جے پور: ۵۵ ۔ ۵۸؛ خطوط گرامی، کراچی؛ ادب عزیز: ۲۸۰، ۳۶۳]

باقرؔ — شاہ باقر علی بہاری

ضلع گیا (بہار) میں پیربگہ ایک مختصر سا قصبہ ہے۔ باقر یہاں کے ایک مشہور خاندان مشائخین کے چشم و چراغ تھے۔ والد کی طرف سے سلسلۂ نسب حضرت مخدوم العارفین جلال الدّین محمد کبیر الاولیا گازرونی پانی پتی کے واسطے سے حضرت رکن الدّین عبد الرحمٰن الکبیر مدنی تک اور والدہ کی طرف سے حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادرؒ جیلانی تک پہنچتا ہے۔

ان کے مورث اعلیٰ خواجہ رکن الدین عبد الرحمٰن الکبیر، خلیفہ منصور عباسی (۷۵۴-۷۷۵ء) کے زمانے میں حکومت کی سخت گیری کے باعث مدینۂ منوّرہ سے نقل مکان کر کے گازرون (فارس) چلے آئے تھے۔ بعد کو ان کے اخلاف یہاں سے سرخس منتقل ہو گئے۔ اس خاندان کے جو بزرگ سب سے پہلے ہندستان آئے، ان کا نام خواجہ شہاب الدّین عبد الرحمٰن ثانی تھا۔ وہ غالباً سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ ۴۰۳ھ (۱۰۱۲ء) میں یہاں آئے۔ سلطان نے انھیں پانی پت کی حکومت اور قضائت سپرد کی۔ وہ عمر بھر یہیں رہے اور یہیں دفن ہوئے۔ ان کی دسویں پشت میں حضرت جلال الدّین محمد کبیر الاولیا ہوئے، جو اپنے زمانے کے مشہور ولی اللہ گزرے ہیں۔ ان کی تیسری پشت میں حضرت مخدوم شاہ داؤد طلب علم کی غرض سے نکلے اور صوبۂ بہار میں، جو اُس وقت علم و فضل کا مرکز تھا، پہنچے۔ اس طرح اس خاندان کی ایک شاخ پانی پت سے بہار منتقل ہو گئی۔

جناب باقرؔ کے والدِ بزرگوار حضرت شاہ وارث علی انھیں اسلاف کے نام لیوا تھے۔ ان تک کسی نے ملازمت کا تعلق پیدا نہیں کیا تھا؛ صرف عبادت و ریاضت اور درس و تدریس ان کا معمول رہا۔ سب سے پہلے جس نے اس خاندان میں ملازمت کا پیشہ اختیار کیا، وہ شاہ وارث علی ہی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی حکمتِ عملی کے تحت چاہتی تھی، کہ یہاں کے معزز

اور صاحبِ اثر اور باوقار لوگ اس کی ملازمت میں شامل ہو جائیں، تاکہ عوام میں اس کی ساکھ قائم ہو جائے۔ چنانچہ بعض مجبوریوں کے باعث شاہ وارث علی بھی سررشتۂ عدالت میں منسلک ہو گئے۔ ان کی ملازمت کا سارا زمانہ آرہ میں گزرا؛ بیس برس یہاں رہے جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے، تو اپنے وطن پیر بگہ چلے آئے اور یہیں ۲ دسمبر ۱۸۳۳ء/۱۹ رجب ۱۲۴۹ھ کو واصل حق ہوئے۔

حضرت شاہ وارث علی کی اولاد میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں بڑے شاہ حسین علی تھے اور چھوٹے ہمارے صاحبِ ترجمہ شاہ باقر علی۔

باقر ۱۹ جون ۱۸۳۱ء (۸ محرم ۱۲۴۷ھ) کو بروزِ یکشنبہ پیدا ہوئے۔ یہ اپنے والد کی سب سے چھوٹی اولاد اور ان کی وفات کے وقت صرف ڈھائی برس کے تھے؛ چنانچہ ان کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے کی۔ سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کرایا۔ پھر گھر ہی پر ایک اُستاد سے فارسی کی تکمیل کرائی۔ اس کے بعد عربی پڑھنا شروع کی تھی، کہ یہ سلسلہ رُک گیا اور ایک زمانے تک انھیں دوبارہ اس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی۔ یہ انھوں نے بہت مدّت بعد مولانا مہدی حسن سے پڑھی۔ اس دوران میں انھوں نے لکڑی، پٹہ، گتکہ وغیرہ کے فن خلیفہ مداری اور میر یار محمدؐ سے حاصل کیے۔ پھر تیر اندازی، شمشیر زنی، نیزہ بازی، شہسواری، بانک، بنوٹ، میر کریم اللہ سے سیکھے اور کافی بڑی عمر میں اپنی ملازمت کے زمانے میں ایک شخص امراؤ خان بھوپالی سے بندوق چلانا اور نشانہ لگانا سیکھا۔ غرض کہ جملہ فنونِ سپہگری اور مردانہ کھیلوں میں طاق تھے۔

باقر بھی اپنے والد اور بڑے بھائی کی طرح انگریزی حکومت کے ملازم رہے۔ ۱۸۵۹ء میں ان کی سب سے پہلی تقرری سررشتۂ افیون میں گماشتے کی حیثیت سے آرہ میں ہوئی۔ یہاں سے ۱۹ برس کے قیام کے بعد ۱۸۷۸ء میں بڑہروا (ضلع موتی ہاری) تبادلہ ہوا۔ پھر ۱۸۸۲ء میں پٹنہ آئے اور یہیں سے ۱۸۸۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد مستقل سکونت آرہ میں اختیار کر لی۔

ملازمت سے پنشن پالینے کے بعد ان کی تندرستی خراب رہنے لگی۔ معدے نے کہ ام الامراض ہے، بہت تکلیف دینا شروع کی۔ کبھی شدید قبض ہو جاتا، اور کبھی شدید اسہال۔ غرض صحت روز بروز کمزور ہونے لگی۔ وہ ایک خانوادۂ تصوّف کے چشم و چراغ اور خود صاحبِ حال

بزرگ تھے۔ عقائد کے لحاظ سے سنّی حنفی اور حضرت شاہ قیام اصدق (متوفی ۲۱ رمضان ۱۳۰۱ھ / ۱۵ جولائی ۱۸۸۴ء) سے طریقۂ چشتیہ نظامیہ میں بیعت اور خود اُن کے خلیفہ اور صاحبِ اجازت تھے۔ اس لیے اوراد و وظائف اور ریاضت کا معمول بیماری کے ایّام میں بھی نہیں چھوٹا۔ وفات سے ایک دن پہلے یک بیک فرمایا، کہ مجھے ایک ضروری کام سے گیا جانا ہے۔ چنانچہ بستر وغیرہ بندھوایا، اور گاڑی سے گیا پہنچ گئے۔ اگلے دن اسہال شروع ہو گئے۔ طبیعت پہلے ہی سے نڈھال تھی، رہی سہی کسر اسہال نے پوری کر دی۔ طاقت بالکل زائل ہو گئی۔ اسی حالت میں شبِ جمعہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء (۲۴ جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ) کو وفات پائی۔ جنازہ پیر بگہ لایا گیا اور یہاں اپنے خاندانی قبرستان میں اپنی والدہ کی قبر کے متصل دفن کیے گئے۔ اِنّا للّٰہ وَ اِنّا اِلیہ راجعون۔

باقرؔ نے تین نکاح کیے۔ پہلی شادی کے وقت اُن کی عمر صرف ۱۷ برس کی تھی۔ یہ بیوی بہت جلد فوت ہو گئیں؛ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا نکاح دو ڈھائی سال بعد اسی مرحومہ کی چھوٹی بہن سے ہوا۔ ان سے دو لڑکیاں باقرؔ کے بعد زندہ رہیں۔ تیسرا نکاح شیخ امیر اللہ صدّیقی کی صاحبزادی سے ہوا۔ یہ بزرگ بہرائچ کے رہنے والے اور راجہ صاحب نانپارہ کے وہاں ملازم تھے۔ اس نکاح سے باقرؔ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ان کی وفات کے وقت موجود تھے۔ سب سے بڑے جناب عطا حسین جنھوں نے ان کا دیوان مرتّب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ پہلے حکومتِ ہند کے محکمۂ ریلوے میں ملازم ہوئے اور بعد کو حیدر آباد دکن چلے گئے۔ دوسرے فرزند خان بہادر مولوی عبدالصّمد صاحب ڈپٹی کلکٹر، اور تیسرے ڈاکٹر عبدالکریم بھی گورنمنٹ میں ملازم رہے۔

باقرؔ نے قاطعِ بُرہان کے معرکے میں بھی حصّہ لیا تھا۔ غالبؔ نے مؤیّدِ بُرہان کی تصنیف پر ایک قطعہ لکھا تھا (انشا کردہ است۔ غوغا کردہ است) جس پر یہ شعری مباحثہ شروع ہو گیا۔ اس موقع پر باقرؔ نے دو قطعے عبدالصّمد فدا سلہٹی (شاگرد مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری) کے جواب میں اور ایک منشی جواہر سنگھ جوہرؔ لکھنوی (شاگرد ناطق مکرانی) کے جواب میں لکھے تھے۔ آغا علی شمسؔ نے ایک مضمون اردو نثر میں لکھا تھا، جس میں غالبؔ کے کلام پر اعتراض کیے تھے باقرؔ نے اس کا جواب فارسی نثر میں دیا۔ باقرؔ کے یہ منظومات اور مضمون ہنگامۂ دل آشوب میں شامل ہیں اور وہیں سے دیوانِ باقرؔ بھی نقل کیے گئے ہیں۔

باقؔر نے شاعری گویا ورثے میں پائی تھی۔ ان کے والد شاہ وارث علی بھی شاعر تھے۔ اشکیؔ تخلص تھا، انھوں نے اپنے کلام پر اصلاح شیخ محمد وجیہہ الدین عشقی (خلف شیخ غلام حسین مجرمؔ عظیم آبادی) سے لی تھی۔ عشقی اپنے وقت کے اُستاد تھے۔ گارساں دتاسی کا تذکرہ بہت حد تک عشقی کے تذکرے سے ماخوذ ہے۔

خان بہادر سید علی محمد شادؔ کے اُستاد شاہ اُلفت حسین فریادؔ، ان ہی اشکی کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے۔[۵]

باقر اُردو میں کم اور زیادہ فارسی میں کہتے تھے۔

انھوں نے غالبؔ سے اپنے تلمذ اور اُن سے اپنی عقیدت کا اظہار بارہا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ہمچو غالب در جہاں یک نکتہ سنجے برنخاست — من فدائے لطفِ او، باقر کہ اُستادِ من است

ہست فیض نظرِ حضرتِ غالبؔ، باقر — شورِ نظمِ تو کہ در ملک وجہان افتاد است

'ہنگامۂ دل آشوب' کے قطعے میں لکھتے ہیں:

باقر از شکرانۂ ایں، کے تواں آمد بروں
کہ مرا تلمیذِ غالب حق تعالیٰ کردہ است

پھر یہی نہیں، غالب کی وفات کے بعد بھی اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے: کہتے ہیں:

باقر! برخیز و برخواں پیشِ او، از گفتہ اَت
از پےِ اصلاح، روحِ غالب استاد آمدہ

۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) کی ایک غزل کا مقطع ہے:

کجا شد غالبِ شیریں نوا، باقر کہ آہ اکنوں
صدا زاں طوطیِ ہندِ خوش الحانم نمی آید

نمونۂ کلام یہ ہے:

اے جان و دلم سوختۂ آزارِ محبّت — جاناں چہ کنم، پیش تو اظہارِ محبّت

آغوشِ من و شاہدِ صد گونہ تمنّا — بالینِ من و سایۂ دیوارِ محبّت

اے باقرِ دل خستہ! چنیں حالِ تو چو نست! — شاید کہ دلت گشتہ گرفتارِ محبّت

---

۵ سید علی محمد شاد عظیم آبادی نے "حیاتِ فریاد" میں لکھا ہے کہ اشکی دلّی گئے تھے اور وہاں انھوں نے خواجہ میر درد کی شاگردی اختیار کی۔ یہ بے اصل ہے؛ درد نے ۱۱۹۹ھ (۸۵-۱۷۸۴ء) میں انتقال کیا۔

بگفتمش، کہ مبر نام و ننگ من، فرمود
برو، برو، کہ نخواہیم نام و ننگ ترا

ذرۂ دردے طلب، تا محرمِ رازے شوی
حاصلِ ایں زہدِ تو، زاہد! ثوابے بیش نیست

اے سنگدل! یکے نشنیدی و مدّتے
باقر بر آستانِ تو فریاد کرد و رفت

توانم داشتن در سینہ رازِ عشق را پنہاں
چہ سازم، ضبطِ عشق از چشمِ گریانم نمی آید

ز دستِ وحشتِ دل نیست یک روزے نصیبِ من
کہ صد چاک از گریباں تا بداما نم نمی آید

چہ می پرسی ز احوالم، چہ گویم با تو، اے ظالم!
چہا جورے، کہ از دستِ تو بر جانم نمی آید

کجا شد غالبِ شیریں نوا، باقر کہ آہ اکنوں
صدا زاں طوطیِ ہندِ خوش الحانم نمی آید

ایں قدر جور و جفا، بر دلِ رنجور مکن
ہر چہ خواہی بکن، از پیشِ خودم دور مکن

ہوشم بربود آں صنمِ جلوہ طرازے
جا دور وِشے، ماہ وَشے، مایۂ نازے

جائے کہ تو باشی و من خستہ جگر ہم
سرسبز شود گلشنِ رازے و نیازے

کوتاہ کنم دامنِ صحرائے طلب را
گر دست دہد سلسلۂ زلفِ درازے

شکلِ تصویر ہو خاموش، تماشا کیا ہے!
بیٹھے بیٹھے کھیچے جاتے ہو، یہ نقشا کیا ہے!

تمھاری دید کی حسرت میں دیکھو جان جائیگی
کھلی رہ جائینگی آنکھیں، نکل جائیگا دم اپنا

کلیجہ تھامے ہاتھوں سے مرے گھر روز آؤگے
کسی دن تو اثر دکھلائیگا اندوہ و غم اپنا

[مقدمۂ دیوانِ باقر؛ تاریخِ شعرائے بہار، ص ۶۵، ۸۷؛ حیاتِ فریاد، ۱۵۵-۱۶۸؛ نگار (اپریل ۱۹۵۳ء)، ص ۴۱-۴۲؛ ہنگامۂ دلِ آشوب؛ مسلم شعرائے بہار، ۱: ۷۱؛ دودِ چراغِ محفل: ۱۴۱-۱۹۴]

بدری داس — پنڈت

"پنڈت بدری داس ڈاک منشی، کرنال باآں کہ مجھ سے اس سے ملاقات ظاہری نہیں ہے، مگر میں جب جیتا تھا تو وہ اپنا کلام میرے پاس اصلاح کے واسطے بھیجتا تھا۔ بعد اپنے مرنے کے میں نے اس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیج دیا کرو۔

[خطِ غالب بنام تفتہ، اردوئے معلّٰی: ۶۸]

بسملؔ ـــــ منشی شاکر علی (غلام بسم اللہ) میرٹھی ثم بریلوی

ان کے والد منشی سرفراز علی بانس بریلی کے رہنے والے، قوم کے کمبوہ، کمشریٹ میں سررشتہ دار تھے۔ دراصل اس خاندان کا مسقط الرّاس مارہرہ تھا۔ اور یہ اسی خاندانِ کمبوہ کے چشم و چراغ تھے، جس کے ایک فرد چودھری عبدالغفور سرور (تلمیذِ غالبؔ) بھی تھے۔ بسلسلۂ ملازمت باہر رہے اور پھر انھوں نے بریلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے۔ غالبؔ کے پہلے مجموعۂ خطوطِ اردو "عودِ ہندی" کے ناشر منشی ممتاز علی میرٹھی منشی سرفراز علی کے بیٹے تھے۔ وہ بسملؔ کے علاتی بھائی تھے، یعنی سرفراز علی کی ایک بیوی سے ممتاز علی تھے، دوسری سے بسملؔ۔

بسملؔ میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ شاکر علی اصلی نام تھا۔ غلام بسم اللہ تاریخی نام ہے (۱۲۳۹ھ)۔ ان کی تعلیم بیشتر مارہرہ اور بریلی میں ہوئی۔ عربی بعد کو مفتی محمد سلطان حسن خان سلطاںؔ صدر الصدور (تلمیذِ غالب) سے حاصل کی، جب وہ میرٹھ میں منصف تھے۔ مدتوں مظفر نگر اور میرٹھ میں ناظرِ عدالت رہے۔ اس لیے عام طور پر دوستوں میں ناظر صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ غالبؔ نے انھیں "سکتر شاعراں" کا خطاب دے رکھا تھا۔

مذہب سے بہت دلچسپی تھی۔ دو مرتبہ حج کیا۔ حضرت شاہ عبدالرحمٰن شاہجہاں پوری سے بیعت تھے۔ اسی لیے آخر میں نعت گوئی سے زیادہ شغف ہو گیا۔ ان کا رسالہ "نالۂ بسملؔ"[۵] چھپ چکا ہے۔

---

۵ نالۂ بسملؔ سے متعلق خود بسملؔ نے غالب کا ایک لطیفہ بیان کیا ہے، جو لطف سے خالی نہیں۔ چونکہ لوگ عام طور پر اسے نہیں جانتے، اس لیے اسے یہاں درج کیا جاتا ہے

بسملؔ نے "نالۂ بسملؔ" اصلاح کی غرض سے غالبؔ کے پاس بھیجا۔ بسمل صاحب خوشخط نہیں تھے، اور یوں بھی اس زمانے میں یاے معروف و مجہول میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بسملؔ نے ایک جگہ "بندے"

(باقی اگلے صفحہ پر)

(۱۸۹۶ء) جس میں مؤذنِ رسول، حضرت بلال کا قصہ مسدس کی شکل میں لکھا ہے۔ اس کے آخر میں ایک نعتیہ قصیدہ اور قدسی کی مشہور نعت کی تضمین بھی شامل ہے۔

پنشن لینے کے بعد بریلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہیں زیرِ جامع مسجد آج بھی ان کے خاندان کے لوگ رہتے ہیں۔ ۱۸۹۸ء (۱۳۱۵ھ) میں وفات پائی۔ محو بریلوی نے تاریخ کہی "ان العاقبت للمتقین"۔ اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

غالب کی تقلید کا بہت شوق تھا اور ان کی طرحوں میں لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ غالب کی ایک زمین میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

شب وفورِ اشک سے گردوں کفِ سیلاب تھا — دورۂ چشمِ کواکب، حلقۂ گرداب تھا
واں حنا بندی، عناں گیرِ خرامِ ناز تھی — یاں تنِ کاہیدہ، غرقِ اشکِ خونِ ناب تھا
واں رخِ پرنور تھا، صبحِ امیدِ زندگی — یاں ہر اک داغِ جگر، خورشیدِ عالمتاب تھا
حسنِ تمکیں آزما کو، پاسِ خودداری اُدھر — خانہ زادِ عشق کو، ملحوظ یاں آداب تھا
اُن کو پاسِ ننگ دامنگیر، مجھ کو پاسِ وضع — وہ اُدھر بیتاب تھے اور میں اِدھر بیتاب تھا

میں نے دیکھا رات بسمل کو پڑا تھا خاک پر
بسترِ سنجاب تھا، نے بالشِ کمخواب تھا

[یادگارِ ضیغم: ۶۸؛ خمخانۂ جاوید، ۱: ۵۹۰ - ۵۹۱؛ غالب اور عصرِ غالب: ۲۳۱، ۲۳۳؛ ہماری زبان (۱۵ مارچ ۱۹۶۲ء) ص ۹]

(گزشتہ سے پیوستہ) کو بندی لکھا مصرع یہ تھا:

بندی کو مولا نے کیا سرفراز

میرزا نے املا کی تصحیح کر کے "بندے" کر دیا اور لکھا کہ "عیاذاً باللہ، آپ کا یہ عقیدہ ہے؟" (غالب اور عصرِ غالب (از ڈاکٹر محمد ایوب قادری): ۲۳۳)

بیتابؔ — صاحبزادہ عبّاس علی خان رامپوری

رام پور کے حکمران خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد نواب محمد عبدالعلی خان بہادر، نواب فردوس مکان محمد یوسف علی خان بہادر کے حقیقی چچا تھے۔
چونکہ انتخاب یادگار کی تالیف کے وقت ان کی عمر ۶۶ برس کی بتائی گئی ہے، اس لیے تقریباً ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء-۱۸۱۰ء) میں پیدا ہوئے ہونگے۔ ۱۸۳۷ء تک دہلی میں مقیم رہے، پھر لکھنؤ چلے گئے۔ اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث ہمعصروں میں ممتاز تھے۔ کلام پر حکیم مومن خان مومن دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کی وفات (۱۸۵۲ء) کے بعد کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ لیکن غالب کے دوسرے سفرِ رامپور (۱۸۶۵ء) کے بعد ان کے شاگرد ہو گئے۔ اپنا دیوان بھی ان کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیج دیا، اور ان کی وفات تک خط و کتابت کے ذریعہ مشورہ بھی کرتے رہے۔
۱۸۵۷ء کے بعد رام پور میں حاکم صدر بنائے گئے تھے، فروری ۱۸۸۳ء تک اسی عہدے پر متمکن رہے۔ ۶ جون ۱۸۸۳ء (مطابق ۲۹ رجب ۱۳۰۰ھ) کو ظہر کے وقت فوت ہوئے۔
دیوان "گلدستۂ باغِ جناں" کے عنوان سے شعبان ۱۳۰۱ھ میں چھپا تھا۔ گلزارِ عشق اور بہارِ عشق دو قصّے بھی لکھے تھے، جو طبع نہیں ہوئے، ان کے قلمی نسخے رضا لائبریری، رامپور میں موجود ہیں۔
ان کے چھوٹے بھائی صاحبزادہ محمد عنایت علی خان بھی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور عنایت تخلص کرتے تھے۔ بقولِ شیفتہ و کریم الدین فارسی کلام صہبائی کو اور اردو میر حسن تسکین (شاگرد نصیر و مومن) کو دکھلاتے تھے۔ لیکن امیر مینائی کہتے ہیں کہ مومن سے مشورہ تھا۔ یہ ۱۴ اگست ۱۸۴۸ء (۱۴ رمضان ۱۲۶۴ھ) کو زہر خورانی سے دہلی میں فوت ہوئے۔

درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہیں۔

بیتاب کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ہر بات میں برہم کوئی اتنا نہیں ہوتا
آپس میں، ذرا سمجھو تو، کیا کیا نہیں ہوتا!
یوں، کون ستاتا ہے مری جان کسی کو
خوبی پہ جسے اپنی بھروسا نہیں ہوتا
کچھ بن گئی ہے ایسی ہی دم پر مرے، ورنہ
مرنا تو کسی کو بھی گوارا نہیں ہوتا

کروں اللہ سے فریاد، تمھارا ہو کر
تمھیں منصف ہو، کہ پھر میں رہوں کس کا ہو کر
خیر گذری، کہ ذرا چونک کے پھر لگ گئی آنکھ
رہ گیا یوں ہی سا کچھ حشر کا غوغا ہو کر

دوستی اپنی، خدا کے لیے، تہ کر رکھیے
نہیں بھاتا ہے مجھے، ناصحو! اتنا اخلاص

بیتاب! درد عشق کہاں، اور ہم کہاں
بیٹھے بٹھائے ٹوٹ پڑا، ناگہاں فلک

ان بیوفائیوں کا دکھاتا ذرا مزہ
ہوتا ذرا بھی دل، جو مرے اختیار میں

بیتاب کا بھی رندو! معلوم ہے پتا کچھ
ہم اس کو دیکھتے تھے، اکثر اس انجمن میں

پھر بیٹھے بیٹھے چھیڑ نکالی، خدا سے ڈر
ظالم! ابھی تو آنکھ کا آنسو تھما نہیں

کون کہتا ہے کہ یاں آنے کا دستور نہیں
بات تو یہ ہے کہ ملنا انھیں منظور نہیں

یا بند ناصحوں کی زباں کر دے، اے خدا!
یا مجھ کو دے یہ صبر، کہ بیٹھا سنا کروں
بہر خدا بتا تو دے اتنا بھی، ناصحا!
اس کو کروں نہ یاد، تو پھر کیا کیا کروں!

ہزار صبر کرو، لاکھ بیقرار نہ ہو
نہیں وہ چیز محبت کہ آشکارا نہ ہو

ہمیں کرنا تھا جو، وہ کر بیٹھے
آپ باتیں بنائیں، گھر بیٹھے

وفادار، ناصح! مبارک تمھیں
ہمیں تو وہی بیوفا چاہیے
مقابل میں تیرے تو، اے پند گو!
تجھی سا کوئی بیوفا چاہیے
بجا ہیں تمھارے سب ارشاد پر
ذرا اور کی بھی سنا چاہیے

زباں سے نام اس کا دم بدم ناصح لواتا ہے
خدا کے واسطے چپ رہ، کلیجہ منھ کو آتا ہے

گو صبر ہے عشاق کا شیوہ، پہ ستم گر!
جب جی ہی پہ بن جائے تو پھر کیا نہیں کرتے
بیتاب! یہ کیا قہر ہے، او جان کے دشمن!
ہر بات پہ یوں پھوٹ کے رویا نہیں کرتے

پاس رکھنے کا جو بیتاب! کریں وہ دعویٰ
صحبت غیر بھی، ناچار گوارا ہو جائے

کیا کہے جاتے ہو، کچھ وصل کی تدبیر بتاؤ
آپ عقبیٰ میں تو ناصح رہے کام آنے سے

مل گیا راہ میں بتخانہ بھلے سے زاہد!
کعبے سے جا ہی چکے تھے ترے بہکانے سے

ذکر اس کا ہو، کچھ بھی فرمائے — کاش ناصح ہی دل کو بہلائے
اور ان کا گلا ہوا اُلٹا — کر کے شکوہ بھی ان سے پچتائے

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ
ساقی اگر نہیں ہے نہ ہو، مے سے کام ہے

بیتاب! پی خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ
یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

آج پیغامبر! نہ کچھ کہنا — ہیں وہ ہم پر بہت خفا بیٹھے
یہ بھی قدرت خدا کی، اے بیتاب! — تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے

[گلشن بیخار: ۳۴-۳۵، ۳۷؛ طبقات الشعرائے ہند: ۳۷۶؛ انتخاب یادگار: ۷۶، ۸۱؛ ۲۳۳-۲۳۴؛ اخبار الصنادید: ۱۷۳؛ خمخانۂ جاوید: ۶۳۴۔]

بیدلؔ ۔ شیخ عبدالسّمیع انصاری رامپوری

قصبۂ رامپور منہیاراں (ضلع سہارنپور) کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد شیخ محمد یوسف مشہور طبیب تھے۔ سلسلۂ نسب صحابی رسول حضرت ابو ایوبؓ انصاری سے ملتا ہے۔

بیدل کی ابتدائی تعلیم نجی طور پر ہوئی۔ اس کے بعد چندے مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے استفادہ کیا، اور بالآخر ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳-۱۸۵۴ء) میں مزید کسبِ علم کی غرض سے دلّی کا رُخ کیا۔ یہاں اس وقت مولوی امام بخش صہبائی اور (صدرالصدور) مولوی صدرالدین آزردہ کا طوطی بولتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بھی فارسی کی تکمیل صہبائی سے کی، اور عربی اور حدیث وتفسیر کی آزردہ سے۔ ان کے علاوہ اساتذۂ عہد، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولوی سعادت علی سہارنپوری، مولانا شیخ محمد تھانوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بھی کچھ استفادہ کرنے کی روایت موجود ہے۔ یوں وہ علومِ مروّجہ میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔

قیامِ دلّی کے زمانے ہی میں شعر و شاعری سے رغبت پیدا ہوئی، تو میرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان کی شاگردی اختیار کر کے اُردو میں شعر کہنے لگے۔

سات برس میں تعلیم مکمّل کرنے کے بعد کسبِ معاش کا مرحلہ پیش آیا۔ سب سے پہلے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰-۱۸۶۱ء) میں رڑکی (ضلع سہارنپور) میں ایک برہمن ٹھیکیدار کے بیٹے ناہر سنگھ کی تعلیم و تربیت پر مامور ہوئے۔ نوجوان ناہر سنگھ ان کی بزرگی اور زہد و ورع اور دینداری و تقوی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ خلیل الرحمن اس کا اسلامی نام رکھا گیا تھا جب یہ خبر ناہر سنگھ کے خاندان تک پہنچی، تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ عبدالسمیع کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ ناہر سنگھ پر بھی بہت سختی کی گئی، لیکن اس نے استقامت کا ثبوت دیا، اور اپنے

اعتقاد پر قائم رہا۔۱
مولوی عبد السمیع رڑکی سے نکلے تو اپنے وطن پہنچے۔ حسنِ اتفاق سے انھیں ایام میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۲ ہندستان آئے ہوئے تھے۔ اپنی تعلیم و تربیت اور اُفتادِ طبع کے زیرِ اثر عبد السمیع ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حاجی صاحب نے ان کے علم و تقویٰ سے متاثر ہوکر

۱۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی سوانح عمری میں جن مولانا خلیل الرحمٰن کا ذکر آتا ہے، وہ یہی صاحب ہیں۔ انھوں نے بعد کو علومِ اسلامیہ میں مہارت پیدا کرلی اور پھر ہجرت کرکے مکۂ معظمہ چلے گئے۔ وہاں حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور ان سے خلافت پائی۔ مکہ ہی میں فوت ہوئے۔

۲۔ مولانا امداد اللہؒ دوشنبہ ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ (۱۸ اپریل ۱۸۱۸ء) نانوتہ (ضلع سہارنپور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد امین العمری تھانوی تھے۔ مولانا امداد اللہ نے فارسی کی رسمی تعلیم کے بعد مولانا قلندر بخش جلال آبادی سے مثنوی مولانا روم پڑھی۔ پھر دلّی آئے اور شیخ نصیر الدین شافعی مجاہد کے دامن سے وابستہ ہوگئے اور ان کے شہید ہوجانے کے بعد اولاً چندے تھانہ بھون میں رہے، پھر شیخ نور محمد جھنجھانوی کی خدمت میں پہنچ کر ان کی بیعت کرلی، اور ان کے حکم کی تعمیل میں ارشاد و تلقین میں جُٹ گئے۔
۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بیشتر علماء و صلحا نے مولانا امداد اللہ کو اپنا امیر منتخب کرلیا تھا۔ لیکن شاملی (ضلع مظفر نگر) کے معرکے میں دیسی فوج کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ مجبوراً اس کے بعد بیشتر علما روپوش ہوگئے اور کچھ اصحاب نے ملک سے ہجرت کرنے میں عافیت دیکھی۔ انھیں میں مولانا امداد اللہ بھی تھے۔ انھوں نے وطن سے نکل کر مکّہ مکرمہ میں سکونت اختیار کرلی۔ اسی سے صفت "مہاجر مکّی" گویا ان کے نام کا جزو بن گئی ہے۔ یہاں انھوں نے مجاہدات و عبادات سے وہ مقام حاصل کرلیا جس نے انھیں مرجعِ اصحابِ علم و یقین بنادیا۔ علمائے عصر میں سے ایک بڑی تعداد نے ان کی بیعت کرلی تھی۔
انھوں نے تصنیف و تالیف میں بھی اپنے آثار چھوڑے ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب تصوف اور معرفت کے مضامین سے مملو ہیں۔ "ضیاء القلوب" فارسی میں اور "ارشادِ مرشد" "گلزارِ معرفت" "تحفۃ العشاق"، "جہادِ اکبر"، "غذائے روح" "دردنامۂ غمناک" وغیرہ اُردو نظم میں ہیں۔
چہار شنبہ ۱۲ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ (۱۸ اکتوبر ۱۸۹۹ء) مکّۂ معظمہ میں رحلت کی۔ قبرستان جنت المعلیٰ میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔ (نزھۃ الخواطر، ۸: ۷۰۔ ۷۲)

انھیں اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔ روایت ہے کہ عبدالسمیع صاحب نے حاجی صاحب موصوف کی بیعت قصبۂ جھنجھانہ (ضلع مظفر نگر) میں اسی درخت کے نیچے کی تھی، جہاں کسی زمانے میں خود حاجی صاحب نے اپنے پیرِ طریقت حضرت میاں نور محمد جھنجھانوی کی بیعت کی تھی۔ اس کے بعد حاجی صاحب نے انھیں خلافت سے بھی مشرف فرمایا۔

میرٹھ (یو پی) کے رؤسا میں شیخ الٰہی بخش (ف: ۲۱ مئی ۱۸۸۳ء) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے اپنی دولت رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ان کے اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس پر انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حافظ عبدالکریم (ف: ۷ نومبر ۱۹۰۵ء) کے تینوں بیٹوں (غلام محی الدین؛ وحید الدین؛ بشیر الدین) کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لے لی۔ انھیں ان تینوں صاحبزادوں کے لیے ایک صاحبِ استعداد اور موزوں استاد کی ضرورت تھی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ مولوی عبدالسمیع بیدل فارغ ہیں، تو انھوں نے مولوی صاحب کو میرٹھ آنے کی دعوت دی، جو بیدل نے قبول کر لی۔ ان تینوں لڑکوں نے نہ صرف ان سے فارسی، عربی اور دینیات کی تعلیم پائی، بلکہ بعد کو بیعتِ طریقت بھی کر لی۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ پیش آیا، جس سے بیدل کے تقویٰ اور محتاط طبیعت کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔

بیدل کے تقرر پر یہ طے ہوا تھا کہ انھیں بارہ روپے مشاہرہ کے علاوہ رہنے کو مکان اور "روٹی" بھی دی جائے گی۔ چنانچہ کھانے کے وقت چپاتی اور مختلف قسم کے سالن خوان میں پیش ہوئے۔ آپ نے چپاتی اٹھالی اور اسے پانی کے ساتھ نوش فرما لیا۔ خوان واپس پہنچا، تو باورچی نے تعجب کیا اور صورتِ حال حافظ عبدالکریم صاحب کے گوش گزار کر دی۔ حافظ صاحب نے خیال کیا کہ شاید کھانا مولوی صاحب کے پسندِ خاطر نہیں تھا، جس سے انھوں نے اسے واپس کر دیا۔ حافظ صاحب نے باورچی کو حکم دیا کہ آیندہ زیادہ پُرتکلّف کھانا مولوی صاحب کے لیے پکایا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی؛ لیکن خوان اب بھی جوں کا توں حسبِ سابق واپس آگیا۔ اس پر حافظ عبدالکریم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کو کھانے میں جو چیز پسند ہو اس کے پکانے کا حکم دے دیجیے۔ تو کہا کہ مجھے تو ہر ایک چیز پسند ہے، کھانا میری پسند اور ضرورت کے مطابق ہے۔ جب پوچھا گیا کہ آپ پھر صرف روٹی پر کیوں اکتفا کرتے ہیں، اور

سالن واپس کر دیتے ہیں؟ تو کس سادگی سے جواب دیا کہ تقرری کے وقت تنخواہ میں صرف "روٹی" طے ہوئی تھی، سالن لینے کا میرا کوئی حق نہیں تھا؛ لہٰذا میں نے اس کے لینے سے اجتناب کیا۔ اس پر حافظ عبدالکریم نے عرض کیا کہ "روٹی" میں چپاتی اور سالن دونوں شامل ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دونوں چیزیں قبول کر لیں۔

ان کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ باہر سے گراں قدر مشاہروں پر ملازمت کی دعوتیں آئیں، لیکن انھوں نے ہمیشہ انکار کر دیا؛ بلکہ روایت یہ ہے کہ ریاست ٹونک کی مدرسۂ عالیہ کی صدارت اور چار سو ماہانہ کی پیشکش کی بھی پروا نہ کی۔ حافظ عبدالکریم نے یہ سنا تو انھوں نے چاہا کہ آپ نقصان میں کیوں رہیں آج سے ہماری طرف سے ۴۰۰ روپیہ ماہانہ قبول کر لیں؛ انھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ۴۲ برس میرٹھ میں بسر کیے۔ یہیں منگل یکم محرم ۱۳۱۸ھ (یکم مئی ۱۹۰۰ء) کو رہگرائے عالمِ بقا ہوئے۔ قبرستان حضرت مخدوم شاہ ولایت کے احاطے میں دفن ہوئے۔

اولادِ جسمانی میں صرف ایک صاحبزادے محمد میاں تھے، جنھوں نے دلّی جاکر حکیم عبدالمجید خان (خلف حکیم محمود خان) سے طب پڑھی اور میرٹھ واپس آکر اپنا مطب قائم کیا۔ انھیں پہلوانی کا بھی شوق تھا، بڑے تن و توش کے خوش خوراک آدمی تھے۔ ۶ محرم ۱۳۵۹ھ (۱۴ فروری ۱۹۴۰ء) کو انتقال کیا؛ اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

شاعری کے آغاز میں بیدل بھی رسمی غزل کی طرف زیادہ متوجہ رہے۔ لیکن جوں جوں مذہب سے شغف بڑھتا گیا، اور بالخصوص حاجی امداد اللہؒ سے بیعت کے بعد، نعت و منقبت سے زیادہ مزاولت رہنے لگی۔ ان کی مندرجۂ ذیل ۱۲ مطبوعات کا پتا چل سکا ہے۔ جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، بیشتر مذہبی موضوعات خاص کر نعت و مولود سے متعلق ہیں؛ (۲) مناظرہ کے تحت آتی ہے؛ اور (۷) نصاب سے متعلق ہے؛ یہ رسالہ ایک ہفتہ میں لکھا گیا ہے:

۱۔ دافع الاوہام، فی محفل خیر الانام (لکھنؤ: ۱۲۹۶ھ)
۲۔ انوارِ ساطعہ در بیانِ مولود و فاتحہ (میرٹھ: ۱۳۰۲ھ)
۳۔ راحۃ القلوب فی مولد المحبوب (دہلی: ۱۲۹۰ھ)
۴۔ بہارِ جنت (میلاد شریف) (کانپور: ۱۳۱۰ھ)

۵۔ سلسبیل فی مولد ہادی سبیل (میرٹھ : ۱۳۱۲ھ)
۶۔ نورِ ایمان (؍؍ : ۱۳۱۲ھ)
۷۔ حمدِ باری
۸۔ طرازِ سخن (مجموعۂ کلام) (میرٹھ : ۱۳۱۴ھ)
۹۔ جوہر لطیف (نعتیہ مثنوی) (میرٹھ : ۱۳۲۷ھ)
۱۰ فیضانِ قدسی (فضایل آیتہ الکرسی) (دلّی : ۱۹۲۷ء)
۱۱ وسیلۂ مغفرت (مجموعۂ ادعیہ)
۱۲۔ مظہر الحق

ان کا بیشتر منظوم کلام ان کی آخری ایام کی بے توجہی کے باعث ضائع ہوگیا۔ ان کے شاگرد خان بہادر شیخ بشیر الدین جن کی تعلیم و تربیت ہی بیدل کی نگرانی میں ہوئی تھی، بعد کو شعر بھی کہنے لگے تھے۔ وہ تسخیر تخلص کرتے اور اصلاح بھی بیدل سے لیتے تھے۔ انھوں نے جہاں تہاں سے کلام جمع کیا اور اسے 'طرازِ سخن' کے عنوان سے شائع کر دیا۔ ۴۸ صفحات کا یہ مختصر کتابچہ پہلی مرتبہ محمود پریس، میرٹھ سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔ نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

شرر افشاں اِدھر لب ہیں اُدھر آنسو برستے ہیں
تماشا جس طرح برسات میں ہو برق و باراں کا
نمودِ ذرّہ بے خورشید کب ممکن ہے، اے بیدلؔ!
سبب حسنِ قدم ہے گرمیِ بازارِ امکاں کا

کیا کہوں جو خاکساری میں ہے، اے بیدلؔ بہار
مل کے دانہ خاک میں کیا سبز و رعنا ہوگیا

مت خون پہ بیدلؔ کی کمر باندھ، کہ وہ تو
اک طائرِ بے بال ہے سو بھی کوئی دم کا

کوئی حسرت نہیں نکلتی ہائے
مدّعا کوئی بر نہیں آتا

شبنم کو رونا آتا ہے انجام دیکھ کر
غفلت سے مسکراتا ہے غنچہ گلاب کا
وحدت کی رمز کھل نہ سکے بے فنا ہوئے
دریا سے وصل ٹوٹ کے ہووے حباب کا

تھا ابھی وصل، پھر جو آنکھ کھلی
یار آغوش سے جدا دیکھا
دارِ فانی میں آدمی کیا ہے
بہتے پانی میں بُلبلا دیکھا

کیا کہوں کس کس مصیبت سے چلا پیمانہ رات
چرخ نے گھیرا تھا چکّر باندھ کر خمخانہ رات
کیا مصیبت میں کسی کا ساتھ دیتا ہے کوئی!
دل کو سمجھے تھے یگانہ، ہوگیا بیگانہ رات

شمشیرِ الم دیکھ کے غش آئے ہے جن کو
یارب! مجھے لائینگے وہ کیونکر تہِ خنجر!

گر بلا وہ ہیں تو ہم بھی ہیں جفاکش، دیکھیں
پیچ و خم دینگے ہمیں آپ کے گیسو کب تک؟

غم نہیں ہے کہ اضطراب نہیں
جان پر میری کیا عذاب نہیں

دل دیا حق نے وہ، کہ ہے بیتاب
آنکھ وہ دی کہ جس کو خواب نہیں

یہاں یہ نوبت کہ سانس گنتے ہیں
وہاں وہ غفلت کہ کچھ حساب نہیں

اپنے عاشق کی بیکلی مت پوچھ!
دن کو آرام شب کو خواب نہیں

شعلہ رُو تیری گرم خوئی سے
کونسا دل ہے جو کباب نہیں

مختصر ہے یہ حال بیدل کا
تن میں طاقت، جگر میں تاب نہیں

وہ آویں، نہ آویں مگر منتظِر ہم
جو اپنی سی ہوتی ہے کر دیکھتے ہیں

وہ دیکھے نہ دیکھے، مگر ہم تو بیدل!
اسی کو بس آٹھوں پہر دیکھتے ہیں

جب دوڑتے ہیں نفع کو، پاتے ہیں ضرر کو
تقدیر کھڑی ہنستی ہے تدبیر بشر کو

بیدل! میں کبھی کوچۂ دلبر میں نہ جاتا
لایا مجھے میرا دلِ بیتاب اِدھر کو

زہد کا زعم، نہ طاعت پہ ہے تکیا ہم کو
کچھ خدا ہی کے کرم پر ہے بھروسا ہم کو

آجانا دم کا، زیست ہے، نکل جانا، موت ہے
ہر دم معاملہ ہے بقا و فنا کے ساتھ

دل کی عبث تلاش ہے، پہلو میں دل کہاں
بیدل! تمھارا دل تو گیا دلربا کے ساتھ

نہ سہتے رہ کے گلشن میں، جفائے باغباں لیکن
رگِ گل کی محبت رشتہ بندِ پائے بلبل ہے

اے دل، تو ہی پھر بندِ قفس توڑ، تڑپ کر
وہ تو نہ کبھی حشر تک آزاد کرینگے

پھر دیدۂ تحقیق کو وحدت پہ نظر ہے
ہیں ذرّہ و خورشید برابر کئی دن سے

نہ دل لگاؤ، یہ دتی کے لوگ ہیں بیدل!
اب آگے مانو نہ مانو، یہ کہہ دیا ہم نے

انیس قدسیاں تھی ہائے اس عالم میں جاں میری
ہوئی مٹی خراب اس خاک میں آکر کہاں میری

گلی، بازار، کوچے میں، جدھر جائیں جہاں سنیے
وفا کا میری شہرہ ہے، تری بیداد کا غل ہے

کی شفا کی جو دعا، اور ہوا درد نصیب
ہائے، میں کیا کہوں اللہ سے اور کیا ہو جائے!

[حیاتِ بشیر: ۶۶ - ۸۲ (حاشیہ)؛ غالب اور عصرِ غالب: ۱۶۵ - ۱۷۶؛ اردوئے معلیٰ، دلّی (شمارۂ اول، غالب نمبر ۱۹۶۰ء): ۱۰۹ - ۱۱۷]

بیدلؔ (در سوا) ـــ مولوی ابوالحسنات محمد حبیب الرحمٰن انصاری سہارنپوری

مشہورِ عالم مولانا حاجی احمد علی محدث سہارنپوری کے صاحبزادے تھے جو خاندانِ ولی اللّٰہی میں شاہ محمد اسحاق صاحب کے نامور شاگردوں میں ہوئے ہیں۔ مولانا احمد علی اپنے دور کے مشاہیر میں سے تھے۔ ان کے علم و فضل سے بہت لوگوں نے استفادہ کیا۔ مولانا شبلی نعمانی بھی اُن کے شاگردوں میں سے تھے؛ ان کی وفات ۱۲۹۷ھ میں ہوئی۔ نساخؔ نے تاریخ کہی:

چوں آں احمد علیِ نیک باطن
بسُوئے خُلد زیں دار الفنا رفت
برائے سالِ ترحیلش بہ نساخؔ
ملک گفتا: "زدنیا مقتدا رفت"

ان کے تین بیٹے حیدر آباد دکن گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن ان میں سب سے بڑے تھے۔ یہ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ - ۱۸۴۴ء) میں پیدا ہوئے؛ "ظہور الدّین احمد" تاریخی نام ہے۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ - ۱۸۹۵ء) میں نواب عماد الملک ناظمِ تعلیمات حیدر آباد دکن کے بلاوے پر وہاں گئے، اور مدرسۂ عالیہ نظام میں ۲۵۰ روپے مشاہرہ پر فقیہ اوّل کے عہدے پر تقرر ہوا۔ بتدریج مددگار مہتمم بن گئے اور تنخواہ چار سو ہو گئی۔ اسی عہدے پر تھے، جب ۱۹۱۹ء میں انتقال ہوا؛ وہیں حیدر آباد میں مدفون ہیں۔

قیامِ دکن کے ابتدائی زمانے میں انھیں کچھ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل ابھی غالب شناسی کا رواج نہیں ہوا تھا، اور وہاں بھی ذوق کی استادی مسلّم تھا۔ ایسے میں بھلا غالب کے کسی شاگرد کی کیا پرسش ہوتی۔ حسنِ اتفاق سے انھیں ایام میں بیدل کی مہاراجا سرکشن پرشاد کے دربار تک رسائی ہو گئی۔ مہاراجہ بہادر کی خدمت میں پیش کردہ پہلے ہی قصیدے کا ایک بند تھا:

غالب کی رزم بزم کا ادنیٰ سا خوشہ چیں ہے بیدلِ شکستہ قدمبوسِ آستاں

تزئینِ بزم دے تو زمیں پر بنے جناں لکھے جو رزم، خوف سے رستم اچھل پڑے

پر شکر ہے کہ شاعرِ دریوزہ گر نہیں
کرتے ہیں آپ قدر جو ہوتے ہیں قدرداں

مہاراجا بہادر کے علاوہ انھوں نے نظامِ دکن میر محبوب علی خان آصف جاہ ششم کی مدح میں بھی متعدد قصیدے کہے۔ تقریبِ سالگرہ پر قصیدہ پیش کرنا ان کے معمول میں شامل تھا۔ مہاراجا بہادر کی سرکار سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔

بیدل کا خط بھی بہت پاکیزہ تھا، نستعلیق اور شکستہ دونوں بہت عمدہ لکھتے تھے۔ ناخن سے لکھنے کی مشق ایسی بےمثال تھی کہ دیکھنے والے اش اش کر اٹھتے تھے۔ روایت ہے کہ جو غزلیات حضورِ نظام کی خدمت میں پیش کرتے، وہ عموماً ناخن ہی کی لکھی ہوتی تھیں۔

بیدل بڑے جید عالم تھے۔ بعض کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ مثلاً "مسندِ امام ابو حنیفہ"، "تاریخِ تیموری" "مقاماتِ بدیع ہمدانی"۔ یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک رسالہ "فضیلتِ علم" بھی لکھا تھا، جو سلسلہ وار ماہانہ پرچے "دبدبۂ آصفی" میں چھپتا رہا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی وفات کے بعد چندے "دبدبۂ آصفی" اور "محبوب الکلام" کی ادارت بھی کرتے رہے۔ یہ دونوں پرچے مہاراجا کشن پرشاد کی سرپرستی میں شائع ہوتے تھے۔

غالب کے علاوہ حسین علی خان شاداں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ طبیعت مشکل پسند اور مضمون آفرین پائی تھی۔ فی البدیہہ اشعار کہنے میں خاص ملکہ تھا۔ دکن میں ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی۔

تلامذہ اور احباب کے اصرار کے باوجود کبھی اپنے کلام کو مرتب کرنے پر متوجہ نہ ہوئے۔ اس لیے افسوس کہ بہت کلام ضائع ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد عقیل ندوی نے ان کے منتشر کاغذات کو جمع کیا تھا۔ قصائد تو کسی حد تک محفوظ تھے اور تلاش سے دستیاب ہو گئے، لیکن غزلیات صرف ایک ابتدائی نامکمل بیاض اور رسائل سے جمع ہوئیں۔ عقیل نے شروع میں ایک دیباچہ کا اضافہ کیا جس میں کچھ حالات بھی شامل کیے ہیں۔

یہ قلمی دیوان میری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں تقریباً ۱۶۰ غزلیات ہیں۔ متفرق اشعار بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ آخر میں قصائد اور قطعات کی اچھی خاصی تعداد ہے، جو انھوں نے حضورِ نظام اور مہاراجا بہادر اور بعض دوسرے عمائدِ دکن کے لیے کہے۔ یہ نسخہ ایک

مثنوی پر ختم ہوتا ہے۔ اس دیوان سے ایک اور بات معلوم ہوئی، کہ وہ پہلے رسوا تخلّص کرتے تھے۔ کئی غزلوں کے مقطع میں یہ تخلص استعمال ہوا ہے، مثلاً

ہے عبث شکوۂ ویرانیِ دل، اے رسوا!
جس جگہ عشق رہا، کب وہ گھر آباد رہا

ہے عبث رسوا کو اوس کا انتظار
وہ تو آغوشِ تصوّر میں بھی آکر کم رہا

دل پھنسا زلفِ گرہ گیر میں رسوا!
بعد مجنوں کے ہوئی مجھ کو یہ زنجیر نصیب

کون پہلو سے گیا ہے مرے اُٹھ کر رسوا!
منھ کو آتا ہے مرے، لختِ جگر آپ سے آپ

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھیں نعت سے بہت شغف تھا۔ متعدد غزلیات پوری کی پوری اسی صنف میں ملتی ہیں۔ بسا اوقات رسمی غزل لکھتے لکھتے بھی درمیان میں دو ایک شعر نعت میں کہہ جاتے ہیں۔ اب انتخابِ کلام ملاحظہ ہو:

بیدلِ خستہ ہے اک طفلِ دبستاں اب تک
روح سے حضرتِ غالب کی مدد ملتی ہے

چنے ہے پھول بیدل حضرتِ غالب کے گلشن سے
معطر ہو کلام اپنا نہ کیوں بوے مضامیں سے

ہمرنگ ہو گیا تری زلفِ سیاہ کا
نازش نہ کیوں ہو تیرگیِ بخت پر مجھے

لاکھ تڑپا کیا، پر اوس نے نہ دیکھا، دیکھا!
بس بے جور، اُف رے ستم، اب بھی سنبھل، او بیدل

پابزنجیر رہا، تو بھی میں آزاد رہا
نکہتِ گل کی طرح، ہوں وہ خودی سے باہر

تیرِ مژگاں سے ستمگار مرے سینہ میں ـــــ زخم تھا، زخم سے ناسُور ہوا، خوب ہوا!

تیرِ مژگاں! دل میں میرے کیا اثر پیدا کیا ـــــ مرغِ بسمل کی طرح یہ رات بھر تڑپا کیا

سر برہنہ، اشک جاری، زرد چہرہ ہے ترا ـــــ سچ بتا، اے شمع! ماتم تو نے یہ کس کا کیا

عبث ہو دنیا پہ جان دیتے، نہیں ہے بیدل ثبات اس کو
یہاں کے جھگڑوں کو ہیچ پایا، یہاں کا دھندا سراب دیکھا

ہاتھ اوچھا پڑا ہے قاتل کا ـــــ رہ گیا دل میں حوصلہ دل کا

عمر محوِ سفر ہے، عمر ہوئی ـــــ اور پتا کچھ نہیں ہے منزل کا

کیوں کہا، نامہ بر! وہاں جا کر ـــــ غیر ہے ہائے، حالِ بیدل کا

گر ملاحت سے وہ قاتل نمک افشاں ہوتا ـــــ حشر تک زخم نہ منّت کشِ درماں ہوتا

لذتِ لختِ جگر، خارِ تمنّا کی خلش ـــــ خواہشِ زخم کہ پہلو میں نمک داں ہوتا

تنگیِ زخم سے ارمانوں کے عقدے نہ کھلے ـــــ کاش، دل بھی مرا ہم رنگِ گریباں ہوتا

لڑتے ہیں عبث شیخ و برہمن پسِ دیوار ـــــ مسجد نہ کسی کی ہے، نہ بتخانہ کسی کا

عہدِ پیری ہے بے پر و بالی ـــــ اب گلہ کیا شکستہ پائی کا

برقِ نظارہ سوز ہے وہ نگاہ ـــــ صاد ہے جس پہ اک خدائی کا

رونے سے فائدہ تجھے کیا چشمِ نم ہوا ـــــ کچھ دل کی آگ کم ہوئی، کچھ درد کم ہوا؟

خانۂ دل ہیں مرے عشق کو جب بار نہ تھا ـــــ جان بیزار نہ تھی، دل پہ کوئی بار نہ تھا

بیتابی و سوزش ہے فقط آپ کا صدقہ ـــــ ہاں، درد ہے غمخوار پرانا مرے دل کا

امیدیں توڑ دی، دل خون کرنا، بدگماں رہنا ـــــ ترے انداز سیکھے یاس نے، اے جانِ جاں کیا کیا

نہیں دل میں بجز خونِ تمنّا، نام تک باقی ـــــ کیا ہے خانمانِ آرزو کو بے نشاں کیا کیا

روز کرتے ہو تازہ تازہ ستم ـــــ کس سے سیکھی ہے یہ جفا صاحب!

کیجیے التفات غیروں پر ـــــ بیکسوں کا بھی ہے خدا، صاحب!

عشق آتا ہے تو ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں ـــــ دین و ایماں، دل و دیدہ، جگر، آپ سے آپ

روکشِ ارماں، حریفِ آرزو، پامالِ رشک ـــــ کیا ہیں محسودِ تمنّا، خفتگانِ کوئے دوست

بیدل! اور کہہ سکے نہ منھ سے کچھ ـــــ بیخودی خاک میں ملائی رات

آئیگا بہرِ سیرِ چمن کیا نگار آج ـــــ پھرتی ہے ہر روش پہ نسیمِ بہار آج

عیش دنیا ہیچ ہے، اور پوچ ہے اس پر غرور
آج ہم غمناک ہیں، اور کل عدو غمناک تھا

دل لگایا دہر سے، افسوس، بیدل! کیا کیا
لطف تھا جب تک کہ دامانِ تمنا چاک تھا

مایۂ حسن پرستی نہ رہا میرے بعد
حسن بھولا وہ انداز و ادا میرے بعد

ہاتھ پتھر کے تلے آگیا اب تو اپنا
خون روتی ہے شب و روز حنا میرے بعد

یہ پشیمانی مری موت پہ، اللہ اللہ!
اب نہیں ہوتے کسی پر وہ خفا میرے بعد

مجھ سا بیدل ہستم و جور کا خوگر نہ ملا
وہ ہوئے شیفتۂ طرزِ وفا میرے بعد

کس قدر دستِ جنوں سے ہوں پریشاں العیاذ
الاماں کہتا ہے دامن، اور گریباں العیاذ

ہوں وہ مجنوں، دشت گردی سے مری
کہہ رہے ہیں سب کے سب خارِ بیاباں العیاذ

جائے عبرت ہے کہ رسوا سا جواں
عشق میں تیرے پھرے یوں دیدۂ گریاں العیاذ

رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے غم لہو ہو کر
انیس جسم ہوا درد مو بمو ہو کر

یہ بیخودی ہے حریفِ خودی کہ جیتا ہوں
نصیبِ شیشہ و جام و مے و سبو ہو کر

ہوئے شگفتہ وہ آخر نسیم حسرت سے
جو غنچے رہ گئے سربستہ آرزو ہو کر

پس فنا بھی یہ باقی ہے شوقِ پابوسی
تری گلی میں گئی خاک کو بکو ہو کر

کسی کی زود پشیمانی میرے مرنے پر
دلِ عدو میں کھٹکتی ہے آرزو ہو کر

حریم کعبۂ غیرت سے مت نکال قدم
جیا تو خاک جیا ننگِ آبرو ہو کر

جب آیا سامنے بیدل، تو آگیا غصہ
ہوا نہ آئینہ معتوب رو برو ہو کر

مضطرب دل میں کبھی، اور کبھی باہر بیچین
نظریں پھرتی ہیں ترے شوق میں اندر باہر

میری ہی جان حزیں تھی نذرِ اندازِ وفا
یاد وہ کرتے ہیں مجھ کو طرزِ دشمن دیکھ کر

فکرِ عمرِ جاوداں، اور چند روزہ زندگی
پانو پھیلاتے ہیں، بیدل! طولِ دامن دیکھ کر

وحدت ہے مرا کیش، موحد کے ساتھ ہوں
زاہد سے ہوں قریب، نہ ہوں برہمن سے دور

ظلم ہے، جور ہے، جفا ہے عشق
سخت کافر ہے، بد بلا ہے عشق

سہل تم نے سمجھ لیا ہے عشق
جاں ربا اور غم فزا ہے عشق

تیرے بیمار کب پنپتے ہیں
تو ہی کہہ، تیری کیا دوا ہے عشق

حضرتِ دل! یہ کیوں ہے بیتابی
پھر کہیں تجھ کو ہو گیا ہے عشق

دیکھنا کیسے ہوتے ہو رُسوا
ابھی نام خدا ہوا ہے عشق

پسِ مردن، مری جاں! آدمی کی قدر ہوتی ہے
کروگے تم وفاؤں کو ہماری یاد مدت تک

اے جذبِ محبت کے تلاطم، تو کدھر ہے
دریا رہے امید کا پایاب کہاں تک!

ہستی کے سمندر میں خدایا، مری قسمت
اب دیکھیے پیدا کرے گرداب کہاں تک!

کھلتا نہیں یہ بھید کسی طرح کسی پر
ہیں عالمِ اسباب کے اسباب کہاں تک!

کیوں نہ پروازِ طبیعت میکشی سے ہو فزوں
ڈالتے ہیں آگ پر جس وقت مے، اڑتی ہے آگ

کم نہیں دوزخ سے ہمیغزوں کی صحبت، الاماں
جب نیستاں میں پہنچتی ہے، تو چیخ اٹھتی ہے آگ

خاکساری سے نہیں مٹتا فروغِ عزّ و جاہ
راکھ کے نیچے دبانے سے کہیں بجھتی ہے آگ!

نہ پوچھو بیدلِ خستہ کی حالت
جگر پامال، تن لاغر، خفا دل

یار ہے خواب میں، بیدار کروں یا نہ کروں
فتنہ خوابیدہ ہے، ہشیار کروں یا نہ کروں

وعدہ وہ کرکے نہ آئے، مگر اللہ رے رعب
خوف ہے جی میں کہ تکرار کروں یا نہ کروں

تری شوخی کا اثر ہے، ساقیِ سیماب وش
کیفِ ہمرنگی ترے بادہ گساروں میں نہیں

راستی حرفِ غلط تھا، محو دونوں سے ہوا
ترے وعدوں میں نہیں، میرے ستاروں میں نہیں

باتیں کبھی ایما، کبھی دزدیدہ نگاہیں
مضموں تو کچھ بھی نہیں، عنوان بہت ہیں

عمرِ بے اعتبار کی باتیں
ہیں سرِ راہگذار کی باتیں

کب وہ سنتا ہے، تو نے کیوں اس سے
دلِ اُمّید وار! کی باتیں

یارب! کیے گناہ جنونِ شباب میں
ناکردہ جو ہیں، درج ہیں فردِ حساب میں

بہلا رہا ہوں دل کو اُمیدِ جواب میں
تسکینِ تشنگی ہے فریبِ سراب میں

ساقی! ادھر تو دیکھ کہ میں دیر مست ہوں
کچھ مستیِ نگاہ ملا دے شراب میں

تمہیدِ بیخودی ہو کہ تمکینِ ضبط ہو
وہاں ایک بے نیازی ہے سب کے جواب میں

پامالِ یاس، کشتۂ غم، تشنۂ آرزو
یہ جانِ ناتواں ہے مری کس حساب میں

بیدل! بچو کہ فکرِ فضیلت فضول ہے
فاضل کسی جگہ بھی نہیں ہے حساب میں

کوئی غصہ نہیں عتاب نہیں
خامشی کا مگر جواب نہیں

دل بشوقِ خرامِ عشر آہنگ
کب ہم آغوشِ اضطراب نہیں

خندہ ہائے نمک فشانِ عدو / مرہمِ زخمِ انقلاب نہیں
بل کبھی لیتے نہیں ہیں اہلِ کمال / زلف پابندِ پیچ و تاب نہیں

نہ وہ رنگت، نہ وہ نکہت، نہ وہ شوخی، نہ ادا / غنچۂ حسرتِ دل صحنِ گلستاں میں نہیں
جنبشِ اعضا میں نہیں، تابِ رگِ جاں میں نہیں / تار جز تارِ نفس اپنے گریباں میں نہیں
راستی حرفِ غلط تھا کہ مٹا دونوں سے / میری قسمت میں نہیں، آپ کے پیماں میں نہیں
سازِ ہستی کو ہے جس طرح فنا ہم آہنگ / مستتر ہے، بُتِ طنّاز! تری ہاں میں نہیں

ہماری آنکھ کب آغوشِ انتظار نہیں / اُمید یاس سے کس وقت ہمکنار نہیں
خس آشیاں کے لیے چُننے کس تمنّا پر / تمھاری برق مزاجی کا اعتبار نہیں
حریم کعبہ سے پوچھو غمِ فراقِ بتاں / سیاہ پوش یہ کیوں ہے، جو سوگوار نہیں

بیخودی سے بڑھ کے خودداری بنی ہے راہزن / طُور کا جلوہ نظر آنے لگا ہر سُو ہمیں
ہم موحد ہیں، نہیں صورت پرستی اپنا کیش / اس لیے تصویر اپنی ہم نے کھچوائی نہیں
کیا لڑکپن، کیا جوانی، کیا بڑھاپا، ہمنشیں! / چیز جو ہم سے گئی، وہ لوٹ کر آئی نہیں

چین دن کو ہے مجھے، نے اے ستمگر رات کو / دن کو تنکے چُنتا ہوں، گنتا ہوں اختر رات کو

کچھ ناز ہو، کچھ غمزہ ہو، کچھ شرم و حیا ہو / معشوق کی یہ شان نہیں، ظلم و جفا ہو
اخفائے راز باعثِ صد التفات ہے / اے نالۂ رسا! کبھی پیغامبر نہ ہو
رازِ نہفتہ کُھل گیا چینِ جبیں سے آج / کیوں نازشِ عتاب ہو، الفت اگر نہ ہو

یاد ہے جوششِ وحشت ترا احساں مجھ کو / فکرِ داماں ہے، نہ ہے فکرِ گریباں مجھ کو
جان بھی اپنی ہوئی اب تو وبالِ خاطر / دل نہ آتا تھا نظر جان کا خواہاں مجھ کو
تا کجے آتشِ خس پوش چھپیگی، بیدل! / پاسِ رسوائی نے کھویا، دلِ سوزاں مجھ کو

تمنّائے نظر یہاں یہ کہ میں ہوں کوئے جاناں ہو
تقاضائے جنوں واں وہ کہ تو ہو، اور بیاباں ہو
خدایا! درد دے اور درد کی کچھ ایسی اُلفت دے
نہ درماں کی تمنّا ہو، نہ دردِ دل کا درماں ہو
یہ چلتا پھرتا سایہ ہے، ابھی کچھ ہے، ابھی کچھ ہے
عبث حسنِ دو روزہ پر، بتو! تم اتنے نازاں ہو

مزہ جب مشعرہ میں ہے، غزل پڑھنے کا اے بیدلؔ
محمد یار احقر ہوں، حبیب الدّین سوزاں ہو

وہ ولولہ، وہ جوشِ جوانی، وہ دن کہاں ——— کچھ دم رہے ہیں پاس کے، بیدلؔ گزارنے

میری حالت پہ واں نظر نہ ہوئی ——— آہ مِنّت کشِ اثر نہ ہوئی
وصل میں ہجر کی تسلّی کیوں ——— غیر کی رات کیا بسر نہ ہوئی
شکوۂ جور گو اِدھر نہ ہوا ——— پر وفا پر نظر اُدھر نہ ہوئی
آنکھ بیصبر ہو کے پھوٹ پڑی ——— پردہ دار اپنی چشمِ تر نہ ہوئی
دل سے کہتا رہا فسانۂ ہجر ——— قصّہ گوئی میں بھی سحر نہ ہوئی

تمھیں کہو کہ شکایت ہے جا بجا کس کی
ہوئی زمانے میں یوں شہرتِ جفا کس کی
اُچٹ کے دل سے جگر میں گیا خدنگِ نگاہ
نشانہ کون تھا، اور آگئی قضا کس کی

تِرا وہ حسن کہ ہنگامہ طلب عالم سے
میرا وہ دم کہ چلا میری نظر سے پہلے
تجھ کو پیغامِ سفر دیتی ہے بیدلؔ! پیری
کرلے کچھ فکرِ سفر، وقتِ سفر سے پہلے

[تزکِ محبوبیہ، ۲ (دفترِ ہفتم): ۳۳-۳۴؛ خمخانۂ جاوید، ۱: ۶۷۲-۶۷۴؛ دار العلوم کے سپوت: ۸۳؛ دیباچہ دیوان بیدلؔ (قلمی)]

بیصبر ــ منشی بال مکند سکندر آبادی

یہ بھی اسی سکندر آباد (ضلع بلند شہر۔ یوپی) کے رہنے والے ایک بھٹناگر کائستھ خاندان کے فرد تھے، جہاں کے منشی ہرگوپال تفتہ (تلمیذِ غالب) تھے؛ بلکہ تفتہ ان کے ماموں تھے۔ بیصبر کے والد کا نام رائے کانھ سنگھ تھا۔ (خمخانۂ جاوید، ۱: ۶۸۲ میں نام کانجی مل؛ یہ غلط معلوم ہوتا ہے) یہ خاندان دراصل پنجاب کا رہنے والا تھا؛ انھیں وہاں کے ایک مقام "دُگال"[۵] سے منسوب کیا گیا ہے۔ خدا معلوم، یہ لوگ کس زمانے میں اور کیوں وہاں سے نقلِ مکان کرکے یوپی چلے آئے، لیکن بہر حال اس سے ان کی اَل "دُگالیہ" پڑ گئی۔

بیصبر نے بکرمی سمبت میں اپنی تاریخِ ولادت ایک قطعہ میں یوں کہی ہے:

مرا سالِ ولادت ہندوی میں — جو کوئی صورتِ معنی میں پاوے
تو کر دے قافیے کو دُور تا ہوں — ہزار و ہشت صد و نہ آوے

(۱۸۶۹ بکرمی)

(بکرمی سمبت ۱۸۶۹ مطابق ہے، ۱۸۱۲ ۔ ۱۸۱۳ عیسوی کے)

بیصبر کی تعلیم بہت معقول تھی۔ یوں بھی اس عہد میں کائستھوں میں فارسی، عربی پڑھنے کا عام رواج تھا کیونکہ یہ لوگ بالعموم حکومتِ وقت کی ملازمت میں داخل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۶ برس کی عمر میں انھوں نے فارسی اور عربی کے علاوہ ریاضی میں بھی معقول دستگاہ حاصل کر لی۔ نجوم، ہیئت، منطق اور تصوف و ویدانت سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ شعر گوئی کا شوق پیدا

---

۵ پنجاب (پاکستان) کے ضلع گجرات کی تحصیل پھالیہ میں ایک مختصر قصبہ "دگل" ہے۔ یہ پھالیہ سے کوئی دو میل جنوب کی طرف واقعہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ "دگال" سے یہی جگہ مراد ہو۔

ہوا، تو اپنے ماموں ہرگوپال تفتہ سے رجوع کیا اور ان سے عروض اور رموزِ شاعری کی تعلیم حاصل کی۔ بعد کو تفتہ کی ترغیب اور ایما ہی پر غالب کا تلمذ اختیار کیا۔ غالب کے متعدّد خطوں میں ان کا ذکر ہے۔

سترہ سال کی عمر تھی، جب انگریزی عملداری میں محکمۂ پرمٹ میں ملازمت اختیار کی۔ لیکن یہاں سے دل اُچاٹ ہو گیا، تو اسے چھوڑ کر سہارنپور کلکٹری میں نوکری کر لی۔ ۱۸۶۱ء میں جوان بیٹے کی موت سے دل شکستہ ہو کر ۱۸۶۳ء میں پنشن پر میرٹھ میں خانہ نشین ہو گئے۔

ان کی اولاد میں چار بیٹوں کا ذکر ملتا ہے۔ خود چوتھے بیٹے سری کرشن سروپ کی ولادت پر قطعۂ تاریخ کہا تھا:

ہر دم زدیدنش دلِ من شاد می شود	فرزندِ چارمی چو بمن داد کردگار
"سالِ ہزار دو صد و ہفتاد می شود"	بیصبر چوں بظاہری و معنوی بجُست

(۱۲۷۰ھ) = (۱۸۵۳ء)

ان کے نام تھے: (۱) ہرسروپ۔ یہ ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ بیصبر نے ان کی تاریخِ ولادت کہی تھی: سن یک ہزار و دو صد و شصت

(۱۲۶۰ھ)

ہرسروپ کا بیصبر کی زندگی ہی میں ۱۸۶۱ء/ ۱۲۷۹ھ میں انتقال ہو گیا۔ اسی کی وفات کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا تھا۔ بیصبر نے خود ان کی وفات کی دو تاریخیں کہی تھیں:

عیسے نے دی صدا کہ: "ہو اہائے کیا غضب" (۱۸۶۱ء) اور

"ہے ہے دریغا وائے وائے" (۱۲۷۹ھ)

۲۔ برہما سروپ: یہ ۱۹۰۴ بکرمی / ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخِ ولادت کہی تھی:

پسر یہ واہ ہوا فخرِ خانداں پیدا (۱۹۰۴ء)

یہ بیصبر کی وفات کے بعد تک زندہ رہے۔

۳۔ کرشن چندر سروپ: ان کی تاریخِ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ یہ بھی بیصبر کی وفات کے وقت زندہ تھے۔ شعر بھی کہتے تھے، منیر تخلص تھا۔

۴۔ بینی سروپ: یہ سب سے چھوٹے تھے۔ ان کا ۱۸۷۳ء میں انتقال ہوا، جب ان کی عمر صرف ۲۰ برس کی تھی؛ ان کی ولادت ۱۸۵۳ء کی ہے۔

بیصبر کے نام لیوا آج بھی سکندر آباد میں موجود ہیں؛ اور خاندان ماشاء اللہ بہت خوشحال اور فارغ البال ہے۔

بیصبر بڑے قادر الکلام اور پُر گو تھے۔ ان کی تصانیف میں مندرجۂ ذیل کتابوں کا پتا ملا ہے:
اُردو کے تین دیوان (۱) دیوانِ عام (غزلیات، رباعیات، قطعات)؛ (۲) دیوانِ خاص (غزلیات)؛ (۳) دیوان قصائدِ اُردو (۵۴ قصائد، ترکیب بند، ترجیع بند)؛ (۴) دیوان فارسی (غزلیات، قطعات، رباعیات، تضمین)

تین مثنویاں: (۱) لختِ جگر (تاریخی نام: ۱۲۵۳ھ)؛ (۲) اخگرِ عشق؛ اس کی تاریخ بیصبر نے خود کہی تھی:

جس کا سن "لالۂ پُر داغ" ملا، پر وہ لالہ بسر باغ ہوا
۱۲۷۳ + ۲ = ۱۲۷۵)

تیسری مثنوی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔
("سراپا سخن" میں "یادگارِ فرزنداں میں نوحہ وسراپا بطرزِ جدید" کہا ہے (ممکن ہے، یہ تیسری مثنوی ہو)

نثر میں (۱) "ادیب البنات" میں مستورات کو تہذیب الاخلاق کی تلقین کی گئی ہے (۲) "گلستانِ ہند" جو شیخ سعدی کے تتبع میں ہے۔
"بدیع البدائع" میں کلام کے مروّجہ صنائع و بدائع کا ذکر ہے۔ اس کی تاریخِ تصنیف کہی تھی:

پےِ تاریخِ ختمِ ایں رسالہ — بسالِ عیسوی دل در شمار است
بگویم از سرِ بہجت کہ بیصبر — "بنام ایزد عجب باغ وبہار است"
(۱۸۶۸ + ۲ = ۱۸۷۰)

اس میں صنائع کی مثالیں فارسی شعرا کے علاوہ اردو میں سرتاسر اپنے کلام سے مہیا کی ہیں؛ جس سے خود ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ اگرچہ جیسا کہ دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے، یہ ۴۸ صفحات کا مختصر رسالہ حسبِ منشاو اشتہار لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی (یوپی) ۱۸۷۰ء میں تصنیف ہوا تھا، لیکن یہ اگست ۱۸۸۵ء میں مطبع دبیر ہند، بلند شہر میں طبع ہوا۔

اپنے استاد کے عاشق زار تھے۔ ایک قصیدہ "پرکالۂ آتش" میں ان سے متعلق کہتے ہیں:

جس کا غالب ہے تخلص، اسد اللہ ہے نام — یہ تو ہے کفر جو کہیے کہ ہے یزداں میرا
پیر ہے، ہادی مرا، رہبر مرا، استاد مرا — قبلہ ہے، کعبہ ہے، دیں میرا ہے، ایمان میرا

مجھ کو گویا ہے حدیث اس کا جو ہے اردو کلام — فارسی اس کا وہ دیوان ہے قرآں میرا
انوری ہے مرا، اور وہ ہے مرا خاقانی — آگرہ، خاور ہے اور دلّی، ہے شرواں میرا
فاریاب اس کا ہے گھر، کوچہ ہے اس کا ساوج — ہے ظہیر اپنا وہی، اور ہے وہی سلماں میرا
درِ عرفی و شفائی پہ جبیں سا نہیں میں — کعبہ شیراز ہے، نے قبلہ، صفاہاں میرا

ایک دوسرے قصیدے "دُودِ دل" میں کہتے ہیں:

سودا و میر و مصحفی و جرأت اور درد — مجھ کو نہیں ہے کام کچھ ان رفتگاں کے ساتھ
ممنون و مومن، آتش و ناسخ، نصیر و ذوق — کچھ واسطہ نہیں ہے ان اہلِ زباں کے ساتھ
جو مہر کو ہے ذرّہ سے نسبت، وہی مجھے — نسبت ہے میرزا اسد اللہ خاں کے ساتھ
غالب ہے غالب الشعرا کا مرے لقب — رشتہ تلامذہ کا ہے اس نکتہ داں کے ساتھ
اس شاہِ ملکِ نظم سے ہے مجھ کو مشورہ — مثلِ بزرجمہر ہوں نوشیرواں کے ساتھ
ایراں کو عہدِ غالبِ عالی جناب میں — تابِ مقاومت نہیں ہندوستاں کے ساتھ

ایک قطعے کے چند شعر دیکھیے:

میں اپنے جان و دل سے ہوں فدائے میرزا غالب
سر اپنا ہے سدا قربانِ پائے میرزا غالب
نہ کیوں نام اس کا سب ناموں پہ غالب ہو کہ دنیا میں
ہوئی نام آوری پیدا برائے میرزا غالب
اگر ملکِ سخن کی سلطنت بخشے مجھے خسرو
نہ لوں میں کیونکہ ہوں میں تو گدائے میرزا غالب
کسی کی طبع، اے بیصبر! ایسی ہے، نہ فکر ایسی
زہے فکر و زہے طبعِ رسائے میرزا غالب

غالب کی وفات پر قطعات تاریخ کہے تھے:

ہماں میرزا غالب اُوستادِ من
بجان آفریں، جاں چو آخر سپرد
بپرسیدم از دل سنِ رحلتش
بنالید و گفت: "آہ غالب بمُرد"
(۱۲۸۵)

اسد اللہ خاں وہ غالب آہ — جس سے اہلِ کمال تھے مغلوب
جب سدھارے بسوئے خلد ہوئے — سخن ان کے الم میں سینہ کوب
اس سپہرِ سخن کے اختر کا — مجھ کو سالِ غروب تھا مطلوب
کہا عیسیٰ نے از سرِ حسرت — "ہوا حیف آفتابِ ہند غروب"

(۸ + ۱۸۶۱ = ۱۸۶۹)

اس صاحبِ کمال کا ۷۵ برس کی عمر میں جمعہ ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء (۲۷ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ) شیو راتری کے دن میرٹھ میں انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے منشی کرشن سروپ منیر نے قطعہ کہا:

بیصبر چوں زعالمِ فانی بخلد رفت — عالم بچشمِ اہلِ بصیرت سیاہ شد
بازم مپرس حالِ دلِ بیقرارِ من — دور از سرم چو سایۂ آں قبلہ گاہ شد
اے سایۂ سعادتِ ازلی، کجا شدی — باز آ کہ حالِ منتشیانت تباہ شد
بارے بگو کہ تا چہ گناہ دیدہ زمن — اے دیدہ ام بخاکِ رہت فرشِ راہ شد
سالِ وفاتِ تو زکہ پرسم کہ بعدِ تو — ایں سلسلہ گسستہ چو متروک راہ شد
چوں فکرِ سال ناخنم اندر جگر خلید — از یمنِ برکتت سوئے غیبم نگاہ شد
ہاتف بگفت ترک دو کردہ بسالِ ہند — بستہ درِ سخن چو فنا فی اللہ شد
اعدادِ حرفِ اوّلیں ابیات کن شمار — سنِ شریف داں کہ چہ سپید و سیاہ شد

اس کے پہلے مصرعوں کے حرفِ اوّل جمع کرنے سے ان کی عمر کے سال (۷۵) معلوم ہوتے ہیں۔

میں نمونۂ کلام زرا طویل دے رہا ہوں کیونکہ ان کا کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔

میرا سر آج زیرِ خنجر ہے — کون دنیا میں میرا ہمسر ہے
میرا سر اس کی راہ کا ہے سنگ — آتے ٹھوکر ہے، جاتے ٹھوکر ہے
دشت وحشت میں ہوں میں سرگرداں — پانو، میں میرے ایک چکر ہے
گر سرِ بیگنہ کشی ہے، تو آ — طشت ہے، سر ہے، اور خنجر ہے
ہمسری سرو گر کرے اس سے — اس کا دعویٰ غلط سراسر ہے
اشک و لختِ دل اور داغوں سے — گہر و لعل و زر میسر ہے
منتِ خار و سنگ کا احساں — پانو پر میرے، میرے سر پر ہے
خیلِ عشاق کا میں ہوں سردار — کہ سرِ دار پر مرا سر ہے

سنگِ در پر ترے بوقتِ سجود سرِ شاہ و گدا برابر ہے
خاک اس کی گلی کی، اے بیصبر!
سروران جہاں کی افسر ہے

اے وائے کہ ہیں ایک ہم، اور کام بہت
درپیش ہے راہِ عدم، اور کام بہت
رہنا ہے یہاں دم کے دم، اور کام بہت
افسوس، زندگی ہے کم، اور کام بہت

اس آفتِ جاں سے کرکے یاری ہم نے حاصل نہ کیا جز آہ و زاری ہم نے
معلوم مصیبتیں نہ یہ عشق کی تھیں دل دے کر کی یہ اپنی خواری ہم نے

دیکھوں قیامت آتی ہے کیا میری جان پر
پھر سینے میں نہیں مرے دل کو قیام آج

کہا جو میں نے، ستم جو سنے نہ تھے، دیکھے
کہا کہ سنتا ہے، دیکھیو، ابھی کیا ہے!

وعدہ جو شام کا ہے، تو بیتابیوں سے ہم
شامت میں ہیں کہ دیکھیے، کب ہوگی شام آج

بگاڑی بات میری، اور بنائی اس سے بات اپنی
رقیبوں کی بن آئی ہے، خدا کی کیا خدائی ہے

کرتے کرتے خود پرستی، ہوگیا میں بت پرست
کفر حد سے جب کہ گذرا، بس وہی ایماں ہوا

اس قدر دل میں میرے درد ہوا کہ سحر ہوتے ہوتے سرد ہوا
آتی ہے آمدِ خزاں کی خبر رنگِ روئے بہار زرد ہوا
پہنچا کب منزلِ مراد کو، جو راہِ الفت میں رہ نورد ہوا

کونسا آپ کا کہا نہ کیا وہ تو فرماؤ، میں نے کیا نہ کیا
تو نے سمجھا مجھے برابرِ غیر سب برابر ہوا، کیا نہ کیا
تو نے کس دن بلایا جو میں نے پا کو سر، سر کو اپنے پا نہ کیا

نہ کعبے میں، نہ بتخانے میں دیکھا
سماں جو دل کے کاشانے میں دیکھا

کہتا تھا ہو کے باغ سے مرغِ چمن جدا
یارب! نہ ہو کسی سے کسی کا وطن جدا

اس کوچے میں جائینگے نہ ہم، ہم سے نہ ہوگا
کیا کھائیں قسم، پاسِ قسم، ہم سے نہ ہوگا

لہو بدلے آنسو کے آنے لگا
مرا گریہ اب رنگ لانے لگا

دعویٰ، اے لعبتِ ناخدا ترس
نہ خدائی کا کر، خدا سے ڈر

حال سن کر کہا کہ جھوٹ نہ بول
قصہ کر مختصر، خدا سے ڈر

کر نہ دل کو خراب، خانہ خراب
ہے خدا کا یہ گھر، خدا سے ڈر

چشمِ دزدیدہ، یاد رکھیو کہ ہے
سادھ کا ایک، چور کے سو روز

نہ کسی دوست تلک جاؤں، نہ غمخوار کے پاس
یا تو تنہا ہی رہوں، یا رہوں دلدار کے پاس

اٹھ گئے آج تو کچھ جلد، خدا خیر کرے!
آن کر حضرتِ عیسیٰ ترے بیمار کے پاس

گر ترے وصفِ مژہ پر دل سنے دو چار حرف
تیر پر بھیجے تبرّا، اور سناں پر چار حرف

خالی اُلفت سے زمانے میں ہے کون
مفت بدنام ہے نامِ عاشق

مجھ منتظر کو راہ دکھائیگا کب تلک
قاصد! تو سچ بتا کہ وہ آئیگا کب تلک!

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر
مانندِ شمع مجھ کو جلائیگا کب تلک!

تہمت لگا کے شکوے کی جب تم کروگے ظلم
شکوہ کوئی زباں پہ نہ لائیگا کب تلک

رہتے ہیں منتظر ترے لاکھوں ہی راہ میں
جانے فسوں ہے کیا تری کافر نگاہ میں!

نہ کوئی دوست رہا ہے، نہ اب رفیق اپنا
بُرے دنوں میں، یہ سچ ہے، کسی کا کوئی نہیں

زمانہ ہو گیا عشقِ بتاں میں کافر اب
رفیقِ غیرِ خدا، شیخ جی کا کوئی نہیں

شعر گوئی کو اب فراغ کہاں
ہیں کہاں، دل کہاں، دماغ کہاں!

میری قسمت میں خونِ دل کے سوا
بادہ و شیشہ و ایاغ کہاں!

جو قتلِ دل ہے زبانزد، تو بس ہوا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

رموزِ عشق کو سمجھے ہوئے ہو تم، بیصبر!
جنابِ حضرتِ ناصح کی بات کیا سمجھو

کبھی آتے ہو تم، نہ جاتے ہو — روز باتیں ہی تم بناتے ہو
موسمِ گل میں مثلِ برق و سحاب — گہ ہنساتے ہو، گہ رُلاتے ہو

ہیں پھرا حق سے، بت پھرا مجھ سے — جاؤں اب میں پناہ میں کس کی!

نہ کسی یار سے، نہ ہمدم سے — دوستی اب تو ہے فقط غم سے
محو کس سرو قد کا ہے بیصبرؔ! — کہ تو آزاد ہے دو عالم سے

آپ تو واں گئے اور ہم کو یہاں چھوڑ گئے — ہائے، کیا کر گئے تم، ہم کو کہاں چھوڑ گئے

مدعا گر ہے تو یہ ہے عاشقِ دلگیر کا — اشک میں ہونا اثر کا، آہ میں تاثیر کا
بے خودانِ عشق کو کیا حاجتِ ترکِ لباس — تن سے پیراہن جدا ہوتا نہیں تصویر کا
آدمی کی کٹتی ہے بیصبرؔ! کس سختی سے عمر — پیر ہونا طفل کا، لانا ہے جوئے شیر کا

عیاں جب اپنا فروغِ جمال تو نے کیا — تمام کر دیا مہ کو، کمال تو نے کیا

زبس ہر چیز کی قدر اس کی ضد سے ہوتی ہے ظاہر — ہوئی جس روز سے شادی، نہ ہم نے لطفِ غم پایا

فتورِ پیری نے آ کے قویٰ میں ڈال دیا — سحر نے تفرقہ مہماں سرا میں ڈال دیا

تجھ سے کیا اس کا گلہ، کیا ترا احساں مجھ پر — غیر پر تیر چلایا تھا، مرے آن لگا

کر کے مجھ کو قتل، وہ مغرور بولا غیر سے — تھا بہت اس کو بھی اپنی سخت جانی پر گھمنڈ

کچھ میں کہتا ہوں، تو کہتے ہیں: "کیا چاہتے ہو؟" — "چپکے بیٹھے نہیں رہتے ہو، اٹھا چاہتے ہو"
تم نہ بولے تو نہ بولا کوئی تم سے، بیصبرؔ! — اب کہا چاہتے ہو کچھ، تو سنا چاہتے ہو

غیر کو دیکھنا بچشمِ عتاب — دیکھنے کا بہانہ تو دیکھو

تیغِ ابرو شہرۂ آفاق ہے — چشمِ بد دور! اپنے فن میں طاق ہے

یاد جب مجھ کو یار آتا ہے — گریہ بے اختیار آتا ہے

ابھی تو گذرے ہیں دن ایک دو، ابھی کیا ہے
دلا! تو بیٹھا کوئی دن تو رو، ابھی کیا ہے

زمیں سے آسماں، اور آسماں سے لامکاں پہنچے
تلاشِ یار میں دیکھو، کہاں سے ہم کہاں پہنچے

سوزِ جگر یہ اپنا نہیں، خود بخود ضرور — یہ آگ تو کسی کی لگائی ہوئی سی ہے
بوٹا سا قد، چھریرا سا تن، چمپئی سا رنگ — بھولی سی صورت، آنکھ لجائی ہوئی سی ہے

وہ جوشِ خوں نہیں، محتاج ہو جو نشتر کا ۔ نہ نکلے توڑ کے جو رگ کو، وہ لہو کیا ہے
گر افتخار ہے معشوق کا، تو عاشق سے ۔ نہیں جو ہیں ترے نزدیک کچھ تو تو کیا ہے
نہیں ہے صبر، تو بیصبر! ہے تلاش عبث ۔ جو چیز کھوئی گئی، اُس کی جستجو کیا ہے

آخر ترے غم میں مر گئے ہم ۔ بھرنا تھا جو دُکھ سو بھر گئے ہم
بیصبر! نہ جان کا کیا خوف ۔ اس کوچے میں بے خطر گئے ہم

اس دل نے کیا خراب مجھ کو ۔ دکھلائے نہ کیا عذاب مجھ کو
بیصبر! میں زندگی سے ہوں تنگ ۔ دے موت خدا اشتاب مجھ کو

جاناں دہدم شراب ولو شم ۔ ایں کفر بدیں نمی فروشم
بر ساقی و بادہ، باد قرباں ۔ نقدِ دل و دین و صبر و ہوشم
دستِ منِ و دوشِ عیش کامروز ۔ دستِ صنم است زیب دوشم
از نغمہ زباں مبا د خاموش ۔ گوید بدم آر کہ خموشم
یار و مے و مطرب است بیصبر! ۔ باید کہ نہ جز نشاط کوشم

[تذکرۂ آثار الشعرای ہنود، ۳۳-۳۷؛ بہارِ سخن: ۸۶-۸۷؛ خمخانۂ جاوید، ۱: ۶۸۲-۶۸۳؛ اُردو ادب (ماہی)، ۶: ۳: ۹۴-۱۱۹؛ (مضمون بالِ مکند بیصبر، از قاضی معراج دھولپوری)؛ کلیاتِ بیصبر (قلمی)]

بیصبر — عین الحق کاٹھوی

ضلع میرٹھ (تحصیل باغپت) میں ایک قصبہ کاٹھ ہے؛ وہیں کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر سرکاری ملازمت میں بسر کی۔ بعد کو ریاست نانپارہ (یوپی) میں بہرائچ کے قریب ایک گاؤں رام پور ٹھیکے پر لے لیا۔ یہیں ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

فارسی کی تعلیم بہت اعلیٰ تھی؛ بلا مبالغہ ہزار ہا شعر یاد تھے۔ ایک "تذکرۃ الشعرا" مرتب کیا۔ ایک کتاب "سرقۂ شعری" کے نام سے لکھی تھی۔ دونوں کے مسودے بہرائچ میں حضرت سالار جنگ مسعود غازی کے کتب خانے میں ہیں۔

[از جناب بدر الدین صاحب مرحوم سجادہ نشین رٹول (ضلع میرٹھ)]

پیرجی — پیر قمر الدّین دہلوی

کتب فروشی اور معلّمی ذریعۂ معاش تھا۔ غالب کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک سے بھی اصلاح لی۔ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰ - ۱۸۸۱ء) میں فوت ہوئے۔ غالب رام پور سے شمشاد علی بیگ رضوان کو لکھتے ہیں (۲۴ نومبر ۱۸۶۵ء):

پیرجی بہت یاد آتے ہیں؛ ان کو دعا کہنا (اردوے معلیٰ: ۲۳۸)

یہاں پیرجی سے یہی پیرجی قمرالدین مراد ہیں۔ صرف چند شعر اور ایک غزل ملی:

گو پیرجی سے تم کو محبت نہیں، نہ ہو — کیا اعتقاد بھی نہیں ان کی جناب میں
وہ کیا غیر سے رشتہ، پھر توڑ دیں — کہ یہ بھی نزاکت کے شایاں نہیں ہے
مرے دل کو ہو کس طرح سے مسرّت — کہ اس بزم میں ہائے رضواں نہیں ہے
ہر اک شعر اس کا ہے گنجِ معانی — مقرر یہ غالب ہے، شاداں نہیں ہے

(رضوان سے شمشاد علی بیگ رضوان اور شاداں سے حسین علی خاں شاداں مراد ہیں۔)

بیاں کیونکر ہو دکھ مجھ سے، ستمگر! سوزِ پنہاں کا
کہ تیرے ہجر میں کیا حال ہے میرے دل و جاں کا

مجھے جمعیتِ کونین حاصل سربسر ہوتی
اگر پابند ہوتا آپ کی زلفِ پریشاں کا

مرے گریہ کے طوفاں نے ڈبویا خانۂ دشمن
نہ ہوں ممنون کیونکر اپنے جوشِ چشمِ گریاں کا

ترے روئے منوّر کی وہ تابش ہے کہ اے جاناں!
مقابل ہو سکے، منھ یہ کہاں مہرِ درخشاں کا

ہوئے جو تارکِ دنیا، ملی ہے عشق کی دولت
نہیں، اے ہمدمو! یہ کام ہر اک فردِ انساں کا

رہ و رسمِ محبت سے خبر تم کو نہیں اصلا
ٹھکانا زاہدو! کیا ہے تمھارے دین و ایماں کا

کیا وعدہ بھی آنے کا، اگر اس نے، خدا شاہد
یقیں ہم کو نہیں، ہمدم! کسی کے عہد و پیماں کا

اٹھائے گر نقاب اپنے رُخِ پُر نور سے جاناں
بسنتی رنگ ہو جائے حیا سے ماہِ تاباں کا

ملا کر آنکھ، چھینا اہلِ عالم کا دلِ خود بیں
لقب ہو دلربا کیونکر نہ تیری چشمِ فتّاں کا

یہ کیونکر رنگ و بو پھولوں کی نقش آب ہو ہمدم!
کہ طرّہ کھل گیا ہے آج پھر اس سنبلستاں کا

تجھے کیوں، پیرجی! روزِ جزا کا ڈر ہے عصیاں سے!
شفاعت کو ہے کافی واسطہ شاہِ رسولاں کا

[خمخانۂ جاوید، ۲: ۱۳؛ مشاعرۂ دہلی، جون ۱۸۷۸ء (بحوالہ خط ڈاکٹر
حنیف نقوی، بنارس)؛ ماہِ نو (ماہنامہ) کراچی، جنوری/
فروری ۱۹۶۹ء ۶۲]

تپش ـــــ مولوی غلام محمد خان دہلوی

یہ دراصل دلّی کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں نواب اکبر علی خان بہادر کے زمانے میں دربارِ پٹودی میں بزمرۂ شعرا ملازم ہوئے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا، تو لکھنؤ پہنچے اور وہاں آٹھ برس تک منشی نولکشور کے مشہور "اودھ اخبار" کے ایڈیٹر رہے۔ اپنے زمانے کے مشہور صحافی تھے۔ جب ۱۸۷۷ء میں "اودھ اخبار" سے الگ ہوئے تو لکھنؤ ہی سے اپنا ذاتی ہفتہ وار پرچہ "مشیرِ قیصرِ ہند" جاری کیا۔ یہ اخبار بہت دن چلا۔ اس کا پہلا پرچہ یکم ستمبر ۱۸۷۷ء کو شائع ہوا تھا۔ جب امیر مینائی کی امیر اللغات کی دو جلدیں شائع ہوئی ہیں، تو اس پرچے میں ایک مسلسل مضمون اس کی اغلاط سے متعلق نکلتا رہا تھا۔

۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲-۱۹۰۳ء) میں فوت ہوئے۔ عیش باغ لکھنؤ میں مدفن ہے۔
نظم و نثر، اردو، فارسی، عربی اور تاریخ گوئی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اخیر میں شعر گوئی تقریباً ترک کر دی تھی، صرف نثر لکھتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

سادگی میں بھی نکلتے ہیں ترے لاکھ بناؤ
بن گئے، حسنِ خداداد کا زیور گیسو

منفعل ہوتے ہیں بد، ملتے ہیں جب نیکوں سے
سرنگوں ہیں ترے رخسار کے اوپر گیسو

گرِ دمہ کے ہیں، دھواں دھار گھٹائیں اٹھیں
کاکل و ابرو و خط، زلفِ معنبر گیسو

مست ہو جائیں نہ کیوں، آ ہوئے تاتار و ختن
ہوں ہوادارِ صبا، جب ترے کھل کر گیسو

سچ تو یہ ہے کہ نہ حور اچھی نہ جنت اچھی
سامنے میرے اگر ہو تری صورت اچھی

کیا بیاں کیجیے، کس طرح کٹی ہجر کی رات
شبِ فرقت سے تو، ہے صبحِ قیامت اچھی

شکوۂ جور و ستم سن کے زباں سے میری
بولے وہ، عشق میں جتنی ہو مصیبت اچھی

زاہدو! ذکرِ خدا ہم کیا کریں — ہے بتوں کی یاد ہر دم، کیا کریں!
اپنے غم میں مر رہے ہیں آپ ہم — غیر کے مرنے کا ماتم کیا کریں!
میرے مرنے کی خبر سُن کر، تپش! — بولے وہ بیساختہ "ہم کیا کریں!"

ناصح! جو رازِ عشق کا کچھ جان جائیے — کیسی ملامت، آپ ہمیں مان جائیے
اُس حور وش نے آکے کہا لاش پر مری — مشکل ہوئی اب آپ کی آسان جائیے
عشقِ بتاں سے کیجیے توبہ، تپش ضرور — کعبہ شریف ہو کے مسلمان جائیے

ہمیں دل لگانے کی فرصت نہیں — حسینوں سے ملنے کی عادت نہیں
زمانے میں کیا حسن صورت نہیں — مگر سیرت و آدمیت نہیں
تجھے زاہدِ خشک! کیونکر ہو عشق — مقدّر میں تیرے یہ نعمت نہیں

محبت ہے ان کی عداوت کے بعد — عداوت ہے لطف و عنایت کے بعد
نہ اب تفرقہ ڈال، اے آسماں! — ملے ہیں بہت رنج و حسرت کے بعد
لگانا نہ دل، اے تپش! تم کہیں — نہیں خیر عشق و محبت کے بعد

اپنا مقصود ہے دیدارِ صنم اے واعظ — حور کیا چیز ہے اور خواہشِ جنت کیسی
اپنے مرنے کا نہیں غم، مگر اس کا ہے الم — چھپ گئی آنکھوں سے وہ چاند سی صورت کیسی
میری غمخوار ہے، دلسوز ہے، اک شمعِ مزار — رات بھر اشک فشاں ہے سرِ تربت کیسی

بہ قبضہ، مطلعِ پُرنور آفتابِ ظفر — بلمعۂ نظر افروز، مشرقِ تنویر
بود بہ معرکہ ازبس غذائے تیغش خوں — بکف چو نبض طپید، موجِ جوہرِ شمشیر
ہلال پیکر و خورشید لمعہ، سعد سرش — ستارہ جوہر و سیماب چشمہ، برق خمیر
بشرحِ گرم رَوِیہائے برق طبع سمند — عنانِ خامہ طپید ہمچو نبض در تحریر

[یادگارِ ضیغم: ۴۳۰؛ گلدستۂ سخن: ۱۸-۲۰؛ آبِ بقا: ۱۷۰؛
قصایدِ مدحیۂ نظام: ۳۷۸؛ اردو کے اخبار نویس: ۲۹۱-۲۹۷؛ پیامِ یار:
(دسمبر ۱۸۸۹): ۶]

تپش ـــــــ سید مدد علی اکبرآبادی

اصل ان کی ایران سے ہے۔ ان کے والد کا نام میر نجف علی جعفری سبزواری تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق سے ملتا ہے۔ تپش تقریباً ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۰ - ۱۸۲۱ء) میں آگرے میں پیدا ہوئے اور وہیں محلّہ زین خانہ میں سکونت رہی۔ معلمی پیشہ تھا۔ عربی، فارسی دونوں زبانوں میں معقول دستگاہ تھی۔ فارسی مولوی قمرالدّین خان سے اور عربی تا ملا حسن اور صحیح مسلم مفتی ریاض الدّین خان سے پڑھی۔ شروع میں میاں نظیر اکبرآبادی کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر سے چند غزلوں پر اصلاح لی۔ بعد کو مرزا غالب کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ شیعی مذہب کے پیرو تھے۔
متعدد تصانیف مثلاً خزینۃ القواعد، فاتح الاذہان، محاربات ہند (۱۲۲۸ھ تا ۱۲۸۶ھ)، جغرافیہ منظوم، رسالہ مظہر علم در حساب، ہدایت الانام بہ منقبت چہاردہ معصومین، ان سے یادگار ہیں۔ ایک رسالہ میں اردو محاوروں سے متعلق دادِ تحقیق دی تھی، اسے مولوی غلام جیلانی وکیل عدالت صدر دیوانی کی نذر کیا تھا۔ منشی شیونراین آرام (شاگردِ غالب) نے جو گلدستہ معیار الشعرا جاری کیا تھا، اس کی تہذیب و ترتیب کا کام بھی تپش سے متعلق رہا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف علوم سے دلچسپی تھی۔
خم خانۂ جاوید میں تپش کا حال طپش تخلص کے تحت بھی لکھا گیا ہے۔ صحیح تپش ہے (جیسا کہ مدد علی نے خود لکھا ہے) کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

یار نے سن کے مرے نالے، تجاہل سے کہا ــــ "کوئی تو روتا ہے، واللہ مقرر باہر"
بے اثر ہوتی نہیں، سنتے ہیں آہِ عاشقاں ــــ پھر یہ کیا ہے، آہ کا اپنی اثر ہوتا نہیں
نزی ہے عفو کی عادت، مری ہے عصیاں کی ــــ کیا ہے کس لیے پھر موردِ قصور مجھے

فراق و درد و الم، غم، ستم، فغان و تپش
یہ ساتوں گھیرے ہیں ہفتے سے بے قصور مجھے

کبھی ناداں بنے ہم، گاہ فخر الاذکیا ٹھہرے
کبھی رندِ شرابی اور کبھی ہم پارسا ٹھہرے

گدا تیرے کرم سے خسروِ حاجت روا ٹھہرے
"تری دیوار کے سایہ تلے آکر ہما ٹھہرے"

اسیرانِ محبت کوچۂ دلدار میں جاکر
کبھی رسوا ہوئے، گہ موردِ لطف و عطا ٹھہرے

نہ ہووے تا بامکاں عاشق و معشوق ہرجائی
گلِ خورشید کیا ممکن جو گردش سے ذرا ٹھہرے

جو کامل ہیں ملائم گفتگو کرتے ہیں ہر اک سے
روئی پھر کیوں نہ منھ پر شیشۂ مے کے بھلا ٹھہرے

مرے اعمال نامہ سے نہ ہو چیں بر جبیں زاہد
یقیں ہے یاں عنایاتِ جنابِ کبریا ٹھہرے

چرائی کچھ آب اوس کے رخِ تاباں کی خنجر نے
بتاؤ، کیوں نہ صاحب! زخمِ دل میرا ہرا ٹھہرے

بسانِ دانۂ تسبیح جس کو ہو سدا گردش
قضا کے ہاتھ پھر کیونکر نہ اوس کا فیصلہ ٹھہرے

کدورت اختلاطِ ظاہری میں آہی جاتی ہے
نہ کیوں پھر شاخِ پیوندی کا پھل خوش ذائقہ ٹھہرے

غم و درد و الم، رنج و مصیبت ساتھ ہیں میرے
خدا جانے یہ کس منزل پہ جاکر قافلہ ٹھہرے

جو جاؤں ان کے در تک، تو نہیں آنے وہ دیتے ہیں
کروں گر جبر دل پر، تو گماں اُن کو بُرا ٹھہرے

نہ باندھیں ہاتھ بے تقصیر جو پہلے سے یہ گلرو
تو ناحق خلق میں بدنام کیوں دُزدِ حنا ٹھہرے

رقیبِ روسیہ کا خوف، درباں کا رہا کھٹکا
کبھی ہم بھولے بھٹکے جو ترے کوچے میں آ ٹھہرے

بلاؤ یا نکالو، بٹھنے دو یا کھڑا رکھو
میں راضی ہوں اوسی میں، آپ کی جس میں رضا ٹھہرے

رہوں چپکا تو کہتے ہیں: زباں کیا کٹ گئی تیری
کبھی کچھ بولتا ہوں تو وہ شکوہ اور گلا ٹھہرے

اکڑ کر قدِ دلبر سے نہ پھل کچھ سرو نے پایا
مقابل مہرِ تاباں کے سُہا ہووے، تو کیا ٹھہرے

زمیں سے تا فلک سب رہ گئے اپنا سا منھ لیکر
ضعیف الخلق تھے، پر ہم ہی مقبولِ خدا ٹھہرے

احد میں میم داخل، اور احمد میں احد شامل
جلیں جس جا پر جبریل، واں کب دم مرا ٹھہرے

کہاں فرقت ہیں دل رکھنے کو، گردن کے قریب آکر
نہ ہم تم سے الگ ٹھہرے نہ تم ہم سے جدا ٹھہرے

زہے قسمت، تپش اوس کی محمد جس کا حامی ہو
نصیبہ ور وہ ہے جس کا علی مشکلکشا ٹھہرے

صفا اگر طلبی، زاہدا بمشربِ ماست
بجز ریا، دگر از فرشِ بوریا مطلب

حشمت افزا، مملکت بخش و خود آرائے دگر
نیست در اقلیمِ خوبی چوں تو دارائے دگر

بر دلم افتادہ از جعدش بلا ہائے دگر
"در سرم از نکہتِ زلف است سودائے دگر" (طرح)

از ہوائے عارضِ تو روضۂ رضواں شگفت
مشک بیز از کاکلت گردید صحرائے دگر

آں چناں بگریستم آخر بیادِ رُوئے دوست
جوش زد از سینۂ من موجِ دریائے دگر

از جبین و چشم و عارض و ز قدم تا فرقِ او
من بطرزِ نو رقم سازم سراپائے دگر

دیدہ ام کز راستیِ قدِ محشر زائے اُو
در زمین و آسماں افتادہ غوغائے دگر

عاشقِ شوریدہ و رسوائے خاص و عام را
از متاعِ دردِ خوبان ست سودائے دگر

گرچہ بگرفت از دہانم نعمتہائے خوانِ غیب
از رباطِ فضل خود بخشید آلائے دگر

گل شدہ از مردنِ غالب، چراغِ شاعری
اے تپش! در خلق مثلش کیست یکتائے دگر

[شعر و سخن، ۳۴-۳۵؛ گلستانِ بیخزاں: ۵۷؛ خم خانۂ جاوید؛ ۲ : ۳۵-۳۶؛ نیز ۵ : ۳۴۷؛ اسعد الاخبار، آگرہ: ۲۴ اپریل ۱۸۴۹ء (ص ۴)؛ ایضاً: ۲۴ جون ۱۸۴۹ء (ص ۱۴)]

تحسین ـــــ حافظ قاضی عبدالرحمٰن پانی پتی

یہ اولاد میں تھے حضرت محمد جلال الدین کبیر الاولیا کی ۔ گویا ان کا اور غالب کے ایک دوسرے شاگرد باقر بہاری کا خاندان ایک ہے ۔
ان کے والد مولوی عبدالہادی تھے ۔ پانی پت کے مشہور عالم قاضی محمد ثناء اللہ بھی اسی خاندان کے فرد ہیں، وہ ۱۱۴۳ھ میں پیدا ہوئے، سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا ۔ اس کے بعد مختلف اشغال میں لگے رہے ۔ آخر میں دہلی پہنچے اور حدیث کی تکمیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے کی ۔ نقشبندی سلسلے میں خواجہ محمد عابد سنامی سے اور ان کی وفات کے بعد حضرت مرزا جان جاناں مظہر سے بیعت ہوئے ۔ مظہر نے انھیں "علم الہدیٰ" کا لقب عطا فرمایا تھا ۔ اس کے بعد واپس پانی پت آ گئے اور ساری عمر افتاء وارشاد اور درس وتدریس میں گزری ۔ ان سے تیس سے زیادہ کتب یادگار ہیں ۔ ان میں سے درسی کتاب مالا بد منہ اور حنفی نقطۂ نگاہ سے تفسیر مظہری (عربی) خاص طور پر مشہور ہیں ۔ ندوۃ المصنفین نے اس تفسیر کا اردو ترجمہ بھی چھاپ دیا ہے ۔ غرۂ رجب ۱۲۲۵ھ (۲ اگست ۱۸۱۰ء) کو فوت ہوئے ۔ مولوی محب اللہ پانی پتی نے آیت قرآن "فہم مکرمون فی جنّٰت النعیم" سے تاریخ نکالی ۔
تحسین نے ضروری علوم دلّی میں حاصل کیے تھے ۔ حافظِ قرآن تھے ۔ تمام عمر یادِ خدا اور زہد و تقویٰ و قناعت میں بسر کر دی ۔ ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں بعارضۂ ذات الصدر انتقال فرمایا ۔ حالی سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے؛ حالی کے دو فارسی خط ان کے نام شائع ہو چکے ہیں ۔ دیوان شائع نہیں ہوا، اگرچہ اس کی موجودگی کا علم ہے ۔ فارسی کی طرف زیادہ توجہ تھی ۔ نمونہ کلام یہ ہے:

تو زخمِ خنجرِ قاتل نخوردی — چہ دانی لذتِ بسمل شدن را
بسودا قوتِ دستم گر این ست — توانم چاک زد جیبِ کفن را
دروغے کرد از صدقِ محبت — بمردن زندہ نامِ کوہکن را

گر خوش و نغز ند حوُراں، باتو ارزانی ہمہ — با من مجنوں رہا کن، واعظ! آں مہ پارہ را
شورِ قلقل بود تحسیں! شب درونِ خانہ آ — داشتی پہاں کہ ایں شاہدِ مے خوارہ را

آنانکہ حق جلوۂ جانانہ شناسند — در سنگِ حرم، آتش بت خانہ شناسند
زاہد! نشوی منکرِ رنداں کہ بمستی — رازِ دو جہاں، از خطِ پیمانہ شناسند
دانند کہ آوارگیم از پَے کاریست — فریاد کہ مجنونم و فرزانہ شناسند

مطلب ز مے پرستاں قدحِ شراب، کانیاں — نہ شنید جز بہ رندے کہ ز اہلِ راز باشد
چکنم چو زلفِ خوباں، ز حرم کشد بہ دیرم — حذر از خمِ کمندے، کہ چناں دراز باشد
ز رقیب تا بہ تحسیں، چہ تفاوت است دانی — اگرت میانِ عشق و ہوس امتیاز باشد

آنم کہ حریفم نگہِ عشوہ گراں را — تیز است گر ایں دشنہ مرا ہم جگرے ہست

خشک شد دامنِ تر، بادۂ نابے ساقی — داغم از زہدِ ریائی، دمِ آبے ساقی
زلفِ ترسا بچگانم سوے میخانہ کشید — ورنہ من بودم و کنجے و کتابے، ساقی!
بود با چشمِ تو بحثے بہ تغافل مارا — غمزہ طے کرد ز شوخی بجوابے ساقی!

[صبحِ گلشن: ۸۲ - ۸۳؛ تذکرۂ علماے ہند: ۳۸؛ حیاتِ نو، ۱۹۳۴ - ۱۹۳۵ء؛
صحیفہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء (غالب نمبر حصہ چہارم): ۱۰۷ - ۱۱۰]

تفتہ ـــــ منشی ہرگوپال سکندرآبادی

دلّی سے ۴۰ - ۴۵ میل شمال کی طرف ایک اچھا خاصا قصبہ سکندرآباد (ضلع بلند شہر) ہے، جسے سکندر لودھی (۱۴۸۹ - ۱۵۱۷ء) نے بسایا تھا۔ اسی کے زمانے میں ایک بھٹناگر کائستھ خواجہ دیپ چند (خلف امر دیو) فیروزآباد (مضافات آگرہ) سے نقلِ مکان کرکے یہاں بس گئے۔ چنانچہ ان کے خاندان والوں کی اَل آج تک "فیروزآبادی" ہے۔ اس خاندان کو ۵۴۰ بیگہ پختہ معافی اور عہدۂ قانونگوئی موروثی ملا تھا۔
خواجہ دیپ چند کی اولاد میں ایک صاحب موتی لال ہوئے ہیں۔ ان کے آٹھ بیٹے تھے جن کی اولاد اٹھ گھرے کہلاتی ہے۔ منشی ہرگوپال انہی موتی لال کے بیٹے تھے۔ ۱۷۹۹ء، ۱۸۰۰ء (۱۲۱۴ھ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی کا شوق شروع سے تھا۔ انگریزی محکمۂ بندوبست میں مدتوں قانونگو رہے۔ لیکن شاعری کے شوق میں نوکری کو خیرباد کہہ دیا۔ ۱۸۵۰ء میں تھوڑے عرصے کے لیے ریاستِ جے پور میں بھی ملازمت کا تعلّق ہوگیا تھا۔ لیکن یہ کھکھیڑ بھی زیادہ دن تک نہ سہہ سکے اور جلد ہی مستعفی ہوگئے۔ کبرسنی میں ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء (۱۵ رمضان ۱۲۹۶ھ) کو سکندرآباد ہی میں بعارضۂ تپِ وبائی وفات[۵] پائی۔ بدری کرشن فروغ نے تاریخ کہی:

---

۵ اگرچہ غالب کے ایک دوسرے شاگرد محمد علی خاں انجم نے تفتہ کے قطعۂ تاریخِ وفات میں کہا ہے: ع ہاں، مگر مُرد تفتہ در دہلی! لیکن یہ ٹھیک نہیں، وفات سکندرآباد میں ہوئی، جیسا کہ تواریخ بلند شہر میں ہے۔ انجم کو وفات کی خبر کسی نے دلّی سے دی ہوگی اور انھوں نے خیال کرلیا کہ وفات بھی دلّی ہی میں ہوئی۔



منشی ہرگوپال تفتہ سکندر آبادی

ستمبر ستھا بعالم گذاشت — کہ از دہر سوئے جناں تفتہ رفت
دوم روز در دہر ماتم دو چند — ز جورِ فلک الاماں تفتہ رفت
کنوں کو بحالِ جہاں مہرباں — ز اہلِ جہاں مہرباں تفتہ رفت
بخوں گشتہ پُر چشمِ افلاکیاں — جہاں راست ور ورِ زباں "تفتہ رفت"
سنِ عیسوی گفتمِ آخر، فروغ — "چہ سوئے جناں، زیں جہاں تفتہ رفت"

(۱۸۷۹ء)

مولوی ممتاز احمد تھانوی نے ہجری میں کہی:

سالِ نقلش با دلِ زار از خرد
من شنیدم "بے سر و پا شد سخن"

(۱+ ۱۲۹۵ = ۱۲۹۶ھ)

اولاد میں دو لڑکے (امراؤ سنگھ اور پیتمبر سنگھ) اور ایک لڑکی تھی۔ چھوٹا لڑکا پیتمبر سنگھ ۱۸۵۵ء (۱۲۷۱ھ) میں فوت ہو گیا۔ اس کی وفات نے ان کی کمر توڑ دی۔ اسی موقع پر انھوں نے (۲۲۲) شعر کا وہ طویل مرثیہ لکھا تھا، جو ان کے دیوانِ دوم میں موجود ہے۔ گلستان کی تضمین بھی اسی کی یادگار کے طور پر لکھی تھی جیسا کہ اس کے آغاز میں صراحت کی ہے۔ صاحبزادی کا بھی اس کے بعد جلد ہی انتقال ہو گیا۔[۵] امراؤ سنگھ ان کے بعد زندہ رہے۔

---

۵ بے محل نہیں ہوگا، اگر یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے عام طور پر مشہور ہے کہ مرحوم ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر، جو ہندستان کے مایۂ ناز سائنسدان تھے، اور جن کا یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو انتقال ہوا، تفتہ کے نواسے تھے۔ یہ غلط محض ہے۔ واقعہ یہ ہے: سکندر آباد کے کائستھوں ہی میں ایک صاحب دل سکھ رائے تھے۔ جو اگرچہ یقیناً اسی خواجہ دیپ چند کی نسل سے ہونگے جو تفتہ کے بھی مورثِ اعلیٰ تھے، لیکن جن کا بہر حال تفتہ سے کوئی قریبی تعلق نہیں تھا۔ ان دل سکھ رائے کے تین لڑکے تھے: منّا لال اور مَنّا لال اور پیارے لال۔ آخر الذکر (پیارے لال) کی اولادیں دو صاحبزادے (دیوی دیال اور جوالا دیال) اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحبزادی (پاربتی دیوی) موگا (ضلع فیروز پور۔ پنجاب) کے لالہ پرمیشوری سہائے ایم اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول بھیرہ (پنجاب) سے بیاہی گئیں (پرمیشوری سہائے کے والد لالہ منوہر لال تحصیلدار روہتک تھے) ان کے تین بچے ہوئے، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ لڑکوں کے نام تھے شانتی سروپ اور رجنیتی سروپ۔ یہی شانتی سروپ ہمارے سر شانتی سروپ بھٹناگر ہیں۔ دوسرے بھائی آج کل بلند شہر میں مقیم ہیں (یہ حالات مجھے سر شانتی سروپ بھٹناگر کی خالہ انار دیوی کی بیٹی پریم کماری سے معلوم ہوئے) (دیکھیے اگلا صفحہ)

انھوں نے سنبلستان کے آخر میں اسی صاحبزادے کی شکایت لکھی ہے۔ اُن کی اولاد اس وقت سنگرور (ریاست جلیند) میں موجود ہے

تفتہ ابتدا میں رامی تخلص کرتے تھے۔ حسین قلی خان نے اپنے تذکرے (نشترِ عشق) میں لکھا ہے کہ نور العین واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے ان کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا کیا۔ چونکہ ذکاوت اور استعداد سے بہرہ وافر ملا تھا، اس لیے تھوڑی سی توجہ اور مشق سے بہت جلد ترقی کر گئے۔ نشترِ عشق میں جو انتخاب دیا ہے، اس میں تخلص رامی ہی ہے، مثلاً

رامی تو کز غمت بیمار بود　　عاقبت امروز، از دنیا گذشت

ز رامی تو چو ما سرگزشت پرسیدیم　　کشید آہ وگریباں درید وہیچ نگفت

اوائلِ مشق میں مرزا محمد حسن قتیل کی شاگردی اختیار کی۔ لیکن یہ ان کی وفات (۱۲۳۳ھ) کے وقت صرف ۱۹ برس کے ہونگے: اس کے بہت دن بعد جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو انھوں نے تخلص بدل کر تفتہ اور مرزا کا خطاب دے کر مرزا تفتہ بنا دیا۔ تفتہ اُستاد کے محبوب شاگردوں میں سے تھے، اور انھوں نے ان کی تہذیب و تحسین میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ تفتہ نے تمام عمر فارسی میں بسر کر دی۔ اُردو میں اُن کے صرف ایک قطعہ کا پتہ چلتا ہے جو انھوں نے استاد کے انتقال پر لکھا تھا:

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزار ہیچمداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پا و سر ہوئے

فارسی میں بہت بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا۔ چار دیوان ہیں۔ دیوان اول اسعد الاخبار آگرہ میں چھپا تھا۔ اس کے صرف ۳۰۰ نسخے چھپے تھے اور منشی محمد ظہور علی خان صاحب بہادر

تعجب ہے کہ سر شانتی سروپ نے اپنی زندگی میں اس کی تردید نہ کی۔ بلکہ جب مولوی عبدالحق اور خواجہ حسن نظامی نے ان کے دیوان لاجونتی کا مقدمہ لکھا اور اس میں اُن کے تفتہ کا نواسہ ہونے کا ذکر کیا، تو اُسے جوں کا توں رہنے دیا۔

نائب اور مختارِ کل سرکار ٹونک نے ازراہِ قدردانی اس کے مصارفِ طبع میں اعانت فرمائی تھی۔ اس کا چھاپا ۱۸۴۸ء میں شروع ہوا اور یہ ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا اور اس کی قیمت چار روپیہ فی نسخہ تھی۔ ان کے علاوہ رائے جگل کشور صاحب وکیلِ محکمۂ عالیہ صدر دیوانی نے بھی بنظرِ اعانت مطبع اس کی بیس جلدیں خریدی تھیں (اسعد الاخبار، دسمبر ۱۸۴۸ء) اس دیوان میں ہر زمین میں دو غزلہ ہے، اور اس کے شروع میں غالب کا لکھا ہوا دیباچہ ہے (جو پنج آہنگ اور کلیاتِ نثر غالب میں بھی شامل ہے)

دیوان دوم مطبع کوہ نور، لاہور، ۱۸۵۷ء میں چھپا تھا۔[۵]

دیوان سوم کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس کا نسخہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ البتہ تذکرہ صبح گلشن اور تذکرہ روز روشن کا بیان ہے کہ یہ دیوان تمام تر خلاقِ معانی کمال اسماعیل اصفہانی کی زمینوں میں ہے اور تفتہ نے ہر جگہ خوب دادِ سخن دی ہے۔

دیوان چہارم کا چھاپا مارچ ۱۸۶۹ء (یعنی غالب کی وفات کے ڈیڑھ دو مہینے بعد) مکمل ہوا۔ یہ منشی شیونرائن آرام (شاگردِ غالب) کے مطبع مفید خلائق، آگرہ میں طبع ہوا تھا۔

تفتہ نے سعدی کی بوستان کے تتبع میں بھی ایک مثنوی لکھی، جس کا نام انھوں نے غالب کے کہنے پر "سنبلستان" رکھا تھا۔ یہ مثنوی ۱۲۷۷ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ اس میں حمدِ الٰہی کے بعد اپنے موحد ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

منم آں کہ ناید زمن جز گناہ   گناہ از من و جملہ عفو از الٰہ
شود عاقبت رحمتش حامیم   کہ اسلامیم من، نہ اصنامیم
خود آں واحد اگو کہ در ہر لباس   مرا جملہ خوانند واحد شناس

آگے نعت کے یہ اشعار ملتے ہیں:

محمد فرستاد و رحمت نمود   محمد طریقِ شریعت نمود

۵۔ حکیم خلیل الرحمٰن خلیل (پیلی بھیت) کے پاس تفتہ کے دیوان دوم کا وہ نسخہ تھا، جو خود تفتہ کے پاس رہا تھا۔ خلیل صاحب کا بیان تھا کہ اس کے حاشیہ پر کچھ ایسا کلام بھی ہے جو طبع نہیں ہوا، اور تفتہ نے خود درج کیا تھا۔ (زمانہ، کانپور۔ جولائی ۱۹۳۴ء)

محمد فرستادۂ آں کہ بست — دل اندر محمدؐ ز روزِ الست
امامِ رُسل، اشرفِ انبیا — مقدّم نشینِ صفِ انبیا
ہمہ خلق و شفقت، ہمہ عدل و داد — تو گوئی کہ از غایتِ اتحاد
خدا جملہ صرفِ محمد نمود — خدائی و غیر از خدائی کہ بود
باں دلکشی نقشِ اُو برکشید — کہ از نقشِ دیگر قلم درکشید
کند امّتِ خویش را محترم — بود روزِ محشر شفیع الامم
مرا روزِ محشر سیہ باد رُو — اگر در شفاعت کنم جز باُو
عقیدت کہ با اُو مرا بودہ است — کرا بودہ است و کجا بودہ است
زمانیکہ نامش بگیرد کسے — لبش گیرم از ذوق و بوسم بسے
چنانست شیریں کہ بنود مرا — ز نامِ محمد لب از ہم جدا
ازیں پس من و بارگاہِ رفیع — بوجہے کہ دارم محمدؐ شفیع
بہ عشقش ہمہ عمرم آید بسر — بود محو او سر بسر دل دگر
دمِ مرگ گردد ز خم سوے اُو — کہ فرض است کردن سوے قبلہ رُو
پس از نعتِ اُو از منِ کامجُو — درود از سرِ صدق بر آلِ اُو

درودِ خدا بر دہ و دو امام
بحقِ محمد علیہ السلام

اس کے بعد سببِ تالیف میں لکھتے ہیں کہ سخت تشویش اور پریشان حالی میں علی گڑھ گیا۔ وہاں مولوی محمد ظہور علی صدر الصدور کول نے اپنے صاحبزادے وارث علی کو میرے بلانے کو بھیجا۔ میں حاضر ہوا۔ بہت محبّت اور تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔ رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے اس درجہ مانوس ہو گئے کہ بالآخر انھوں نے تفتہ سے علی گڑھ میں مستقل قیام کی فرمایش کر دی۔ تفتہ کو سرِ تسلیم خم کرتے ہی بنی۔ مولوی محمد ظہور علی نے ان کے لیے رہنے کو مکان اور کھانے پینے کا مناسب انتظام کر دیا، اور یوں تفتہ بے غل و غش اطمینان سے علی گڑھ میں رہنے لگے۔

اس سے پہلے مولوی ظہور علی کا جوانسال بیٹا محمد سلیمان انھیں داغِ مفارقت دے چکا تھا اور وہ اس کی دائمی جدائی سے بہت دل گرفتہ اور مغموم رہتے تھے۔ انھوں نے

تفتہ سے فرمائش کی کہ وہ ایک مثنوی قلمبند کریں، جس میں محمد سلیمان کا ذکر ہو، تاکہ اس کی یادگار قائم رہے، اور وہ خود اس کے پڑھنے سے اس کی یاد تازہ رکھ سکیں۔ چنانچہ جس طرح انھوں نے اپنے بیٹے ہیتمبر سنگھ کی وفات پر گلستان کی تضمین لکھی تھی، محمد سلیمان کے لیے بوستان کے جواب میں سنبلستان قلمبند کی۔ یہ ۲۶۰ صفحات پر مشتمل کتاب پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی۔

انھوں نے سعدی کی کریما کی تضمین بھی کی تھی۔ یہ بھی چھپ چکی ہے۔

اس خروار سے بطور نمونہ چند شعر درج کرتا ہوں:

رہا نداز چنیں بے دانشی ہا، یت خدا اے دل — بدانش فتی و دیگر طمع داری رہائی را
چند گوئی کہ نشان نیست ز خونیں کفناں — مگر ایں لالہ کہ بینی، ز شہیدانِ تو نیست

دردے کہ جانِ ما بلب آرد، دوائے ماست — مرگے، کہ رُو بما بنماید، شفائے ماست

تیغ افتاد از کفِ قاتل — زندگانی وبالِ گردن کیست
می دَوَد چار سُو، نمی دانم — برقِ گرمِ تلاشِ خرمن کیست

ایں اگر گویم، کرا آید یقیں — قصدِ جانم، یارِ جانی می کند
دل کہ با مرگ آشنائی داشتہ ست — زندگانی، جاودانی می کند

سالکانِ تفتہ جاں، تنہا نہ منزل سوختند — راہ را در آتش افگندند و منزل سوختند
عاشقاں گرمِ تماشا، چوں شدند از فرطِ شوق — بر رُخِ معشوق دیدند آنچہ حایل، سوختند
بگذر از دیوانگانِ خود، کہ ایں آتش دماں — طوق را کردند خاکستر، سلاسل سوختند
حالِ باغ از من مپرس، اے محفلِ عیشِ تو گرم — لالہ ہائے تو، برنگِ شمعِ محفل سوختند
مشربم گیرد، بزہد و اتقا آتش فگن — تفتہ! با حق ساختند آناں کہ باطل سوختند

اے تماشا گاہِ ایں دل روئے تو — عالمے در دل تماشا کردہ ایم
ما نہ تنہا دیدہ پُر نم کردہ ایم — آنچہ نتواں کرد، آں ہم کردہ ایم
دارد از خود رفتگی ہا عالمے — رفتہ ایم و سیرِ عالم کردہ ایم

[تواریخ بلند شہر: ۱۳۱؛ صبحِ گلشن: ۸۶-۸۷؛ روزِ روشن: ۲۳۶-۲۳۷؛ خم خانۂ جاوید، ۲: ۱۱۵-۱۱۶؛ گلشنِ ہمیشہ بہار: ۹۹؛ اسعد الاخبار: دسمبر ۱۸۴۸ء؛ بزمِ فروغ: ۴۵؛ مضمون ہرگوپال تفتہ از پروفیسر مختار الدین احمد (غیر مطبوعہ)]

تمنّا ـــــ مولوی احمد حسین مرزا پوری

اس سلسلے میں دیکھیے مینا (مولانا احمد حسین مرزا پوری)
[مشاطۂ سخن (۷)، ص ۱۳۹-]

تمنّا ـــــ مولوی محمد حسین مراد آبادی

مراد آباد کے شرفا میں سے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شوق کرتے تھے۔ اُردو میں شیخ مہدی علی زکیؔ سے اصلاح لی اور فارسی میں غالب سے۔ تلاشِ معاش میں سرگرداں

ـــــــــ

؎ زکیؔ شیخ مہدی علی مراد آبادی، شیخ کرامت علی کے صاحبزادے تھے۔ مدّتوں جنّت آرامگاہ نواب محمد سعید خاں بہادر والیِ رام پور کی ملازمت میں رہے، بعد کو لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں واجد علی شاہ کی سرکار سے خطاب "ملک الشعرا" عطا ہوا تھا۔ لیکن پھر واجد علی شاہ ان سے ناراض ہو گئے اور خطاب واپس لے لیا۔ جب انگریزوں نے سلطنتِ اودھ پر قبضہ کر لیا اور واجد علی شاہ کلکتہ چلے گئے تو یہ عہدِ فردوس مکان میں دوبارہ رام پور آ گئے۔ زکیؔ آخری دَور کے مشہور شعرا میں سے تھے۔ تاریخ میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ علومِ دینی میں بھی معقول دستگاہ تھی اور یہ انھوں نے علمائے فرنگی محل سے حاصل کیے تھے۔ انبالے گئے ہوئے تھے کہ مارچ ۱۸۶۷ء (ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ) میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ وفات کے وقت عمر ۷۲ برس کی تھی۔ دیوان مطبوعہ موجود ہے۔ دیوان کا ایک قلمی نسخہ دلّی یونیورسٹی کے کتب خانے میں ایسا ہے،
(دیکھیے اگلا صفحہ)

حیدر آباد دکن بھی گئے لیکن وہاں کامیابی نہ ہوئی اور بے نیلِ مرام واپس مراد آباد چلے آئے۔ نواب محمد صدّیق حسن خان (بھوپال) کے احباب میں سے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں دیوانِ اردو شائع کیا تھا۔ دیوان فارسی غالباً نہیں چھپا۔

تمنّا پر تصوف کا غلبہ تھا۔ ایک پورا فارسی میں مجموعۂ نعت "قصائدِ تمنّا" چھپا ہوا موجود ہے۔ اسی کے آخر میں تین قصیدے ان کے مرشد شاہ عبد الغنی مجدّدی (بن شاہ ابوسعید) کی مدح میں ہیں۔

شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی کی کتاب "تقویتِ ایمان" پر جو ہنگامہ بپا ہوا تھا اور جو امکانِ نظیر وامتناعِ نظیر کے مناقشے کی بنا ثابت ہوا، تمنّا نے بھی اس میں حصّہ لیا تھا؛ یہ مولوی فضلِ حق خیر آبادی کے مؤید اور شاہ اسمٰعیل شہید کے مخالف تھے۔

نوے برس کی عمر تھی، جب ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹-۱۹۰۰ء) میں انتقال ہوا۔ امیر مینائی نے تاریخ کہی:

شوقِ دیدارِ الٰہی میں بڑھتی رہی روح
آخر اس دھن میں سوئے خلدِ بریں جا نکلی
سالِ رحلت جو کہا ہاتفِ غیبی نے، امیر!
"جان کیا نکلی تمنّا کی، تمنّا نکلی"

(۱۳۱۷)

ذرہ ذرہ ز جنوں، بر سرِ کار است ایں جا | صد پری شیشہ بہ مُشتِ غبار است ایں جا
چو برقِ شوخیش، دیوانگاں را مجلس افروزد | پری رقصاں، بگردِ شمع چوں پروانہ برخیزد
چہ گوئی حالتِ زاہد کہ مدہوشانہ می آید | پری ہم از سرِ کوے کسے دیوانہ می آید

جس میں مطبوعہ دیوان سے کچھ زائد کلام بھی ہے۔ ایک رسالہ عروض میں بھی مسمّیٰ بہ یادگیر یادگار چھوڑا۔ کتابخانۂ رامپور میں ان کی نوشتہ پانچ داستانیں بھی ہیں (طلسم جام جم، طلسمِ حیرتکدۂ آصفی، طلسم حکیم قسطاس، سبع سیارہ؛ بالاباختر) یہ آج تک شائع نہیں ہوئیں۔ خان بہادر ظفر حسین خان (لکھنؤ) انھیں کے پوتے تھے، جنھیں ایک کتاب "مآل و مشیئت" لکھنے پر ساہتیہ اکاڈیمی کا انعام (پانچ ہزار روپیہ) ملا تھا (خم خانۂ جاوید، ۳: ۲۵۶-۲۵۷؛ رسالہ آجکل نومبر ۱۹۵۲؛ انتخاب یادگار: ۱۴۰؛ صبح گلشن: ۱۹۰)

سویدا ے دلِ عاشق، مگر باشد سپند اینجا — کہ دودِ خوں چکانِ، از محفلِ جانانہ می آید

موجۂ غم ہر نفس طوفانِ فریادم کند
ماتمے دارم کہ مرگِ ناگہاں شادم کند

درجہاں بنود بدست ہیچ کس معموریم
خانۂ عشقم خرابیِ غم آبادم کند

تعلّق از منِ دیوانۂ خود یک قلم مگسل
وفا گر نیستت جاناں! بیا و بے وفائی کن

اُردو کلام فارسی سے پست تر ہے ۔ نمونہ یہ ہے ۔

جوشِ الفت نے بڑے دھوکے میں رکھا عمر بھر
ہم یگانہ جانتے تھے جس کو، وہ بیگانہ تھا

یہ مرض تھا عینِ صحت، جو طبیب یار ہوتا
مجھے غم ہی خوش تر می تھا، جو وہ غمگسار رہتا

ہوئے ہیں آپ جو بے گانہ آشنا ہو کر
بتائیے کہ بنے درد کیوں، دوا ہو کر؟

گو سو طرح کے رنج و بلا میں پھنسا رہے
دل کا یہی مزا ہے، کہیں مبتلا رہے

[شمع انجمن ۱۰۰ - ۱۰۱؛ خمخانۂ جاوید، ۲: ۱۳۳ - ۱۳۴؛ غالب اور عصرِ غالب: ۱۴۰ - ۱۴۶]

توفیق ـــــ شاہزادہ بشیرالدّین میسوری ثم کلکتوی

سلطان شہید ٹیپو سلطان (ف: ۱۷۹۹ء) والیِ میسور کے بارہ بیٹے تھے۔ ان میں سے ساتویں شاہزادہ شکر اللہ سلطان (ف: ۱۸۳۷ء) تھے۔ یہی بشیرالدین کے والدِ ماجد تھے۔

ٹیپو سلطان کے خاندان سے متعلق اختلاف ہے۔ کوئی انھیں پنجابی الاصل کہتا ہے، کوئی افغان بتاتا ہے۔ "نشانِ حیدری" کے مصنّف کا بیان ہے کہ ان کے آبا و اجداد قریشی نسل کے عرب تھے۔ اس کے بیان کے مطابق اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام، جو سب سے پہلے ہندستان وارد ہوئے، ولی محمد تھا۔ وہ ایران اور پنجاب سے ہوتے ہوئے دلّی پہنچے۔ ممکن ہے کہ وہ راستے میں بہت دن پنجاب میں ٹھیرے ہوں، جس سے بعد کے لوگوں نے خیال کیا کہ وہ پنجابی ہیں۔ چندے دلّی میں قیام کرکے وہ گلبرگہ (دکن) پہنچے۔ یہاں ولی محمد کے صاحبزادے محمد علی کی شادی حضرت شاہ بندہ نواز کی درگاہ کے متولّی کی صاحبزادی سے ہوگئی۔ تھوڑی مدّت بعد جب ولی محمد کا انتقال ہوگیا، تو ولی محمد نے گلبرگہ سے نقلِ مکان کیا اور اپنی بیوی اور تین بیٹوں سمیت پہلے بیجاپور اور پھر کولار میں سکونت اختیار کرلی۔ پہلی بیوی کے بعد انھوں نے کولار ہی میں دوسری شادی کی۔ اس سے ان کا چوتھا لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام انھوں نے فتح محمد رکھا۔ یہی فتح محمد، حیدر علی کے والد اور ٹیپو سلطان کے دادا تھے۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عروج و زوال کی داستان بھی تاریخ ہندستان کا حصّہ ہے اور وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔ مئی ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے نظام حیدرآباد کی مدد سے ٹیپو سلطان کو شکست دی۔ خود سلطان میدانِ جنگ میں آخری دم تک لڑتے

ہوئے شہید ہوئے اور ان کی سلطنت انگریزوں اور نظام اور میسور کے قدیم شاہی خاندان میں تقسیم کر دی گئی۔ سلطان شہید کے بارہ صاحبزادوں اور ایک صاحبزادی کے لیے دو لاکھ چوبیس ہزار پگوڈا (تقریباً سات لاکھ روپیہ) سالانہ پنشن مقرر ہوئی اور ان سب کو ویلور کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۸۰۷ء میں بعض لوگوں نے خروج کیا اور ان شاہزادوں کو آزاد کر کے دوبارہ تخت نشین کرنا چاہا اور اس منصوبے کی تکمیل کے لیے شکر اللہ سلطان کو اپنا سردار اور رسالار مقرر کیا۔ انگریزوں نے طاقت سے یہ مخالفت کی آگ تو دبا دی لیکن انہی کے ساتھ انھیں اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ اس خاندان کا میسور کے اتنا نزدیک رہنا مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لیے سارے قافلے کو کلکتے بھیج دیا۔ یہاں یہ لوگ ٹالی گنج میں مقیم ہوئے۔ ان کی اولادِ امجاد اب بھی یہیں رہتی ہے۔

شاہزادہ بشیر الدین توفیقؔ کی عمر کا بیشتر زمانہ کلکتے ہی میں گزرا۔ انھیں بھی اپنے والدِ بزرگوار کی طرح علم و فضل سے بہرۂ وافر ملا تھا اور اس سے بھی انھوں نے اپنے خاندان کی شاندار روایات قایم رکھیں۔ ان کے دیکھنے والے ان کے اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ برگزیدہ کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ اردو، فارسی نظم و نثر میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ دیوان ہژبر کی تقریظ و تاریخ اس پر گواہ ہیں [۲]۔ ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴-۱۸۸۵ء) میں وفات پائی۔ نساخ نے تاریخ کہی:

رفت شہزادہ بشیر الدین توفیق از جہاں
سوئے خلد و داغِ ہجر خویش در دلہا سپرد
زد رقم سالِ رحیلش، کلکِ نساخِ حزیں
"وائے! حیف و آہ! شہزادہ بشیر الدین بمرد"
(۱۳۰۲)

---

۲ ہژبر تخلص تھا، جرنیل فریدون قدر میرزا محمد ہژبر علی بہادر فرزند سلطان واجد علی شاہ کا۔ ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے (جوان اختر تاریخ ولادت ہے)۔ تادمِ مرگ مٹیا محل کلکتہ میں مقیم رہے۔ سلطان عالم ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ (بزمِ سخن: ۱۲۰ - ۱۲۱)

دوسری تاریخ ہے "رونقِ فردوس توفیق" (۱۳۰۲ھ)۔
غالب کے خطوط (اردو اور فارسی) مطبوعہ ان کے نام موجود ہیں۔
توفیق کے علاتی بھائی شاہزادہ اعظم الدین بھی شاعر تھے، سلطان تخلص تھا۔
فارسی کے چند شعر ملے:

دلے آزادۂ داری، ازیں خوشتر چہ می خواہی
درونے سادۂ داری، ازیں خوشتر چہ می خواہی

تو، اے عاشق! از اشکِ سرخ در پیمانۂ چشمت
مصفّا بادۂ داری، ازیں خوشتر چہ می خواہی

چراروشن نگہ دانی شبِ تاریکِ عاشق را
جبینے ہمچو پرویں، عارضے ہمچو قمر داری

شدی توفیق گر بے چیز، باگردونِ دُوں مستیز
زفیضِ طبعِ گوہر ریز، گنجے از گہر داری

ندیدہ است کس از شاخِ خشک میوۂ تر
بجز قلم کہ دہد میوۂ ترو شیریں

[نگارستانِ سخن: ۱۸ - ۱۹ ۴۰؛ خم خانۂ جاوید، ۲: ۱۵۲ - ۱۵۳]

ثاقب ــــ میرزا شہاب الدین احمد خان دہلوی

نواب ضیاالدین احمد خان نیرّ رخشاں کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت شروع سے اپنے والدِ عالی مقدار کی نگرانی میں پائی، جس سے بہت جلد اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث اقران و اماثل میں ممتاز ہو گئے۔ انگریزی بھی جانتے تھے۔ ان کی بیدار مغزی اور قابلیت کا اعتراف حکومتِ انگریزی نے بھی کیا اور عین نوجوانی میں انھیں دلّی میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا۔

افسوس کہ بہت کم عمری میں انتقال کیا۔ صحت مدّت سے خراب رہتی تھی۔ غالب کی وفات کے دو مہینے کے اندر اندر دوشنبہ ۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء (۶ محرم ۱۲۸۶ھ) کو عصر کے وقت وفات پائی۔ تپِ دق بہت دن سے لاحق تھا۔ ہر طرح کے علاج کیے، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا، بلکہ حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ موت سے چند دن پہلے اسہال کا حملہ ہوا۔ دن میں بیس بیس تیس تیس اجابتیں ہوئیں، جس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ وفات کے وقت صرف ۲۹ برس کی عمر تھی۔ قدم شریف میں اپنے چچا نواب شمس الدین احمد خان والیِ فیروز پور جھرکہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

قربان علی بیگ خان سالک نے تاریخ کہی:

از صدمۂ مرگِ ثاقبِ والاجاہ — ہر سُو است نالہ ہائے جانکاہ
تاریخِ وفاتِ او چنیں سالک گفت — "روزِ ششم، مہِ محرم، صد آہ"
(۱۲۸۶)

نساخ نے تاریخ کہی:

مر گئے آہ! شہاب الدین خاں — غم میں ہیں سب مومن و کافر
سال لکھا خامے نے: "وائے — حیف! شہابِ ثاقبِ نیّر"
(۱۲۸۶)

نواب شمس الدین احمد خاں کی بیاہتا بیوی (جانی بیگم بنت مرزا مغل بیگ خان) سے دو لڑکیاں ہوئی تھیں: احمد النساء بیگم اور محمد النسا بیگم۔ احمد النسا بیگم، نواب عبدالرحمٰن خان والی جھجر کے چچازاد بھائی نواب سعادت علی خان کے نکاح میں آئیں۔ انھیں کی بڑی صاحبزادی سکندر جہاں بیگم سے ثاقب کا نکاح ہوا تھا۔ غالب نے ان کی شادی پر سہرہ کہا تھا، جس کے یہ دو شعر محفوظ رہ گئے ہیں:

ہمنشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں
بزم شادی ہے فلک، کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں، و لے بحرِ رواں ہے سہرا

ثاقب نے اپنے پیچھے چار صاحبزادے (شجاع الدین احمد خان تاباںؔ[1]، بہاء الدین احمد خان باطل وطلب، سراج الدین احمد خان سائل[2] اور ممتاز الدین احمد خان مائل) اور ایک صاحبزادی (اختر سلطان بیگم) اپنی یادگار چھوڑی۔ صاحبزادی کا نکاح نواب سر امیر الدین احمد خان والی لوہارو سے ہوا۔ چاروں بیٹوں کو شاعری ورثے میں ملی۔ تاباں[1] اور سائل[2] نے تو اچھی خاصی شہرت حاصل کی۔

۱؎ ۲۳ دسمبر ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ فارسی میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے۔ پہلے حسین علی خاں شاداںؔ سے، پھر داغؔ سے مشورہ کیا۔ نہایت مشّاق اور زود گو تھے۔ شطرنج کا بھی لپکا تھا۔ ان کا نکاح باقر علی خان کامل کی صاحبزادی محمد سلطان بیگم (عرف جندو بیگم) سے ہوا۔ تاباں نے ۱۶ اپریل ۱۹۲۸ء کو انتقال کیا۔ مہرولی میں صندل خانۂ مرزا بابر میں مدفون ہیں۔

۲؎ ۲ شوال ۱۲۸۰ھ (۲۹ مارچ ۱۸۶۴ء) تاریخ پیدائش ہے "مرزا سراج دین احمد خان" سے تاریخِ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ غالبؔ نے قطعۂ تاریخِ ولادت لکھا تھا (۵۸) لیکن وہاں نام غلط (سراج الدین احمد خان) چھپا ملتا ہے۔ مجروحؔ، انورؔ، ارشدؔ، داغؔ تینوں سے استفادہ کیا۔ ان کی پہلی بیوی ممولا بیگم، نواب ممتاز علی خان والی پاٹودی کی بیٹی تھیں۔ ان سے انقطاع کے بعد دوسرا نکاح داغ کی لے پالک بیٹی لاڈلی بیگم سے ہوا۔ داغؔ ہی سے تلمذ تھا۔ استاد کے پاس بہت دن تک حیدرآباد میں مقیم رہے۔ اسی زمانے میں وہاں سے ایک رسالہ معیار الانشاد بھی نکالتے رہے تھے، جس میں بیشتر

(دیکھیے اگلا صفحہ)

ثاقب تخلص غالب کا دیا ہوا تھا، جو شہاب کی مناسبت سے ہے۔ زبان کا کیا ذکر کہ وہ ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ کلام میں مضمون آفرینی کی کوشش کرتے ہیں۔ معاملہ خوب لکھتے ہیں۔ تصوف اور اخلاق کی چاشنی بھی موجود ہے۔

کیوں وعدہ کروں؟ بے خبر آجاؤ کسی وقت
ہوں وصل کا خواہاں، نہیں مشتاق خبر کا

گھر بیاباں میں بنایا نہیں ہم نے لیکن
جس کو گھر سمجھے ہوئے تھے، وہ بیاباں نکلا

کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں
کچھ حال سنو، تو ہم سنائیں

آتے نہیں یاں اگر، نہ آئیں
اے کاش! مجھے وہاں بلائیں

ہم سینہ سپر کیے کھڑے ہیں
وہ شوق سے خنجر آزمائیں

جو کام میں غیر کے ہوں صرف
افسوس، وہ دلربا ادائیں

اے بخت! کہاں تلک برائی
اے چرخ کہاں تلک جفائیں

ق
کل میں نے کہا کہ بندہ پرور!
چہرے سے نقاب آپ اٹھائیں

کہتے ہیں اداشناس باہم
"اچھا ہو جو رخ" تو کیوں چھپائیں

بولے: "رودادِ موسیٰ و طور
سن لی ہو، تو دیکھنے کو آئیں"

"بسم اللہ! ہم اٹھائیں پردہ
پر اُن سے کہو کہ تاب لائیں"

نہیں عقل سے عشق خالی کہ اس میں
بڑے تجربے ہم کو حاصل ہوئے ہیں

غلط فہم ہیں، عاشقانِ مجازی
کہ محوِ تماشائے محمل ہوئے ہیں

رہینگے گرفتارِ صورت پرستی
اگر حسنِ معنی سے غافل ہوئے ہیں

(بقیہ گزشتہ صفحہ) تلامذہ داغ کا کلام چھپتا تھا۔ اپنی خاندانی روایات کے مطابق شاہ دلدار علی مذاق (شاگرد ذوق) سے بیعت بھی تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ۸۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا؛ اور نہ اب شائع ہونے کی کوئی امید ہے۔ فرماتے تھے اپنی عمر میں ایک لاکھ کے قریب شعر کہے ہونگے۔ ایک ضخیم مثنوی "نورٌ علیٰ نور" جس میں نورالدین جہانگیر اور نورجہان بیگم کی حیاتِ معاشقہ کا بیان ہے، نامکمل رہ گئی۔ اب بھی اس میں آٹھ دس ہزار شعر سے کم نہ ہونگے۔ یہ بھی اپنی خاندانی ہڑواڑ صندل خانہ مرزا ابابر میں دفن ہوئے۔ تاریخ ہوئی "بہ جنت جانشینِ داغ آسود" (تمنا)

نہ لپٹیں، نہ ہوں قتل، انصاف یہ ہے
کہ ہم خود بد آموزِ قاتل ہوئے ہیں
ہمیں ذوقِ صحرا نوردی ہے ثاقبؔ!
نہ سمجھو، کہ جویائے منزل ہوئے ہیں

رنجش سے گر کہا ہو، تو ایماں نہ ہو نصیب
کافر بتوں کو کہتے ہیں عشّاق پیار سے

فکرِ وصال و ہجر کا صدمہ اُٹھائیے
اس چند روزہ زیست میں کیا کیا اٹھائیے
بیٹھے ہیں ہم تو اب دل لے آرزو لیے
وہ دن گئے کہ داغِ تمنّا اٹھائیے
ثاقبؔ! وہ ضبطِ اشک کو سمجھے ہیں بے غمی
یہ رو دیئے، کہ شورشِ دریا اٹھائیے

اک بوند اثرناک نہ اے چشمِ تر آئی
ہر گز نہ مری تجھ سے کچھ اُمّید بر آئی
ہے بند درِ حجرہ، مگر یار کے گھر کا
جو زلف کی بو تجھ میں یہ بادِ سحر آئی
سینے کو مرے چاک کیا، پر ہوئے برہم
جب نوبتِ نظارۂ داغِ جگر آئی
چپ بیٹھے ہیں، کچھ، کرتے نہیں بات کسی سے
ثاقبؔ کے مگر مرنے کی ان کو خبر آئی

[اکمل الاخبار ۴: ۱۲ (۲۶- اپریل ۱۸۶۹ء) ؛ خم خانۂ جاوید
۲: ۱۶۶- ۱۷۰ ؛ کشکول سیّد بہاء الدین بشر : ۱۸۴]

جمؔ —— نواب سید محمد جمشید علی خان بہادر مرادآبادی

مرادآباد کے عمائدین سے تھے۔ شاہی میں اُن کو مشیر الدولہ سفیر الملک نصیر جنگ کا خطاب ملا تھا۔ سلسلۂ نسب آٹھویں امام حضرت علی رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ مولانا محمد صالح جو بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے اتالیق تھے اور بعد کو فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفوں میں بھی شامل رہے، جمؔ کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ ان ہی خدمات کے انعام میں شاہجہان نے انھیں پرگنہ حسن پور (ضلع مرادآباد) میں محمد آباد اور سات آٹھ گانو دوامی جاگیر میں عطا کیے تھے۔ یہ جاگیر ۱۸۴۰ء تک اسی خاندان میں رہی، پھر انگریزی حکومت نے اسے ضبط کر لیا۔

جمؔ کے دادا کا نام قاضی ظفریاب خان تھا۔ والد قاضی ولایت علی، درجۂ اول کی سند حاصل کر کے مرادآباد ہی میں وکالت کرتے رہے۔

جمؔ اچھے صاحبِ علم تھے، اُردو فارسی دونوں زبانوں سے مزاولت تھی۔ تاریخ اور صحافت سے خاص شغف تھا؛ ایک زمانے تک اخبار "جامِ جمشید" اور "روہیلکھنڈ پنچ" نکالتے رہے۔ ایک اخبار "بلند اختر" کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ پھر ریاست جے پور میں عدالتِ فوجداری کے سررشتہ دار ہو کے چلے گئے۔ چندے ریاست کوٹہ میں حاکم اپیل بھی رہے۔ ریاست جے پور میں ان کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔

ان کے بڑے صاحبزادے سید عبد العلی صاحب بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر تھے، شاعر بھی تھے اور اخبار نویس بھی۔ عابدؔ تخلص تھا اور داغؔ کے مشہور شاگردوں میں سے تھے، بلکہ بقول لالہ سری رام استاد ہمیشہ انھیں "فخرِ داغؔ" کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ پہلے "جامِ جمشید" کے ایڈیٹر رہے، پھر اپنا ایک اخبار "مخبرِ عام" جاری کیا۔

اے مجمعِ بحرین دِلت عدل و کرم را   وے مطلعِ سعدین دَرَت علم و عَلَم را

از روے تو شد صبحِ وطن، شامِ غریباں
وز کوے تو شد داغ بدل، باغِ ارم را

ممنونِ تو ہر شیخ و برہمن بود، آرے
شمع ست گُلِ باغِ کرم دَیر و حرم را

از رشکِ دلِ روشنت، اے نورِ جوانی
برزد بزمن پیرِ فلک ساغرِ جم را

از فیضِ تو خوں خشک شدہ در تنِ حاتم
وز عدلِ تو دل تر شدہ کسریٰ عجم را

شاہِ انجم چو شود رونقِ اورنگِ حمل
سازد از فیضِ نظر فرشِ زمیں را مخمل

شاہدِ گل شود از ناز و ادا جلوہ فروش
بلبلانِ چمن از شوق بخوانند غزل

ساغرِ لالہ گر ایں گونہ دہد ساقیِ شوخ
چہ عجب شوقِ گرفتن بکند پنجۂ شل

چشم از عکسِ چمن سرخ شود ہمچو شفق
طبع از گل بنماید ہمہ لبریز بغل

تھا خفتہ میں شب مست مے جامِ الم کا
اک دولتِ بیدار کا رُخ خواب میں چمکا

سرتا بقدم غیرتِ خورشید تھی پیکر
تھا حسنِ حسینانِ جہاں عکس قدم کا

بکھرے ہوئے بالوں میں وہ عارض کے تھے جلوے
گویا کہ گھٹا سے تھا کوئی چاند سا چمکا

ابرو کا وہ عالم تھا، کہ تھی تیغِ سیہ تاب
کشتہ تھا دلِ راست ہر اک جلوۂ خم کا

آتی ہے مگر کوچۂ جاناں سے، یہ اے حزم!
دامن ہے معطر جو نسیم سحری کا

بوقتِ نزع عیادت کو رشکِ حور آیا
اجل سے چھٹ گئی لو، اور یہ فتور آیا

مچیگا شہرِ خموشاں میں غل قیامت کا
خرامِ ناز سے، گر وہ سُوے قبور آیا

شہیدِ عشق کے سر پر ہوا نہ کب محشر
عدو کے ساتھ وہ کس دن نہ سُوے گور آیا

نہ جانے، ہم سے سکندر کو کیا کدورت تھی
مزاجِ یار میں آئینہ سے غرور آیا

درست وصف، بجا خوبیاں، مگر زاہد!
نہ غیرِ نام، نظر بادۂ طہور آیا

بجا ہے آپ کو مطلب عدو سے، اے توبہ!
کہیں سے نشہ میں، میں ہی تھا رات چور آیا

فریب غیر سے، جو آپ نے کیا آزاد
غلام سے کوئی طاعت میں کیا قصور آیا

شگفتہ غنچۂ دل اب بھی گر نہ ہو تقدیر
پیامِ موسمِ گل، نغمۂ طیور آیا

جہاں میں حضرتِ غالب کے بعد، حزم! افسوس
نظر نہ کوئی سخن سنج، دُور دُور آیا

[قصائد مدحیۂ نظام: ۲۰۱ - ۲۲۵؛ خم خانۂ جاوید، ۵: ۴۹۵ - ۴۹۶؛
تاج التواریخ (حصہ اخبارات): ۶ - ۷؛ گلدستۂ ریاضِ سخن (۲۰ فروری ۱۸۸۵ء): ۴۰]

جنوں ــــ خان بہادر قاضی عبدالجمیل بریلوی

خاندان کا سلسلہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان سے ملتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں مصر سے ہندستان آئے۔ حکومت وقت کی طرف سے ان کی مناسب آؤبھگت ہوئی اور وہ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے۔ آخر میں بریلی کی قضائت ان کے خاندان کے سپرد ہوئی۔ ان کے اجداد میں سے قاضی ثناء اللہ اپنے علم و فضل اور تدبر اور فراست کے باعث نواب شجاع الدولہ کے خاص معتمد علیہ رہے تھے، اور انھیں جاگیر اور معقول وظیفہ ملتا تھا۔ ان کے انتقال (۱۱۸۷ھ) کے بعد قاضی غلام نبی ان کے جانشین ہوئے۔ دربارِ اودھ اور سرکارِ انگریزی دونوں جگہ ان کی قدر و منزلت تھی۔ ان کا ۱۶ دسمبر ۱۸۱۲ء کو انتقال ہوا؛ اور ان کے بیٹے قاضی غلام احمد ان کے قائم مقام ہوئے۔

قاضی غلام احمد صاحب عالم ہونے کے باعث حکومتِ وقت کی طرف سے موردِ اعزاز و اکرام ہوئے۔ صدر الصدور اور جسٹس آف کورٹ کے عہدے ملے۔ متعدد مرتبہ خلعت عطا ہوئے۔ ۲۰ اگست ۱۸۳۸ء کو یہ راہیِ ملکِ جاودانی ہوئے، تو قاضی عبدالجلیل ان کے بڑے بیٹے اس وقت صدر امین تھے۔ اس لیے انھوں نے عہدۂ قضائت سے بطیبِ خاطر دست برداری دے دی، اور اپنے چھوٹے بھائی قاضی غلام حمزہ کو مقرر کر دیا، اور خود امین ہی رہے۔ انگریزی نپنشن جواب تک ذاتی چلی آتی تھی۔ قاضی غلام حمزہ ہی کے زمانے میں موروثی ہوئی۔ ان کی وفات ۴ دسمبر ۱۸۷۰ء (۱۰ رمضان ۱۲۸۷ھ) کو ہوئی۔ یہی ہمارے صاحبِ ترجمہ جنوں کے والدِ بزرگوار تھے۔

قاضی عبدالجلیل ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۶-۱۸۳۵ء) میں پیدا ہوئے۔ کتبِ درسیہ صدر الصدور مفتی عنایت احمد (مصنفِ تواریخ حبیبِ الٰہ) سے پڑھیں۔ علومِ ریاضیہ میں بھی دستگاہ

کامل تھی۔ فارسی اور عربی میں منتہی کا درجہ حاصل کیا۔ ان کے اسلاف کی طرح حکومت نے ان کی بھی بہت آؤ بھگت کی اور انھیں عہدۂ قضا پر فائز کیا۔ ۱۸۹۸ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ ۲۰ مئی ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ اردو کلام پر مرزا غالب سے اصلاح لی جس کا سلسلہ صفر ۱۲۶۹ھ (نومبر / دسمبر ۱۸۵۲ء) سے شروع ہوا۔ ان کے ذاتی تعلقات اپنے استاد سے بہت عقیدت مندانہ تھے اور استاد بھی ان سے بہت شفقت اور محبت کا سلوک کرتے تھے۔ غالب کی کتاب دستنبو کا دوسرا ایڈیشن انھی کی نگرانی میں ۱۸۶۵ء میں بریلی سے شائع ہوا تھا۔

ان کے بڑے صاحبزادے قاضی محمد خلیل بھی شاعر تھے، حیران تخلّص کرتے تھے۔ انھوں نے اولاً حسن رضا خان (تلمیذِ داغ) سے مشورہ کیا۔ پھر حافظ پیلی بھیتی سے اصلاح لی۔ ان کا ۱۹۳۹ء میں انتقال ہوا۔

افسوس جنون کا کلام ضائع ہو گیا۔ انھوں نے کبھی اس کی ترتیب کی طرف توجہ نہ کی، بلکہ آخری زمانے میں تو شعر و شاعری سے طبیعت کچھ اچاٹ سی ہو گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خود اپنی زندگی ہی میں اپنا کلام تلف کر دیا تھا۔ ادھر اُدھر سے جو کچھ ملا، ملا وہی بطور نمونہ پیش ہے۔

کچھ آیا راہ پہ، شاید وہ بدگماں میرا
کہ رات ذکر بہت کچھ رہا وہاں میرا
یہ کیا، کہ غیر نے جو کچھ کہا، بجا ہے وہی
مری زبان سے سنتے، مگر بیاں میرا
جنوں نے جور کا شکوہ کیا، تو کہتے ہیں
کہاں کو چھوڑ کے جاؤ گے آستاں میرا

جو حسیں ہم کو ملا، کافر و بے دیں ہی ملا
جس کو دیکھا اُسے غارت گرِ ایماں دیکھا
نہ ہوا خندۂ بے وجہ، گوارا گل کا
ہم نہ کہتے تھے، نہ کر سیرِ گلستاں، دیکھا

کہاں یہ تاب کہ آنکھیں ملا سکوں تجھ سے
کہ اک نگہ میں دگرگوں ہے حال محفل کا

دیکھ کر اس بُت کو، کیا کہیے کہ کیا یاد آ گیا
ہم کو اس کی بے نیازی سے خدا یاد آ گیا
میں جو رخصت ہو کے ان سے پھر گیا تو یوں کہا
کیوں گئے، کیوں آئے، کیا بھولے تھے کیا یاد آ گیا

ہے سرِ شام ہی سے بھاری رات
ہائے کیسے کٹیگی ساری رات

سرسری تھا گلۂ جور و جفا، اے جاناں!
تم پشیماں نہ کرو مجھ کو پشیماں ہو کر

سامنے سے یوں نکل جاتے ہیں وہ
ان سے گویا کچھ شناسائی نہیں

نہ سہی لطف و عنایت، ستم و جور سہی
غم تو یہ ہے کہ نہیں حال کا پُرساں کوئی

غم تو یہ ہے، کہ میں نے ان سے بات
کیوں کہی دل کی بیقراری کی
ہجر میں کون تھا، مرا ہمدرد
کچھ ترے غم نے غمگساری کی
اے جنوں! مر کے اس ستمگر پر
قدر بھی کھوئی، جاں نثاری کی

کچھ گئے گزرے نہ تھے ایسے، مگر کیا کیجیے
ہم سے پیمانِ وفا باندھ کے توڑا نہ گیا
آپ حیران تھے مجبوری دل پر از بس
آئینہ دیکھ کے پھر ہوش میں آیا نہ گیا
گرچہ رنج و غمِ ہجراں کے گلے تھے دل میں
سامنے اس ستم ایجاد کے بولا نہ گیا
میرے نقصاں نہ ہوئے عشق میں کیا کیا ظالم
دل گیا، جان گئی، کیا کہوں کیا کیا نہ گیا
چل بسا گلشنِ ہستی سے جنونِ مرحوم
غمِ ہجرتِ بیدرد اُٹھایا نہ گیا

[ماہنامہ کمال (دہلی) جنوری ۱۹۱۲ء؛ خمخانۂ جاوید، ۲: ۲۷۶-۲۷۷، اکمل التواریخ،
۱: ۴۵-۴۶؛ العلم (سہ ماہی، کراچی) غالب نمبر، ۱۹۶۹: ۱۴۰]

جوہرؔ ـــــ منشی جواہر سنگھ دہلوی

غالبؔ کے ان کے والد رائے چھج مل سے بہت دوستانہ تعلّقات تھے؛ چنانچہ جس زمانے میں وہ کلکتے گئے ہیں، رائے چھج مل ہی کو اپنے معاملات کی دیکھ بھال سونپ گئے تھے۔ رائے صاحب موصوف فارسی بہت اچھی جانتے تھے اور غالبؔ کے بہت قدر دان تھے۔ غالبؔ کے فارسی دیوان کا سب سے قدیم خطّی نسخہ جو اب تک منظرِ عام پر آیا ہے اور کتابخانہ بانکی پور (پٹنہ) میں موجود ہے، انھیں رائے چھج مل کا لکھا ہوا ہے؛ یہ ۱۲۵۳ھ میں لکھا گیا تھا۔ ان کا انتقال ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ - ۱۸۶۱ء) میں ہوا، تو غالبؔ نے تاریخِ وفات کہی:

گویند، رائے چھج مل شیریں کلام مُرد | دیرینہ دوست رفت، ازیں تنگنا دریغ
گفتم، کسے ز سالِ وفاتش نشاں دہد | غالبؔ شنید و گفت، چہ گویم: "بسا دریغ"

منشی جواہر سنگھ انگریزی عملداری میں تحصیلدار تھے۔ یوپی اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں رہے۔ غالبؔ نے ایک رباعی میں ان کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم | شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم، کہ میکش ازماست | در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

جوہر بیشتر فارسی کہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان چھپا تھا لیکن دیکھنے میں نہیں آیا۔ بروایتِ بشیر غالباً ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ ان کی ایک غزل اُردوئے معلّیٰ میں ہے؛ اسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بحیرتم کہ ز دوزخ، کسانِ دوزخ را | کجا برند، چو آہم شرارہ بار افتد
نہ گبرم و نہ مسلماں بحیرتم کہ مرا | سوائے دوزخ و مینو کجا گزار افتد
قرار در وطن، افسردہ می کند، دل را | خوشا غریب کہ دور از دیار یار افتد

ترا کہ شیوہ دگرگوں کنی، بہ زعم بتاں
خوش ست، گر ز جفا بر وفا قرار افتد
چکد ز خامۂ جوہر سخن چناں کہ مگر
بزورِ موج، دُر از بحر، بر کنار افتد

اُردوے معلّٰی کی تاریخِ طبع کہی :

چو اُردوے معلّٰی گشت تالیف
ہمانا یک جہاں گرد دید طالب
پے سالِ مسیحائی طبعش
بگو جوہر: "خہے اُردوے غالب"
(۱۸۶۹ء)

قاطع برہان (غالب) کی تاریخ کہی :

ایں نسخہ کہ غالباً چو او دیگر نیست
تالیفِ حریفِ غالبِ دوراں ہست
جوہر ایں گفت سالِ طبعش طبعم
"زیبا فرہنگ قاطع برہاں ہست"
(۱۲۷۸ھ)

تو وز راہِ کرم بر سرِ مرگزار غلط
من و برہ نشستن بہ انتظار غلط
بَرو، بزہد بد آموزیم مکن، زاہد!
من و ز شاہد و مے توبہ در بہار غلط
بعمد، در خورِ پرسش نیم مگر وقتے
شود بکلبۂ من راہِ آں نگار غلط
براں سرم، کہ دگر باکسے نیامیزم
اُمیدِ لطف ز یارانِ روزگار غلط

[اُردوے معلّٰی : ۳۹۳ - ۳۹۴ ؛ سید باغ دودر ؛ گلستانِ سخن :
۱۹۰ ؛ قاطع برہان ؛ ۹۷ ؛ اُردو (سہ ماہی کراچی) ۵۴ : ۲:۲۳۵]

جوہر — حکیم محمد معشوق علی خان شاہجہانپوری

روہیل کھنڈ کے ایک معزز اور مشہور خاندان افاغنہ کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے جدِّ اعلیٰ محمد عمر خان عرف عمر بابا، ولایتِ کابل کے سرحدی قصبہ چمکنی کے رہنے والے تھے۔ جسے غوریا خان کے پسرِ چہارم چمکنی خان نے اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ عمر بابا خود بھی اسی چمکنی خان کی نسل میں سے تھے۔ ان کی ریاضت و عبادت اور زہد و ورع کی بنا پر ان کے معاصران کا بہت اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ عمر بابا کا مزار نواحِ چمکنی میں اب تک مرجعِ انام ہے۔ سب سے پہلے انھی عمر بابا کے صاحبزادے محمد ابراہیم خان آغازِ شباب میں نواب بہادر خان کے ہمرکاب شاہجہان پور آئے اور یہیں بس گئے۔

محمد معشوق علی خان جوہر کے والد کا نام اصغر علی خان تھا۔ جوہر ۱۸۵۲ء میں شاہجہانپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر دہلی اور لکھنؤ میں طب کی تکمیل کی۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۷ء تک ریاستِ ڈیرہ (ضلع سلطان پور) میں ملازم رہے۔ یہاں سے نکلے، تو ریاست بھوپال میں بزمرۂ وکلاء مختاری شامل ہو گئے۔ یہاں نہایت خوشحالی سے بسر اوقات ہوئی۔ حکمران خاندان سے بھی اچھے تعلقات تھے، جیساکہ ان کے متعدد قصائد سے ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ وہ اکثر مشاعرے کرتے رہتے تھے، اس لیے بھوپال اور اس کے اطراف میں ان کے باعث اردو زبان کو بہت ترقی ہوئی۔

۱۹۰۸ء میں بھوپال سے مولوی محمد عزیز مرزا ہوم سکریٹری کے ساتھ حیدر آباد دکن آئے جو بھوپال میں ان سے ذیابیطس کا علاج کرانے آئے اور صحتیاب ہو گئے تھے۔ غالباً بعد کو انھیں کے توسط سے ان کی قدردانِ علم و فضل مہاراجا کشن پرشاد مدارالمہام تک رسائی ہوئی۔ جوہر نے بوقتِ ملاقات ایک قصیدۂ غرا نذر گزرانا جس کے

صلہ میں مہاراجہ بہادر نے قدر افزائی کے علاوہ انھیں ریاست کی عدالتِ عالیہ (ہائی کورٹ) کی سندِ وکالت بھی عطا فرمائی اور اس طرح آپ یہیں کے ہو رہے۔ مدّتِ دراز کی غیر حاضری کے بعد ۱۹۲۵ء میں اپنے وطن شاہجہانپور واپس آئے۔ یہیں ایک ہفتہ کی مختصر علالت کے بعد بمرضِ اسہال اگست ۱۹۲۸ء میں انتقال کیا۔ ہوش و حواس آخر تک قائم رہے، بلکہ اپنی تجہیز و تکفین کا انتظام خود بحالتِ مرض کیا۔ موت سے دو ماہ پہلے اپنی تاریخِ وفات چار (۴) کے تعمیے سے کلُّ نفسٍ ذائقۃ الموت نکالی تھی (۴ + ۱۹۲۴ء) بعدِ رحلت اپنے آبائی قبرستان واقع محلہ گاڑی پورہ میں متصل مزارِ حضرتِ اسحاق خاں سپردِ خاک ہوئے۔

اولاد میں دو صاحبزادے جناب حامد علی خاں حامدؔ اور محمود علی خاں بسلسلۂ ملازمت اورنگ آباد دکن میں موجود ہیں۔ خاندان کے باقی افراد شاہجہانپور میں ہیں۔

جوہرؔ طبابت میں بھی بہت اچھی دستگاہ رکھتے تھے، اگرچہ طبابت کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا۔ ان کے دو دیوان، اردو اور فارسی مرتّب شدہ ان کے خاندان میں موجود ہیں؛ اُردو میں بلامبالغہ سینکڑوں قصیدے اور قطعے ہیں۔ بہت قادر الکلام اور زود گو تھے۔ سو پچاس شعر کا قصیدہ ایک مختصر نشست میں کہہ لینا ان کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اردو اور فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ اگرچہ جدّت اور تازگی ان کے کلام کی خصوصیت نہیں، لیکن اس کے باوجود وہ لطف سے خالی نہیں۔

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

اے ہمنشیں! پائی تھی راحت وطن میں کیا
غربت کی آفتوں کا گلہ کس لیے کریں

فصلِ بہار آ ہی گئی ہے چمن میں کیا
پیرِ مغاں کا کس لیے ملتا نہیں دماغ

کیا اعتبار ہو چمنِ روزگار کا
دیکھی کبھی خزاں، کبھی موسم بہار کا

کچھ سمجھ بوجھ کے رندوں نے مگر چھوڑ دیا
شیخ جی ہاتھ تو موقع سے لگے تھے لیکن

کچھ کچھ ہے محبت کی جھلک طرزِ جفا میں
گردن پہ وہ رکھ رکھ کے اٹھا لیتے ہیں خنجر

پیدا اثرِ درد ہے، غنچوں کی صدا میں
بربادیِ گلشن پہ ہیں، گل چاک گریباں

لیکن ہے یہ کہنے کو کہ ہیں بند قفس میں
تکلیف نہیں کوئی بھی ہرچند قفس میں

دم گھٹتا ہے، گھبراتا ہے دل، ہوش ہیں اُڑتے — دشمن کو بھی رکھے نہ خداوند قفس میں

دردِ منّت کشِ فریاد نہیں ہے جوہر — ورنہ اوروں کی طرح، ہم بھی زباں رکھتے ہیں

تصوّر بھی دلِ ویراں میں آتا نہیں اس کا — کوئی اُجڑا ہوا گھر بھی کہیں آباد ہوتا ہے!

گذرے مجنوں کو مدّتیں گذریں — دشتِ وحشت میں آج ہو ہے وہی

پھر مرے چھیڑنے کی باتیں ہیں — پھر رقیبوں سے گفتگو ہے وہی

یوں زمانے میں ہیں حسین لاکھوں — جس کو جی چاہے، خوبرو ہے وہی

دل نہیں مانتا ہے، اے ناصح! — تو ہی بتلا کہ کیا کرے کوئی

یہ ایک جام، اور اس میں بھی تھوڑا سا کچھ کم — نہ آئی دیتے ہوئے بھی تجھے حیا، ساقی!

اب فارسی کے چند شعر دیکھیے:

ہر قدم قیس کہ در دشت جنوں زاند اخت — بہرِ وحشت زدگاں جادہ بصحرا انداخت

قیس چوں رفت ازیں غمکدۂ کون و فساد — بارِ سودائے محبّت، بہ سرِ ما انداخت

روز یکہ دیدمت، شدہ ام مبتلائے تو — گنجد بہ چشمِ من نہ کسے ما سوائے تو

بنگر وفائے من کہ چہا بر سرم گذشت — گاہے نہ حرفِ شکوہ زدم، از جفائے تو

دردِ دل را، جز بہ لطفت نیست ممکن راحتے — از ترحم، بر گدائے خود نظر کن ساعتے

بندہ ام، لیکن زنا فرمانیت شرمندہ ام — از خلوصِ دل گہے ہرگز نہ کردم طاعتے

ما گدائے بے نوا ایم، بوریا ما را بس است — بود تختِ سلطنت بہرِ سلیماں راحتے

از وفورِ رحم نعمت ہا عطا کردی بمن — من ادائے شکر را ہرگز ندارم طاقتے

[آثار الشعرا: ۱۸۹ - ۱۹۰؛ خمخانۂ جاوید، ۲: ۳۰۸ - ۳۱۰؛ جوہر، مکتوباتِ دل شاہجہانپوری بنام مؤلف]

حالی — شمس العلما مولانا الطاف حسین انصاری پانی پتی

مولانا حالی ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں پانی پت کے "محلۂ انصار" میں پیدا ہوئے۔ نجیب الطرفین تھے۔ مادری سلسلہ ۳۴ واسطوں سے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر منتہی ہوتا ہے۔ پدری سلسلے میں ۲۹ واسطوں سے ان کے جدِّ اعلیٰ مشہور صحابی اور مدینہ میں حضرت رسول کریم صلعم کے اوّلین میزبان حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے پدری سلسلے میں حضرت شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہرات تھے۔ اس خاندان میں سب سے پہلے خواجہ ملک علی ہروی، خواجہ غیاث الدین بلبن کے زمانے (۱۲۶۶ - ۱۲۸۷ء) میں ہندستان آئے۔ یہ اپنے وقت کے مشہور عالم تھے۔ یہاں پہنچنے پر حکومت وقت کی طرف سے پانی پت کے قاضی مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ منڈی میں اجناس کے نرخ مقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوا۔ مگر خاندان کی یہ ظاہری شان وشوکت حالی سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی؛ بلکہ ان کے والد خواجہ ایزد بخش نے بھی اس جاہ ومال سے کچھ نہ پایا اور ساری عمر عسیر الحالی میں بسر کردی۔ یہ نو برس کے تھے، جب ۱۸۴۵ء میں ان کا بعمر ۴۸ برس انتقال ہوگیا۔ والدہ کو اس سے پہلے ہی کوئی دماغی عارضہ لاحق ہو چکا تھا، جس سے وہ بھی ان کی دیکھ بھال سے قاصر تھیں۔ چنانچہ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت بڑے بھائی خواجہ امداد حسین منظہر اور بڑی بہن کے سپرد ہوئی۔

زمانے کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پہلے قاری حافظ ممتاز علی کی نگرانی میں قرآن کریم حفظ کیا۔ پھر میر ممنون کے بھتیجے (اور داماد بھی) سید جعفر علی سے فارسی اور حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی کا درس لینا شروع کیا۔ ابھی تعلیم ختم بھی نہ ہونے پائی تھی، کہ گھر والوں نے ان کی مرضی کے خلاف انھیں خانہ داری کی

زنجیروں میں جکڑ دیا اور ان کی ان کے ماموں میر باقر علی کی بیٹی اسلام النساء سے شادی کر دی۔ لیکن علم کی جو لگن ان کے دل میں تھی، تاہل کی ذمّہ داریوں نے اس میں کمی نہیں آنے دی۔ ۱۸۵۴ء میں جب کہ عمر ابھی ۱۷ برس سے متجاوز نہیں ہوئی تھی، چپکے سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور دلّی جا پہنچے۔ اس دور کی دلّی گویا علم و فضل کا گہوارہ تھی۔ دور نزدیک کے مشہور اور قابل علما نے یہاں حلقہ ہائے درس قائم کر رکھے تھے۔ یہ بھی مولوی نوازش علی* کے درس میں شریک ہو گئے اور سال بھر ان کی خدمت میں رہ کے کچھ عربی حاصل کی۔ اسی زمانے میں انھوں نے مولوی فیض الحسن سہارنپوری اور مولوی امیر احمد اور شمس العلماء میاں نذیر حسین سے عربی پڑھی۔ اس کے بعد اگلے ہی سال (۱۸۵۵) عزیزوں کے اصرار پر انھیں دلّی کو خیر باد کہنا پڑا۔ اور وہ واپس پانی پت چلے آئے؛ لیکن یہاں وطن میں بھی انھوں نے تحصیلِ علم اور مطالعے کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ۱۸۵۶ء میں معمولی مشاہرے پر کلکٹر حصار کے دفتر میں ملازم ہو گئے، لیکن اس تعلّق کو زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ بپا ہو گیا اور وہ نوکری چھوڑ کر گھر آ گئے۔

"غدر" کے بعد حسنِ اتّفاق سے وہ واقعہ پیش آیا جس نے انھیں مولوی الطاف حسین سے حالی بنا دیا۔ ۱۸۶۳ء میں وہ نواب محمد مصطفٰے خان شیفتہ کے مصاحب اور ان کے منجھلے صاحبزادے نقش بند خان مہجور کے اتالیق ہو کر جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر) چلے گئے۔ شیفتہ جہاں جیّد عالم تھے، وہیں اردو اور فارسی کی نظم و نثر کا بھی بہت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے؛ اور جہاں تک نقدِ سخن کا تعلّق ہے، اپنے زمانے سے یقیناً بہت آگے تھے۔ حالی کو

---

* مولوی نوازش علی اصل میں پونڈلی (یا بڑی) ضلع کرنال کے رہنے والے تھے۔ دلّی کے علماء سے کتبِ درسی پڑھیں اور شاہ محمد اسحاق سے حدیث کا سبق لیا۔ دہلی میں کھجور کی مسجد کے قریب سکونت تھی۔ حسین بخش سوداگر کے قائم کردہ مدرسے اور مسجد میں جو جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے مقابل کٹرہ گوگل شاہ کے سامنے واقع تھی، ان کا درس ہوا کرتا تھا۔ اپنے زمانے کے مشہور واعظ اور بلند پایہ عالم تھے۔ سر سیّد بھی ان کے شاگرد تھے؛ انھوں نے درسی کتابیں انھیں سے پڑھی تھیں (تذکرۂ اہلِ دہلی: ۱۰۱؛ حیاتِ جاوید، ۱: ۴۶؛ ایضاً ۲: ۴۰۸ - ۴۵۱)



مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی

خوش قسمتی سے ایسے یگانۂ روزگار شخص کی مصاحبت میسّر آگئی۔ شیفتہ اردو اور فارسی میں مومن اور غالب کے شاگرد تھے، اور اس عہد کے جملہ اصحاب کمال ان کے احباب میں سے تھے۔ چنانچہ حالی کو بھی ان کی معیّت میں مفتی صدر الدّین خان آزردہ ؎، مرزا اسداللہ خان غالب، نواب ضیاءالدّین احمد خان نیرّ رخشاں، حکیم احسن اللہ خان اور دوسرے اربابِ علم وفن سے ملنے کا موقع ملا۔ جوہر قابل تھا، شیفتہ جیسے سخن فہم اور سخن سنج کی صحبت اور سرپرستی نے اسے بیرونی آلایشوں سے پاک کر دیا اور ان نامآور اصحابِ کمال نے اسے جلا دی۔ وہ خود تحریر کرتے ہیں کہ جب میں پہلی مرتبہ (۱۸۵۴ء۔ ۱۸۵۵ء) بغرضِ تعلیم دہلی آیا ہوں تو ان دنوں "قلعۂ معلّٰی" کے دیوانِ عام میں جو مشاعرہ

؎ مفتی صدر الدّین خاں کشمیری الاصل اور مولوی لطف اللہ کے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) دہلی میں پیدا ہوئے؛ "چراغ" تاریخ ولادت ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی، شاہ رفیع الدّین دہلوی اور مولوی فضل امام (والدِ مولوی فضل حق خیر آبادی) سے تعلیم حاصل کی اور خود صاحبِ مسند وافتا ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندستان نے اس جامعیت کے بہت کم اشخاص پیدا کیے ہیں۔ شاہی میں بھی مسندِ افتا پر فائز تھے؛ انگریزی عہد میں بھی صدر الصدور رہے۔ ساری عمر درس وتدریس میں گزری۔ شاہجہانی مدرسہ دار البقا پھر سے زندہ کیا تھا۔ طالب علموں کے تمام اخراجات کے خود کفیل ہوتے تھے۔ ان کے بیسیوں شاگرد مشہور عالم ہوئے۔ ان میں سر سیّد احمد خاں، نواب صدّیق حسن خان (بھوپالی)، نواب یوسف علی خان (رام پور)، مولانا خیر الدّین (والدِ مولانا ابو الکلام آزاد)، مولوی فیض الحسن خان قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو وفات پائی۔ "چراغِ دو جہاں بود" اور "وا اے چراغِ دین" سے تاریخ نکلتی ہے۔ دہلی سے باہر قطب صاحب کے رستے میں "درگاہ روشن چراغ" کے احاطے میں آسودۂ خواب ہیں۔

شروع میں چند غزلیں شاہ نصیر کو دکھائیں۔ پھر مجرم اکبر آبادی سے مشورہ کیا اور آخر کار میر نظام الدین ممنون سے اصلاح لی۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں پر یکساں قادر تھے۔ سارا مجموعۂ کلام غدر میں ضائع ہوگیا۔ ایک تذکرۂ شعرا بھی مرتب کیا۔ اس کے کچھ ابتدائی اجزا کا قلمی نسخہ کیمبرج میں موجود تھا۔ اسی کی نقل یہاں پروفیسر مختار الدّین احمد نے ترتیب وتحشیہ کے بعد شائع کی ہے (دلّی، ۱۹۷۰ء)

(تذکرۂ علمائے ہند: ۹۳۔ ۹۴؛ خمخانۂ جاوید، ۱: ۵۳۔ ۶۱)

ہوتا تھا، وہاں میں نے غالب کو فارسی اور اردو غزل پڑھتے سُنا۔ اس سے مجھے شاعری کا شوق ہوا" چنانچہ ایک دن میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں اپنا کلام سنایا، تو انھوں نے فرمایا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا، لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے، کہ اگر تم شعر نہیں کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے"۔ ابتدائی مشق کے زمانے میں خستہ تخلص کرتے رہے۔ چنانچہ ان کی جو تضمین قدسی کی مشہور نعت پر مجموعہ "حدیثِ قدسی" میں شامل ہے، اس میں یہی تخلص ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان ایام میں انھوں نے کچھ زیادہ شعر نہیں کہے، نہ کلام پر باقاعدہ کسی سے اصلاح لی۔ لیکن جب وہ مستقلاً شیفتہ کے پاس جہانگیر آباد آگئے، تو یہاں آنے کے بعد غالباً شیفتہ ہی کے کہنے سے انھوں نے غالب کی شاگردی اختیار کرلی۔ انھوں نے ایک شعر میں اپنے استفادے کا ذکر کیا ہے۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

غالب کی شاگردی نے سونے میں سہاگے کا کام کیا اور حالی جلد ہی میرزا کے دوسرے شاگردوں اور اپنے ہمعصروں سے گوئے سبقت لے گئے اور بالآخر خود استادی کا درجہ حاصل کیا۔

پس یہ علم و ادب کی انتہائی خوش نصیبی تھی کہ وہ شیفتہ کے ساتھ جہانگیر آباد گئے، ورنہ خدا معلوم، انھیں وہ مواقع حاصل ہوتے یا نہیں جو انھیں میسّر آئے۔ وہ تقریباً سات برس تک شیفتہ کے ساتھ رہے اور ان کی وفات کے بعد یہاں سے نکلے اور مختلف جگہ ہوتے ہوئے ۱۸۷۰ء میں لاہور پہنچے۔ یہاں اس زمانے میں اُردو خاص توجہ کا مرکز بن رہی تھی۔ سررشتۂ تعلیم کے انگریز ڈائرکٹر فلر تھے، اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال دہلوی ایم اے ان کے مشیر کار۔ ماسٹر صاحب موصوف نے دہلی سے دعوت دے دے کر ایسے اصحاب کو بلایا، جو محکمے کی ترقی میں کسی طرح معاون ہوسکتے تھے۔ حالی کو یہاں سرکاری بک ڈپو میں ان کتابوں کی زبان درست کرنے کی خدمت سپرد ہوئی، جو سررشتۂ تعلیم انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کروا رہا تھا۔ یہاں سے تقریباً چار برس کی ملازمت کے بعد وہ ۱۸۷۴ء کے اواخر یا ۱۸۷۵ء کے شروع میں دہلی آگئے اور اینگلو عربک اسکول میں بمشاہرہ ۶۰ روپلے فارسی اور عربی کے مدرس اول مقرر ہوئے۔ سرسید احمد خان

سے ان کی ملاقات یہیں ہوئی، جس کا ثمرہ ۱۸۷۹ء میں مدّ و جزرِ اسلام یعنی مسدس حالی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں نواب سر آسمان جاہ بہادر وزیرِ اعظم حیدرآباد دکن ہندستان کی سیر کے لیے تشریف لائے، تو سر سیّد نے حالی کو ان کی خدمت میں پیش کیا۔ نواب سر آسمان جاہ بہادر نے ازرہِ علم پروری حضور نظام کی سرکار سے صیغۂ امدادِ مصنّفین سے ان کی اینگلو عربک اسکول کی تنخواہ کے مساوی ۷۵ روپیہ (حالی) ماہانہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اس کے تین سال بعد ۱۸۹۱ء میں جب یہ کالج وفد کے ہمراہ دکن گئے، تو یہ ۷۵ روپیہ سے بڑھا کر ۱۰۰ روپیہ کر دیا گیا۔ چونکہ سو روپے ماہانہ ان کی بسر اوقات کے لیے کافی تھا، اس لیے یہ ملازمت سے مستعفی ہو کر پانی پت آ گئے، اور بقیہ عمر علم و ادب کی خدمت میں بسر کر دی۔ حکومتِ وقت نے ان کی خدمات کا اعتراف یوں کیا کہ جون ۱۹۰۴ء میں انھیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا۔

خواجہ حالی کا نکاح ان کے بچپن ہی میں ان کے ماموں سید باقر علی کی صاحبزادی اسلام النساء سے ہو گیا تھا۔ اس سے ان کی تین اولادیں زندہ رہیں: اخلاق حسین اور سجّاد حسین دو بیٹے اور عنایت فاطمہ ایک بیٹی۔ خواجہ اخلاق حسین کی صاحبزادی مشتاق فاطمہ کا نکاح آنریبل خواجہ غلام الثقلین سے ہوا تھا، جن کے صاحبزادے خواجہ غلام السیدین مرحوم سابق سکریٹری وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند تھے۔ صالحہ عابد حسین اُن کی بہن ہیں، ان کا اصلی نام مصداق فاطمہ ہے۔ اُردو کے مشہور افسانہ نگار خواجہ احمد عباس کی والدہ مسرورۃ النساء، حالی کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ سجّاد حسین کی صاحبزادی تھیں، ان کا نکاح خواجہ غلام الثقلین کے بھائی خواجہ غلام السبطین سے ہوا تھا۔ اسلام النساء کا ۲۲ اگست ۱۹۰۰ء کو انتقال ہوا۔

۷۷ برس کی عمر میں یکم جنوری ۱۹۱۵ء (۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ) رات کے اوّلین وقت ڈھائی بجے پانی پت میں انتقال فرمایا اور حضرت شاہ شرف الدّین بُو علی قلندر کی درگاہ کے صحن میں (بڑے دروازے سے داخل ہوتے ہی اُلٹے ہاتھ) دفن ہوئے۔

حالی کا کلام کسی تبصرے کا محتاج نہیں، وہ نظم و نثر دونوں کے مسلّمہ استاد ہیں۔ ان کی نثری کتابیں حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، اُردو زبان کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں تو ان کا دیوان اور مسدّس اور نظموں کے مجموعے انھیں صفِ اوّل کے شاعروں

میں معزز جگہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ وہ بڑے جامع شخصیت کے مالک تھے۔ "مقدمۂ شعر و شاعری" اور "یادگارِ غالب" سے فن تنقید میں گہری نظر کا پتا چلتا ہے، تو مسدسِ حالی اور رسوا نخم..یوں سے ان کے تاریخ کے مطالعہ اور روایت و درایت کی محققانہ چھان بین کا سراغ ملتا ہے۔ دیوان سے پرانے رنگِ سخن پر قدرت کا اظہار ہوتا ہے، تو مسدس اور متعدد نظموں سے جو انھوں نے انجمنِ پنجاب کے جلسوں میں پڑھیں، ان کی طبیعت کی آزادہ روی اور ترقی پسندی کا میلان نمایاں ہے۔ انھوں نے مولانا محمد حسین آزاد کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کر کے ہماری فرسودہ شاعری کو نئی ڈگر پر ڈالنے میں جو خدمت سر انجام دی، وہ کسی طرح بھولنے کی چیز نہیں۔ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی یکساں دستگاہ تھی؛ ان زبانوں میں ان کا دیوانِ مختصر بعنوان "ضمیمۂ اردو کلیاتِ حالی مشتمل بر نظم و نثر فارسی و عربی" ان کی وفات سے چند ماہ پیشتر ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا۔ (تحفہ ہند پریس، دہلی)

اردو اور فارسی کلام کا مختصر انتخاب درج ذیل ہے:

اک بندۂ نافرماں، ہے حمد سرا تیرا
قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا

جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے تر تمھارا
رونا نہ ہو گا، حالی! شاید یہ کم تمھارا

اسی ہیں بے خبر حضرتِ دل! کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد، اس کی بھول کر بھی، کبھی تمنا نہ کیجیے گا

خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
عشق سنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید

ہم روزِ وداع اس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو، روتے بھی تو کیا ہوتا

گر صاحبِ دل ہوتے، سن کر مری بیتابی
تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کچھ میری بیخودی سے تمھارا زیاں نہیں
تم جانتا، کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا

عمر شاید کرے نہ آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

ہونگے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دُور ہے رسوائی کا

تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط
اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا

قلق اور دل کا سِوا ہو گیا
دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑیگا مجھے زخم دل
اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا
نہیں بھولتا اُس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے مِلنا بلا ہو گیا

آج امتحاں ہے نالۂ بے اختیار کا
کل ظرف دیکھنا ہے ترے رازدار کا
اک خوشی ہو گئی ہے تحمّل کی، ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوے قتل
کیا اعتبار، زندگیِ مستعار کا

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبط راز تھا
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب
آنے لگا جب اس کی محبت میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ، جان کا اس میں زیاں ہے اب

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینھ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکیگی، گلِ تر کی صورت

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد
گو مے ہے تند و تلخ، پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ! بن پڑیگی نہ کچھ، ہاں کہے بغیر
قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

دل سے خوشیاں ہو گئیں سب گوشہ گیر
نام تھا شاید جوانی کا نشاط
غنچہ چٹکا اور آ پہنچی خزاں
فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط

خود رفتگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم
دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ زلفِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جاکر نظر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
یارب! اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ربط ہم سے، مگر اس قدر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں

خواب راحت میں وہ لذّت ترے اے پیری نہیں
جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم، وہ بات نہیں

مجھ کو تم سے پُر اعتمادِ وفا!
تم کو مجھ سے پر التفات نہیں

قیس ہو، کوہکن ہو، یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

بیقراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے
اب بھی کہتے ہیں، کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے، کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں
بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو

وفا اغیار کی، اغیار سے پوچھ
مری الفت در و دیوار سے پوچھ

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چراتے تھے

وقت رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

حالی اُٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے

یاد آؤ گے بہت، لطف سمجھ کر کیجیے
اس بھلائی کا ہے انجام بُرا، یاد رہے

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت!
ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دیگی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے

فارسی کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

من زرُولیش حسن معنی دیدہ ام
آنچہ دل بُرد ست، آنے دیگر است

چوں منِ غمزدہ ناکام ہمے باید زیست
ہر کرا در شب راحت غم فردائے ہست

به طبعم سازگار افتاد دردش
مرا پرہیز از درماں ضرورست

گر بگیرد، ہمہ عیب است، چہ عیب و چہ ہنر
ور پذیرد، ہمہ زیباست، چہ زیبا چہ زشت

عشق از خویش بریدن می خواست
حالی! از خلق بریدیم عبث

روزِ محشر، کہ ز ہر شیخ و برہمن پرسند
سر دہم قصۂ شوقِ تو، چو از من پرسند
پارۂ بیخبری، نطق مرا درکار است
مے بیارند و ز من نکتۂ ہر فن پرسند
بندہ را نیست مجالِ سخن آنجا، حالی!
ورنہ افسانہ دراز است، گر از من پرسند

لطفِ طاعت چہ بود، نیست اگر ذوقِ نظر
نہ پرستم صنمے را کہ خود آرا نبود
مجلسِ وعظ ملامت گہ و ما غمزدگاں
کم نشینیم بہ بزمے، کہ مدارا نبود

آتش زن صد خرمن و ویران کن صد کشت
برقے ست کہ در نرگسِ شہلاے تو باشد
خرسند نمی سازی و غمگیں نہ پسندی
ناکام کسے کش سر و سوداے تو باشد

جاں گدازند بلطف و بغضب شاد کنند
ہر چہ خواہید ازیں عشوہ گراں، می آید
بعد ازیں راز بصد پردہ نہاں نتواں داشت
عشق می آید و باطبل و نشاں می آید
دوش چیزے ز سخن ہاے محبت نگذاشت
بجز آں حرف، کہ از دل بزباں می آید

آں گوش کہ پُر ز حرف و صوتست
گنجائیِ رازِ ما ندارد
کارم بکسے فتادہ، کز ناز
پرواے نیازِ ما ندارد

شکوہ برلب نباید، عاقبت کیں می شود
زخم را درماں نباشد چوں کہن خواہد شدن

گر بازوے ہمت ہست، دستے بگریباں زن
ور پاے ارادت ہست، لختے بہ بیاباں شو
ساقی بقدح بخشی گو توبۂ ما بشکن
مطرب بنوا سنجی گو رہزنِ ایماں شو
ہم بادہ دما دم خور، ہم بوسہ پیاپے دہ
بے پردہ تر از گل آے، چوں بوے گل ارزاں شو

سر نہ بدرے و خاکِ پاے ہمہ باش
دل دہ بہ یکے و دل رباے ہمہ باش
خواہی شوی آشناے بیگانہ نما
بیگانۂ آشنا نماے ہمہ باش

از شعر و سخن گوشِ جہاں کر بادا
ویں مشغلۂ بیہدہ کمتر بادا
بر ہر کہ دعاے بد کنم، می گویم
یارب! کہ گراں مایہ سخنور بادا

[حالی (انگریزی)؛ مقالاتِ حالی (۱): (ترجمۂ حالی): ۲۶۱-۲۷۰؛ تذکرۂ حالی؛ یادگارِ حالی؛ چند ہمعصر: ۱۳۲ - ۱۵۱؛ اردو (سہ ماہی) جلد ۳۱ و ۳۲]

حباب ـــــــ پنڈت امراؤ سنگھ

۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۰-۲۵ برس تک رڑکی کالج میں ریاضی کے معلّم رہے نظم و نثر دونوں سے مزاولت تھی۔ ایک اخبار بھی جاری کیا تھا جس میں زیادہ تر اُن ہی کے مضامین ہوا کرتے تھے۔

غالب نے مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں امراؤ سنگھ کا یوں ذکر کیا ہے!

امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار اون کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں؛ ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس ہے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے اوس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچّوں کو میں پال لونگا، تو کیوں مصیبت میں پھنستا ہے!

اس خط سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

جس زمانے میں غالب نے یہ خط لکھا ہے، تفتہ ان ایام میں سکندرآباد میں مقیم تھے۔ فحوائے عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ سنگھ بھی ان دنوں سکندرآباد ہی میں تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امراؤ سنگھ کی دو بیویاں یکے بعد دیگرے فوت ہوئیں، اور دوسری بیوی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ مری تھیں۔

۶۵ برس کی عمر تھی، جب ۱۹۰۹ء میں لاہور میں انتقال کیا، جہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔

نمونۂ کلام درج ہے:

گلشن میں گدگدی سے نسیم سحر کی آج ۔۔۔ گل ہنس دیا، تو غنچہ بھی کچھ مسکرا دیا

بہاے بحر جو ہے، گوہر خوش آب سے ہے
دُرِ سرشک سے ہے، آنکھ بے بہا دریا

نسیمِ صبحِ بہار اں سے بزم تھی مری نیند
خروشِ بلبلِ نالاں سے اڑ گئی مری نیند

نگاہِ دیدۂ بیہوش ہیں ہم   صداے نالۂ خاموش ہیں ہم

غُل کرتا ہوا مژدۂ آزادی کا   زنداں سے رہا ہو کے اسیر آتا ہے
ہے ساتھ جو توشۂ توکّل بخدا   آزادِ غمِ جہاں جو فقیر آتا ہے
بیتابی و اضطراب کا نقش مٹا   اے موج! حباب دستگیر آتا ہے

جنوں تعلیم تھی کیا بزمِ شب! جو صبح ہوتے ہی
گریباں پھاڑتے گھر سے، تمھارے ہمنشیں نکلے

[بہارِ سخن: ۱۳۶ - ۱۳۷؛ خمخانۂ جاوید، ۲ : ۳۸۰؛ خطوط غالب: ۶۰]

حزیں ——— میر بہادر علی بریلوی

ظفر کے ولی عہد مرزا فخرو کے مصاحب و مقرب، بڑے وضعدار اور سنجیدہ طبع بزرگ تھے۔ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر نجف علی تھا، جن کے دادا مستقیم الدولہ میر علی بخش مشہور خوشنویس تھے۔ عارف کی زندگی بھر اُن سے اصلاح لی؛ ان کی وفات کے بعد غالب سے استفادہ کیا۔ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ - ۱۸۶۹ء) میں فوت ہوئے۔

سب ناز سہے ہیں نے بیجا و بجا ان کے نبھتی نہ حزیں ان سے، گر میں بھی برا ہوتا

کر دیا شوق نے خوبانِ جہاں کو اُس کے تفتہ دل، سوختہ جاں، خستہ جگر اپنا سا

میرا احوالِ زبوں اُن پہ کھلیگا کیونکر سامنے آئینگے جب وہ، تو سنبھل جاؤنگا

دنیا کی حسرتیں ترے گوشے میں آگئیں اللہ رے وسعتیں تری، اے تنگنائے دل!

دیکھا وہ اپنی آنکھ سے، جو کچھ سنا نہ تھا اور دیکھیے حزیں! ابھی کیا کیا دکھائے دل

یوں کہہ کے رخنے ڈالیے ان کے حجاب میں اچھے بُرے کا حال کھلے کیا نقاب میں

سبُو منھ سے لگائینگے، اب اتنا صبر ہے کس کو کہ بھریے خُم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

اے سوزِ عشق! روز نیا داغ تا بکے اس سے تو تن میں آگ لگا ایک بار دے

حزیں! کس سے توقع ہو وفا کی نہ ہو امید، جب اپنی ہی جاں کی

بیخودی کھو کے، لیے سر پہ ہزاروں جھگڑے توبہ، مے سے ہوئے ہم تو پشیماں اُلٹے

اثر جو آہ میں پایا تو ہو گئی تسکیں وہ بیقرار ہوئے، آ گیا قرار مجھے

بلا سے گر نگاہوں میں ہیں ہلکے سبک ہو کر تو ہم اٹھے جہاں سے

[طبقات الشعرائے ہند: ۴۳۶؛ گلستانِ سخن: ۱۹۹ - ۲۰۰؛ گلستانِ بیخزاں: ۷۵؛ شمیمِ سخن: ۱۱۴؛ بزمِ سخن: ۳۹؛ خمخانۂ جاوید، ۲: ۲۹۷-۲۹۸]

حسین ـــــــ بی خورشید جان دہلوی

دلّی کی رہنے والی ایک طوائف تھی[۵]۔ اس نے بعد کو کلکتہ میں سکونت اختیار کرلی تھی، چنانچہ "تالیفِ یادگارِ ضیغم" کے زمانے میں کلکتہ میں مقیم تھی۔ گلدستۂ "نتیجۂ سخن" میں اس کی غزلوں پر عنوان ملتا ہے:

"بی خورشید جان طوائف متخلص حسین۔ خوشہ چینِ خرمنِ حضرتِ غالب" ان کا دیوان بعنوانِ "دیوانِ حسین" ۱۳۰۳ھ میں کلکتہ میں چھپا تھا (رپن پریس) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید بعد کو حکیم شیخ نبّو صاحب ہلال خوشہ چینِ خرمنِ حضرت شوخی (نادر شاہ) سے مشورہ کرنے لگی تھیں۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

سن کے آواز بلاتا تھا وہ دلبر پہلے
پھروں ہم سر نہ ٹپکتے تھے، ہر در پر پہلے
حالِ دل کہنے کو آیا ہوں، کہوں گا، لیکن
دیکھ تو میری طرف، آنکھ اٹھا کر پہلے
صاف کہہ دیجیے، کیوں اپنی حسین سے ہے غبار
اس طرح تھے نہ کبھی آپ مکدّر پہلے

(نتیجۂ سخن: مئی ۱۸۸۴ء)

جھکتے ہیں شوقِ قتل پہ ہر ہر ادا کے ہاتھ
سچ مچ بنے نہ ہوں کہیں ان کے حیا کے ہاتھ
دل کی طرح سے جب ہوئی تاثیر بیقرار
بیچین ہو کے رہ گئے، یارب! دعا کے ہاتھ

---

۵ میں نے طبع اول میں "یادگارِ ضیغم" کی سند پر ان کا نام خورشید صاحب لکھا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان کا نام بی خورشید جان ہے۔

قربان کس طرح سے نہ ہو دل کی آرزو
نامِ خدا حسین! ہیں حسنِ حنا کے ہاتھ
(ایضاً: اپریل ۱۸۸۵ء)

نالاں و بیقرار ہوں کوچے میں یار کے
لوٹے گئے ہیں قافلے صبر و قرار کے
نالے پہ عندلیب کے، روتے ہو، زاہدو!
کیا شیفتہ ہو تم بھی کسی گلعذار کے
دل سے خیالِ یار کا جاتا نہیں حسین!
شیشے میں رکھ لیا ہے پری کو اُتار کے
(ایضاً: جنوری ۱۸۸۶ء)

گرمیٔ صحبت کا ہے اس رشکِ گل پر یہ اثر
ہے تصوّر سے بھی صورت اس کی کھلائی ہوئی
ان دنوں حد سے سوا ہے پردہ داری کا لحاظ
یاد بھی جب ان کو آتی ہے تو شرمائی ہوئی

[یادگارِ ضیغم: ۱۲۱ - ۱۲۲: خطوط ڈاکٹر حنیف نقوی، بنارس]

حسین علی بیگ، مرزا

ان کا تخلّص معلوم نہیں ہو سکا۔ "ارمغانِ گوکل پرشاد" میں ہے:

> غافل: محمد علی دہلوی خلف مرزا حسین علی بیگ مرحوم شاگرد غالب و ذوق دہلوی۔ بالفعل ہاتھرس کے اسکول انگریزی میں مدرّس ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ایک دیوان اور مثنوی "سرایت عشق" یادگار ہیں۔ حکمت سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ حکیم مشتاق علی کاکوروی کے شاگرد ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسین علی بیگ نے غالب اور ذوق دونوں سے مشورہ کیا تھا۔ ان کے بیٹے محمد علی غافل کے حالات تو گوکل پرشاد کے مندرجۂ صدر اقتباس میں آ ہی گئے ہیں۔

[ارمغانِ گوکل پرشاد: ۶۴]

حقیرؔ ـــــ خوب علی دہلوی عرف میر چھوٹے صاحب

دلّی کے رہنے والے تھے۔ شاہ نصیر کے بعد غالب کا تلمّذ اختیار کیا۔ الور میں راجہ شیو دھیان سنگھ کی سرکار میں ملازم تھے۔ شاہ بہاءالدین دہلوی (معروف بہ عبداللہ شاہ) بشیر لکھتے ہیں کہ حقیر نے ان کو بتایا کہ میرا دیوان الور میں چھپا ہے۔ لیکن میرے قیمت ادا کر دینے کے باوجود انھوں نے دیوان کا نسخہ نہیں بھیجا۔ اس کے بعد بشیر لکھتے ہیں: "ان میں یہ بڑا سخت عیب ہے کہ اوروں کے کام کو اپنا بتاتے ہیں۔ یہ رباعی لکھا گئے ہیں، ۱۲۸۷ھ میں، مگر مجھ کو یقین نہیں کہ ان کی تصنیف ہے":

"ع" سے عین عبادت کا سرانجام ہوا
"ل" وہ لام کہ جس لام سے اسلام ہوا
"ی" بھی یاد رہا بندے کی ہر اک مشکل میں
صدقے جاؤں میں، کہ کیا خوب علی نام ہوا

[تذکرۂ بشیر بحوالہ "اُردو (سہ ماہی)، کراچی" شمارۂ خصوصی بیاد غالب، ۴۵: ۱ (جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء)]

حقیر ـــــ منشی نبی بخش اکبرآبادی

اگرچہ ان کا خاندان اصل میں پنجاب کا رہنے والا تھا، لیکن بعد کو یہ لوگ نقل مکان کرکے دہلی اور پھر آگرے چلے آئے۔ چنانچہ حقیر کے والد شیخ حسین بخش آگرے میں پیدا ہوئے۔ یہ بھی شاعر تھے۔ پہلے تخلص بخشی تھا، بعد کو بدل کر عاصی کر لیا۔ نظیر کے شاگرد تھے۔ آگرے کے محلہ تاج گنج میں رہتے تھے۔ حقیر انگریزی عدالت فوجداری میں سررشتہ دار تھے۔ اور اس علاقے سے مدتوں کول (علی گڑھ) میں مقیم رہے۔ غالب ان کے پایۂ سخن سنجی کے بے حد معترف تھے اور انھوں نے اپنے خطوط میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔ حقیر نے پہلے میاں نظیر اکبرآبادی کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیرؔ سے اصلاح لی، بعد کو غالب سے مشورہ کرنے لگے، اُردو، فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔

ؔ خلیفہ گلزار علی اسیر ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ - ۱۸۰۲ء) میں پیدا ہوئے۔ علوم رسمیہ کی تعلیم اپنے والد سے پائی اور اس میں کوئی خاص دستگاہ بھی نہیں تھی۔ شروع میں مہاراجہ بلونت سنگھ (بنارس) کے پاس ملازم رہے، بعد کو دھولپور چلے گئے؛ یہاں انھیں پانچ روپیہ یومیہ ملتا تھا۔ دوران قیام دھولپور میں ریاست کی تاریخ اُردو میں نظم کی۔ دیوانِ اُردو کے علاوہ ایک مثنوی سوزِ عشق بھی یادگار چھوڑی۔ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں انتقال کیا۔ ان کے ایک شاگرد غلام محمد خان رہاؔ نے چھ کے تخرجے سے تاریخ نکالی۔ ع گفت: "اسیرِ دامِ ہستی شد رہا" یہی قبر پر کندہ ہے۔ آگرے کے اکثر شعرا ان سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے صاحبزادے نثار علی بھی شاعر تھے؛ پذیر تخلص کرتے تھے۔

[شاعر آگرہ نمبر: ۳۵ - ۳۶؛ خمخانۂ جاوید؛ ۱: ۲۹۸]

اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۰ء میں انتقال کیا۔ اولادِ جسمانی میں دو لڑکے عبداللطیف اور نصیرالدین اور ایک لڑکی زکیہ بیگم یادگار چھوڑے۔
حقیر کی وفات پر غالب نے قطعۂ تاریخ کہا تھا:

شیخ نبی بخش، کہ با حسنِ خُلق — داشت مذاقِ سخن و فہم تیز
مرگ ستم پیشہ، امانش نداد — کیست کہ با مرگ بسیجد ستیز
سالِ وفاتش، زپے یادگار — با دلِ زار و مژۂ دجلہ ریز
خواستم از غالبِ آشفتہ سر — گفت مدہ طول و بگو "رستخیز"
(۱۲۷۷ھ)

بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ مختلف جگہ سے جو کچھ ملا، وہی ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ممکن ہے غالب نے جو کچھ ان کی شعر فہمی سے متعلق کہا ہے، وہ درست ہو، لیکن جہاں تک شعر گوئی کا تعلق ہے، ان کے کلام میں کوئی خاص قابلِ ذکر بات دکھائی نہیں دیتی:

سایۂ قصر ترا یاد آیا — پھر ہمیں ظلِّ ہما یاد آیا
زخم کے منھ میں بھر آیا پانی — جب کہ پیکاں کا مزا یاد آیا
پھر گریباں کے اڑینگے ٹکڑے — پھر وہی چاکِ قبا یاد آیا
یدِ بیضا کا جو مذکور ہوا — ان کا نقشِ کفِ پا یاد آیا
خط جو غیروں کو کیے اس نے رقم — ہم کو قسمت کا لکھا یاد آیا
بسکہ مصنوع ہے صانع کی صفت — بت کو دیکھا تو خدا یاد آیا
آج پھر اس بُتِ کافر نے حقیر!
وہ ادا کی، کہ خدا یاد آیا

دیر میں ذکر اپنا، کعبہ میں بیاں اپنا — ایک ہم ہیں اور چرچا ہے کہاں کہاں اپنا
مجھ خفتہ بخت کا جو سُنا ذکر سو گئے — احوالِ غم میں خواب کا افسانہ بن گیا
بڑھ گئی توقیر میری امتناعِ دخل سے — اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، مجھ کو اس کے درباں دیکھ کر
وہ نگاہیں، جن سے تھی مجھ کو تسلی کی امید — تشنۂ خوں، آفتِ دل، دشمنِ جاں ہو گئی
شانے نے بل نکال دیے زلفِ یار کے — موذی کو اس نے زیر کیا مار مار کے [۵]

---

۵ سیدھا کیا ہے موذی کو کیا مار مار کے۔ (تذکرۂ نادر) غالباً اصلاح سے پہلے یہ صورت تھی۔

چلّا اٹھا میں رات کو دھو کے میں یار کے
اب تک خجل ہوں ماہِ فلک کو پکار کے

کیا بیحجاب باتیں وہ مطرب پسر کرے
پردے میں باتیں کرتے ہیں پردے ستار کے

خط کا ابھار عارضِ گلرنگ پر ہوا
شکرِ خدا، قریب دن آئے بہار کے

لاغر ہے قیس، پر نہ حقیر! اس قدر کہ میں[1]
ہے کاہ کوہ آگے مرے جسمِ زار کے[2]

پھر جنوں آکے ہوا دست و گریباں ہم سے
نہ گریباں ہی بچے اب کے، نہ داماں ہم سے

ہم تو چھوڑینگے نہ اس کے رُخ و کاکل کا خیال
کوئی کافر کہے، یا کوئی مسلماں ہم سے

آتشِ دل نے تو سرتا بقدم پھونک دیا
دیکھیں اب کرتے ہیں کیا دیدۂ گریاں ہم سے

کشمکش ہم سے شبِ ہجر کی مت پوچھ حقیر!
ہجر سے تنگ ہیں ہم، تنگ ہے ہجراں ہم سے

فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں!

زخوں فشانیٔ چشم، ترا بخوں گیرند
کہ ہم زتست مرا، آنچہ در دل افتاد ست

در گلستاں گذرش زاں افتد
کہ گل از چشمِ گلستاں افتد

افتد آں سر کہ درو ساماں ست
سرِ ہماں بہ کہ زساماں افتد

خوں شد و کارِ دل افتاد بہ اشک
اشک را کار بداماں افتد

خوں کردہ رواں بسکہ بہر سو مژۂ ما
خونریز تر است از نگہِ او مژۂ ما

آخر چہ قدر خوں چکد از یک صفِ مژگاں
اے کاش کہ بودے بہر ہر مو مژۂ ما

بے روے تو، اے غنچہ دہن! دیدۂ ما را
صد خار خلانید بہ پہلو مژۂ ما

آگاہ نبود آہ کس از خوں شدنِ دل
ایں پردہ بر انداختہ از رو مژۂ ما

ہردم کند ابرام زدل در طلبِ خوں
در گریہ فتاد است چہ بدخو مژۂ ما

سنجد گہر و لعل زبس وقت گرستن
اندر نظرِ ماست ترازو مژۂ ما

جنبید و بہر کوچہ زخوں سیل رواں کرد
ما ناست بداں جنبشِ ابرو مژۂ ما

سرو لبِ جو دید و زخون کرد رواں جوے
اندر غمِ آں قامتِ دلجو مژۂ ما

وقت است کہ طوفاں زپےِ داوری آید
یکسو ست رگِ ابرو، دگر سو مژۂ ما

چوں غرق نباشم حقیر! ایں ہمہ در خوں
برما نکند رحم بہر مو مژۂ ما

---

[1] ہم (ایضاً)
[2] تل ہے پہاڑ سامنے اس جسمِ زار کے (ایضاً)

تراست سہل و مرا سخت مشکل اُفتاد است
بمن ترا و مرا کار با دل اُفتاد است
بمنزلے است، ثباتِ قدم، مرا کہ در آں
ہزار مرتبہ لیلیٰ ز محمل افتاد است
ز خوں فشانیِ چشمم ترا بخوں گیرند
کہ ہم ز تست مرا آنچہ در دل افتاد است
عیاں کہ نور بگیتی کنوں چساں گنجد
رُخت بماہِ منوّر مقابل افتاد است
چگونہ دل ز سراپاے او تواں برداشت
کہ کار با بُتِ شیریں شمائل افتاد است
نہ جاے شکر و نہ راے شکایت است مرا
بکین و مہر نگاہِ تو شامل اُفتاد است
خوش آں کہ خوں بدل و خارِ رہ بپایم بود
ازیں کہ پا بگِل و خار در دل افتاد است
ہلاکِ طرزِ ستمہاے غمزۂ کہ بمن
چہا نکردہ و از کردہ غافل اُفتاد است
حقیر! زود بروں آ ز قلزمِ غفلت
کنوں کہ کشتیِ عمرت بساحل افتاد است

[گلستانِ بیخزاں: ۳۶ – ۶۶؛ اردوے معلیٰ: ۸۳؛ شمیم سخن: ۱۱۸؛ خمخانۂ جاوید، ۲: ۹۰ – ۴۸؛ شاعر (آگرہ نمبر): ۷۲؛ اسعد الاخبار ۱۸۴۷ء نیز ۲۱ و ۳۱ جولائی ۱۹۴۸ء؛ تذکرۂ نادر: ۵۸]

حیدر ـــــ آغا حیدر علی بیگ دہلوی

بزرگوں کا وطن مشہد (ایران) تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ محمد مرتضیٰ مشہدی، نادر شاہ کے حملۂ ہندستان میں ان کے ساتھ آئے (۱۷۳۹ء)؛ خاندان کے اور لوگ بھی ان کے ہمراہ آئے تھے۔ نادر شاہ تو لوٹ مار کرنے کے بعد واپس چلا گیا، لیکن یہ لوگ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ جب امن و امان قائم ہو گیا، تو آغا محمد مرتضیٰ کی محمد شاہ کے دربار تک رسائی ہو گئی اور وہ شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے۔

محمد مرتضیٰ کے پوتے آغا رجب علی بیگ (۱۱۶۷ھ - ۱۲۴۴ھ) صاحب ترجمہ حیدر دہلوی کے دادا تھے۔ آغا رجب علی بیگ کے تین بیٹوں کے نام ہمیں معلوم ہیں: بڑے آغا نجف علی بیگ منجھلے آغا بندہ علی بیگ، اور چھوٹے آغا احمد علی بیگ۔ آغا نجف علی بیگ دلّی میں تھانیدار کے عہدے پر رہے۔ آغا بندہ علی بیگ کثیر الاولاد تھے؛ ان کے پانچ بیٹے ہوئے (کربلائی آغا عبد علی بیگ، آغا حیدر علی بیگ (صاحب ترجمہ)، آغا میرزا علی بیگ، آغا ولایت علی بیگ، آغا اصغر علی بیگ) داغ کے نورتن، ہمارے مشہور شاعر آغا ظفر علی بیگ شاعر دہلوی (ف: ۱۹۴۰ء) انھیں کربلائی آغا عبد علی بیگ کے بیٹے تھے؛ گویا یہ حیدر کے حقیقی بھتیجے ہوئے۔

آغا عبد علی بیگ بھی شعر کہتے تھے؛ فدائی تخلص تھا۔ تیسرے بیٹے آغا میرزا علی بیگ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے؛ شعر بھی کہتے تھے اور اس میں خاص طور پر حضرت امام حسین کے مصائب سے متعلق نوحے لکھنے پر توجہ تھی؛ پڑھتے بھی خوب تھے۔ سب سے چھوٹے آغا اصغر علی مدتوں ایران میں برطانوی قنصل خانہ میں ملازم رہے؛ انھیں انگریزی حکومت کی طرف سے "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔

حیدر کے والد بندہ علی بیگ انگریزی فوج میں ملازم تھے، لیکن کسی وجہ سے استعفیٰ دے کر دلّی میں خانہ نشین ہو گئے۔ بعد کو کرنیل رینی نے انھیں لاہور بلایا اور اپنے رسالے (۱۸ انگا) میں تنخواہ تقسیم کرنے پر بعہدۂ دفعدار مقرر کر دیا۔ انھوں نے اسی عہدے سے پنشن پائی۔ ان کا ۱۸۷۸ء میں دلّی میں انتقال ہوا۔

آغا بندہ علی بیگ کا انگریزوں سے یہ ارتباط ان کے بیٹوں کے بہت کام آیا؛ ان میں سے کئی اصحاب کو آسانی سے ملازمت مل گئی۔ انگریزوں نے اپنا قبضہ مستقل ہو جانے کے بعد آبپاشی کے انتظام کے لیے یہاں گنگا اور جمنا سے کئی نہریں نکالی تھیں۔ حیدر گنگا کی نہر میں سب اوورسیر مقرر ہو گئے تھے۔ اس حیثیت سے وہ بہت دن تک اٹاوہ میں مقیم رہے۔ جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو دلّی واپس آ گئے۔

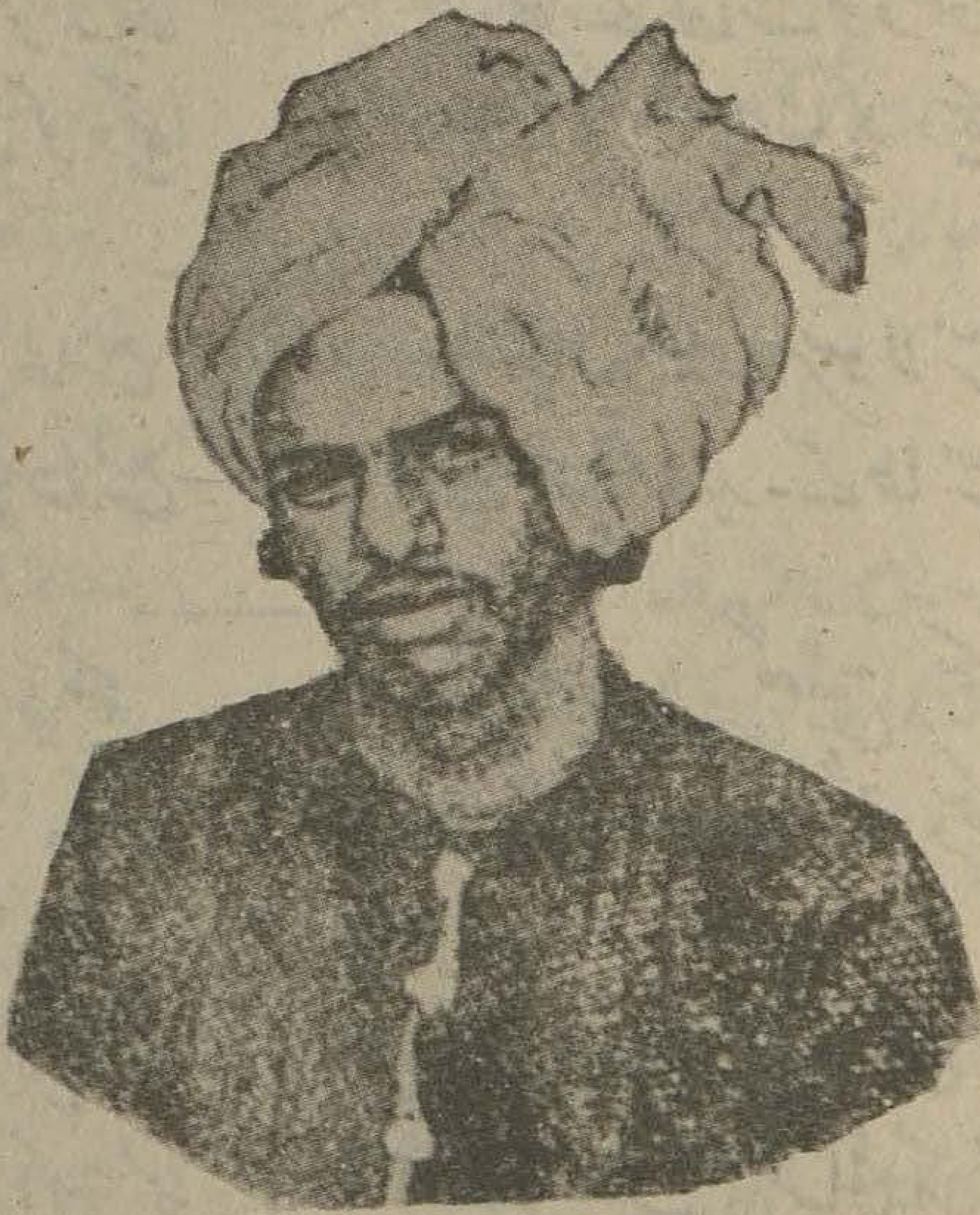
حیدر خاموش طبع شخص تھے، انھیں نمود و نمایش سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ حال آنکہ ان کے زمانے میں کئی گلدستے چھپنے لگے تھے، جن میں ہمعصر شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا، لیکن کہیں حیدر کی کوئی غزل نظر سے نہیں گزری۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ وہ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے؛ اور انھیں نظم و نثر دونوں سے دلچسپی تھی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ان کی تصانیف ہیں۔ ان کا "دیوان نوحہ جاتِ حیدر" (نولکشور، لکھنؤ: ۱۸۹۰ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید مرثیہ بھی کہتے ہوں۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیفات مختار نامہ (اردو)، مثنوی عزیز دل، فغانِ حیدر (واسوخت)؛ رسالۂ قافیہ (منظوم)، افیون نامہ (منظوم) کارزار نامہ (فارسی) کے نام ملتے ہیں۔ افسوس کہ ان کا دیوان تقسیم ملک (۱۹۴۷-۱۹۴۸ء) کے فسادات کی نذر ہو گیا۔

ان کی ایک اور مختصر کتاب "دل کم" (WELCOME) بھی ملتی ہے۔ اس کا مطبوعہ نسخہ آغا سرخوش دہلوی (مقیم کراچی) کے پاس محفوظ ہے۔ دراصل یہ ۱۹۰۳ء کے دلّی دربار کے کوائف کی منظوم داستان ہے۔

ملکہ وکٹوریہ (۱۸۳۷-۱۹۰۱ء) کے انتقال ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کے بعد ان کے فرزند اکبر ایڈورڈ ہفتم بن کر شاہ انگلستان ہوئے۔ یہ لارڈ کرزن کی وائسرائلٹی کا زمانہ تھا جن سے بڑا کوئی شاہ پرست ہندستان نہیں آیا۔ انھوں نے شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کی تقریب منانے کو لال قلعہ دلّی میں

---

۵ نادم سیتاپوری نے اسے ۱۹۱۱ء کا دربار قرار دیا ہے (خیابانِ غالب: ۲۶۰) یہ غلط ہے۔



آغا حیدر علی بیگ حیدرؔ دہلوی

ایک شاندار دربار منعقد کیا۔ ولایت سے ایڈورڈ ہفتم کے برادرِ خُرد ڈیوک آف کناٹ خاص اس دربار کی رونق بڑھانے کو شاہی نمایندے کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اسی موقع پر صنعتِ مرتبع میں مشہور نظم کہی تھی، جو ان کے کلیات (حصّہ اوّل) میں "جلوۂ دربارِ دہلی" کے عنوان سے ملتی ہے۔ اپنے نادر قوافی کے باعث اس کے مندرجۂ ذیل بند ضرب المثل بن چکے ہیں:

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا ۔۔۔ اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا ۔۔۔ حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پُر تھا پہلوے مسجد جامع ۔۔۔ روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع ۔۔۔ سب کے سب تھے دید کے طامع

سُرخی سڑک پر کُٹتی دیکھی ۔۔۔ سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتشبازی چھُٹتی دیکھی ۔۔۔ لطف کی دولت لٹتی دیکھی

اوجِ بخت ملاقی اُن کا ۔۔۔ چرخِ ہفت طباقی اُن کا
محفل ان کی، ساقی اُن کا ۔۔۔ آنکھیں میری، باقی اُن کا

وغیرہ۔

یہ کتابچہ مطبع قیومی، کانپور میں چھپا تھا۔ اس میں حیدر نے شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور ان کی مدح لکھی ہے۔ اس کے علاوہ سرسید تحریک اور دار العلوم علی گڑھ سے متعلق کچھ نیم سیاسی نظمیں ہیں۔ آغا خان کے بارے میں لکھتے ہیں:

سیّد نے جو کہا، وہی آغا نے کر دیا ۔۔۔ سیّد نے سر دیا، مگر آغا نے زر دیا
ہم تیرہ بخت شامِ غریباں سے تھے نڈھال ۔۔۔ آغا نے تحفے میں ہمیں نورِ سحر دیا
چندہ ہو دو کروڑ کا میری ہے یہ دعا ۔۔۔ آغا نے بیس لاکھ ہی اب تک نذر دیا
بیچارہ بے دیار تھی یہ قوم جانگداز ۔۔۔ اب قیصری صلاح سے آغا نے گھر دیا

ایک روایت کے مطابق حیدر کا ۱۹۱۰ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان کسی وقت انتقال ہوا۔

دیوانِ توحہ جات سے قدسی کی مشہور نعت کے مطلع کی چند تضمینیں ملاحظہ ہوں:

اہلِ دنیا کی جو آنکھوں پہ قدم تم نے رکھا — آنکھوں نے اپنا شرف جان کے سایے کو لیا (؟)
اس لیے سایہ نہیں اس قدِ رعنا میں ہوا — دیکھ اعجاز ترا، چشم نے ہر دل کی کہا

مرحبا، سیّد مکّی، مدنی العربی!
دل وجاں باد فدایت، چہ عجب خوش لقبی

ایک انگشت سے شق تم نے کیا جب کہ قمر — تیرے فرماں کے ہوئے تابع وہیں اہلِ خبر
شق ہوا چاند، شہا! جوہنی پڑی تیری نظر — کہتا تھا ہاتھ: مبارک ہو شہِ جنّ و بشر

مرحبا، سیّدِ مکّی مدنی العربی!
دل وجاں باد فدایت، چہ عجب خوش لقبی

پردۂ غیب میں اللہ تھا، یا دستِ خدا — ہے یقیں مجھ کو "یداللہ" نہ بولا ہوگا
پاسِ آداب سے لب اس کے ہوئے ہونگے نہ وا — اس لیے میں یہی کہتا ہوں کہ خالق نے کہا

مرحبا، سیّدِ مکّی، مدنی العربی!
دل وجاں باد فدایت، چہ عجب خوش لقبی

شافعِ روزِ جزا تم ہو، شہِ جنّ و بشر! — تم کو لولاک کہا خالقِ اکبر نے، مگر
لطف کر حیدرِ ناچیز پہ بہر حیدر — وردِ اُس کے یہی کلمہ ہے شہا، آٹھ پہر

مرحبا، سیّدِ مکّی، مدنی العربی!
دل وجاں باد فدایت، چہ عجب خوش لقبی

آخر میں غزل کے چند شعر دیکھیے:

ہوش و حواس دل کو ابھی آئے جاتے ہیں — صورت جو اپنی وہ مجھے دکھلائے جاتے ہیں
ہے دل میں، اُلجھے دامِ بلا میں کوئی شکار — زُلفوں کے بال اس لیے سلجھائے جاتے ہیں
حیدر نہ سونگھی بوئے وفا ہم نے آخرش — ہم گلرخوں کے ہاتھ سے گُل کھائے جاتے ہیں

[یادگارِ ضیغم: ۱۱۶-۱۱۷؛ خیابانِ غالب: ۲۵۳-۲۶۳]

خاورؔ ـــــ مرزا محمد اکبر خاں قزلباش

والد کا نام مرزا محمد مہدی خان تھا اور قوم کے قزلباش تھے۔ یہ خاندان اصل میں سیستان کا رہنے والا تھا مگر خاورؔ کے اسلاف ایک زمانے سے نقل مکان کر کے نواحِ کابل میں آرہے تھے۔ خاور یہیں ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ - ۱۸۴۰ء) میں پیدا ہوئے[1] اور عنفوانِ شباب میں سیر و سیاحت کی ہوا سر میں سمائی تو واردِ ہندستان ہوئے، اور آخر دلّی پہنچے۔ موزوں طبع تھے، شعر کہنے لگے۔ مرزا محمد حسین خراسانی سے مشورہ کرتے تھے۔ ہندستان آنے کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کی خدمت میں بہ نظرِ اصلاح پیش کیا۔ دلّی سے لکھنؤ کی راہ لی۔ اور ذہن کی برّاقی سے تھوڑی مدّت وہاں رہ کر اُردو حاصل کر لی اور مشق سے اتنا ملکہ بہم پہنچایا کہ اہلِ زبان کی طرح گفتگو کرتے اور شعر کہتے تھے۔ اُردو کلام پر میر وزیر علی صباؔ[2] سے اصلاح لی۔

---

[1] یہ نگارستانِ سخن کا بیان ہے۔ اس کے برعکس سخن شعرا (نسّاخ) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد "مقیم اکبر آباد" تھے۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہجرت مرزا محمد مہدی خان نے کی اور جن ایام میں وہ اکبر آباد میں مقیم تھے، خاور یہاں پیدا ہوئے۔ یا شاید باپ بیٹا دونوں ایک ساتھ ہندستان آئے، اور مرزا محمد مہدی خان اکبر آباد میں بس گئے۔

[2] صبا لکھنوی، میر وزیر علی نام، بیٹے تھے میر بندہ علی کے۔ ان کے ماموں میر اشرف علی نے انھیں گود لے لیا تھا۔ آسودہ حال اور یار باش آدمی تھے۔ دو سو ماہانہ واجد علی شاہ کی سرکار سے اور تیس روپے نواب محسن الدولہ بہادر (نبیرۂ غازی الدّین حیدر) کے ہاں سے ملتے تھے۔ کچھ اور جائداد منقولہ و غیر منقولہ بھی تھی۔ غرض بڑے عیش سے بسر کی۔ صبح سے شام تک احباب کا جمگھٹا رہتا اور افیون کا دَور جاری رہتا۔ (دیکھیے اگلا صفحہ)

افغانستان کی پہلی لڑائی (۱۸۳۹ - ۱۸۴۲ء) کے دوران میں انگریزی فوج پر افغانستان میں مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا ہے تو خاور کے بزرگوں نے بعض انگریزوں کو پناہ دی اور ان کی جان بچائی تھی - انگریزوں نے اس خدمت اور ہمدردی کا یہ صلہ دیا کہ ایک خاص نشان مقرر کیا کہ اس خاندان کا جو فرد بھی یہ نشان دکھائیگا، ہر انگریز کا فرض ہوگا کہ اس کی حتی الامکان مدد کرے؛ چنانچہ خاور بھی مورد عنایات رہے تھے۔ لکھنؤ میں ڈاکٹر لوگن ان اصحاب میں سے تھے جو خاور کے والد اور چچا کی مدد سے بچ کر ہندستان واپس آئے تھے - اسی لیے وہ خاور پر بہت مہربان تھے اور ہر طرح ان کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔

یہ لکھنؤ سے نکلے تو جموں جاکر مہاراجا کے متوسلین میں شامل ہو گئے - یہاں سے پٹیالہ پہنچے - ریاست کی طرف سے سو روپیہ ماہانہ مقرر ہو گیا، اور یہیں انھیں خطاب سلطان الشعرا بھی ملا - لاہور سے ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی میں ایک عربی رسالہ "النفع العظیم" نکلا تھا - تھوڑے دن تک اس کے بھی ایڈیٹر رہے - علمی اور تاریخی معلومات بہت وسیع تھیں، اور اکثر فنون میں مہارت حاصل تھی - چنانچہ اپنے زمانے کے اخبارات میں مضامین لکھتے رہتے تھے۔

جس زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں جدید مشاعروں کی بنیاد ڈالی ہے،

بقیہ گزشتہ

شعر میں آتش کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے دیوان "غنچۂ آرزو" ان کی وفات کے ایک سال بعد شائع ہوا (۱۲۷۲ھ)، ان کی مثنوی "صیدیہ" بھی مشہور ہے - گھوڑے سے گرنے کے باعث بدھ ۲۷ رمضان ۱۲۷۱ھ (۱۳ جون ۱۸۵۵ء) کی رات کے پچھلے پہر انتقال ہوا - غلام حسنین قدر بلگرامی نے تاریخ کہی: او فتادہ صبا از اسپ خود (۱۲۷۱) محلہ شاہ گنج، لکھنؤ کے قریب احاطہ نگی بیگ (حال میر نگی) میں اپنی تعمیر کردہ مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے تھے - مسجد موجود ہے، قبر کا نشان مٹ گیا۔

ان کے دیوان کا انتخاب (مرتبہ کاظم علی خان) اتر پردیش اردو اکادمی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے (۱۹۸۲ء) [خمخانۂ جاوید، ۵: ۲۵۳ - ۲۵۸؛ اردوے معلیٰ (ماہنامہ) (اگست ۱۹۰۷ء): ۱ - ۸]

خاور بھی ان دنوں لاہور ہی میں تھے۔ یہ بھی ان مشاعروں میں حصّہ لیتے رہے۔
۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰-۱۸۸۱ء) میں وفات پائی۔ نواب ضیاءالدین احمد خان نیرؔ رخشاں نے تاریخ کہی:-

صد حیف کہ مُرد خاورِ دانشور
آں شاعرِ خوش بیان، معنی پرور
یک سالِ دگر، کاش بماندے زندہ
تا سال شدے کہ "مُرد مرزا خاور"

(۱۲۹۸ = ۱۲۹۹ - ۱)

فارسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

او در دلِ من ست و دلِ من بدستِ او
چوں آئینہ بدستِ من و من در آئینہ

دمِ بادِ بہاری شد چو روح القدس در گلشن
وزاں شد مریمِ گلبن بعیسیٰ گل آبستن

نسیمِ باغ جاں پرور، شمیمِ بوستاں دلبر
صبا را عُود در مجمر، ہوا را مشک در ہاون

نبود سلسلہ جنبانِ کلامم کہ بدہر
بستۂ بندِ وفایش، دلِ آزادِ من ست
غالبِ نامور، آں کش اسد اللہ خوانند
شاہِ ملکِ سخن و مرشد و استادِ من ست

رُباعی

دی شب کہ بکوے میفروشم بردند
دادند پیالہ و ز ہوشم بُردند
ہرچند کہ گفتند حریفاں! "برخیز"
القصّہ نرفتم و بدوشم بردند

ــــہ تذکرہ اختر تاباں (ص ۱۴۹) میں لکھا ہے کہ وزیر النساء بیگم وزیرؔ تخلص، خاور کی بیوی تھی۔ یہ غلط ہے جیسا کہ منشی درگا پرشاد نادر نے اپنے تذکرے گلشنِ ناز (ص ۴۲) میں صراحت کی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وزیراں کی شاگرد ہو، جیسا کہ صاحبِ صبح گلشن (ص ۸۹۰) کا بھی خیال ہے۔

خاور بفلک نزدِ ہنر می بازیم | بیہودہ بایں بوالہوسی می سازیم
نازد ہمہ کس بہ بخت و بر طالعِ خویش | ما خود بنصیبِ دگراں می نازیم

اُردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

معمور ہے داغوں سے سراپا مرے دل کا | مثلِ شجرِ طُور ہے نقشا مرے دل کا
جیتا ہوں نہ مرتا ہوں عجب دکھ میں پڑا ہوں | کیا پوچھتے ہو حال ہے کیسا مرے دل کا
کیا آپ کی مانوں میں بھلا، حضرتِ ناصح! | کچھ حال تمھیں معلوم ہے، قبلہ مرے دل کا

نہ دیکھا ہو جس نے کبھی رقصِ بسمل | وہ آج آ کے دیکھے تماشا ہمارا
ہوئے تم جو اس بے مروت کے خاور! | نہ ہے وہ کسی کا، نہ ہوگا ہمارا

مرنے کا لطف، دیکھ رہا ہوں میں زیست میں
یہ بھی تو ایک موت ہے، مرتا نہیں ہوں میں
کچھ حالِ دل کے کہنے سے ڈرتا نہیں ہوں میں
اس میں بھی ایک بات ہے، کہتا نہیں ہوں میں

[سخنِ شعرا: ۱۴۷ - ۱۴۸؛ نگارستانِ سخن: ۲۶ - ۲۷؛ روزِ روشن: ۱۹۶؛ خمخانۂ جاوید، ۳: ۱۰ - ۱۱؛ دو نایابِ زمانہ بیاضیں: ۱۰۷ - ۱۰۸؛ تاریخ پٹیالہ: ۷۲۲]

خستہ ــــــ محمد کریم الدّین

محمد حشمت علی خان موجد رامپوری (شاگردِ مومن) کے مطبوعہ دیوان (مطبع احمدی، کانپور، محرم ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء) میں قطعہ بعنوان "محمد کریم الدّین صاحب متخلص بہ خستہ شاگردِ غالب" میں ان کے دیوان چھپنے کی تاریخ ہے:

چھپا جب ہر طرح سے پا کے ترتیب | بہ امدادِ خدا دیوانِ خستہ
تو موجد! غیب سے ہاتھ آئی تاریخ | "سنا ہے چھپ چکا دیوانِ خستہ" (۱۲۹۶)

گویا (۱) تلمیذِ غالب تھے؛ (۲) صاحبِ دیوان تھے؛ اور (۳) دیوان ۱۲۹۶ میں چھپا۔

[اکادمی (دو ماہی)، لکھنؤ۔ ۲: ۱۰: ۴۸]

خلیل و فوق ــــــ محمد ابراہیم آروی

ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے؛ غالباً آرہ (ضلع شاہ آباد) کے رہنے والے تھے، اور یہاں محلہ چوک مسجد میں قیام تھا۔ پیشہ کے لحاظ سے محرّرِ عدالت تھے۔ ان کا کلیات نظم ونثر اردو فارسی مطبع نور الانوار آرہ سے ۱۸۷۳ء (۱۲۹۰ھ) میں شائع ہوا تھا۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں یہ غالب سے برابری کے دعویدار تھے، جیساکہ ان کے ایک مقطع سے ظاہر ہے ؎

خلیل ایں غزل گفتم از رُوے دعوا جوابش دہد غالبِ نکتہ آرا

لیکن ۱۸۶۷ء میں یہ اصلاح کی درخواست لے کر غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے معلوم نہیں کہ غالب نے یہ درخواست قبول کی یا نہیں۔ غالب نے ان کے خط کا جو جواب دیا تھا، وہ کلیاتِ فوق میں شامل ہے (ص ۱۴۵ - ۱۴۶)۔ اس سے یہ نہیں کھلتا کہ آیا فی الواقع انھوں نے اصلاح دینا منظور کیا یا نہیں۔ بہر حال فوق کا نام شاملِ تلامذہ کر لیا گیا ہے کیونکہ اس کا امکان ضرور ہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

زنہار اے خلیل! بریں دہر دل مبند یک گوشۂ قناعت و یک بوریا بس است

گویم من از تو چوں کہ زشوقت چہا گزشت برجانِ ناتواں چقدر رفتنہا گزشت

بے رُوے تو گل بدیدہ خار است بد تر زخزاں مرا بہار است

گویم ہمہ عالم بمرادِ دلِ ما باشد — گر یار بکامِ منِ بیدل شدہ باشد

بسانِ غنچہ دلِ من چمن چمن بشگفت — در آں زماں کہ نسیمے ازاں دیار آمد

مفتون، دل! مباش نہ نیرنگیِ جہاں — نرگس صفت بدہر سراپاے دیدہ باش

حُسن تو کرد چناں محو کہ نتوانم گفت — کہ چیا نیم بذکرِ تو سراپا مشغول
ہمرہاں پیش و پس قافلہ رفتند و من — رہ غلط کردم و ماندم بتماشا مشغول

کوئی کہتا ہے کعبہ رخ کو تیرے، کوئی تبخانہ — غرض جھگڑا رہا اے یار! ہر شیخ و برہمن میں

ہوتی فروتنی ہے تنک ظرف سے کہاں — ظاہر ہے دیکھ گردنِ مینا میں خم نہیں
شکوے کا کیا محل ہے، بہر حال شکر کر — دنیا میں، کون ہے، جسے اندوہ و غم نہیں

اشک ہے سرخ، مرا رنگ ہے زرد — حالتِ دل کو بیاں کیا کیجے
بخدا شکر کی جا ہے ہر طور — شکوۂ جورِ بتاں کیا کیجے

صبا کی طرح پھرتے ہیں وہی سرگشتہ جو اے دل!
زیادہ اس جہاں میں پاؤں پھیلاتے ہیں چادر سے

[کلیاتِ خلیل و فوق]

خضر ــــــ میرزا خضر سلطان دہلوی

بہادر شاہ ظفر دہلوی کے بیٹے تھے۔ یہ وہی خضر سلطان ہیں، جن کی پیدائش پر غالب نے کہا تھا:

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر[۵] سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد خاندانِ شاہی کے دوسرے افراد کے ساتھ یہ بھی ۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو مقبرۂ ہمایوں میں گرفتار ہوئے اور اسی دن خونی دروازے کے باہر، اپنے بڑے بھائی میرزا ظہیر الدّین عرف مرزا مغل اور بھتیجے میرزا ابوبکر (خلف میرزا فخرو) کے ساتھ کپتان ہڈسن کی گولی کا نشانہ بنے۔ دوسرے دن تینوں شاہزادوں کی لاشیں، چاندنی چوک میں کوتوالی کے چبوترے کے سامنے پھانسی پر لٹکا دی گئی تھیں۔ وفات کے وقت عمر ۲۶ سال سے متجاوز نہیں تھی۔ ایک لڑکا میرزا محمد عثمان اور ایک

---

۵ اشارہ ہے اکبر شاہ ثانی کی طرف جو خضر سلطان کے دادا اور ظفر کے والد تھے۔ یہ بھی شاعر تھے اور اپنے والدِ مکرم شاہ عالم ثانی کے تخلص آفتاب کی رعایت سے شعاؔع تخلص کرتے تھے۔ ۱۷۵۹ء میں مکند پور ریوان میں پیدا ہوئے اور ۱۸۰۶ء میں تخت پر بیٹھے۔ ۳۱ برس کی حکمرانی کے بعد ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ ظفر انھی کے جانشین ہوئے تھے۔ ظفر نے تاریخ وفات کہی: "عرش آرام گاہِ عالی قدر" آفتاب اور شعاع دونوں باپ بیٹے موتی مسجد (دلّی) کے پاس شاہ عالم بہادر شاہ اول (خلفِ عالمگیر) کے مجر میں مدفون ہیں۔ (خمخانۂ جاوید، ۴: ۵۵۲)۔

لڑکی یادگار چھوڑی - یہ صاحبزادی ان کے بھتیجے میرزا مجاہد الدین شاہی (خلف میرزا مغل) سے منسوب تھیں - میرزا محمد عثمان بھی شعر کہتے تھے، افسر تخلص تھا اور میرزا قادر بخش قادر سے اصلاح لیتے تھے - لگ بھگ ۴۰ برس کی عمر تھی، جب ۱۳۰۶ھ میں فوت ہوئے - میرزا خضر سلطان کے چند شعر ملے:

گالی سے کون خوش ہو، مگر حسنِ اتفاق جو تیری خُو تھی، وہ ہی مرا مدّعا ہوا

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر غیروں پہ کرم ہو، یہ ستم بھی نہیں تھوڑا

جام جمشید کو، آیینہ سکندر کو ملا خضر میں وہ ہوں، کہ حصّے میں مرے دل آیا

کہتے ہو: "وہ بھی ہوس پیشہ ہے، جیسا تو ہے" مجھ سے اک چھیڑ ہوئی، شکوہ عدو کا نہ ہوا

کہتے ہو کہ اک روز تجھے قتل کریںگے پر یہ بھی تو اے شوخ ستمگر نہیں ہوتا

نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی، نہ سن سکتے ہیں کچھ تیری
ہمیں اس وقت میں اے بیوفا! دیکھا، تو کیا دیکھا

[خمخانۂ جاوید، ۳: ۲۵-۲۶؛ نیز ایضاً، ۱: ۳۴۳-۳۴۴]

خورشید ـــــ خورشید احمد لکھنوی ثم دہلوی

شاہ شکور احمد شکور کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کی پانچویں پشت میں تھے۔ ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ - ۱۸۲۰ء) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے[1]۔ بہت سیلانی آدمی تھے۔ ماوراالنہر اور خراسان تک کی سیر کی تھی۔
سلسلۂ نقشبندیہ میں اپنے عم زاد بھائی شاہ رؤف احمد رأفت[2] سے بیعت تھے۔ اور ابتدا

۱؎ طبع اوّل میں ولادت ۱۲۶۵ھ لکھی گئی تھی، جو مبنی تھی "انتخاب یادگار" کے اندراج پر کہ وہاں عمر پچیس برس کی لکھی تھی۔ لیکن جناب کلب علی خاں فائق نے ٹھیک لکھا ہے کہ یہ سہوِ کتابت ہے، عمر پچپن سال ہوگی۔ اسی لیے تبدیلی کر دی گئی ہے (دیکھیے: ماہِ نو، کراچی: جنوری، فروری ۱۹۶۹ء)
۲؎ حضرت شاہ رؤف احمد رأفت بھی حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے والد شاہ شعور احمد رامپوری تھے۔ رأفت رام پور ہی میں ۱۴ محرم ۱۲۰۱ھ (۶ نومبر ۱۷۸۶ء) کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام "رحمان بخش" ہے (مولد لکھنؤ۔ طبقات الشعرائے ہند) جید عالم تھے۔ طریقت میں اوّل شیخ درگاہی سے استفادہ کیا، پھر دلی میں حضرت شاہ غلام علی کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ ان کے بزرگ خلفاء میں ان کا شمار ہے۔ بہت دن بھوپال میں مسندِ ارشاد و ہدایت کی زینت رہے۔ بھوپال کے سب حکمران ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ۴۸ سال کی عمر تھی جب ۵ اپریل ۱۸۳۴ء (۲۵۔ ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ) کو عین سفرِ حج میں عرشۂ جہاز پر انتقال فرمایا۔ نساخ کی کہی ہوئی "قدوۂ جنت رأفت" تاریخِ وفات ہے۔ (انتخاب یادگار، اور شمیمِ سخن دونوں جگہ عمر اور تاریخِ وفات غلط ہے)۔ شاعری میں جرأت کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا شوق تھا۔ جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے (دیکھیے اگلا صفحہ)

میں مشورۂ سخن بھی انھیں سے کیا۔ ان کے بعد شاہ سعد اللہ حیدر آبادی اور شاہ احمد سعید دہلوی سے بھی کسبِ فیض کیا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ مومن کی زندگی میں اُن سے مشورہ کرتے رہے؛ ان کے بعد غالب سے اصلاح لی۔
جب دتّی پر زوال آیا، تو یہ ہجرت کر کے کابل چلے گئے، اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۲۹۱ھ میں مکّۂ معظمہ میں رحلت کی؛ اولادِ جسمانی میں تین لڑکے اور تین لڑکیاں یادگار چھوڑیں۔

کہاں پہلو میں دل خورشید! جس کو ہم تسلّی دیں
جو کچھ تھا آنسوؤں کے ساتھ خوں ہو کر نکل آیا

پھاڑنے کو اور کیا باقی رہا! دستِ جنوں
چاک دامن ہو گیا، پُرزے گریباں ہو گیا

جاتا نہیں آنکھوں سے تصوّر کبھی خورشید!
موجود ہے ہر وقت؛ وہ گویا مرے آگے

نویدِ وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے، خورشید!
کسی طرح کوئی تسکینِ اضطراب تو دے

فارسی کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:
سُوئے چمن اے وائے پریدن نتوانیم
در موسمِ گل ریخت فلک بال و پرِ ما
(باقی گزشتہ)

عروض اور قوافی میں بھی بینظیر مہارت تھی۔ اردو میں چھ اور فارسی میں ایک دیوان اپنے پیچھے چھوڑے؛ ایک معراج نامہ اردو نثر میں اور اردو مثنوی یوسف زلیخا بھی ان سے یادگار رہے۔ اردو میں دو جلدوں میں تفسیرِ رؤفی لکھی۔ اپنے مرشد شاہ غلام علی کے ملفوظات درر المعارف کے عنوان سے جمع کیے۔ بعض اور رسائل بھی جمع کیے تھے۔
رافت کے صاحبزادے جناب مولوی حبیب احمد بھی شاعر تھے۔ ردیت تخلص تھا اور اپنے والد ماجد ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کے استاد تھے۔ ۸۴ برس کی عمر میں ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء (۲۵ جمادی الاوّل ۱۲۶۲ھ) کو بھوپال میں ہیضہ سے انتقال کیا۔ (طبقات الشعرائے ہند: ۲۶۱-۲۶۲؛ انتخاب یادگار، ۲۰؛ ۱۴۳-۱۴۴؛ شمیم سخن: ۱۲۵-۱۲۶؛ نگارستان سخن: ۳۰؛ تذکرۂ کاملانِ رامپور: ۱۴۳-۱۴۷؛ تذکرۂ علمائے ہند: ۶۶-۶۷؛ آثار الشعرا: ۱۱۷-۱۱۸؛ فرح بخش: ۴۴)۔

دیدن بروے خوبِ تو، گیریم جرم ماست
برحالِ زار رحم نکردن، گناہِ کیست!

عاشق و رندم و بیباک، بہ مسجد چہ کنم
اے برہمن! بُت و بت خانہ و زُنّار کجاست

از رقیب آزار، اے دل، گر رسد ہرگز منال
از براے گل جفاے خارمی باید کشید

بے طلب آمد و من ہیچ نہ پُرسم، خورشید!
نالۂ من بدلش خوش اثرے پیدا کرد

از جاے رفتہ ز بد آموزیِ رقیب
لطفے، عنایتے، کرمے داشتی چہ شد
آخر بگو، چگونہ بہ حق مشتغل شدی
خورشید! امہ تقاضنے داشتی: چہ شد

ما لعلِ تو با لعلِ بدخشاں نفروشیم
جنس است گراں مایہ کہ ارزاں نفروشیم

ساقی! بخیز و بادۂ گلگوں بجام کن
فارغ مرا ز وسوسۂ ننگ و نام کن

اے صبا! نکہتِ آں رشکِ چمن باز رساں
مژدۂ دولتِ دیدار بمن باز رساں

مہِ خورشید یک سو، چہرۂ آں سیمتن یکسو
عبیر و مشک یکسو، بوے زلفِ پرشکن یکسو

[سخنِ شعرا: ۱۵۴-۱۵۵؛ انتخاب یادگار، ۲: ۱۲۶؛ خمخانۂ جاوید، ۳:
۶۷-۶۸؛ ہدیۂ احمدیہ بحوالۂ ہماری زبان، ۱۵ مارچ ۱۹۶۲ء: ۷]

درد ــــ منشی ہیرا سنگھ دہلوی

رائے چھج مل کے بیٹے اور منشی جواہر سنگھ جوہر تحصیلدار کے چھوٹے بھائی تھے۔ دہلی میں مسجد فتحپوری اور سرائے احمد پائی کے درمیان گندی گلی میں رہا کرتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی کی سفارش پر کچھ دن روہتک میں ملازم رہے تھے۔ افسوس مزید حالات اور کلام دستیاب نہ ہوسکا۔

[اردوی معلّیٰ : ۲۹۴]

ذکا و بیباک ـــ مولوی حبیب اللہ مدراسی ثم حیدرآبادی

یہ خاندان دراصل بیجاپور کا رہنے والا تھا۔ وہاں سے ان کے اجداد میں سے کوئی صاحب کرناٹک چلے آئے اور یہاں مصطفےٰ علی خان جاگیردار کے ملازموں میں شامل ہو گئے۔ ذکا کے والد حافظ محمد میران نائطی تھے۔

اگرچہ حافظ محمد میران کا سلسلۂ ملازمت اودگیر میں تھا، لیکن ان کے تینوں بیٹے بڑے محمد رحمت اللہ (رسا) اور محمد حبیب اللہ (ذکا) اپنی نانھیال نیلور (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ان سے چھوٹی دو بہنیں بھی تھیں۔

ذکا ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ - ۱۸۲۹ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے "خاش وخماش" کے دیباچے میں خود ہی اپنی تاریخ ولادت "بے خودِ بدخوے" سے نکالی ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی محمد رحمت اللہ رسا سے حاصل کی۔ پھر علوم متداولہ دوسرے اساتذۂ وقت سے پڑھے۔ چنانچہ فارسی پر پوری قدرت حاصل کی اور عربی بھی بقدرِ ضرورت جانتے تھے۔ فارسی میں نظم و نثر دونوں خوب لکھتے تھے۔

شاعری کا شوق بہت کم عمری میں ہوا۔ شروع میں میر مہدی ثاقب سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کے بعد سید میر مرتضیٰ بینش[۵] سے مشورہ کیا۔ شعر و سخن سے قدرتی لگاؤ تھا ہی،

---

۵ سید مرتضیٰ بینش۔ ان کے والد میر صادق علی حسینی سید تھے۔ خاندان کے جدِ اعلیٰ مشہد سے گلبرگہ آئے۔ شاہ ابراہیم مصطفیٰ ان کے بزرگوں میں تھے، جو حضرت خواجہ محمد بندہ نواز گیسو دراز کے ماموں تھے۔ بینش ۱۲۲۶ میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ مادۂ تاریخ ولادت "آفتاب سپہر سیادت" ہے۔ عربی فارسی اور دیگر علوم دینیہ علمائے مدارس سے حاصل کیے۔ شاعری کا شوق ہوا تو پہلے اپنے والد (بقیہ اگلا صفحہ)

ان صاحبِ کمال استادوں کی تربیت سے بہت جلد ترقّی کر گئے اور کرناٹک میں ان کے کلام کی دھوم مچ گئی۔ حاسدوں کی کمی نہیں تھی۔ انھوں نے زک دینے کے لیے جوڑ توڑ کرنا شروع کیے۔ انہی ایّام میں وہاں نواب کرناٹک کی شادی کی تقریب کے سلسلے میں ایک مشاعرۂ اعظم بڑے اہتمام سے منعقد ہوا جس کے کرتا دھرتا نواب کرناٹک کے مصاحبِ خاص شیخ محمد حسین راقم المخاطب بہ شیریں سخن خان بہادر تھے۔ خود نواب صاحب نے بھی اس مشاعرے میں بہت دلچسپی لی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس شاعر کا کلام حاصلِ مشاعرہ ثابت ہو، اسے انعام اور خلعت سے نوازا جائے۔ میر مشاعرہ شیخ محمد حسین راقم ذکا کے مخالفوں میں تھے۔ چونکہ ہر ایک شخص کا خیال تھا کہ میدان ذکا کے ہاتھ رہیگا، اس لیے راقم نے انھیں انعام سے محروم کرنے کے لیے یہ چال چلی کہ مشاعرہ سے ایک دن پہلے اعلان کرا دیا، کہ ہر ایک شاعر اپنا کلام خود سنائیگا۔ ذکا کی زبان میں لکنت تھی اور وہ مجمع میں اپنا کلام خود نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اس اعلان کا صاف مطلب یہ تھا کہ انھیں پڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ اس سے سخت بددل ہوئے؛ اور ۱۲۷۲ھ میں کرناٹک کا قیام ترک کر کے حیدرآباد چلے آئے۔ اس وقت عمر ۲۸ سال کی تھی۔

یہاں وہ سید محمد عبّاس (والد نواب مہدی نواز جنگ) اور عبدالوہّاب صاحب کے ذریعے سے نواب مختار الملک کی سرکار تک پہنچے اور ان کے کاتبِ خصوصی مقرر ہو گئے۔ ان دنوں حیدرآباد میں حافظ میر شمس الدین فیضؔ[۵] کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ بھی ان کے دامن سے

(باقی گزشتہ)

اور بھائی سے اور پھر مولوی میران محی الدّین واقفؔ سے اصلاح لی۔ اس کے بعد حیدرآباد آئے تو یہاں بھی بہت نام پیدا کیا۔ نواب والاجاہ محمد غوث خان بہادر کے دربار سے بزمرۂ شعرا وابستہ تھے۔ ۱۲۶۵ھ میں اہل وعیال کے ساتھ عتباتِ عالیہ کی زیارت کے لیے کربلا اور نجف اشرف چلے گئے۔ کربلائے معلیٰ ہی میں واصل بحق ہوئے۔ روضۂ مبارکہ کے صحن میں آسودۂ خواب ہیں۔ میر مہدی ثاقب، بینش کے بھائی عمر میں ان سے تین برس بڑے تھے۔ انھوں نے واقفؔ کے علاوہ میر مبارک اللہ خان راغب سے بھی مشورہ کیا۔ (صبحِ وطن: ۳۸، ۳۹؛ ۴۹؛ گلزارِ اعظم: ۱۲۱-۱۲۲؛ محبوب الزمن، ۱: ۳۰۴-۳۰۵)۔

۵ میر شمس الدین فیضؔ یہ خاندان اصل میں دہلوی تھا۔ سب سے پہلے ان کے دادا محمد رحمت اللہ خان

(باقی اگلا صفحہ پر)

وابستہ ہو گئے۔ لیکن جب ۱۸۶۲ء میں غالب کا شہرہ سُنا تو ان سے اصلاح لینے لگے۔ ایک شعر میں ان کا ذکر یوں کرتے ہیں:

آں کہ در حضرتِ اُو خامہ بعرضِ ادب است
شاہِ مردانِ سخن غالبِ عالی نسب است

دوسرے شعر میں کہتے ہیں:

قائل ہوں میں غالب کے ذکا، طرزِ سخن کا
ایسا کوئی دلّی میں سخنور نہ ہوا تھا

مدتوں نواب مختار الملک کے میر منشی رہنے کے بعد تعلقدار درجہ سوم مقرر ہوئے۔ لیکن نواب صاحب نے ان کا حیدر آباد سے جانا گوارا نہ کیا اور ان سے کام اپنی پیشی ہی کا لیتے رہے۔ بعد کو ان کی جاگیر کی دیکھ بھال کے لیے علاقہ پر چلے گئے۔ وفات سے پہلے ناگر کرنول میں تعلقدار تھے۔ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴-۷۵ء) میں بعارضۂ فالج انتقال کیا۔ ۴۷ برس کی عمر پائی۔ حیدر آباد کے مشہور شاعر نواب حفیظ الدین خان یاسؔ نے تاریخ کہی:

"مات فی عشق رب حبیب اللہ"

غالباً حیدر آباد کے جنوبی محلہ چنچل گوڑہ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔[۵]

(بقیہ گزشتہ) آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدر آباد آئے۔ فیض کے والد میر امیر الدین تھے۔ فیض ۱۲۱۵ھ میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ "تاریخِ ولادت" وجود مظہر کل" ہے۔ بارہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ عربی فارسی میں بہت اچھی دسترس تھی۔ ناخن سے نقش و نگار بنانے اور لکھنے کے فن میں اچھی مہارت تھی۔ کلام پر اصلاح حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی (شاگرد خواجہ میر درد) سے لی۔ روحانی فیض حضرت ابراہیم علی شاہ سے حاصل کیا، انہی کے خلیفہ بھی ہوئے۔ ۶۸ برس کی عمر میں ۱۳ رجب ۱۲۸۳ھ (۲۱ نومبر ۱۸۶۶ء) کو انتقال فرمایا۔ حیدر آباد میں لال دروازے کے باہر مزار ہے۔ یہاں ہر سال ۱۳ رجب کو عرس ہوتا ہے۔ ان کے شاگرد حکیم محمد مظفر الدین خان مزاج نے تاریخ وفات کہی ؏ شد سال وصال او بوحدت۔ "باللہ وجودِ مظہر کل"۔ اردو فارسی کا مشترکہ دیوان موجود ہے۔ کچھ نثری رسالے بھی لکھے تھے، جن میں سے کچھ چھپے، باقی قلمی رہ گئے۔ دو صاحبزادے تھے، مولوی میر ضیاء الدین احمد اور مولوی میر عماد الدین احمد متخلص بہ وصف۔

(محبوب الزمن، ۲: ۹۱۳-۹۱۸؛ مرقع سخن، ۱: ۱۳۵-۱۴۰)

[۵] میں نے عبد الرزاق بسمل کی سند پر طبع اول میں مشرقی محلے کے قبرستان میں تدفین کا ذکر کیا تھا، لیکن بعد کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ مشرقی محلے کے قبرستان میں صرف مہدوی مسلک کے لوگ دفن ہو سکتے ہیں؛ اس لیے وہاں ذکا کی تدفین کا سوال ہی نہیں، کیونکہ وہ مہدوی نہیں تھے۔

ذکاء نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے ان کے ایک بیٹا محمد میران سُہا ہوئے اور دوسری سے ایک بیٹا محمد اسداللہ۔ حیدر آباد کے مشہور شاعر حبیب اللہ ذکا موخرالذکر ہی کے بیٹے تھے۔ ذکا کا دیوان "خاش و خماش" محمد میران سہا ہی نے مرتب کر کے ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں طبع کرایا تھا۔ اس پر جو مختصر تقریظ غالب نے لکھی تھی، وہ اس کے شروع میں چھپی ہے؛ اور اُردوے معلّیٰ میں بھی شامل ہے۔ غالب کی اصلی تحریر "خاش و خماش" کے خطی نسخے کے ساتھ جامعۂ نظامیہ، حیدر آباد کے کتابخانہ میں محفوظ ہے۔ اردو کلام بھی انھوں نے جمع کیا تھا۔ لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ ان کی ایک اردو مثنوی بھی "جواہر الانسان" یعنی "پند نامۂ ذکا" کے نام سے ۱۲۹۳ھ میں حیدر آباد (دارالطبع سرکار عالی) سے شائع ہوئی تھی۔ یہ نواب مختار الملک کے لیے لکھی گئی؛ اس میں ۳۲ صفاتِ کاملہ کا ذکر ہے۔

اپنے استاد کی تاریخ وفات کہی تھی:

میرے استادِ معنوی غالب — جن کا ہر لفظ معنیِ اعجاز
وحدہٗ لاشریک لہٗ کی قسم — تھے وہ فنِ سخن میں بے انباز
ایسی قسمت کہاں جو میں کرتا — پردۂ چشم صرفِ پا انداز
ہاں سنا ہے کہ ان کے تھے کردار — جیسے گفتارِ حافظِ شیراز
کیا عجب ہے، جو حرمت سے — بخش بھی دے کریم بخشہ نواز
ہند کا انوری و سعدی تھا — متفق اس پہ ہیں سخن پرداز
خود ہی فرما گیا ہے یہ مقطع — پیش بینی کا دیکھنا انداز
"اسداللہ خاں تمام ہوا — وادریغا، وہ رندِ شاہد باز"
پہلے مصرع سے تا بآخر شعر (۱۲۷۵+۱) — سالِ تاریخ کا ہے جلوہ طراز
عیب دانی صفت خدا کی ہے — اک عدد کی کمی میں تھا یہ راز

غالب نے اپنی تنخواہ کے ماہ بماہ کرنے کے لیے بہادر شاہ ظفر سے درخواست کی تھی، جس کا پہلا شعر ہے:

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ — اے جہاندارِ آفتاب آثار

ذکا نے ایک موقع پر ایسی ہی درخواست نواب مختار الملک سالار جنگ کی خدمت میں

پیش کی تھی۔ دیکھیے:

اے خداوندگارِ بندہ نواز / فی المثل، تو طبیب میں بیمار
ہے جگہ رحم کی، ترے آگے / گر میں چلاؤں، روؤں زار نزار
شعر و انشا کی قدر ایک طرف / ہوں میں چودہ برس کا کارگزار
اتنی مدت ہوئی، مگر نہ ہوا / کسی صورت سے ملزم سرکار
یہ سنا تھا، مریدِ نعمت کا / جس خدمت پہ ہے جہاں میں مدار
چاہتا ہی رہا کوئی خدمت / جس میں درماہ ہوے بیش قرار
ہے مری ذات میں وہ استعداد / کہ نہیں میرا شیوہ استعذار
کونسا کام جو نہ دوں انجام / کونسا گھاٹ جو نہ اتروں پار
وعدے ہوتے رہے نوازش کے / مگر ایفا کے کچھ نہیں آثار
نخلِ ماتم نہیں ہوں میں واللہ / کہ نہ ہو میرے لیکھے فصل بہار
شیرِ قالیں نہیں ہوں میں باللہ / کہ نہ ہو میرے حصے ذوقِ شکار
لیک ناکام اپنی قسمت سے / سر بزانو ہوں، پشت بر دیوار
سیکڑوں کامیاب ہوتے ہیں / کیسے کیسے اجانب و اغیار
فی الحقیقت مقامِ حیرت ہے / کہ میں سنگِ نشاں، وہ راہ سپار
یعنی سب پہونچ جائیں منزل کو / میرے آگے سے، اور کروں میں شمار
دردِ دل تو بہت سے ہیں لیکن / مجھ میں تھوڑی سی ہے طاقت اظہار
تس پہ بھی گر زرا تغافل ہو / موت آساں ہے زیست ہے، دشوار
مرتے مرتے بھی یہ دعا دونگا / خضر کی عمر تجھ کو دے دادار
تیرے ہوتے، بلا سے مر جائیں / مجھ سے امیدوار ساٹھ ہزار

بس ذکا! دیکھی تیری لسّانی
باادب ہے، یہ آصفی دربار

اس درخواست پر نواب مختار الملک نے انھیں تعلقدار درجہ سوم مقرر کر دیا تھا، لیکن اس کی صرف تنخواہ ملتی رہی، کام اس کے بعد بھی ان کی پیشی میں کرتے رہے کیونکہ انھیں ان کی علیحدگی منظور نہیں تھی۔

بہت پختہ اور زود گو شاعر تھے۔ ہجو پر بھی پوری قدرت حاصل تھی اور اس میں بیباک تخلص کرتے تھے۔ یہ کلام بیشتر بہت عریاں بلکہ فحش تھا۔ اسی لیے یہ چھپنے سے رہ گیا اور اب اس کے شائع ہونے کی کوئی اُمید بھی نہیں۔

مختصر انتخاب ملاحظہ فرمائیے:

باغِ ہستی میں بہت میں کم رہا — تو بھی رو تا صورتِ شبنم رہا

طوفِ کعبہ سے غرض ہم کو بتوں کی دید ہے — اے جنوں! رہنے دے پردہ جامۂ احرام کا

اے گل! دماغِ خندہ بجا نہیں مجھے — آئی بہار، تو میں چمن سے نکل گیا

وہ مرے خون کا مشتاق، میں نظارے کا — میں اِدھر ہوں، تو اُدھر ہے مرا قاتل بنیا

آئے ہیں بے بلائے، مرے گھر کو وہ ذکا! — بدلا ہے کچھ تو چرخِ ستمگار کا مزاج

بھری ہے سر میں مرے اس قدر ہوائے قدح — کہ اپنے نام پہ لکھتا ہوں "خاک پائے قدح"

پلا دے ایسی ہی ساقی! شرابِ مرد افگن — کہ کوئی چل نہ سکے بزم میں سوائے قدح

قسمت کی بات ہے کہ ملیں زاہدوں کو حور — ہم پر حرام ہو رہے بنت العنب تلک

اتنا جنوں کو جوش ہے فصلِ بہار میں — دل اپنا ہاتھ میں ہے، نہ ہاتھ اختیار میں

جس قدر چاہو، ہوا خواہو! تم بیداد کرو — پر تغافل کے سوا طرز اک ایجاد کرو

عشق میں اور بھی بہت ہیں کام — کیا کروں عمرِ تنگ فرصت کو

شیخ صاحب! مری بھی ہے اک عرض — آپ کرنا معاف جرأت کو

گر ذکا کو لگا ہے عشق کا روگ — کیا اذیت ہے، کہیے حضرت کو!

چھوڑ دوں نالہ، کچھ بھی بات ہے یہ — ناصحو! میرے دم کے ساتھ ہے یہ

عشق کا کب ہو زیست میں انجام! — وہ بڑا سانگ، چھوٹی رات ہے یہ

مایوس نہ کر ڈالے کہیں رنجشِ بے جا — ہم وصل کے وعدے پہ تقاضا نہ کرینگے

دلنشینی تمھارے قامت کی — مصرعِ انتخاب کیا جانے!

چشمِ بد دُور! تری خوش نگہی — نرگس نیم خواب کیا جانے!

اس رخ پہ خطِ سبز نکلنے کے دن آئے — کچھ رنگ زمانے کا بدلنے کے دن آئے

میں نے بازی میں عشق کی، اے زیست! — جیتے رہنے سے شرط ہاری ہے

اب فارسی کے چند شعر دیکھیے:

شادم کہ آخر از گِلِ من جام ساختند … صد شکر آبِ رفتہ در آمد بجو مرا
شرمِ گناہ نیز بطاعت برابر است … باشد ذکا! ز تر شدن آخر وضو مرا

زکوے او دہمت قاصد انشانے چند … ہمی تپند، بہر گوشہ، نیم جانے چند
نشستہ اند، بکویت، بلاکشانے چند … کہ می کشند بجاے نفس، فغانے چند

ہجران تو طاقت و تواں برد … فریاد کہ مایۂ فغاں بُرد
دستِ تو، زہر کہ خواست، جاں بُرد … از دستِ تو جاں نمی تواں بُرد
صبر و دل و دیں، کہ جمع کردیم … عشقت آمد، یگاں یگاں بُرد

برخاستن بہ حشر ہم، آساں نبودہ است … با ایں فتادگی، کہ ذکا من فتادہ ام

خدا نکردہ، خدا گر شوی، چہ خواہی کرد … تو آں بتی کہ ز قہرت حذر تواں کردن

گر یار بسویم نظرے داشتہ باشد … در فکرِ جفاے دگرے داشتہ باشد

پرسید حالِ زار و جوابے نگفتمش … در فکرِ آں کہ یار چنیں مہرباں نبود
بدکردہ ام بخود کہ ترا ماہ خواندہ ام … زیں پیشتر دماغِ تو بر آسماں نبود
خلقے ہجوم کرد ز ہر سُو بدیدنم … صبحِ بہار بود گریباں دریدنم
رفت آں شبِ وصال و ز یادم نمی رود … برجستہ رفتنِ تو و دامن کشیدنم

[گلزار اعظم: ۱۹۷ - ۱۹۹؛ تزکِ محبوبیہ، (۲) دفترِ ہفتم: ۶۳ - ۶۴؛ محبوب الزمن، ۱: ۴۴۳ - ۴۴۶؛ متعلقاتِ غالب: ۱۱۹؛ تحریر (۱۳): ۷۸۔ ۷۹؛ سب رس (غالب نمبر: ۱۹۶۹): ۵۴]

رابطؔ —— میرزا احسن رضا خاں صاحب دہلوی

[تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم: ۳۱؛ تذکرہ سخنوران چشم دیدہ: ۱۸]

راضی ـــــ دیوان جانی بہاری لال جی

ان کے ناگر برہمن بزرگ گجرات سے نقل مکان کرکے بھرتپور میں آبسے تھے راضی کے والد کا نام نتھنی رام تھا۔ قیاس ہے کہ جانی بہاری لال ۱۸۰۷ء اور ۱۸۱۲ء کے درمیان کسی سال بھرتپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آگرہ اور اعظم گڑھ میں ہوئی، جس کی تکمیل بنارس میں کی۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ یہ کہاں تک اور کس نوعیت کی تھی؛ البتہ ان کی تصانیف سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی میں بہت معقول استعداد کے مالک تھے۔

کسب معاش کے لیے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا اور نو برس تک فوجیوں کو پڑھاتے رہے؛ اس سلسلے میں کئی چھاؤنیوں میں قیام رہا۔ محکمے نے سفارش کی اور یہ بھرتپور دربار کی طرف ایجنٹ گورنر جنرل کے وہاں نائب وکیل مقرر ہو گئے۔ پانچ برس بعد یہاں سے نکلے، تو راجپوتانہ ایجنسی میں منشی کا عہدہ مل گیا۔ چار برس یہاں قیام رہا، پھر تین برس تک والی کچھ مہاراج ادھیراج مرزا مہاراؤ سری دیشل جی کے دیوان کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی زمانے میں دربار بھرت پور نے بلا کر گورنر جنرل کے دربار میں وکیل بنا دیا۔ چند مہینے کے لیے مہاراجا سجن سنگھ والی میواڑ کے اتالیق کی حیثیت سے کام کیا تھا کہ مہاراجا بھرتپور نے اپنے ہاں واپس بلا لیا۔ بہت کبر سنی میں یہیں سے ۱۸۹۴ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے، اور پنچ سرداروں میں شامل ہو گئے۔

۳۰ اپریل ۱۸۹۷ء تک پنشن پائی، گویا یہی تاریخ وفات ہے۔ عمر بھر مجرد رہے۔ اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جاداد (آگرہ، بھرت پور، ناگر باڑہ جیپور) اپنے دو بھتیجوں جانی لکھمی لال (پسر چھگن لال) اور جانی موتی لال (پسر چھنو لال) کے نام منتقل کر دی تھی؛ وہی وارث ہوئے۔

دیوان ربیع الثانی ۱۲۷۷ھ (اکتوبر ۱۸۶۰ء) میں مطبع دربار بھاؤنگر سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی مندرجۂ ذیل تصنیفات کی نشاندہی کی گئی ہے:

۱۔ یادگار راضی (۱۲۴۷ھ) نام تاریخی ہے؛ اور غالباً یہی ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ یہ نہایت مبسوط کتاب ہے، جس میں عربی زبان کے قواعد بیان کیے ہیں۔ یہ مطبع

مفیدِ عام، آگرہ سے ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں شائع ہوئی (صفحات: ۷۲)

۲۔ تعریفِ زبان فارسی و انگریزی (۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء) مثنوی میں دونوں زبانوں کے قواعد بیان کیے ہیں۔ یہ (۱۸۵۹ء/ ۱۲۷۶ھ) میں مطبع اعجاز محمدی، آگرہ میں چھپی تھی۔ (صفحات: ۲۳۰)

۳۔ نگارِ راضی (۱۲۸۵ھ) گلستانِ سعدی کا منظوم ترجمہ بشکلِ مثنوی، مطبع مفیدِ عام آگرہ میں غالباً ۱۸۶۹ء میں چھپی تھی۔ (صفحات: ۱۴۲)

۴۔ دلارامِ راضی (۱۲۸۷ھ) بوستانِ سعدی کا اُردو مثنوی میں ترجمہ۔ یہ بھی مطبع مفیدِ عام، آگرہ میں غالباً ۱۸۷۳ء میں طبع ہوئی۔ (صفحات: ۱۳۰)

۵۔ اثر رنگِ راضی (۱۲۸۹ھ) انوارِ سہیلی (کلیلہ و دمنہ) کا منظوم ترجمہ بشکلِ مثنوی۔ مطبع مفید عام، آگرہ میں ۱۲۸۹ھ میں چھپی (صفحات: ۴۷۸)

۶۔ گلِ مقصودِ راضی (۱۳۰۱ھ) مسٹر جے۔ پی۔ الٹرنین سابق پولیٹکل ایجنٹ میواڑ کی انگریزی تاریخ چتوڑ کا اردو نثر میں ترجمہ۔ یہ کتاب اعجاز محمدی پریس، آگرہ میں چھپی۔ (صفحات: ۱۰۲)

ان کے علاوہ بعض اور کتابوں کے نام لیے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، اور بسیار نویس و زُود نویس تھے۔ کچھ مدت راجپوتانہ گزٹ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اپنی سوانح "حسبِ حال" کے عنوان سے لکھی تھی، لیکن یہ کہیں نظر سے نہیں گزری۔ سنسکرت صرف و نحو سے متعلق چارلس ولکنس اور میکس مولر اور مونیر ولیمز کی انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے۔ اخلاقی مضامین سے زیادہ شغف تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

کروں شکوہ میں کیا اس شوخ کی نامہربانی کا
دمِ رخصت دیا مجھ کو نہ اک چھلّا نشانی کا

نہ دوا فائدہ کرتی ہے کسی کی، نہ دعا
چشمِ بیمار نے، کیسا مجھے بیمار کیا

دل بھی دشمن ہوا، اُس دشمنِ جاں کی خاطر
ہم جسے سمجھے تھے اپنا، وہ بھی اپنا نہ ہوا

چھپاتی ہے بدی سیرت کی، صورت
مکاں سے عیب چھپتا ہے، مکیں کا



دیوان جانکی بہاری لال جی راضی

تو چاہ، نہ چاہ مجھ کو، میں تو جی جان سے تجھ کو چاہتا ہوں

پست ہمت روتے رہتے ہیں صدا تقدیر کو
صاحبِ ہمّت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو

مفت رُسوا ہیں چاہ میں تیری کچھ نہ ٹھہرے، نگاہ میں تیری
کوئی چڑھتا نہیں ہے آنکھوں میں ہے جو صورت نگاہ میں تیری
کھینچ لیتا ہے دل کو آنکھوں میں ہے وہ جذبہ، نگاہ میں تیری

برائی سے اچھوں کو ہوتی ہے نفرت تو اچھا ہے، پھر کیوں ترا دل بُرا ہے!

بے وفاؤں سے دوستی کر کے کیوں، دِلا! مفت خوار ہوتا ہے؟

مشکل ہے زندگی ترے بیمارِ عشق کی چاہے کوئی دعا کرے، چاہے دوا کرے

آرام سے جاہل کی گذرتی ہے ہمیشہ عاشق کو یہاں ایک دم آرام نہیں ہے

شیخ جی، آپ کی نصیحت سے عشق اور اُستوار ہوتا ہے
حسن تسخیر سے نہیں خالی عشق بے اختیار ہوتا ہے
بھول جاتا ہے آپ کو، کم اصل کچھ بھی گر اقتدار ہوتا ہے

[تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود: ۶۳ - ۶۴؛ بہارِ سخن: ۱۶۶؛ خمخانۂ جاوید ۴: ۳۴۲-۳۴۶؛ مضامینِ ویریندر پرشاد سکسینہ (ہماری زبان: ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء) قاضی معراج دھولپوری (ہماری زبان: ۸ نومبر ۱۹۶۱ء)؛ زمانہ کانپور: ستمبر ۱۹۳۷ء: ۱۵۳-۱۵۹]

راقم ـــــــ خواجہ میرزا قمر الدّین خان دہلوی

ان کے بزرگ، غالب کے دادا میرزا قوقان بیگ خان کے ساتھ وسط ایشیا سے ہندستان آئے تھے؛ بلکہ اگر مرزا فرحت اللہ بیگ کا بیان تسلیم کیا جائے تو راقم کے پردادا اور غالب کے دادا آپس میں بھائی بھائی تھے۔ اگرچہ یہ دعویٰ غلط ہے؛ تاہم اس میں شک نہیں کہ راقم اور غالب کے بزرگوں کے باہم تعلقات تھے۔

غالب کی سوانحمری میں خواجہ حاجی کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ یہی خواجہ حاجی، راقم کے دادا تھے۔ خواجہ حاجی کے دو بیٹے تھے؛ بڑے خواجہ شمس الدّین خان عرف خواجہ جان (متوفی ۱۸۷۲ء) اور چھوٹے خواجہ بدر الدّین خان عرف خواجہ امان (متوفی ۱۸۷۹ء) خواجہ امان کا نام اردو ادب میں بوستانِ خیال کے مترجم کی حیثیت سے بہت مشہور ہے؛ اس کی ایک جلد حدائق انظار یا معز نامہ پر غالب نے جو دیباچہ لکھا تھا، وہ اردوے معلّیٰ میں بھی شامل ہے۔

خواجہ قمر الدّین خان ۱۸۳۲ء میں دلّی میں پیدا ہوئے اور تعلیم ختم کرنے کے بعد سولہ برس کی عمر میں لال قلعہ میں ملازم ہو گئے۔ اسی زمانے میں بہادر شاہ ظفر سے تیر اندازی سیکھی۔ چندے مرزا فخرو ولی عہد ظفر کے دامن سے بھی وابستہ رہے۔ جب ۱۸۵۶ء میں ان کا انتقال ہوا تو یہ اپنے والد خواجہ امان کے پاس الور چلے گئے، جو ان دنوں وہاں مہاراجا شیو دھیان سنگھ کے اتالیق تھے۔ ۱۸۵۸ء کے مقامی ہنگامے میں جب تمام دلّی والے الور سے نکالے گئے، تو راقم بھی ان کے ساتھ نکلے۔ یہاں سے پہلے جے پور گئے اور وہاں سے دلّی چلے آئے۔ یہاں آ کے اپنے والد کا بوستانِ خیال کے ترجمہ میں ہاتھ بٹاتے رہے۔ جب ۱۸۷۹ء میں امان کا انتقال ہو گیا، تو انھوں نے

اس کی ساتویں جلد کی اشاعت کا انتظام کیا ، جو خواجہ امان چھوڑ مرے تھے اور اس کے بعد خود دو مزید جلدوں کا ترجمہ کر کے انھیں بھی شائع کیا ۔

راقم کے دادا خواجہ حاجی انگریزی حکومت کے وظیفہ خوار تھے ۔ یہ یوں کہ حکومت کی طرف سے جو پانچ ہزار سالانہ پنشن میرزا غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خان کے پسماندگان کے لیے مقرر ہوئی تھی ، اس کی ادائی نواب احمد بخش خان والیٔ فیروز پور جھرکہ کے سپرد کی گئی تھی ۔ انھوں نے خواجہ حاجی کو بھی اس میں شامل کر کے دو ہزار سالانہ ان کے نام کر دیے ۔ چنانچہ انھیں زندگی بھر باقاعدہ یہ پنشن ریاستِ لوہارو کے خزانہ سے ملتی رہی ۔ لیکن جب ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین احمد خاں کو ولیم فریزر کے قتل کے سلسلے میں پھانسی ہوئی تو ریاست سے متعلق تمام ایسے وظیفے دلّی کلکٹری سے ملنے لگے ۔ خواجہ حاجی ۱۸۲۴ء/ ۱۸۲۵ء میں فوت ہوئے ۔ اُن کے بعد یہ پنشن اُن کے دونوں بیٹوں کے نام منتقل ہو گئی اور اُن کے بعد اُن کی اولاد کو ملتی رہی ۔ یہی وجہ ہے کہ راقم بھی اس پنشن میں حصّہ دار بن گئے ۔ اس کے علاوہ انھیں سوائی مہاراجہ رام سنگھ والیٔ جے پور کی سرکار سے بھی معقول وظیفہ ملتا رہا ۔ چنانچہ اسی تعلّق کے باعث یہ دلّی چھوڑ کر مستقل طور پر جے پور جا بسے تھے ؛ اور اپنی عمر کے آخری ۳۱ برس وہیں مقیم رہے ۔ ان کی اولاد اب بھی وہاں ہے ۔

خواجہ قمر الدین خان کی شادی میرزا غالب کے بھانجے میرزا عاشور بیگ کی صاحبزادی سنگی بیگم سے ہوئی تھی ۔ اس بیوی سے انھوں نے اپنی یادگارِ جسمانی تین اولادیں چھوڑیں ۔ دو لڑکیاں ، احمد النساء بیگم اور شمس النسا بیگم اور ایک لڑکا خواجہ امیر الدین خاں ۔ یہ شعر بھی کہتے تھے ؛ آثم تخلص تھا ۔ ان کا انتقال ۱۴ اگست ۱۹۲۱ء (۹ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ) کو ہوا ۔ اولاد میں صرف پانچ لڑکیاں تھیں ؛ فرزندِ نرینہ کوئی نہیں تھا ۔

راقم نے جے پور ہی میں مارچ ۱۹۱۰ء میں اٹھتر (۷۸) برس کی عمر میں وفات پائی ۔ مدفن بھی یہیں سانگانیر دروازہ کے باہر ، رام نواس باغ کے قریب "قدم رسول" کے احاطے میں حکیم محمد سلیم خاں خستہ کے (جن کی کتاب تکشیف پر غالب نے قطعۂ تاریخ لکھا ہے) مزار کے جوار میں ہے ۔ قبر پر کتبہ نہیں ۔ عجیب اتفاق ہے کہ زندگی میں بھی



مرزا قمر الدّین خان راقمؔ دہلوی

دونوں دوستوں کے مکان دیوار بہ دیوار رہے، اور مرنے کے بعد قبریں بھی پاس پاس ہی ہیں۔

۱۹۰۱ء میں کلیاتِ "نغمۂ اُردو" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ (افضل المطابع، دہلی) ایک مختصر مجموعہ "مرقع نعت" کے نام سے بھی شائع ہوا تھا۔ ایک اور کتاب "سبعہ سیّارہ" لکھی تھی جس میں سیّاروں وغیرہ کے حالات ہیں۔ یہ بھی چھپ چکی ہے۔ "عقدِ ثریا" کے نام سے عورتوں کی زبان میں ایک قصّہ لکھا تھا؛ اس کا صرف پہلا حصّہ چھپا۔ دیوان غالب کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ یہ نہیں چھپ سکی، بلکہ غالباً اس کا مسودہ بھی ضائع ہو گیا۔

اگرچہ پختگی اور زبان پر قدرت لفظ لفظ سے ظاہر ہے، لیکن کلام میں کوئی ندرت نہیں۔ اپنے زمانے کے رسمی مضامین کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے، بلکہ واقع یہ ہے کہ بیشتر کلام بے مزہ ہے۔

مختصراً انتخابِ کلام درج کرتا ہوں:

اللہ! میں ہوں اور یہ غمِ وصلِ یار کا — تو جانتا ہے دردِ دلِ بیقرار کا
آجاؤ پھرتے چلتے کبھی غمکدہ میں تم — آنکھوں سے ہم بھی دیکھ لیں آنا بہار کا

ہم نے اس ناز سے دیکھا ہے کسی کو آئے — آج راقم بھی اگر دیکھتا، حیراں ہوتا

مجھ کو وہ یاد کرے، ہوش کی بنوا قاصد! — جس کے لب پر نہ کبھی نام خدا کا آیا

پہلے ہی چشمِ مست تھی اس کی نظر فریب — میری نظر نے اور فسوں گر بنا دیا

اے ہجومِ نااُمیدی! صبر کر — اب زمانہ ہو چکا اقرار کا

طعنِ احباب سہی، سرزنشِ غیر سہی — عشق میں ننگ نہیں چاک گریباں ہونا

یاں بھروسا ہی نہیں سانس کا، آیا آیا — واں ملاقات کا وعدہ بس فردا ٹھہرا

کوئی ہوگا تمھاری خلوت میں — خوش گیا اور شادماں اُٹھا

کیا جنونِ عشق نے خود بیں کیا مجھے — انجام کا خیال نہ آغاز دیکھنا
جاں نذر میں نہ کر سکا، میری خطا سہی — خنجر گلے پہ روکنا کس کا قصور تھا؟

---

۵ گرم کہ وقتِ قتل تپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیزنہ کردن گناہِ کیست
(غالبؔ)

دیکھ کر حضرتِ واعظ کو، خدا کی سوگند — کفر اچھا ہے ہمیں، ہم نے تو ایماں چھوڑا

ناصح! تمھاری بات تو میں مان لوں، مگر — سمجھا کے دل کو لاؤ، وہ نادان تو گیا

آئے تھے اگر ملنے، دم بھر تو ٹکے ہوتے — کچھ میری سنی ہوتی، کچھ آپ کہا ہوتا

قیس و فرہاد کی شہرت ہو، خدا کی قدرت — حوصلہ عشق کا، کس کس نے کیا میرے بعد

کہتے ہو، کسی غیر سے اب ربط نہیں ہے — اچھا، تمھیں سچے سہی، ہم نے بھی سنا اور

مانا کہ وفادار نہیں ہم، تمھیں سچّے — تم سا بھی وفا شیوہ نہیں، نامِ خدا اور

اس کے وعدہ کی انتہا ہے نہ حد — عمر اپنی وفا کرے کب تک [1]

جس بزم میں گئے ہیں، ہنسا کر اٹھے ہیں ہم — جب تم سے بات کی ہے، رُلا کر رہے ہو تم

جینے کا لطف، مرنے کی لذّت کسے نصیب — جو دیکھتے ہیں غم کی فراوانیوں میں ہم

کیوں ہم کو کوئی پوچھے، تعلق نہیں جسے — اچھے ہیں یا برے ہیں، کسی کی بلا سے ہم

کل کون جیے، کون مرے، کس کو بھروسا — مل جاؤ بس اب وعدۂ فردا نہ کرو تم

جفا کر لو، ستا لو، دیکھنا محشر کے میداں میں — کہ دامن ہاتھ میں کس کے ہو، کس کا منھ گریباں میں

زاہد! نجات کے لیے طاعت نہیں ضرور — کچھ بندگی، ذریعۂ عفوِ خطا نہیں

کوچۂ یار ابھی دُور ہے، دل بیٹھ گیا — دشت میں دیکھنے کو سایۂ دیوار نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم، راقم! — یہ تو مسجد ہے، چلو خانۂ خمار نہیں

کیا مستیاں ہیں اُن کو غرورِ شباب میں — ڈوبے ہوئے ہیں حسن کی گویا شراب میں

تیر نظر میں اس کے دونوں چھدے پڑے ہیں
دیوانہ رہ گزر میں، فرزانہ انجمن میں

جان پیاری ہے تو الفت کے کبھی پاس نہ جائے — غیر ہو، کوئی ہو، ہم عام صدا دیتے ہیں [2]

سنتے ہیں نالوں سے تسکین ہوا کرتی ہے — یاں تو کم بخت سوا آگ لگا دیتے ہیں

واں کل کا وعدہ وہ کہ وفا کا گماں نہیں — یاں غم کی رات یہ کہ سحر کا نشاں نہیں

---

۱ تیرے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بیوفائی کی (مومن)

۲ آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے!
اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصان میں نہیں (حالی)

منزل کی ہے تلاش، پتا کس سے پوچھیے — رہرو نہیں، غبارِ پسِ کارواں نہیں

وہ کام نہیں یاں، کہ بنے چارہ گروں سے — وہ درد نہیں یاں، کہ مسیحا سے دوا ہو

ہے اگر فرقت یہی اور ہجر کا آزار بھی — جان سے ہم بھی گئے، ہم سے دلِ بیمار بھی

یادگاروں میں اسدؔ کے ہے یہ بندۂ راقمؔ — کیا ہوا بزمِ سخن میں نہیں شہرت میری

بلا سے اس کی، کسی جان کا زیاں ہو جائے — درازدستیِ قاتل کا امتحان ہو جائے

بلا سے ہم سے نہیں، غیر سے کرو الفت — کسی کا دل تو کبھی شادمان ہو جائے

حسنِ زیبا لاکھ نظروں سے چھپاتے جایئے — اور کھلتا جائیگا، جتنا چھپاتے جایئے

رات سے مضطرب ہے، دلِ راقمؔ! — دیکھ آیا یہ بیقرار کسے!

ہونے کو ہے شاید کوئی سامان خداساز — جو شام سے ہے اور ہی رونق مرے گھر کی

دیر ہو، کعبہ ہو، عشرت کدہ ہو، کوئی ہو — ہم تو مشتاق نہ ہونگے، ترے گھر کے ہوتے

ہم بھی سنتے ہی رہے، آپ بھی کہتے ہی رہے — روز وعدے ہی رہے شام و سحر کے ہوتے

ہائے راقمؔ نہ رہے حضرت غالبؔ سر پر — قدر فرزند کی ہوتی ہے، پدر کے ہوتے

ایک دو دن کا تماشا ہے گلستانِ جہاں — کون رہتا ہے یہاں اور وطن کس کا ہے!

درد کا ضبط نہ کرنا تو ہے میری تقصیر — خامشی شیوہ یہ ہنگامِ سخن کس کا ہے[۵]

تم ہی سمجھو، کہ وفاخو ہے طبیعت کس کی — تم ہی جانو، کہ دلِ عہدشکن کس کا ہے

عشق کی ابتدا میں، اے ناصح! — سوجھتا ہے مآلِ کار کسے

وہ بات ہی گئی، تمھیں تھی جس کی احتیاط — مدت ہوئی کہ عشق کی تشہیر ہو چکی

گردشِ بخت تو تھی ساتھ ازل سے راقمؔ! — یہ بُری ساتھ لگی گردشِ دوراں تیری

تم کہو، دشمن کہیں، ناصح کہے اور ہم سنیں — جو خدا سنوائے ہم کو، بس وہ سننا چاہیے

ہم سے تم کو لاکھ ہونگے، تم سا ہم کو ہے کہاں — تم اگر مل جاؤ ہم کو، پھر ہمیں کیا چاہیے

[مضامینِ فرحت: ۵: ۱۹۵-۲۸۵؛ ذکرِ غالب: ۳۱-۳۲، ۵۲-۵۴؛
احوالِ غالب: ۲۹۰-۲۹۴؛ خمخانۂ جاوید، ۳: ۳۵۵-۳۶۱]

۵ یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں (غالب)

رُسوا ــــــ شیخ محمد عبدالمجید غازی پوری ۵

شیخ امداد علی کے بیٹے تھے تقریباً ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ - ۱۸۵۰ء) میں غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے اکثر اعزہ و اہلِ خاندان سرکارِ انگریزی میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن تھے۔ شروع میں ان کا ارادہ وکیل بننے کا تھا۔ چنانچہ امتحانِ وکالت کی تیاری کے لیے آگرے آئے اور شاہ اسد علی ڈبل ہائی کورٹ کی پیشی میں کام سیکھنے لگے۔ بعد کو سفرِ دلّی کا اتفاق ہوا اور یہاں غالب کی خدمت میں رہ کر نظم و نثرِ فارسی کی مہارت پیدا کی۔ دو سال بعد غالب کی وفات ہوگئی تو یہ واپس آگرے آگئے۔ ان دنوں آگرہ بھرتپور سڑک زیرِ تعمیر تھی، اس میں یہ بطورِ محرّر کام کرنے لگے۔ بعد کو دل برداشتہ ہو کر اس سے استعفیٰ دیدیا۔

اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ اُردو میں مرزا حاتم علی مہر سے اور فارسی میں غالب سے اصلاح لی۔ بہت پُرگو تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

اُردو:

کہا میں نے ذرا ٹھہرو، تو دل اے دلربا ٹھہرے
کہا اس گیسوؤں والے نے اب کس کی بلا ٹھہرے

نہیں کچھ فصلِ گل بھی دُور، گر ہے زندگی باقی
خزاں کی یہ مصیبت جھیل لے بلبل! ذرا ٹھہرے

قدم پڑتا نہیں ہے، جب کہیں پر فرطِ مستی میں
تو پھر رُوئے زمیں پر کیا برابر نقشِ پا ٹھہرے

---

۵ خمخانۂ جاوید (۳: ۴۰۳) میں نام محمد عبدالحمید لکھا ہے، لیکن تذکرۂ شعر و سخن میں جو حالات ان کے خود نوشت شائع ہوئے ہیں، وہاں نام محمد عبدالمجید ملتا ہے، شعر و سخن زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔

نہیں ملتی رہِ ملکِ عدم، اب کس طرف جائیں
نہ سنگِ رہ یہاں، نے کارواں کہ نقشِ پا ٹھہرے
مسلماں ہو کے بُت پوجے ہمیشہ تم نے، اے رسوا!
قریبِ مرگ ہو، اب دیکھیے، انجام کیا ٹھہرے

فارسی:

محو شد آں کافرِ ترسا بترسائے دگر
واجب آمد بہرِ ہر فرعون موسائے دگر
یا گہر می جوشد، از لعلِ تبسم ریزِ تو
یا بہ چرخِ حسنِ تاباں، شد ثریائے دگر
طاعتِ محرابِ ابروے و طوافِ کوے تو
غیر ازیں در دل نمی دارم تمنّائے دگر
کردہ ام بسیار عصیاں، یا شفیع المذنبیں!
جز جنابِ تو ندارم، ہیچ ملجائے دگر
در جہاں تا آمدم، از خود نمی دارم خبر
ساقیِ ما ریخت در جامم چہ صہبائے دگر
فاش میگویم، میانِ عاشقاں، گر بشنوی
ہمچو من اے جاں! نخواہی یافت رسوائے دگر

[شعر و سخن: ۴۵-۴۸]

رشکی — نواب محمد علی خان بہادر جہانگیرآبادی

نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدِ عالی مقدار کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ مفتی صدر الدین خان آزردہ سے عربی پڑھی۔ بعد کو انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے، اور اس میں بھی کافی دستگاہ پیدا کر لی تھی۔ جس زمانے میں حالی جہانگیر آباد میں تھے۔ یہ بھی اُن کی اتالیقی میں رہے۔ اپنے والدِ بزرگوار کی وفات کے بعد جاگیر کے وارث ہوئے۔ اپنی سادہ مزاجی اور اولوالعزمی اور قومی ہمدردی کی وجہ سے "رعایا اور سرکار دونوں میں نہایت ہر دلعزیز اور نیکنام تھے"۔ چنانچہ ضلع بلند شہر میں انھیں مجسٹریٹی کے اختیارات حاصل تھے۔ ۱۸۹۰ء میں صوبجاتِ متحدہ کی طرف سے وائسرائے لارڈ لینسڈاؤن کی کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ پانچ سال بعد ۱۸۹۵ء میں خان بہادری اور نوابی کے خطاب ملے۔ نواب سر حامد علی خان والیِ رامپور کے زمانۂ نابالغی میں انھیں انتظام ریاست میں مدد دینے کے لیے کونسل مقرر ہوئی تھی، جس میں محکمۂ مال (ریوینو) کے ممبر خان بہادر سید علی حسن تھے۔ انھوں نے بعارضۂ تپ دق اپریل ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا، تو اُن کی جگہ نواب صاحب موصوف نے سرکارِ انگریزی کی منظوری سے نواب محمد علی خان رشکی کو اپنی کونسل کا ممبر مقرر کر دیا۔ اس عہدے کی تنخواہ بارہ سو روپے ماہوار تھی۔ یہ ۴ مئی ۱۸۹۵ء کو اس عہدے پر متمکن ہوئے۔ یکم جون ۱۸۹۶ء کو یہ کونسل ٹوٹ گئی اور نواب صاحب کو اختیاراتِ کاملہ حاصل ہوئے۔ چنانچہ رشکی بھی اس عہدہ سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد اُن کے چھوٹے سوتیلے بھائی نواب محمد اسحاق خان ریاست میں مدار المہام بن کر تشریف لے گئے۔

رشکی ۹ محرم ۱۳۱۷ھ (۲۰ مئی ۱۸۹۹ء) کو دلّی میں لاولد فوت ہوئے۔ ہاتھ پر کاربنکل نکلا تھا؛ وہی موت کا بہانہ بن گیا۔ اپنے والدِ گرامی کے پہلو میں سلطان جی میں مدفون ہیں۔ میر مہدی مجروح نے قطعۂ تاریخ لکھا

زہے امیر محمد علی نجان مشہور — کہ بُد عقیل و فہیم و ذکی و خوش تقریر
زفیضِ بذل و عطا بود در زمانہ سمر — بہ نظم و نثر سخن بود بے عدیل و نظیر
ہزار حیف کہ آں قدر دانِ اہلِ ہنر — بسوئے ملکِ بقا شد ازیں سرا دلگیر
پے سنینِ وفاتش خرد بمن فرمود — بگوے "رفت ز دنیائے امیر ابنِ امیر"

(۱۳۱۷ھ)

مولانا حالی کی کہی ہوئی تاریخِ وفات میں مادّہ "بخشش زحق" (۱۳۱۷ھ) ہے ان کا قطعہ حسبِ ذیل ہے:

محمد علی خاں رئیسِ سُترگ — کہ در مردمی بُرد از اقراں سبق
بناگاہ بر بست رختِ سفر — جگرہا ازیں غصّہ گردید شق
چو بر بخششِ حق بسے تکیہ داشت — شدش سالِ تو دیع "بخشش زحق"

(۱۳۱۷)

اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

بے وفا تجھ سے کیا نہیں ہوتا — ایک وعدہ وفا نہیں ہوتا
قیس کی دھوم مچ رہی ہے مگر — عشق اس سے سوا نہیں ہوتا
شائبہ جور کا نہ ہو جب تک — لطف میں کچھ مزا نہیں ہوتا
چھیڑ دیتے ہیں اُن کو ہم بھی کبھی — گرچہ کچھ مدّعا نہیں ہوتا
ایک رشکی! ہمیں نہیں ہوتے — ورنہ واں اور کیا نہیں ہوتا

کیا کیا بنا کے ہم نے سُنایا رقیب کو — مضمون تیرے نامۂ اُلفت طراز کا

رنجش کا گرچہ کوئی سبب درمیاں نہ تھا — لیکن وہ آپ صلح کریں یہ گماں نہ تھا
مانگی جو اس نے جان، تو عذر و تأمّل بھی — حال آنکہ اک ہنسی تھی فقط، امتحاں نہ تھا
چارہ گر! فکرِ علاجِ دلِ وحشی ہے غلط — کوچۂ یار ہی چھوٹا، تو گلستاں کس کا
شکوے ہمارے سارے غلط ہی سہی مگر — لو، تم ہی اب بتاؤ، کہ کس کا قصور تھا



نواب محمد علی خان رشکی جہانگیر آبادی

کیا بتا ظلم کوئی یاد آیا — ہم پہ کیوں آج مہرباں ہیں آپ!
لائقِ قتل، میں ہی ٹھہرا ہوں — سچ تو یہ ہے، کہ قدر داں ہیں آپ

بیقراری ہے کم ہماری آج — کیا نظر بھر گئی تمھاری آج
وہ منانے کو آئے ہیں رشکی! — نبھ نہیں سکتی وضعداری آج

ہے دگرگوں ابتدائے عشق میں رشکی کا حال — رحم آتا ہے مجھے اس کی جوانی دیکھ کر

فرصت نہیں ہے اپنے ہی عالم کی سیر سے — فرصت بھی ہو تو رخصتِ سیرِ چمن کہاں
یہ منصبِ بلند، ملا جس کو مل گیا — ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

آئے تو اپنا حال، کچھ اُن سے نہ کہہ سکا — کیا جانے، ہو گیا مجھے کیا اضطراب میں

پیشتر وقت سے مرنا، سو وہ امکاں میں نہیں — اور جینا بھی کچھ آساں شبِ ہجراں میں نہیں
اہلِ دل سے نہ کبھی آپ سنیں گے نالہ — چاک دل میں ہے، مگر چاک گریباں میں نہیں

محبت ہے بہت مجھ کو کسی سے — خوش آئے آپ کو بھی گر بیاں ہو
کریں کچھ چھیڑ ان سے آج، رشکی! — اگر تم بھی ہمارے ہمزباں ہو

تم سے گلہ نہیں ہے، ہمارا قصور ہے — اوپر اٹھائیے نگہِ شرمسار کو

مزا الفت کا، جانِ زار سے پوچھ — یہ نکتہ واقفِ اسرار سے پوچھ
بھلا رشکی کو، قدرِ فصلِ گل، کیا! — یہ کیفیت، کسی میخوار سے پوچھ

وہ باتیں، جو کہ اُن سے تھیں چھپانی — غضب ہے، کر رہا ہوں میں انھیں سے
ہزاروں مہر و الفت کی ادائیں — سمجھ لیتے ہیں ہم تیری "نہیں" سے
نہیں ہیں سب سے یہ برتاؤ اس کے — مگر کچھ لاگ ہے، رشکی تمھیں سے

ہر چند دل سے اس کو بھلاتا رہا مگر — یاد آ گیا، کسی نہ کسی بات پر مجھے
ایسی کہانیاں کہیں رشکی نے دردخیز — کمبخت نے نہ سونے دیا رات بھر مجھے

۱۲۶۴ھ کے ایک طرحی مشاعرے میں انھوں نے مندرجہ ذیل غزل پڑھی تھی۔ طرح تھی: یہ مدّعی بغل میں چھپایا نہ جائیگا۔

بے چنگ و نے یہ قصّہ سنایا نہ جائیگا
بے بادہ شوقِ وصل جتایا نہ جائیگا

پردہ اٹھا دیا ہے، تو کچھ سوجھتا نہیں
یہ پردہ زینہار اُٹھایا نہ جائیگا

جان التیام دشمن و دل انقطاع دوست
رُوٹھو نہ تم، کہ ہم سے منایا نہ جائیگا

آنکھیں ملانے میں ہے عبث تم کو احتراز
آنکھیں ہیں، دل نہیں کہ ملایا نہ جائیگا

نبضیں چھٹی ہیں، آنکھوں میں دم ہے، لبوں پہ نام
آؤ کہ کوئی دم میں بلایا نہ جائیگا

کچھ دیر خلوت اور رہتی تو خوب تھا
جلوت میں حرفِ شوق سنایا نہ جائیگا

جاتے ہیں راہ بھول کے وہ مدعی کے گھر
کیا ہم سے اُن کو راہ پر لایا نہ جائیگا

آتش فشاں ہے عشق، پھر اب کوئی کچھ کہے
شعلۂ شوق ہم سے بجھایا نہ جائیگا

افسوں ہوں گر ہزار، یہ وحشت نہ ہوگی کم
جب تک فسانہ ان کا سنایا نہ جائیگا

گر ایک بار رُخ سے نقاب اُن کے اُٹھ گیا
پھر رازِ دل کسی سے چھپایا نہ جائیگا

رشکی بھی آج بیٹھ گیا بزمِ دوست میں
دشمن تو یہ نہیں کہ اٹھایا نہ جائیگا

[اخبار الصنادید، ۲: ۳۶۱ و ۳۶۷؛ خمخانۂ جاوید، ۳: ۴۲۲-۴۳۲؛ ادیب (فیروز آباد، ضلع آگرہ) ۱: ۵-۶؛ ماہِ نو (ماہنامہ، کراچی) جنوری۔ فروری ۱۹۶۹: ۶۸]

رضوانؔ ——— میرزا شمشاد علی بیگ خان دہلوی

نواب میرزا عالم بیگ کے صاحبزادے اور مرزا قربان علی بیگ خان سالک کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۲۵۳ھ (۳۸-۱۸۳۷ء) میں پیدا ہوئے۔ غالب سے فارسی پڑھی، اور انھیں سے کلام پر اصلاح لی۔ الور میں ملازم تھے۔ پہلے وکیل، پھر ڈپٹی مجسٹریٹ رہے۔ شطرنج کا بہت شوق تھا، اور کھیلتے بھی خوب تھے۔ نواب علاء الدین احمد خان علائیؔ نے ریورنڈ وہیٹلی صاحب کے ایما پر ایک سوسائٹی "جلسۂ شطرنج دہلی" کے نام سے قائم کی تھی، جس کا مفصّل ذکر علائیؔ کے ترجمے میں دیا گیا ہے۔ رضوان بھی اس کے رکن تھے۔ اس سوسائٹی سے متعلق انھوں نے ایک مختصر رسالہ "بساطِ فرنگ" کے نام سے لکھا تھا، جو ۱۸۶۷ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ اور بھی چند رسالے نثر میں لکھے۔ بہت صالح اور طاعت گزار جوان تھے۔ چالیس برس کی عمر تھی، جب ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں دلّی میں انتقال ہوا۔ بڑے بھائی سالک نے تاریخ کہی:

روزے کہ برادر از جہاں رفت   گفتیم کہ وائے، وائے رضواں
از "عالم بے مدار" بگذشت   گردید بہ "خُلد جائے رضواں"
(۳۹۸)   (۱۲۹۳=۳۹۸-۱۰۵۷+۶۳۴)

سالک کا مرثیہ بھی موجود ہے۔ لاولد فوت ہوئے۔

طبیعت بہت دقّت پسند اور مضمون آفریں پائی تھی۔ معمولی بات کو بھی پیچ سے کہنے کا شوق تھا۔ چند شعر دیکھیے:

گم گردگانِ راہ کو ہو نقشِ پا دلیل   مل جائے گر نشان ترے پایمال کا
آئینہ دارِ ذات ہے، آئینہ صفات   ہے ذرّہ ذرّہ آئینہ اس کے جمال کا

دیتے ہیں بے طلب مِرے مقصد بقدرِ ظرف
شرمندہ اے کلیم ہوا کیوں سوال کا
شیریں ہے کیا جواب ترا، گو خلاف ہے
منھ بند کر دیا ہے مکرّر سوال کا
صحرا ہے اور میں ہوں، مرا سر ہے اور کوہ
کیا پوچھتے ہو حال، مجھ آشفتہ حال کا
رضواں! خدا کو مان، یہ ظاہر پرستیاں
کم بخت! کچھ بھی خوف ہے تجھ کو مآل کا

کیا لطف زندگی دلِ غم مبتلا کے ساتھ
سیرِ جہاں کو آئے بھی تو کس بلا کے ساتھ
گر جاؤ گے نظر سے، جو ٹوٹی وفا کی آس
جانے بھی دو کہ ضد نہیں اچھی وفا کے ساتھ
شرمِ ستمگری سے بن آتا نہیں انھیں
انداز لطف کا دلِ غم آشنا کے ساتھ
بیتابیاں نہ کیونکہ ہوں، آئینہ دارِ راز
شوخی غضب ہے اس کی نگاہِ حیا کے ساتھ
ہم پاسِ وضع سے رہے، ناکام بیشتر
نازک دماغیاں بھی ہیں یاں التجا کے ساتھ
ہم مر گئے خوشی سے، وہ یاں آئے اس طرح
یہ ظلم کس سے کہیے، کہ مارا وفا کے ساتھ

کہ چکے آپ، سن چکے ہم، پھر
کہتے ہو، کہیے، ماجرا کیا ہے
خود تماشا ہے، خود تماشائی
کون جانے وہ خود نما کیا ہے
میں تو موسیٰ نہیں کہ ہوں محروم
جلوہ پردے میں، اے خدا کیا ہے
دل لگا ایسے بھولے سے رضواں!
جو سمجھتا نہیں، ادا کیا ہے

میری فریاد سے ظاہر ہے بیانِ دہلی
دلِ خوں گشتہ پہ ہے داغِ زبانِ دہلی
ہم کو معلوم تصور سے ہوا ہے اتنا
عرش سے بڑھ کے ہے کچھ رفعتِ شانِ دہلی
کحلِ مازاغ لگاؤ تو کھلے راز کہ ہے
چیدۂ عالمِ ارواح جہانِ دہلی
شہرِ دہلی کو اگر ہند کا دل کیجیے فرض
حضرتِ قلعہ کو ٹھہرائیے جانِ دہلی
ہم نے پائے نہ ہنرمند کہیں دلّی سے
ہم نے دیکھا نہ کوئی شہر بسانِ دہلی
چھوڑ دے زہد کو، زنّار پہن لے زاہد
یک نظر دیکھے جو اندازِ بتانِ دہلی
گر نہ ہوں ہم تو ہو بازار میں گرمی کیونکر
ہم ہی تھے جنسِ گراں ارزِ دکانِ دہلی
ہے عدم کی تجھے منظور، خدایا رونق
کہ اٹھایا انھیں، جو لوگ تھے جانِ دہلی
کیا بتاؤں کہ ہوں کس صدمہ سے رضواں خاموش
دلِ خوں گشتہ پہ ہے داغِ زبانِ دہلی

[خمخانۂ جاوید، ۳ : ۵۴۷-۵۱؛ فغانِ دہلی: ۵۵۔ مکتوب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بنام مؤلف]

رضوان ـــــ نواب محمد رضوان علی خان بہادر عرف محمود اختر مرادآبادی

مرادآباد کے رؤسا میں سے تھے عضد الدولہ نواب محمد عظمت اللہ خان بہادر ناظم روہیلکھنڈ ان کے جدِ اعلیٰ تھے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم زمانے کے رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔ علومِ متداولہ میں اچھی خاصی دستگاہ تھی۔

جس زمانے میں غالب رامپور گئے ہیں، یہ ان کے شاگرد ہوئے۔ غزل کی طرف کم توجہ تھی، نعت سے زیادہ شغف تھا۔ جب حج کے لیے گئے تو مدینۂ منورہ میں روضۂ اقدس پر اپنی مشہور نعت پڑھی، جس کا مطلع ہے:

اِترائیں نگاہیں، جو پڑیں سُوئے محمدؐ
دل لوٹ گیا، دیکھتے ہی رُوئے محمدؐ

اس پر حاکمِ مدینہ خالد پاشا نے حسّان الہند کا خطاب دیا۔ یہ نعت بہت مقبول ہوئی اور مدّت تک طرح ہوتی رہی۔ امیر مینائی نے اسے تضمین کیا ہے۔ مولوی فرید احمد وفاؔ مرادآبادی نے بھی اسے تضمین کیا۔ خود رضوان نے اسے مختلف ڈھنگ سے تضمین کیا یعنی مثلث، مخمس، معشّر وغیرہ، اور ان تمام تضمینوں کو "طغرائے کمال" کے تاریخی نام سے ۱۳۱۱ھ میں شائع کیا۔

اس نعت کی مقبولیت کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ مشہور مسیحی شاعر جارج پیش شورؔ[۵] نے

۵ جارج پیش شورؔ نے اوائل میں مرزا رحیم بیگ میرٹھی سے مشورہ کیا۔ پھر قطب الدین مشیرؔ دہلوی اور ان کے صاحبزادے میاں غلام دستگیر سے اصلاح لی اور خود استادی کا درجہ حاصل کیا۔ بہت قادر الکلام شخص تھے۔ اردو میں ایک مثنوی (خود نوشت سوانح عمری) اور چھ دیوان موجود ہیں۔ "گلشنِ فرنگ" فارسی کا دیوان اس کے علاوہ ہے۔ عربی اور ہندی بھی خوب جانتے تھے، بلکہ ہندی میں تو ان کی ٹھمریاں اور

ردیف میں محمدؐ کی جگہ مسیحا لکھ کر اسے تضمین کیا۔ اس سے جناب رام بابو سکسینہ کو دھوکا ہوا ہے اور انھوں نے اپنی کتاب "یورپین اور انڈو یورپین شعرائے اردو وفارسی" (انتخابات: ۳۷۶) میں لکھ دیا ہے کہ اس کا مصنّف رضوان مراد آبادی کوئی عیسائی شاعر تھا۔ حال آنکہ اصلیت یہ ہے کہ شورؔ نے اپنے جوشِ عقیدت میں اصلی نعت کی ردیف بدل کر اسے حضرتِ مسیح علیہ السلام سے منسوب کر دیا ہے۔

رضوان نے ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء میں اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔ علیم الدین علیم سہنوی نے تاریخ کہی ؎

از جہاں رفت چوں رضوان علی خاں رضواں
در غمش اہلِ سخن زود برفتند زہوش
بعلیم از پے تاریخ وفاتش دمِ فکر
"جائے رضواں بارم باد ابدا" گفت سروش
(۱۳۲۹ھ)

ان کے ذریعہ سے اردو کو بہت فروغ حاصل ہوا، شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ ان کا کلیات "تصویرِ خوبی" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء) پہلے اسی نعت کے چند اشعار سن لیجیے:

اترائیں نگاہیں جو پڑیں سوئے محمدؐ ۔۔۔ دل ٹوٹ گیا، دیکھتے ہی روئے محمدؐ
ہر ماہ گھٹا، بڑھ کے فلک پر مہِ انور ۔۔۔ ابروئے محمدؐ ہے کبھی روئے محمدؐ
موسیٰ کی طرح، برقِ تجلی کو غش آئے ۔۔۔ بے پردہ اگر ہو رخِ نیکوئے محمدؐ

(بقیہ گذشتہ)

ہولیاں آج تک مشہور ہیں۔ عربی کی تعلیم میرٹھ کے ایک مشہور عالم رئیس قاضی رشید الدین سے پائی تھی۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر تھی، جب ۲۳ فروری ۱۸۹۴ء کو میرٹھ میں انتقال کیا۔ داغؔ نے جو قطعۂ تاریخ وفات لکھا تھا، اس کا آخری شعر ہے ؎

سال رحلت عیسوی بنوشت داغ ۔۔۔ "اہلِ عالم کرد ماتم شورؔ، شورؔ"
(۱۸۹۴ء)

[خمخانۂ جاوید، ۵: ۷۱-۷۳]

ان پھولوں سے آتی ہے مجھے بُوے محمدؐ پژمردہ ہوں، یارب! نہ گلِ باغِ محبّت

بہت مشّاق اور پُر گو شاعر تھے، لیکن کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

خود بخود وہ تو عبث چیں بہ جبیں رہتے ہیں ہو کوئی بات، تو کچھ اس کا تدارک کیجے

وہ معنی ہوں کہ مضمونِ فنا ہے زندگی میری
وہ مطلب ہوں کہ ہستی سے ہے بہتر نیستی میری
ابھی فرشِ زمیں پر تھا، ابھی عرشِ بریں پر ہوں
کہاں سے لے اُڑی مجھ کو، کہاں تک بیخودی میری

تکلیف روا رکھ نہ پرِ کاہ کسی کی ہاں تنکے نہ چنواے کہیں آہ کسی کی
عشّاق کو اتنا نہ ستا، اے بُتِ ظالم! فریاد نہ سُن لے کہیں اللہ کسی کی

[خمخانۂ جاوید، ۳: ۴۵۶ - ۴۵۸؛ یادگارِ ضیغم: ۳۹۵ - ۳۹۶]

رفعت و سرور ــــــ مولانا ابوالفضل محمد عبّاس شروانی

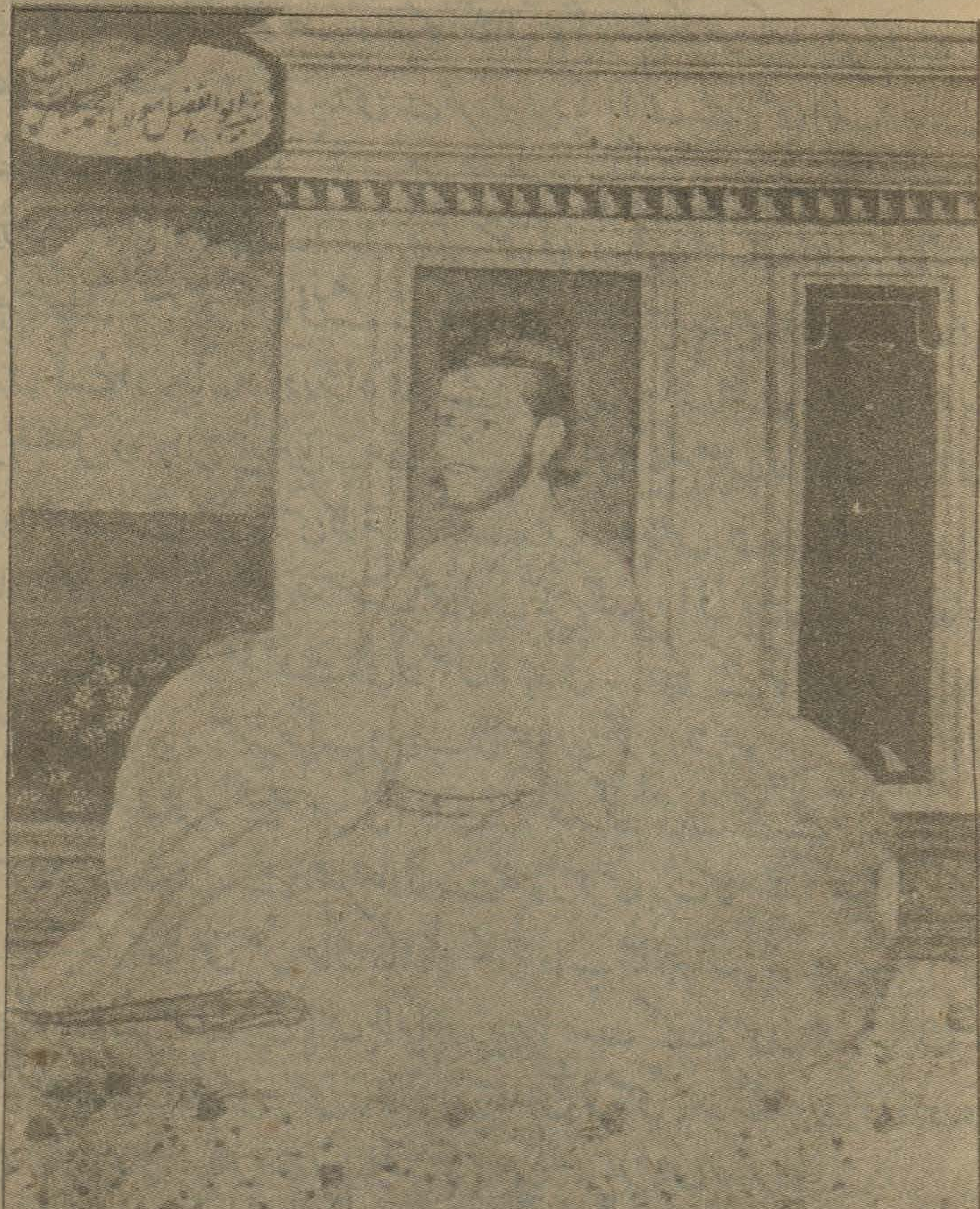
ان کا خاندان ولایتی تھا۔ مذہباً شیعی تھے۔ ان کے جدّ امجد جابر ابن عبداللہ انصاری تھے۔ آبائے کرام مدینۂ منوّرہ سے بغداد چلے آئے اور یہاں بہت عزّت اور احترام سے رہے۔ پھر آب ودانہ کی کشش سے ہمدان (ایران) میں جا بسے۔ ان کے جدّ اعلےٰ مرزا محمد ابراہیم خان ہمدانی، نادر شاہ درّانی کے وزیر بھی رہے۔ انھوں نے شاہ مذکور کے ظلم وستم سے دل برداشتہ ہو کر نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور نجف اشرف میں روضۂ مبارکہ کے مجاور بن گئے۔ لیکن ان کے فرزند رشید مستوفی الملک مرزا محمد علی خان کے ماتھے گئی، وہ قہر نادری کا شکار ہو گئے۔ نادر شاہ نے خود انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کا گھر بار تاراج کر ڈالا۔ ان کی اولاد اور دوسرے رشتہ دار ڈر کے مارے اِدھر اُدھر آوارہ اور منتشر ہو گئے۔ ان کے بھائی مرزا محمد حسن خان، ترک وطن کر کے ہندستان پہنچے اور بنارس میں مقیم ہو گئے۔ مستوفی الملک کے بیٹے مرزا محمد تقی روپوش ہو کر شیخ محمد کے نام سے شروان میں رہنے لگے۔ چندے بعد نجف اشرف پہنچے اور یہاں سیّد مہدی طباطبائی مجتہد العصر کے سامنے زانوے ادب تہ کیا اور ان سے فقہ وحدیث وتفسیر میں دستگاہ حاصل کی۔ شدہ شدہ جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے چچا مرزا محمد حسن خان بنارس میں مقیم ہیں تو وہ بھی یہاں آ گئے لیکن ان کے آنے کے جلد بعد چچا کا انتقال ہو گیا اور چونکہ شیخ محمد شروانی کی اُن کے ورثا سے بن نہ آئی، اس لیے یہ بنارس سے لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں ان دنوں نواب آصف الدولہ کی حکومت تھی۔ انھوں نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ اور یوں ان کی آرام وآسایش سے بسر ہونے لگی۔ کچھ مدت بعد انھوں نے یمن کی راہ لی، او رحدیدہ میں سکونت اختیار کی۔ یہیں ایک تاجر سیّد محمد حیدر بغدادی کی دختر نیک اختر سے نکاح کیا، جن کے

بطن سے شیخ احمد شروانی پیدا ہوئے۔ یہی شیخ احمد صاحب ترجمہ رفعت کے والد بزرگ تھے۔

شیخ احمد کمالاتِ علمی و عملی کی تحصیل کے بعد عنفوان شباب میں یمن سے ہندستان آئے اور کلکتہ میں وارد ہوئے۔ یہاں حکّام فرنگ کی قدر شناسی سے انھیں مدرسۂ عالیہ میں عربی زبان و علوم پڑھانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ اس ملازمت کے دوران میں انھوں نے بعض بہت قیمتی کتابیں تالیف کیں، جو اسی زمانے میں شائع ہو گئی تھیں۔ ان میں سے زیادہ اہم یہ تھیں: حدیقۃ الافراح، (۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء)؛ منہاج البیان الشافی فی علم العروض والقوافی (۱۸۳۴ء/نیز ۱۸۴۶ء)؛ العجب العجائب (۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء)؛ نفحۃ الیمن (۱۲۷۸/۱۸۶۱ء)۔ اسی زمانے میں انھوں نے الف لیلیٰ بھی مرتب کی؛ اس کی اصل غالباً کوئی مصری نسخہ تھی۔ یہ پوری کتاب نہیں، انھوں نے صرف پہلی دو سو راتوں کو درست کیا اور انھیں دو جلدوں میں (۱۸۱۴-۱۸۱۸ء میں) شائع کر دیا۔ یہ پہلا کلکتہ اڈیشن ہے۔ بعد کو سر رچرڈ برٹن نے جب پوری الف لیلیٰ کا انگریزی میں ترجمہ کیا، تو اپنے ترجمے میں اس نسخے سے بہت مدد لی تھی۔

تھوڑے دن بعد انھوں نے نوکری کو خیر باد کہا اور یہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ غازی الدین حیدر شاہ کا زمانہ تھا۔ اِن کے خاندان کے تعلقات دربارِ اودھ سے پہلے سے تھے ہی، چنانچہ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ انھوں نے اپنی کتاب مناقبِ حیدریہ قیامِ لکھنؤ کے زمانے ہی میں لکھی تھی۔ یہاں لکھنؤ میں رکن الدّولہ سیّد محمد اسمٰعیل خان رضوی مرشد آبادی نے اپنی صاحبزادی ان کے حبالۂ عقد میں دے دی۔ شیخ محمد عباس رفعت اسی ازدواج کا نتیجہ تھے۔ غازی الدّین حیدر کی وفات کے بعد شیخ احمد شروانی کا دل لکھنؤ سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ کان پور، بنارس، حیدر آباد، بھوپال، بمبئی وغیرہ کی سیر و سیاحت کرتے پونا پہنچے اور وہیں ۲۱ مئی ۱۸۴۰ء (۱۹ ربیع الاوّل ۱۲۵۶ھ) کو رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے؛ تکیہ رضا شاہ میں مدفون ہے۔

شیخ احمد بڑے صاحبِ کمال شخص تھے۔ اپنے وقت کے متنبی اور حریری تسلیم کیے گئے۔ تمام تذکرہ نویسوں نے ان کے علم و فضل کی تعریف کی ہے۔ مندرجۂ صدر تصانیف کے علاوہ تاج الاقبال فی تاریخ ملکِ بھوپال بھی ان سے یادگار ہے۔



مولانا محمد عباس شروانی رفعت بھوپالی

رفعت ۲۲ شوال ۱۲۴۱ھ (۳۰ مئی ۱۸۲۶ء) کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ عربی اپنے والدِ ماجد اور فارسی شیخ علی حزیں کے شاگرد میر خیرات علی خان مشتاق فیض آبادی سے حاصل کی۔ چودہ برس کے تھے جب والد کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ ان کی اپنے چچا سے نہ بنی اور انھوں نے انھیں جائدادِ پدری سے محروم کر دیا، اس لیے یہ بھی ایک زمانے تک ہندستان کے مختلف شہروں کی سیر کرتے رہے۔ طبیعت سپاہگری کی طرف مائل تھی۔ شہسواری اور نیزہ بازی اور تفنگ اندازی کی مشق کی اور فی الجملہ ان فنون میں معقول مہارت بہم پہنچائی۔ قسمت آزمائی کے لیے دکن گئے۔ لیکن قسمت میں ابھی اور گردش لکھی تھی۔ یہ دلی آئے اور یہاں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی ہوئی۔ "مرزائی" اور "خانی" اور "ابو الفضلِ دوراں" کے خطاب عطا ہوئے۔ ان ہی ایام میں غالب سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنے فارسی کلام اور قصائد پر بالخصوص ان سے اصلاح لی۔ اس زمانے کا دہلی دربار کسی صاحبِ کمال کی صحیح قدر دانی نہیں کر سکتا تھا۔ انھیں بھی یہاں کوئی خاص منفعتِ مالی حاصل نہ ہوئی۔ اکتا کے نکلے تو بھوپال پہنچے اور نواب جہانگیر محمد خان بہادر شمشیر جنگ (نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کے والدِ ماجد) کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد کچھ مدت کے لیے نواب قدسیہ بیگم کے متوسلین میں شامل رہے، پھر ملازمت چھوڑ کر تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ جب نواب والاجاہ سید محمد صدیق حسن خان بہادر کا نکاح نواب شاہجہان بیگم سے ہوا تو انھوں نے ازراہِ قدر دانی انھیں اپنے پاس بلا لیا اور یہ ریاست کے ملازموں میں شامل ہو گئے۔ محکمۂ تنظیمات شاہجہانی (یعنی قانون اور تاریخ نویسی) ان کے سپرد ہوا۔ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس کے بعد بقیۂ عمر یہیں بھوپال میں بسر کر دی۔

رواداری کا زمانہ تھا۔ اختلافاتِ مسلک کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ نواب محمد صدیق حسن خان غالی سنی، بلکہ ہندستان میں "وہابیت" کے اولین علمبرداروں میں گنے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس رفعت شیعی جن کے نام کا سجع تھا۔ شیعۂ آلِ محمد عباس۵

---

۵ یہی سجع انھوں نے بعد کو شعر میں لکھ دیا اور مہر تیار کرائی (۱۲۹۸ھ):

خوش بود سجع نگینم رفعت شیعۂ آلِ محمدؐ عباس

لیکن دونوں کی ایسی خوش اسلوبی سے نبھی کہ رفعت نے مرتے دم تک بھوپال سے قدم باہر رکھنے کا خیال تک نہ کیا۔ دراصل معیار ذاتی استعداد اور قابلیت اور کارگزاری تھا۔

عربی اور فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی، ادب، علم کلام اور تاریخ میں وحید عصر تھے۔ فارسی نظم و نثر پر بھی کماحقہٗ قادر تھے۔ چھوٹی بڑی چونتیس کتابیں تصنیف کیں معلوم نہیں کس بات پر دل برداشتہ ہو کے اپنی بیاض بھوپال کے تالاب میں ڈال دی۔ اور شعر گوئی سے توبہ کر لی۔ اگرچہ دو ایک شعر اردو کے بھی ملتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے، یہ محض بطورِ تفنن کہے گئے تھے؛ دراصل فارسی ہی میں کہتے تھے۔ جو کلام منتشر حالت میں ملتا ہے، اسی سے یہ انتخاب درج ہے۔ ان کے بہت سے قصیدے نواب محمد صدیق حسن خان بہادر اور نواب شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال کی مدح میں موجود ہیں۔

۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ - ۱۸۹۸ء) میں بھوپال ہی میں انتقال کیا۔ میرزا محمد تقی کمال الدین ہجر طہرانی نے تاریخ کہی؛ مصرع تاریخ ہے: آہ از مرگ ابوالفضل کمال۔ دوسری تاریخ بھی انھیں کی ہے: گفت: صد وائے بوالفضایل مرد (۱۳۱۵ھ) بھوپال میں احمد آباد روڈ پر "کربلا" میں سپردِ خاک ہوئے۔

ان کی بیوی حسینا بیگم بھی شاعرہ تھیں؛ حسینہ تخلص تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتی تھیں؛ اردو میں زیادہ، فارسی میں کم۔

بیگم حسینہ کا انتقال رفعت کی زندگی یعنی ۱۲۸۵ھ میں ہوا۔ بھوپال کی فصیل کے باہر مغرب کی طرف احمد علی شاہ کے تکیہ میں مدفون ہیں۔ لوحِ مزار پر ان کے شوہر (رفعت) کی کہی ہوئی یہ تاریخ کندہ ہے:

چوں حسینا بیگم عفت سرشت — دفعۃً دنیائے فانی را ہشت
جست عباسِ حزیں تاریخ او — "باادب" فرمود رضوانِ بہشت
بر سرِ لوحِ مزارِ پاکِ آں — "فادخلی فی جنتی" باید نوشت

(۱۲۸۵ = ۷ + ۱۲۷۸)

اولاد میں دو صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ ابوالقاسم محتشم اور ابوالحسن محترم۔ دونوں

علم و فضل میں اپنے اسلاف کے جانشین تھے۔ مدّت العمر ریاستِ بھوپال کی ملازمت میں بسر کردی۔

تا چشمِ تو آموخت، فنِ فتنہ گری را
در فتنہ گری، داد سبق چشمِ پری را

دردِ سرِ من، بہ شدنی نیست، مسیحا
بیہودہ، بخود راہ مدہ، دردِ سری را

مہر و مہ و انجم، ہمہ ہا گرمِ گزاف اند
وقت ست، کہ آغاز کنی جلوہ گری را

امشب از شمعِ رخِ جانانہ بزمم روشن است
بر بساطم از پرِ پروانہ خرمن خرمن است

سوزِ من، از گریہ، ہرگز کم نگردد، مثلِ شمع
آبِ اشکم، بر سرِ آتش، مثالِ روغن است

یافت بازارِ محبّت رونقے، از داغِ من
دُودمانِ عشق، از نورِ چراغم روشن است

تُرکِ خونخوار، بکف تیغ، سرافشاں برخاست
خوب شد، بارِ سر از دوشِ عزیزاں برخاست

تا کجا، راز ز اغیار، توانم پوشید
یادِ یار آمد و آہ از دلِ نالاں برخاست

دید چوں جوہرِ خوں ناۂ چشمِ رفعت
موجِ خوں، از جگرِ لعلِ بدخشاں برخاست

حالِ من آشفتہ، بجاناں کہ کند عرض
دردِ منِ رنجور، بدرماں کہ کند عرض

بے نیازم کرد از کون و مکاں تاثیرِ عشق
سیم شد از زرِ من، تا یافتم اکسیرِ عشق

من چگویم، حالِ من چونست از ہجرِ بتاں
دردمنداں نیک می دانند دار و گیرِ عشق

راوقِ شیراز دماغ الورد ببباید کشید | این مرکّب درا وان بُرد بیباید کشید
بائٹ گلفامِ نورس، غنچہ لب پستہ دہن | جامِ بادہ در ہوائے سرد بیباید کشید
در فراقِ دلبرِ شیریں دہن، رُخ نار دن | آہِ سرد از سینۂ پُردرد بیباید کشید
الحذر از صحبتِ بد گوہران تیرہ دل | مے بیادِ روئے جاناں فرد بیباید کشید
مقطعِ صائب خوش است اے سرورِ والا گہر | بر سرِ لوحِ طلائے زرد بیباید کشید
"ہر چہ میخواہی طلب کن صائب از شاہِ نجف | منّتے گر میکشی از مرد بیباید کشید"

دُور از بندِ کمندِ سُبحہ و زنّار باش | مست "یا قدّوس" گویان بر درِ خمّار باش
مُشربِ رنداں خوش است و عیشِ ایناں بے گزند | نغمۂ یا ہو چو قمری خوان و در گلزار باش
بزمِ رنداںست، پاسِ عزّت اینجا لازم است | جائے خفتن نیست این دارِ فنا بیدار باش
بینمایم رہ ترا ای راہ جُو از راہِ صدق | سالکِ راہِ قویمِ حیدرِ کرّار باش

اپنے اُستاد کا قطعۂ تاریخ وفات کہا تھا:

جانِ اربابِ سخن غالبِ عالی ہمّت | ناظمِ سحر بیاں، ناثرِ والا فطرت
رشکِ فردوسی و خاقانی و عالی کمال | ثانیِ خسرو و سعدی و حزین و شوکت
ابرِ مدرارِ کمالات و فراتِ دانش | ماہرِ علمِ معانی و بیان و حکمت
ازجہاں کرد سفر سُوئے ریاضِ رضواں | گفت عباس کہ "شایانِ سریرِ جنّت" (۱۲۸۵ھ)

اردو کے صرف یہ دو شعر شوکت نے اپنے تذکرے "فرح بخش" میں دیے ہیں:

پہرا ہے رقیبوں کا چھپر کھٹ کے برابر | دس بیس یقیں ہونگے یہاں کٹ کے برابر

نغمۂ چنگ و رباب و دف و نے | بن ترے مرثیہ خوانی سمجھا

[تاریخِ دلچسپ (قلمی): ۵۷-۵۹؛ جلوۂ خضر، ۲: ۱۹۷-۱۹۸؛ صبحِ گلشن: ۱۸۰-۱۸۲؛ شمعِ انجمن: ۱۸۲-۱۸۳؛ آثار الشعراء: ۱۱۱-۱۱۶؛ راہِ روح (قلمی): ۴۷-۴۸؛ فرح بخش: ۲۳-۲۸؛ غالبیات، چند عنوانات: ۸۷؛ تذکرۃ النساء نادری: ۵۷؛ اخترِ تاباں: ۱۴-۱۵؛ اُردو کی نثری داستانیں: ۸۲-۸۴؛ مکتوب جناب نادم سیتاپوری بنام مؤلف؛ جامعہ (ماہنامہ - دلّی) غالب نمبر (فروری و مارچ ۱۹۶۹): ۱۰۷، ۱۱۳]

رمز — میرزا فتح الملک بہادر غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو دہلوی

خاندانِ تیمور کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے سولہ بیٹے تھے۔ مرزا فخرو ان میں سے چوتھے تھے۔ ان سے تین بھائی بڑے مرزا محمد دارا بخت میران شاہ عرف مرزا شبّو اور مرزا شاہ رُخ اور مرزا کیومرث تھے۔ مرزا فخرو (۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء) میں پیدا ہوئے۔ سورۂ فتح کی آیت "اِنّا فتحنا لک فتحاً مبینا" سے بطرز بسجع تاریخ ولادت (۱۲۳۳ھ) برآمد ہوتی ہے۔ جب ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء کو مرزا دارا بخت ولی عہد کا انتقال ہوا؎، تو لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل نے یہ مسئلہ اٹھایا کہ اب کسے ولی عہد تسلیم کیا جائے۔ آخر معاملے کے سب پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہوئی اور بڑی رد و کد کے بعد مرزا فخرو ولی عہد منظور کیے گئے۔ لیکن شرط یہ ٹھہری کہ یہ برائے نام بادشاہ ہوں گے اور قلعۂ معلےٰ سے اُٹھ کر مہرولی جا رہیں گے۔ چنانچہ ۱۸۵۲ء میں اس معاملے پر دستخط ہو گئے، اور مرزا فخرو کی ولیعہدی کا اعلان ہو گیا۔ بہادر شاہ کی چہیتی بیگم ملکہ زینت محل اس انتظام سے خوش نہیں تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میرا اکلوتا بیٹا، جوان بخت، ظفر کا جانشین تسلیم کیا جائے۔ انھوں نے بہادر شاہ کو ہموار کر لیا تھا اور ان کی طرف سے ایک لمبی چوڑی عرضی ملکہ وکٹوریہ کے نام لکھوائی تھی کہ وہ جوان بخت کی ولیعہدی کا اعلان کر دیں۔ لیکن انگریزی سیاست

؎ وفات کے وقت عمر ۵۷ برس تھی۔ ظفر نے تاریخ کہی:

آں ولی عہدے کہ دارا بخت بود — کرد چوں رحلت ازیں دنیائے دوں
شد درونِ خلق داغ از سوزِ غم — گشت سالِ رحلتش "داغِ دروں"
(۱۲۶۵ھ)

درگاہ چراغ دہلی میں دفن ہوئے تھے۔



میرزا غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو رمز دہلوی

کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور یہ منھ دیکھتی رہ گئیں۔ جتنے منھ اتنی باتیں، بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بیگم نے انگریز ریذیڈنٹ سر ٹامس مٹکاف کو زہر دلوا دیا تھا کیونکہ وہ ان کے رستے میں حائل تھے، چنانچہ صاحب موصوف ۳ نومبر ۱۸۵۳ء کو جاں بحق ہو گئے۔ اس کے بعد مرزا فخرو کا کانٹا تھا؛ یہ بھی ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کی شام کو ہیضہ سے فوت ہو کے اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے، اگرچہ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ انھیں بھی زینت محل نے زہر دلوا دیا ہے۔ مرزا فخرو درگاہ قطب صاحب میں شاہ عالم بہادر اول (خلف اورنگ زیب عالمگیر) کے مجر میں دفن ہیں۔

مرزا فخرو نے اپنی عمر میں تین نکاح کیے۔ پہلا مرزا جہانگیر (اکبر شاہ ثانی کے دوسرے بیٹے اور ظفر کے چھوٹے بھائی) کی اکلوتی صاحبزادی سے ہوا۔ مرزا ابوبکر اسی بیوی کے بطن سے تھے، جو ۱۸۵۷ء میں اپنے دونوں چچاؤں مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کے ساتھ کپتان ہاڈسن کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس بیوی کی وفات کے بعد دوسرا نکاح مرزا الٰہی بخش[۱] کی صاحبزادی حاتم زمانی بیگم سے ہوا۔ اور تیسرا وزیر بیگم[۲] عرف چھوٹی بیگم

---

[۱] یہ وہی مرزا الٰہی بخش ہیں، جن سے متعلق مشہور ہے کہ وہ انگریزوں کے یار غار اور ان کے جاسوس تھے۔ بہادر شاہ کے مقدمے میں یہ بھی گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے۔ ان کا اصلی نام مرزا ہدایت افزا تھا۔ اور یہ شاہ عالم بہادر شاہ اول کی چھٹی پشت میں تھے۔ انگریزوں اور مرزا فخرو سے جو معاہدہ ہوا تھا، وہ بہت حد تک انہی کا کیا دھرا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے انھیں خاندانِ شاہی کا سرپرست تسلیم کر لیا اور جاگیر عطا کی۔ ۲۱ مارچ ۱۸۷۸ء کو وفات پائی۔ مرزا جہانگیر کے مجر میں دفن ہیں۔

[۲] خدا کی شان کہ اس عورت سے جتنی اولاد ہوئی سب شعر کہنے والی۔ یہ محمد یوسف سادہ کار کشمیری کی بیٹی تھی۔ (بڑی بیگم اور عمدہ خانم اس سے دو بڑی بہنیں تھیں) سب سے پہلے یہ ایک انگریز کے گھر میں رہی جس کے نام میں اختلاف ہے۔ کوئی اسے بلاک (Black) لکھتا ہے (ماہِ درخشاں: ۲۱) اور کوئی مارٹن (کارنامۂ سروری: ۶۵) عین ممکن ہے کہ نام مرکب بلیک مارٹن یا مارٹن بلیک ہو۔ اس سے چھوٹی بیگم کے ایک لڑکا امیر مرزا اور ایک لڑکی ہوئی؛ اس کا نام مسیح جان عرف بادشاہ بیگم اور تخلص خفی تھا۔ اس کے بعد یہ نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھرکہ کے پاس پہنچی۔ یہاں داغ

سے شوکت محل ان کا خطاب تھا۔ ان کے بطن سے خورشید عالم خورشید پیدا ہوئے۔ ہمارے مشہور شاعر نواب مرزا خان داغ بھی اسی چھوٹی بیگم کے بیٹے تھے؛ اور وہ اسی واسطے سے قلعۂ معلیٰ میں پہنچے۔ اس لحاظ سے داغ مرزا فخرو کے گیلڑ بیٹے تھے۔ داغ نے مرزا فخرو کی تاریخ وفات کہی ہے:

غم فتح ملک سلطاں، چہ بلائے جان و دل شد | دہدش مقام جنت، ز کرم، کریم غفار
چو ز داغ سال رحلت، دل دردمند پرسید | بکشید "آہ" حسرت "دو صد و دوازدہ بار"

(۲۱۲ × ۶ = ۱۲۷۲ھ)

مرزا فخرو بھی ذوق کی زندگی تک انھیں سے اصلاح لیتے رہے؛ لیکن جب نومبر ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہو گیا، تو ظفر کی طرح یہ بھی غالب سے مشورہ کرنے لگے۔ غالب سے ان کے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ غالب نے لکھا ہے کہ انھوں نے ان کا چار سو روپیہ سالانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرزا زین العابدین خان عارف کے دونوں کم سن بچوں، باقر علی خان اور حسین علی خان کے لیے بھی دس روپیہ ماہانہ پھلوں کے لیے دیتے تھے۔ غالب کے فارسی کلام میں مرزا فخرو کی مدح میں تین قصیدے موجود ہیں۔ غالب کی اردو مثنوی "در صفت انبہ" بھی مرزا فخرو ہی کے آموں کے تحفے کے شکریے میں لکھی گئی تھی۔

رمز کو شعر گوئی کے علاوہ موسیقی اور رقص کا بھی بہت شوق تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ شوق خاندان تیموریہ کی گھٹی میں پڑا تھا۔

(بقیہ گزشتہ) پیدا ہوئے۔ نواب کے پھانسی پا جانے (۱۸۳۵ء) کے بعد یہ آغا مولوی تراب علی کے یہاں گئی۔ ان سے شاہ محمد آغا پیدا ہوئے، جو پہلے شائق (فغان دہلی: ۱۷۲) اور بعد کو شاغل تخلص کرتے رہے (خمخانۂ جاوید، ۴: ۱۹۱)۔ اس کے بعد یہ چندے میر زخشاں کے پاس بھی رہی ہے، جن کا ان دنوں عنفوان شباب تھا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ۱۸۴۴ء میں یہ قلعے میں آئی۔ یہاں مرزا فخرو سے شاہزادہ خورشید عالم خورشید ہوئے۔ مولانا آزاد نے دیوان ذوق (ص ۴۱-۴۲) میں جو لطیفہ چھوٹی بیگم کا لکھا ہے وہ اسی سے متعلق ہے۔ اس کا انتقال اگست ۱۸۷۹ء میں ہوا۔

(اردو ادب، ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۱۱ حاشیہ ۳)

مرزا فخرو کا دیوان ۱۸۵۷ء کی افتاد میں ضائع ہو گیا۔ جو کچھ بچ گیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ بہت پختہ کلام ہے۔ زبان کی تعریف تحصیلِ حاصل کہ یہ واقعی اُن کے گھر کی لونڈی تھی۔ معاملہ خوب لکھتے ہیں مختلف تذکروں میں سے مختصر انتخاب درجِ ذیل ہے:

آنکھیں تو اس کو دیکھ کے ہوتی ہیں بیقرار
بن دیکھے دل تڑپنے لگا، اِس کو کیا ہوا

سب کچھ آساں ہے تجھے، گردشِ دوراں کرنا
ایک مشکل، مری مشکل کا ہے آساں کرنا

مانا، کہ نہ دل لے کے تو مجھ سے وفا کرتا
پر دل کی تسلّی کو، وعدہ تو کیا ہوتا

وہ لے گئے ہیں خدا جانے، کس طرح دل کو
دیا ہے میں نے انھیں، اپنے اختیار سے کیا!

غم وہ کیا ہے، جو جاں گزا نہ ہوا
درد وہ کیا، جو لا دوا نہ ہوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر
بات کیا، جس میں کچھ مزا نہ ہوا
وہ تو ملتا، پر اے دلِ کم ظرف!
تجھ کو ملنے کا حوصلا نہ ہوا
تم رہو اور مجمعِ اغیار
میرا کیا ہے، ہوا، ہوا نہ ہوا
پھر تمھارے ستم اُٹھانے کو
رمزؔ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

ڈھونڈو گے جان کو بھی، محبت کی راہ میں
پھرتے ہو رمزؔ ادل کی ابھی جستجو میں کیا

دل بیتاب ہو گیا تجھ سے رفاقت کی اُمید
کون ہوتا ہے بُرے وقت میں جو تو ہو گا

میں جو رُسوائے زمانہ ہو گیا
اس کی شہرت کا بہانہ ہو گیا
جا پڑے ہم، کوچۂ جاناں میں رمزؔ!
بارے اپنا بھی ٹھکانہ ہو گیا

حال سن سن کے عشق میں تیرا — رمزؔ کرتے ہیں خاص و عام افسوس

دردِ فراق ، فکرِ عدو ، طعنِ دوستاں — اس ایک جان پر مری کیا کیا بلا نہیں

نہ حرم میں جگہ ، نہ دیر میں جاے — ہم گنے جائیں، اے خدا! کس میں

اے دلِ بیتاب ! اتنا اضطراب — صبر تجھ پر، اور تو میں کیا کہوں

یاں یہ حالت کہ دم لبوں پر ہے — واں یہ غفلت، کہ کچھ خیال نہیں

تم نہ تھے، غیر کے گھر، شب کو — بس چلو، یونہی سہی، جانے دو
منھ دکھانا ہے خدا کو اک دن — اے بتو! اتنی خودی جانے دو
شکر و شکوہ سے تعلّق نہ رکھو — بنھ سکے جیسے، نبھی جانے دو
رمزؔ الفت میں جو چاہو آرام — تو یہ راحت طلبی، جانے دو

تم آؤ یا غمِ فرقت میں یہ کم بخت دم نکلے — تمنّا کوئی تو دل کی ہمارے اے صنم نکلے
اگر سیدھی کہوں ان سے، تو یہ الٹی سمجھتے ہیں — مگر یہ حضرتِ ناصح بھی کوئی اک رقم نکلے

ہم نے تو غمِ یار میں ، یوں عمر بسر کی — مر مر کے جو کی شام، تو رو رو کے سحر کی

[ریذیڈنٹ دہلی کا روز نامچہ : ۱۲ و ۳۵ ؛ طبقات الشعراے ہند : ۴۱۶؛
گلستانِ سخن ؛ ۲۴۷ ـ ۲۵۰ ؛ اردوے معلّیٰ : ۱۰۵ ؛ نادراتِ غالب :
۸۵ ؛ خمخانۂ جاوید ؛ ۳ : ۴۹۷ ـ ۵۰۲]

رنجؔ و طبیبؔ ـــــ حکیم محمد فصیح الدّین میرٹھی

میرٹھ کے سر برآوردہ اور باوجاہت خاندان کے فرد اور قوم کے بنی اسرائیل تھے۔ یہ خاندان اصل میں سکندر آباد (ضلع بلند شہر) کا رہنے والا تھا۔ جہاں سے رنجؔ کے آبا و اجداد نقلِ مکان کر کے میرٹھ چلے آئے تھے۔ میرٹھ کا محلہ بنی سرائے (مخففِ بنی اسرائیل) اسی خاندان کا آباد کردہ ہے اور آج بھی باقیاتِ صالحات یہیں مقیم ہیں۔

بنی اسرائیل صحابیِ رسول حضرت عبد اللہ بن سلام کی نسل سے ہیں۔ حضرت عبد اللہ پہلے یہودی تھے اور بعد کو اسلام لے آئے تھے؛ ان کی اولادِ امجاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔

رنجؔ کے مورثِ اعلیٰ الحاج محمد ادریس خجندی شاہ طہماسپ کے ایما پر ہمایوں کے ساتھ ۱۵۵۵ء میں ایران سے ہندستان آئے۔ اکبر نے ان کے پوتے محمد برخوردار خان کو خانی کا خطاب اور میرٹھ میں ۲۷ ہزار گز کا قطعۂ زمین اپنی محلسرا تعمیر کرنے کو عطا کیا۔ یہاں انھوں نے اپنے خاندان کے لیے مکانات بنوائے اور اس محلّے کا نام اپنی قوم کے نام پر محلّۂ بنی اسرائیل رکھا، جو کثرتِ استعمال سے بگڑ کر اب "بنی سرائے" کہلاتا ہے۔ عہدِ مغلیہ میں اس خاندان کے اکثر افراد عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے۔

رنجؔ کے والد حکیم مولوی قمر الدّین کے پھوپھا مولوی صدر الدّین دربارِ گوالیار میں وکیل تھے۔ چونکہ ان کے اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، انھوں نے قمر الدّین کو گود لے لیا تھا۔ قمر الدّین نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ اپنے فن میں ماہر تھے اور اسی سلسلے میں مہاراجا سیندھیا کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ رخصت پر وطن چلے آئے۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو مہاراجہ بہادر نے انھیں طلب فرمایا۔ لیکن خدا معلوم کیوں، یہ



حکیم محمد فصیح الدین رنج میرٹھی

پانو توڑ کے یہیں کے ہو رہے اور واپس نہ گئے۔ اس کے بعد کہیں ملازمت نہیں کی۔ جہوسی کا بھی شوق تھا۔ ۱۸۸۳ء میں انتقال فرمایا۔ رنج نے تاریخ کہی:

بود حیف از خسوف قمر الدین (۱۲۹۹ھ)

رنج نے عربی اور فارسی اور طب کی تعلیم اپنے حقیقی ماموں اور خسر مولوی نصیر اللہ سے پائی، جو ریاست دتیا کی ملازمت ترک کر کے اپنے مکان پر مقیم ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ طب میں حکیم سعادت علی خان میرٹھی (ف ۱۲۸۰ھ) سے بھی استفادہ کیا۔ ماموں کی زندگی بھر رنج انھیں کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنا الگ مطب شروع کیا۔ کامل اور حاذق طبیب تھے، خصوصاً اپنے ماموں مرحوم کی طرح نسائی امراض کے علاج میں بہت شہرت حاصل کی۔ افسوس کہ عین جوانی یعنی ۴۹ برس کی عمر میں استسقائے لحمی کے مرض سے آٹھ مہینے بیمار رہ کر ۳۰ مارچ ۱۸۸۵ء شب کے دو بجے وفات پائی۔ میرٹھ کے قبرستان شاہ سلطان میں دفن ہوئے۔

ان کے صاحبزادے حکیم محمد فخر الدین فخر و شاد نے از لب بکا (یعنی دو) کے تعمیہ سے "آہ رنج در گذشت" سے عیسوی میں تاریخ (۱۸۸۵ء) نکالی۔ ہجری تاریخ ان کے دوست جا دج پیش شور نے کہی:

خوشی شور کی لے گئے اپنے ساتھ　　　نصیب اس کو ہے "اب غم رنج آہ"
(۱۳۰۲)

ان کی بیوی کا انتقال ان سے چند برس پہلے ۱۰ ستمبر ۱۸۶۷ء کو ہو چکا تھا۔

شاعری میں رنج کے علاوہ اپنے پیشے کی مناسبت سے کبھی کبھی طبیب تخلص بھی کرتے تھے۔ نعت سے بھی شغف تھا چنانچہ ایک مختصر مجموعہ گلشن نعت کے عنوان سے موجود ہے۔ دیوان بھی زندگی میں مرتب نہیں ہوا۔ یہ اُن کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے حکیم محمد فخر الدین نے "مخزن الفصاحت" کے تاریخی نام سے ۱۳۰۷ھ (۱۸۹۰ء) میں مطبع ہاشمی، میرٹھ میں چھپوا کر شائع کیا۔ اس کے علاوہ ان کی تالیف شاعرات کا ایک تذکرہ "بہارستان ناز" بھی یادگار ہے۔

حکیم محمد فخر الدین کی وفات بعمر ۵۵ برس ۱۹۱۵ء (۲۹ نومبر) میں ہوئی۔ ان کا نکاح اپنی سگی پھوپھی کی بڑی بیٹی تبارک النساء سے ہوا تھا۔ ان کے صاحبزادے حکیم محمد محمود الحق

بھی طبابت پیشہ تھے، ان کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۵۰ء کو ہوا۔ دونوں باپ بیٹے قبرستان سلطان شاہ (میرٹھ) میں آسودۂ خواب ہیں۔ اب اس خاندان کے نام لیوا حکیم محمود الحق کے خلف الصدق حکیم سیف الدین احمد سلمہٗ (میونسپل کمشنر) میرٹھ میں مطب کرتے ہیں۔

انتخاب ملاحظہ ہو:

دیکھتا تھا میں نگاہوں سے ہر اک جا تجھ کو — اور انھیں ہیں تو نہاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا
عجب وہ لوگ ہیں جو اپنے دل کو تھام لیتے ہیں — ہمیں تو تھامنا مشکل ہے آنسو چشمِ گریاں کا
اغیار اور خلوت، ایسا نہ جانتے تھے — دربارِ خاص اُن کا، دربارِ عام نکلا
پرتو فگن جو ساقیِ گلفام ہو گیا — گلرنگ شیشۂ دلِ ناکام ہو گیا
یارب! مرے گناہ کی تعزیر اور کیوں — بس ہے یہی، کہ لطف نہ پایا گناہ کا
آج اُن سے صلح ہوتے ہوتے پھر کل پر رہی — سہل ہو کر کام مجھ ناکام کا مشکل ہوا
مرے خط میں لکھا عدو کو سلام — آگے آیا لکھا مقدّر کا
عشق میں ہم نے کیا اپنوں کو غیر — تم نے کیونکر، غیر کو اپنا کیا!
بت خانہ سے گھبرائے تو کعبہ سے بندھا دھیان — بت ظلم جو کرتے ہیں تو آتا ہے خدا یاد
ناچار دل سے تنگ بتوں کی جفا سے ہم — فریاد ایک ہو، تو کریں بھی خدا سے ہم
لاکھوں بناؤ ایک تغافل میں آپ کے — لاکھوں بگاڑ، ایک مرے اضطراب میں

معلوم نہیں کچھ کہ میں آیا ہوں کہاں سے
جاؤں گا کہاں، آیا تھا کیوں، کون ہوں کیا ہوں!

بہار آئی ہے پھر وحشت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
بڑھیں کیوں ہاتھ، خود ٹکڑے گریباں ہوتے جاتے ہیں

دن کاٹنے کو خوب تو ہے دل لگی کی راہ
اچھا ہے، جی لگا جو کسی سے، بُرا نہیں

تمنّا جس کی خود محتاج ہو، یارب وہ دل دے دے
نہ دے ایسا مجھے دل تو کہ محتاجِ تمنّا ہو

کب کیا کرتے تھے اس طرح سے پامال مجھے
کب چلا کرتے تھے تم، ایسی ادا سے پہلے

قاصد گیا، ہر طرح سے تسکین ہوئی، لیکن
اب دل کو یہ دھڑکا ہے کہ کیسی خبر آئے

[خمخانۂ جاوید، ۳ : ۵۰۷؛ دیباچہ و خاتمہ مخزنِ فصاحت؛
مکاتیبِ غالب (حواشی): ۲۰۰؛ عبرت، ماہنامہ۔ بمبئی،
ستمبر ۱۹۵۰ء : ۳۵ - ۳۶ (مضمون، "حکیم محمود الحق
مرحوم" از شاہ بدرالدین انور چشتی)]

رِند ـــــ جانی بانکے لال

غالب کے اپنے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دربار بھرت پور میں وکیل تھے، اور ان ہی کے واسطے سے منشی ہرگوپال تفتہ کو بھی وہاں کسی طرح کی ملازمت مل گئی تھی، یا کوئی اور سلسلۂ روزگار ہو گیا تھا۔
۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ - ۱۸۵۶ء) میں انتقال ہوا۔ ان کا ایک طویل مرثیہ تفتہ کے دیوان دوم (۱۸۵۷ء۔ کوہِ نور پریس، لاہور) میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رند اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اور پچاس برس کی عمر میں لاولد فوت ہوئے۔

[اُردوے معلیٰ : ۴۴، ۵۶]

ذکی ــــ حکیم محمدؐ اشفاق حسین مارہروی

مارہرہ (ضلع ایٹہ۔ یوپی) کے خاندان کمبوہ کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے والد مولوی الطاف حسین کا اپنے عہد کے ذی علم حضرات میں شمار ہوتا تھا۔ ذکی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے پائی۔ بعد ازاں فارسی اور طب کی تعلیم اور تکمیل مارہرہ کے دوسرے اساتذہ سے کی۔ عربی بھی بقدرِ ضرورت جانتے تھے۔

شاعری کا شوق بہت کم عمری میں پیدا ہوا۔ اس کے آغاز کا قصّہ بیان کرتے تھے کہ میرا ابھی مشکل سے چودہ برس کا سن ہوگا کہ میں وطن میں ایک مشاعرے میں گیا۔ وہاں جو کلام سُنا اور سامعین نے جس طرح سے داد دی، اس سے طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ گھر پہنچ کر مشاعرے کی طرح پر سات شعر لکھے اور انھیں لے جاکر والد صاحب قبلہ کو دکھایا۔ توقع تھی، کہ میری طرح وہ بھی خوش ہونگے اور داد دینگے، اُلٹا انھوں نے ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ یہ شغل ترک کردو، پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اس پر میں بہت مغموم ہوا۔ لیکن مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے چند شعر نعت رسول میں لکھے اور انھیں لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بھلا اب وہ کیسے اعتراض کر سکتے تھے! میری چالاکی کو بھانپ گئے اور فرمایا: اچھا، تم اگر شعر گوئی سے باز نہیں رہ سکتے، تو میں منع نہیں کرتا، لیکن اپنی تعلیم کی طرف سے غافل نہ ہونا اور اسے بہرحال مقدّم سمجھنا۔ اس کے بعد میں کبھی کبھی شعر کہتا رہا اور مارہرہ اور قرب وجوار کے مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگا۔

سرکاری ملازمت ذریعۂ معاش تھی۔ ملازمت کا پورا زمانہ محکمۂ بندوبست میں بسر ہوا۔ ابتدائی ایام ایٹہ میں گذرے۔ پھر اترپردیش کے دوسرے اضلاع مثلاً مظفّر نگر، بنارس جلیسر، بدایوں وغیرہ میں قیام رہا۔ انگریزی ملازمت کے اختتام کے بعد چندے گوالیار میں

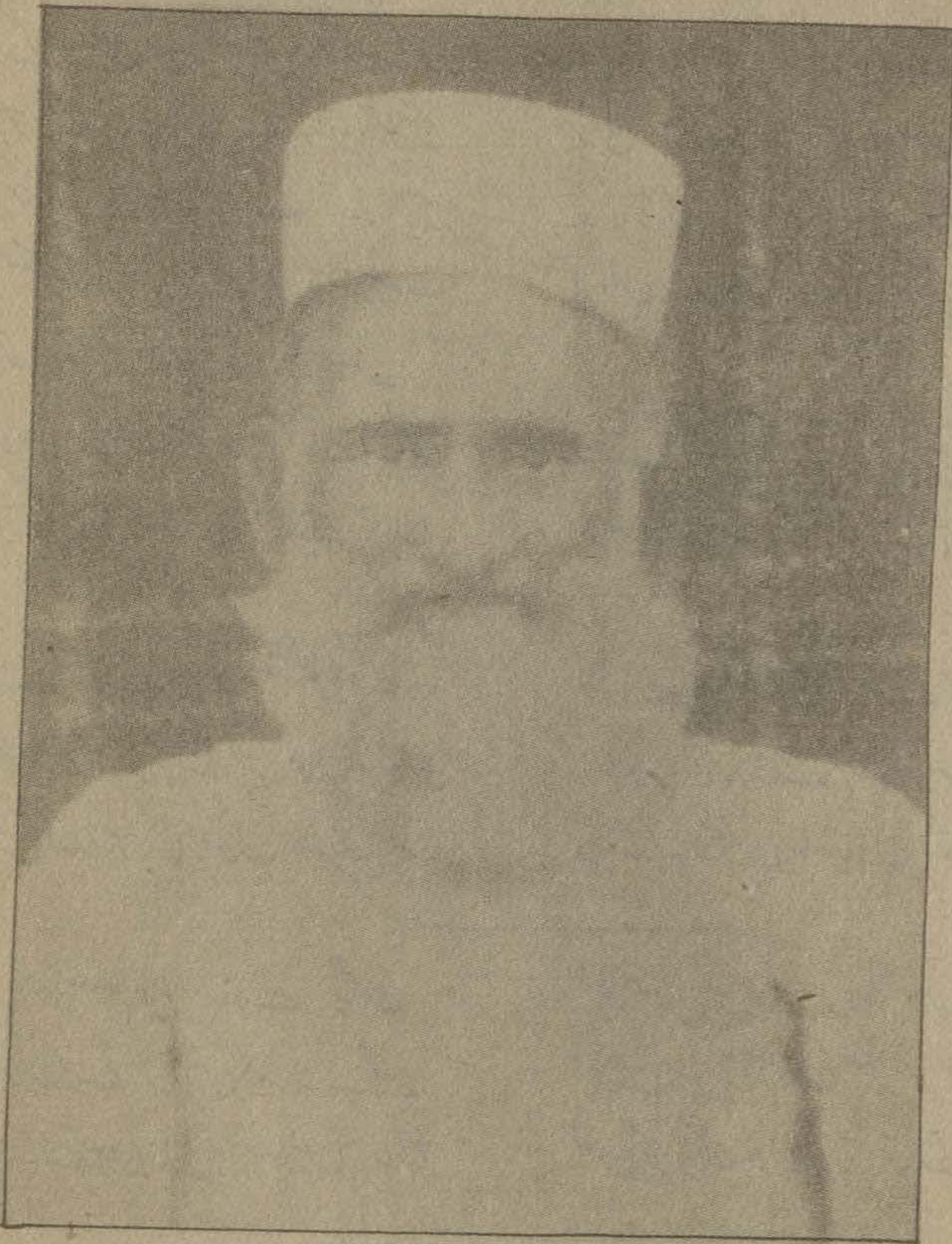
بھی رہے۔ ۱۹۰۷ء میں بھوپال پہنچے اور یہاں بھی پہلے محکمہ بندوبست اور پھر جمعبندی (Land Records) کے دفتر سے وابستہ رہے۔ ۱۹۱۵ء میں محکمہ کے افسرِ اعلیٰ کے رویّے سے ناراض ہو کر ملازمت سے استعفےٰ دے دیا اور خانہ نشین ہو گئے۔

طب کی تعلیم مکمل تھی اور اس فن میں پوری دستگاہ تھی، لیکن کبھی اُسے ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ البتّہ جہاں کہیں رہے، ادویہ کا ذخیرہ ساتھ رہا، اسے ضرورتمندوں میں مفت تقسیم کرتے جب بھی اپنے وطن مارہرہ جانے کا اتّفاق ہوتا، وہاں اپنے ہمدرس دوست حکیم آلِ حسن کے مطب میں چلے جاتے، مریضوں کو دیکھتے اور انھیں مشورہ دیتے۔

مذہب سے بہت شغف تھا۔ پابندِ صوم وصلواۃ اور صاحبِ دل بزرگ تھے۔ مارہرہ کے سلسلۂ قادریہ برکاتیہ سے منسلک اور حضرت سید ابوالحسین احمد شاہ نوری سے بیعت تھے۔ اپنے سلسلے کے تمام اوراد و وظائف پوری پابندی سے ادا کرتے تھے۔

ذکی کی شادی اپنے خاندان ہی میں ۲۵ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ ان کی بیوی زینب فاطمہ رشتے میں ان کے چچا کی بیٹی تھیں۔ یکے بعد دیگرے چھ لڑکے پیدا ہوئے، لیکن ان میں سے کوئی زندہ نہ رہا اور سب انھیں صغرسنی ہی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ بفضلہٖ آخری تین بچے زندہ رہے۔ ان میں سب سے بڑی صاحبزادی میمونہ خاتون تھیں۔ محمد ملیح زبیری (جن سے یہ حالات ملے) انھیں کے صاحبزادے ہیں۔ صاحبزادی کا ذکی کی زندگی ہی میں انتقال ہو گیا۔ ان سے چھوٹے محمد اخلاق حسین تھے۔ یہ بھوپال کے کسٹم ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور پنشن پانے کے بعد بھی وہیں رہے۔ اُن کا ۱۹۵۵ء میں بعارضۂ فالج کراچی میں انتقال ہوا۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی عرفان فاطمہ حیات ہیں اور آج کل (۱۹۵۷) اپنے اہل وعیال کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔

ذکی کی بیوی کا ۱۹۲۸ء میں انتقال ہو گیا۔ چونکہ اہلی زندگی بہت خوشگوار گذری تھی، اس لیے بڑھاپے میں رفیقۂ حیات کی جدائی سے بالعموم مغموم اور اُداس رہنے لگے۔ ۱۹۲۹ء میں ملیریا کا سخت حملہ ہوا، اور بہت دن صاحبِ فراش رہے۔ اگرچہ اس سے نجات مل گئی لیکن پھر نہ طبیعت پورے طور پہ بحال ہوئی، نہ کمزوری کا ازالہ ہوا۔ یہ حالت تھی، جب ۱۹۳۰ء میں دوبارہ ملیریا کا حملہ ہوا۔ چونکہ بخار بہت تیز تھا، اُسے روکنے اور کم کرنے کے لیے دوائیں دی گئیں۔ ان سے حرارت تو کم ہو گئی، لیکن پسینہ اتنا آیا کہ اس سے نقاہت المضاعف



حکیم محمد اشفاق حسین زکی مارہروی

ہوگئی۔ اسی حالت میں ۹۳ برس کی عمر میں ۱۴/۱۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء کی درمیانی شب میں انتقال کیا۔ صبح کو تجہیز و تکفین ہوئی اور بھوپال کے تکیہ جھولا شاہ میں سپردِ خاک کیے گئے۔ تکیے کی مسجد کے احاطے کی مغربی دیوار سے ملحق قبر ہے، جو مرحوم کی وصیت اور خاندانی روایات کے مطابق کچی رکھی گئی۔ ان کے نواسے جناب ملیح زبیری نے تاریخ وفات کہی:

چو شد ساز انفاس یاکش خموش — زکی را نہادند اندر مغاک
چو ایں حادثہ سخت آمد، ملیح! — زفرطِ اَلم می تپیدم بخاک
مکن غم، ندائے شنودم زغیب — کہ ایں بندۂ ماست "مغفور پاک"
(۱۳۴۹ھ)

نمونۂ کلام میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

دم الجھنے لگا ہے، بے الجھے — زلف اُلجھی اگر، تو کیا ہوگا
رہگزارِ بلا پہ بیٹھے ہیں — نہ ملا راہبر، تو کیا ہوگا

زہے قسمت! پسندِ خاطرِ مشکل پسند آیا — ازل سے چھانٹ کر لائے تھے ہم جو دل پسند آیا
نکل کر آنکھ سے آنسو رُکے ہیں نوکِ مژگاں پر — کہ لڑکوں کو تماشائے لبِ ساحل پسند آیا
ہوئی ہے تیغ کند اُس کی بقولِ حضرتِ غالب — "تماشائے بخوں غلتیدنِ بسمل پسند آیا"

صیاد دُور، موسمِ گل، سامنے چمن — کنجِ قفس میں روؤں نہ کیوں بال و پر کو میں
زار انتظارِ خط نے کیا اس قدر مجھے — انجان سوچتا ہوں مگر نامہ بر کو میں
قدرِ سخن زمانے میں باقی نہیں، زکی! — کس کو دکھاؤں آج متاعِ ہنر کو میں

سِفلوں سے پوچھتا ہوں غربت میں — کہیے، کیسا مزاجِ عالی ہے؟

وابستہ رہ چکے ہیں جو دل زلفِ یار کے — پابند ہیں وہ آج غمِ روزگار کے
جو اپنے عزتِ نفس کو پہچانتے نہیں — رہتے ہیں فکر میں وہی جھوٹے وقار کے
بلبل کو آشنائے جنوں کر دیا، زکی! — صدقے گلوں کے پیرہنِ تار تار کے

جو اس سے دوری میں عمر گزرے، اسے نہ کر زندگی میں شامل
قریب رہ کر جو وقت گذرے، وہ زندگی میں شمار کرے

نعت دستزاد میں یہ رنگ ہے:

اک برقِ تجلّی مری ہستی پہ گرا کر، مدہوش بنا کر
سینے کو بنا دو مرے تم وادیِ سینا، یا شاہِ مدینہ!
میخانہ بدوش آج مرے سامنے آجا، متوالا بنا جا
حصّے میں مرے آئے تری آنکھوں سے پینا، یا شاہِ مدینہ!

بگڑی ہوئی قسمت مری للہ بنا دو، ہر غم سے چھڑا دو
جب دل کو نہ ہو چین تو کس کام کا جینا، یا شاہِ مدینہ!

(مکتوب جناب محمد ملیح زبیری، کراچی)

زکی ــــ نواب سیّد محمد زکریا خان رضوی دہلوی

دلّی کے ایک معزز خاندانِ سادات کے چشم و چراغ تھے۔ خان دراصل نام کا جزو نہیں تھا، بلکہ ان کے بزرگوں کو شاہی میں "خانی" کا خطاب ملا تھا، جو خاندان کے بعض اصحاب کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا رہا۔ اصل میں یہ خاندان کشمیری تھا۔ ان کے بزرگ نواب مختار الدولہ ابو القاسم خان بہادر، شاہ عالم ثانی کے وزیر مجد الدّولہ عبد الاحد خان کے قریبی عزیز تھے۔ زکی نے وجاہتِ دنیوی کے علاوہ شاعری بھی گویا وراثت میں پائی۔ ان کے والدِ ماجد سیّد محمود خان بھی شعر کہتے تھے اور محمود تخلص کرتے تھے۔ اُردو شعرا کے مشہور تذکرے "عمدۂ منتخبہ" کے مؤلف اعظم الدّولہ نواب میر محمد خان معظم جنگ سرور (شاگردِ محمد جان بیگ سامی) ان کے نانا اور دادا کے بھائی) تھے۔ بزرگوں کا مسکن دلّی کا مشہور محلّہ زینت باڑی تھا۔ لیکن یہ خاندانی جاہ و جلال زکی کی قسمت میں نہیں تھا۔ سب جاداد کچھ ان سے پہلے اور باقی ۱۸۵۷ء کے بعد خالصے لگ گئی۔ خاندان کے بہت سے افراد بھی (بقول سیّد ابو القاسم رضوی ۹۰ عدد) اسی ہنگامے میں انگریز کی گولی کا نشانہ بنے۔

زکی ۱۸۳۹ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی، منطق، ریاضی کی تعلیم غالب، صہبائی اور پنڈت رام کشن بسمل سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ طب میں بھی واقفیت بہم پہنچائی۔ قرآن بھی حفظ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ بھی دلّی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ آخرکار محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے اور بتدریج ترقی کر کے صوبہ یوپی کے مدارس کی ڈپٹی انسپکٹری کے عہدے تک پہنچے۔ اس تعلق سے مدّتوں میرٹھ، گورکھپور، بریلی، الہ آباد اور بدایوں میں رہے۔ جب ۱۹۰۱ء میں ملازمت کی میعاد



نواب محمد زکریا خان رضوی زکی، دہلوی

ختم ہوئی ہے تو وہ بدایوں ہی میں تعینات تھے۔ اس کے بعد بھی وہ مستقلاً بدایوں ہی میں رہے؛ یہیں ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳-۱۹۰۴ء) میں اللہ کو پیارے ہوئے؛ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے والد ماجد سید احمد کی درگاہ (ساگرتال، نوادہ) کے احاطے کی جنوبی دیوار کے باہر جانب شرق آسودۂ خواب ابدی ہیں۔

بڑے قادر الکلام شخص تھے۔ مولوی حشمت اللہ حشمت، پنڈت جواہر ناتھ کول ساقی، تولاّ بدایونی، سید احمد دہلوی (مؤلف فرہنگ آصفیہ) وغیرہ ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے دیوان غزلیات (دیوانِ زکی) پر غالب نے چند سطریں بطور سند لکھ دی تھیں۔ وہ اس کے ساتھ موجود ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ بہت مشّاق اور نازک خیال شاعر تھے۔ استاد کے کلام کی بعض خصوصیات مثلاً مضمون آفرینی، دقّت پسندی، فارسی تراکیب وغیرہ کو انھوں نے نباہنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ بہت کچھ کلام غیر مطبوعہ رہ گیا، جو ان کے خاندان میں موجود ہے۔

زکی کی بیوی کا نام مریم بیگم تھا۔ مریم بیگم نے ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء میں رحلت کی۔ اولاد میں پانچ بیٹے: (۱) سید ذوالفقار علی رضوی، (۲) سید ابوالقاسم رضوی، (۳) سید حامد حسن رضوی (۴) سید عنایت حسین رضوی، (۵) سید ولایت حسین رضوی[1] اور ایک بیٹی ہوئے۔ ان میں سے (۱) اور (۳) اور (۴) نے شادی نہیں کی۔ (۲) یعنی ابوالقاسم کا پہلا نکاح ۱۹۰۹ء میں نواب صدیق حسن خان (بھوپال) کی پوتی (یعنی نواب سید نورالحسن کی بیٹی) سے لکھنؤ میں ہوا، جس کے بعد وہ بھی "نواب" کہلانے لگے۔ ان کے بیٹے سید زبیر حسن رضوی اپنے خاندان کے ساتھ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ ان بیگم کے انتقال (۱۹۲۲ء) کے بعد سید ابوالقاسم نے دوسرا نکاح کیا۔ ان بیگم کی بھی اولاد موجود ہے۔ ابوالقاسم رضوی کا ۱۹۳۸ء میں دلّی میں انتقال ہوا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، بسمل تخلص تھا۔

نمبر (۵) سید ولایت حسین رضوی کا پہلا نکاح اپنے چچا سید محمد یحییٰ خان (زکی کے بڑے بھائی) کے بیٹے سید محمود حسن ثاقب[2] رضوی کی صاحبزادی سے ہوا تھا۔ ان کے

[2] ضمناً یہی محمود حسن ثاقب تھے، جنھوں نے زکی کا غیر مطبوعہ کلام لالہ سری رام صاحب خمخانۂ جاوید کو مہیا کیا تھا۔ یہ شعر کہتے اور زکی ہی کے شاگرد تھے۔ (خمخانۂ جاوید، ۲: ۱۷۹-۱۸۰)

انتقال کے بعد دوسرا نکاح بھی کیا تھا۔

زکی کے ایک چچازاد بھائی سیّد میر حسن رضوی تھے۔ سیّد مسعود حسن شہاب دہلوی ایڈیٹر الزبیر، بھاولپور (پاکستان) انھیں سیّد میر حسن رضوی کے پوتے ہیں۔ میر حسن رضوی اخبار خیر خواہ عالم اور مطبع رضوی کے مالک تھے۔ زکی کا دیوان پہلی مرتبہ اسی مطبع میں ان کے اہتمام سے ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ مطابق جون ۱۸۹۵ء میں چھپا تھا۔

مختصر انتخاب کلام ملاحظہ ہو:

وضعِ بالیدگیِ شوق جو رہبر ہوتی
اے زکی! قطرۂ ناچیز بھی دریا ہوتا

تمکین وضع و طرزِ تبسم میں دیکھیے
انداز اس کی شوخیِ طبعِ سلیم کا

حیف، صد حیف، زکی زندگیِ تلخ اپنی
بیکسی کا اگر انجام یہ ہو، مرجانا

کس نے حیا سے نیچی نظر کی، کہ ہو گیا
آساں نہ دیکھنا مجھے، دشوار دیکھنا

وہ دیکھتے ہیں بزم میں یہ، دیکھتا ہے کون
بارے، ہوا مجھے بھی سزاوار دیکھنا

بیداد میں لطف کیوں نہاں تھا!
کیا یہ بھی عدو کا امتحاں تھا

جب عشق مرا سنا، تو ہنس کر
کہنے لگے: "ہم کو بھی گماں تھا"

عجب کیا ہے وہاں رحمت سے زاہد کی ہو آمرزش
عذاب اس پر یہاں کچھ کم نہ تھا زہد ریائی کا

تری راہ کس نے بتائی، نہ پوچھ
دلِ مضطرب، راہبر ہو گیا

آج کیا جانیں، کہا کیا وہ بھی سن کر رو دیے
ورنہ اظہارِ تمنا بیشتر کرتے ہیں ہم

بے تکلف عشق ہے غارت گرِ ایماں، مگر
حضرتِ ناصح کو کیا، یہ بھی اگر کرتے ہیں ہم

بھرنے میں زخم کے ہیں وہ گل افشانیاں کہاں
جی میں ہے دل کو چھیڑ دیں پھر نشتر سے ہم

رسوا کن جہاں نگہِ ناز ہی نہیں
پنہاں رہے یہ عشق کا انداز ہی نہیں

دشمن کا وصل دوست سے یوں سازگار ہے
گویا وہ چرخ تفرقہ پرداز ہی نہیں

وحشت میں تھک کے بیٹھ رہے مثلِ نقشِ پا
وہ جوش ہی نہیں، وہ تگ و تاز ہی نہیں

یہ شرمگیں نگہ، یہ تبسم نقاب میں
کیا بے حجابیاں ہیں تمھارے حجاب میں

اس تکلف میں وہ لطفِ مےِ گلفام کہاں
میرا انکار کہاں، آپ کا ابرام کہاں

وہ بھلا کیا جانیں، کیا ہوتا ہے جانِ دل کا حال
ان کی شرمِ صلح جو میں، غمزۂ بیباک میں

وہی سبزہ، وہی وحشت وہی ویرانی ہے
اور کیا دشت میں ہوگا، جو مرے گھر میں نہیں

کچھ ایسے تنگ ہیں، غمِ دل سے کہ جی ہیں ہم
کہتے ہیں، دل کو دے کے غمِ روزگار لیں

ناصح! قمارِ عشق کو ہم چھوڑ دینگے آپ
باقی ہے ایک جان، ذرا اس کو ہار لیں

روبرو جلوہ فزا ہے چمنستانِ شہود
نگہِ شوق کبھی، دید میں معذور نہیں

کردیا خوے خموشی کو، وفا میں داخل
بیوفائی میں بھی فریاد کا مقدور نہیں

بدگمانیِ یار کے حق میں، دلِ مہجور حیف!
وہ خدا ناکردہ کیوں، اغیار کی محفل میں ہو

کبھی نہ چھوڑینگے، اس وضعِ التفات کو ہم
تمھاری طرزِ تغافل سے گو ملال بھی ہو

ذکی! شباب گیا، اب کہاں، کہ خاطر میں
اُمنگ بھی ہو، عناصر میں اعتدال بھی ہو

جانستاں ہے، حرفِ مطلب کا جواب ناتمام
ہائے اُس کا شرم سے کہنا کہ "اچھا دیکھیے"

نفس نفس ہے نسیمِ وفا، محرکِ شوق
یہ وہ مزہ ہے جسے ذوقِ جاوداں کہیے

وہاں یہ فکر، کہ رازِ دل آشکار نہ ہو!
یہاں یہ شوق، کہ کچھ حسرتِ نہاں کہیے

وہ سادگی سے، تغافل کو ناز کہتے ہیں
مگر سکھاتی ہے شوخی کہ امتحاں کہیے

ترا وہ ظلم، کہ ہو جائیں دوست بیگانے
مرا یہ حال، کہ دشمن بھی مہرباں ہو جائے

نہ پوچھو، مجمعِ اعدا میں کون ہے جانباز
تمھیں نہ کھینچ لو خنجر کہ امتحاں ہو جائے

تمھارا ذکر نہ ہو، رودادِ شوق نہ ہو
تو یہ ہی کیوں نہ کہو، کوئی بے زباں ہو جائے

دشمن سے ارتباط ہے، اس کا جواب کیا
یہ خو سہی تمھاری کہ میری خبر نہ لی

عدو کے پاس سے کہتے ہو امتحاں نہ سہی
تمھیں کو شوق نہیں ہے، تو مہرباں! نہ سہی

وہ میرا غم ہی نہیں، پوری داستاں نہ سہی
حکایتِ دلِ بیتاب درمیاں نہ سہی

اگر نہیں ستمِ دہر جاوداں، نہ سہی
جفا پسند وہ کیا کم ہیں، آسماں نہ سہی

نہیں ہے عشق کی سرگشتگی میں ساتھ ضرور
ہمیں تو خاک اڑانی ہے کارواں نہ سہی

ذکی! مقامِ سعادت سمجھ کے، بیٹھ رہو
حریمِ کعبہ نہیں ہے درِ مغاں، نہ سہی

خموشی میری ہمدم ہے، کہا کس نے! انساں نے
ترا رازِ محبت، بدگماں! میری زباں تک ہے

چاک داماں کیجیے، ٹکڑے گریباں کیجیے
کچھ تو آخر چارۂ طبعِ پریشاں کیجیے

[خمخانۂ جاوید، ۳: ۶۲۵ - ۶۳۷؛ ادیب (الہ آباد) فروری و مارچ ۱۹۱۳ء؛ انتخاب زرّیں: ۱۴۸ - ۱۵۰؛ خطوط زبیر حسن رضوی، کراچی]

سالک (قربان) — میرزا قربان علی بیگ خان حیدرآبادی ثم دہلوی

یہ قوم کے اوزبک ترک تھے۔ ان کے بزرگ عہدِ عالمگیری میں ماوراءالنہر سے وارد ہندستان ہوئے اور شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ جب شاہِ عالم کے زمانے میں سلطنت کے کاروبار میں اختلال پیدا ہوا، تو اس خاندان کے افراد بھی منتشر ہو گئے۔ سالک کے والد نواب عالم بیگ خان خلف عاشور بیگ خان غالب جنگ تھے۔ اسی زمانے میں وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی نواب نیاز حیدر بیگ کے پیچھے دلّی سے تلاشِ روزگار کے لیے نکلے اور حیدرآباد (دکن) پہنچے۔ یہاں عالم بیگ خان کی شادی قلعہ دارِ گولکنڈہ کے خاندان میں عبدالرحیم خان کی صاحبزادی سے ہوئی۔ سالک کی پیدائش یہیں حیدرآباد میں ہوئی۔ وہ چھٹے برس میں تھے، جب ان کے والد ملازمت کے اختتام پر اپنے وطنِ مالوف دلّی واپس آئے۔

تذکرہ "روزِ روشن" میں سالک کا ترجمہ باب 'ق' میں "قربان علیؔ" کے تحت درج ہوا ہے۔ مصنّف (مولوی محمد مظفّر حسین صبا) لکھتے ہیں:

> اینک در شہرِ حیدرآباد بملازمتِ رئیس آں جا سر بلندی دارد و در مرحلۂ پنجاہ و ہفتم از عمر قدم می گزارد۔ ہر چند نظر بتخلّصش جائے ترجمہ نزار اجزرِ وے باب سینِ مہملہ می بایست، لکن حال و قائش بنامہ نگار بواسطۂ منشی سیّد جمیل احمد جمیل سہسوانی وقتے رسید کہ کتاب تا بابِ شینِ معجمہ حلۂ طبع در بر کشید، ناچار دریں موقع مندرج گردید (ص ۵۵۴)

یہ تذکرہ ۱۲۹۶ھ میں تالیف (تاریخ: بوستانِ فرحت افزا) اور ۱۲۹۷ھ میں طبع ہو

(تاریخ: روزِ روشن جلوۂ رُوئے سحر)۔ گویا ۱۲۹۷ھ میں جب سالک کے حالات مؤلف کو موصول ہوئے ہیں، سالک کی عمر ۵۷ برس کی تھی، اس سے ثابت ہوا کہ ان کی ولادت ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ - ۱۸۲۵ء) میں ہوئی؛ اور وہ عمر کے چھٹے برس (۱۲۴۶ھ ۱۸۳۰ء) میں پہلی مرتبہ دلّی آئے۔

ان کی والدہ کا انتقال ان کے "ایّامِ طفولیت" میں ہوگیا۔

سالک کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت دلّی میں ہوئی اور وہ مدّتوں اسی دیار میں رہے۔ ۱۸۵۷ء کے مشہور تاریخی ہنگامے کے بعد انگریزی استبداد سے بچنے کی خاطر وہ بھی الور چلے گئے تھے۔

لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ الور میں بہت پریشان رہے۔ دلّی کی محفلیں اور یہاں کے احباب یاد آتے ہونگے۔ واپس دلّی آنا چاہتے تھے؛ لیکن انگریزی سیاست سے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں یہاں پہنچنے پر کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے دریافتِ حال کے لیے الور سے اپنے ایک عزیز دوست اور خواجہ تاش محمد تفضل حسین خان کوکب کو مندرجۂ ذیل منظوم خط لکھا:

کوکبِ دوست نواز او ملاذِ سالک / تم سے کرنا ہے یہ اظہارِ تمنّا مجھ کو
کیا کہوں حالتِ بیتابیِ شوقِ دیدار / بیٹھے بیٹھے جو خیال آپ کا آیا مجھ کو
دلِ بیتاب نے بستر پہ لٹایا کیا کیا / دیدۂ تر نے بٹھایا لبِ دریا مجھ کو
دستِ وحشت نے مرا جیب و گریباں تا کا / دشت گردی کا کیا پاؤں نے ایما مجھ کو
دن کو وہ فتنے ہیں مجھ پر کہ جو محشر میں ہوں / شب وہ آفت ہے کہ ہے روز ہی اچھا مجھ کو
قافلہ قافلہ ہیں رنج و الم میرے ساتھ / اور پھر اہلِ جہاں کہتے ہیں تنہا مجھ کو
پاؤں میں غور سے دیکھا تو نہیں ہے زنجیر / اور اس پر نہیں رفتار کا یارا مجھ کو
طوق کا بوجھ بھی گردن میں نہیں ہے لیکن / سر اٹھاتے میں ہے اندیشہ فلک کا مجھ کو
نہیں دیکھا تھا سو تقدیر سے یوں پیش آیا / گھر میں بیٹھے ہوئے زنداں کا تماشا مجھ کو
غرض اس سب سے ہے یہ بات کہ بلواؤ مجھے / اور جو بلوانے میں نقصان ہو پیدا مجھ کو

بھیجیے لکھ کے جو احوال ہوا ہو معلوم
کچھ تو تسکین کا مری کیجیے ایما مجھ کو

جانتے ہو کہ میں آوارہ و بازاری ہوں مرتبہ حضرتِ یوسف کا نہ دینا مجھ کو

دیوان میں اس قطعہ نما خط کا عنوان بڑا معنی خیز ہے: بہ عالمِ گوشہ نشینی از بیمِ مخبراں بہ محمد تفضّل حسین خاں کوکب در الور نوشتہ شد۔ اگرچہ "گوشہ نشینی" کے الفاظ بھی غیر معمولی ہیں، لیکن دراصل سوال پیدا ہوتا ہے کہ "بیمِ مخبراں" کی بنیاد کیا تھی؟ مقطع سے پہلے کا شعر بھی غور طلب ہے:

بھیجیے لکھ کے جو احوال ہوا ہو معلوم
کچھ تو تسکیں کا مری بھیجیے ایما مجھ کو

یہاں سالک کن "احوال" کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟ اور وہ کوکب سے کس اطلاع کے ذریعے تسکین کے متمنی ہیں؟

میرا گمان ہے کہ سالک ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں کسی نہ کسی عنوان انگریز مخالف سرگرمیوں میں ضرور ملوث تھے، اور نئے حاکموں کی نظر میں ان کی حالت مشتبہ تھی۔ اسی لیے وہ داروگیر سے بچنے کی خاطر رُوپوش ہو گئے اور الور میں "گوشہ نشینی" اختیار کر لی کہ جب حالات معمول پر آ گئے، اور ان کے خلاف شبہات رفع ہو گئے، وہ دلّی واپس آ جائیں گے۔ اب وہ کوکب سے پوچھ رہے ہیں کہ دلّی میں "احوال کیا ہے"؟ یعنی ان کے خلاف کارروائی کس رُخ پر جا رہی ہے، تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکیں۔

بہرحال آج سوا سو سال بعد یہ فیصلہ کرنا محال ہے کہ صحیح حالات کیا تھے! واللہ اعلم ۱۸۵۸ء کے آخر میں ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی طرف سے "غدر" کے تمام مجرمین کی عام معافی کا اعلان ہو گیا تھا۔ غالباً اسی کے بعد سالک بھی دلّی واپس آ گئے۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ "مانا دلی میں رہے، کھائینگے کیا!" غالب نے بہت کوشش کی تھی کہ ان بیکاری کے ایّام میں سالک (اور ان کے برادرِ خرد رضوان) کا لوہارو میں ٹھکانا ہو جائے؛ اس سلسلے میں ان کے علائی کے نام کے خطوط "اُردوے معلّٰی" میں موجود ہیں۔ لیکن علائی کے والد نواب امین الدین احمد خان والیِ لوہارو اس پر تو تیار تھے کہ رضوان کو ملازم رکھ لیں، لیکن وہ سالک کو لینے پر آمادہ نہیں تھے[ے]۔ بہرحال کچھ نہیں کھلتا

ے ممکن ہے اس میں بھی "غدر" کے ایّام میں سالک کی "کارگزاریوں" کا کچھ دخل ہوا

کہ سالک نے یہ زمانہ کیونکر بسر کیا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ سالک کو الور میں ملازمت مل گئی تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ غالب کے والد عبداللہ بیگ خان ریاستِ الور میں ملازم رہے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا تھا۔ یہ مہاراجا بختاور سنگھ کی حکمرانی کا زمانہ تھا۔ بختاور سنگھ کی وفات (۱۸۱۵ء) کے بعد ان کا بھتیجا بنے سنگھ گدی پر بیٹھا کیونکہ بختاور سنگھ کے اپنے کوئی اولاد نہیں تھی۔ بنے سنگھ کی وفات (اگست ۱۸۵۷ء) پر اس کا نابالغ بیٹا شیودان سنگھ جائز وارث تسلیم کرلیا گیا، جس کی عمر اس وقت صرف ۱۲ برس کی تھی۔ بنے سنگھ مقامی آبادی کی سرکشی اور شورہ پشتی سے بہت نالاں تھا؛ لہٰذا اُس نے ریاست کے انتظام کے لیے دلّی سے بعض مسلمان امرا کو طلب کیا، اور انھوں نے الور پہنچ کر حالات ٹھیک کر دیے۔

شیودان سنگھ کی اسی ماحول میں پرورش ہوئی تھی۔ وہ اسلامی تمدّن اور طرزِ زندگی کا بہت دلدادہ تھا، اسے اُردو فارسی سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں اُردو کے متعدّد شعرا ملازم تھے۔ مثلاً سالک، مجروح، امراؤ مرزا انور، ظہیر دہلوی، غلام احمد تصویر، خدا بخش تنویر وغیرہ۔ قیاس ہے کہ سالک ۱۸۶۳ء میں الور پہنچے؛ اسی سال ایجنسی موقوف ہوئی اور شیودان سنگھ کو پورے اختیارات ملے۔ سالک کے کلیات میں شیودان سنگھ کی مدح میں ایک بڑا معرکے کا قصیدہ موجود ہے۔

سالک مہاراجا کے وکیل مقرر ہوئے تھے۔ دو برس بعد (۱۸۶۵ء) ان کے چھوٹے بھائی شمشاد علی بیگ رضوان بھی الور آ گئے اور یہاں ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے (یہ عہدہ سالک کے عہدے سے بڑا تھا)۔

لیکن الور کے حالات روز بروز خراب ہو رہے تھے۔ اخراجات اتنے بڑھ گئے تھے کہ ملازموں کی تنخواہ تک وقت پر ادا نہ ہو سکی۔ انگریز کو خدا ایسا سنہرا موقع دے۔ انھوں نے مداخلت کی، مہاراجا کو پندرہ ہزار ماہانہ وظیفہ دے کر ۱۸۷۳ء میں نظم و نسقِ ریاست سے الگ کر دیا، اور انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مہاراجا کے

آوردہ تمام لوگ برطرف کردیے گئے؛ انھیں میں سالک اور رضوان بھی تھے۔ یہ دونوں بھائی دلّی آگئے۔
قرائن ایسے ہیں کہ سالک ۱۲۸۹ھ (۷۳-۱۸۷۲ء) ہی میں دلّی سے حیدرآباد روانہ ہو گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا ۱۲۹۳ھ میں دلّی میں انتقال ہوا تھا۔ سالک اس زمانے میں حیدرآباد میں تھے۔ انھوں نے بھائی کے مرنے کی تاریخ کہی:

ازعالم بے مدار" بگذشت گردید بہ "خلد" جائے "رضوان"
(۱۰۵۷ + ۶۳۴ = ۱۶۹۱ -۳۹۸ = ۱۲۹۳)

انھوں نے اسی موقع پر ایک رباعی بھی کہی تھی:

دُوری کے الم چار برس تک کھینچے امّید تھی دل کو کہ کبھی مل لیں گے
رضواں کو اجل آئی تو بولا یہ فلک اب خاطرِ نومید کو تسکین رہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رضوان کی وفات سے چار برس قبل دلّی سے حیدرآباد چلے گئے تھے۔
حیدرآباد میں ان کے عمِّ بزرگوار رن بہادر خان موجود تھے وہ نواب بہادر رتنا ڑبن کے یہاں ملازم تھے، اور بعد کو انھیں کی دخترِ بلند اختر سے شادی کر کے خانہ داماد ہو گئے تھے۔ سالک انھیں چچا کے ساتھ رہنے لگے۔
حیدرآباد میں وہ صیغۂ تعلیمات میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں نواب عماد الملک بہادر سیّد حسین بلگرامی اس محکمہ کے ناظم تھے۔ ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ میں انھوں نے ایک رسالہ "مخزن الفوائد" جاری کیا تھا۔ سالک اس کی ترتیب و تدوین میں ان کے برابر کے شریک رہے۔ یہ رسالہ مدّتوں اردو علم و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ اس رسالے میں ان کے متعدّد نثری مضمون شائع ہوئے۔ (اگر انھیں جمع کر کے شائع کر دیا جائے، تو یہ بھی ادب کی خدمت ہوگی۔)
جیساکہ "روز روشن" میں ہے، سالک کو ۱۵ سال کی عمر یعنی تقریباً ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹-۱۸۴۰ء) کے لگ بھگ شعر گوئی کا شوق ہوا۔ قربان تخلص اختیار کیا اور حکیم مومن خان مومن کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ لیکن معلوم نہیں، کیوں جلد ہی انھیں چھوڑ کر غالب سے مشورہ کرنے لگے؛ اور پھر ساری عمر ان کے حلقہ بگوش رہے۔

بعض اصحاب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ مومن کی زندگی بھر انھیں کے شاگرد رہے، اور ان کی وفات کے بعد غالب سے منسلک ہوئے۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔
اول تو کسی تذکرہ نگار نے یہ نہیں لکھا کہ سالک اور مومن کا یہ تعلق موخر الذکر کی وفات تک قائم رہا۔ پھر اس کی خود سالک کے بیان سے بھی تصدیق نہیں ہوتی۔ سالک اپنے دیوان "ہنجارِ سالک" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

کوچہ گردِ دیارِ ہیچ مدانی، جادہ نوردِ دشتِ ہرزہ بیانی، راہرو مسالکِ تلاش و تفحص، قربان علی بیگ سالک تخلص، عرض پرداز است کہ "اقلِ روزگارے" بہ استفادۂ والا خدمتِ بابرکت، سحبانِ فصاحت، حسّانِ بلاغت... جناں ساکنِ حکیم محمد مومن خاں مومن مستفید و "بیشتر زمانے" بہ استفاضۂ تربیت جناب افادت مآب نظیری نظیر، ظہوری ظہور،... غیرتِ عرفی و فخرِ طالب میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب غفر اللہ ذنوبہما مستفیض بودہ بہ افاضۂ تلقین و رہنمائیِ آں قطبینِ اوجِ سخنوری و سخن پروری... چندے خود را از زمرۂ قافیہ پیمایاں... شمردہ

مومن نے ۱۲ مئی ۱۸۵۲ء کو رحلت کی۔ سالک کا ۱۸۳۹۔ ۱۸۴۰ء سے لے کر بارہ تیرہ برس تک ان سے استفادہ کرنا کسی عنوان "اقلِ روزگارے" سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے مقابلے میں غالب کے تلمذ کا زمانہ بھی صرف ۱۷ برس بلکہ اس سے کم ہے، جو اس صورت میں کسی طرح "بیشتر زمانہ" کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا کیونکہ دونوں سے زمانۂ استفاضہ میں بہت کم فرق ہے۔ یوں بھی سالک بہت آسانی سے لکھ سکتے تھے کہ میں نے مومن کی وفات کے بعد غالب سے رجوع کیا۔ اسی لیے میرا قیاس ہے کہ مومن کے تلمذ کا زمانہ طویل نہیں تھا۔
سالک نے ۱۲۹۷ھ (۱۸۷۹ - ۱۸۸۰ء) میں حیدر آباد میں وفات پائی۔ ان کے خواجہ تاش غلام حسنین قدر بلگرامی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:

سالک تخلص دہلوی، معجز نگار افسوس مُرد	اے قدر! خواجہ تاشِ ما نواب قربان علی
"نوابِ قربان علی سالک ہزار افسوس مُرد"	مصراعِ تاریخِ وصال اندر رجز آمد بدل

(۱۲۹۷)

خمخانۂ جاوید (۴ : ۳۹) کا یہ کہنا کہ "آخر ۱۸۷۹ء میں۔ اس جہانِ فانی سے رحلت کی" درست نہیں ہوسکتا۔ ۱۲۹۷ھ میں یکم محرم ۱۵دسمبر ۱۸۷۹ء کو تھی؛ گویا اس سال صرف ۱۷دن ۱۸۷۹ء میں پڑے۔ سالک کا دیوان ان دنوں چھپ رہا تھا جیسا کہ اس کے ساتھ شامل قطعاتِ تاریخ سے ثابت ہے؛ یہ سب ان سترہ دنوں سے متعلق نہیں ہوسکتے۔ ان کے دیوان کے سات آٹھ قطعات سے بھی تاریخ (۱۲۹۷) برآمد ہوتی ہے۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کا سالِ وفات ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) ہے۔ حیدرآباد میں مدفن نصیب ہوا، لیکن کہاں، اس کا سراغ نہیں ملتا۔

اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ اردو میں دو دیوان تھے: "ہنجارِ سالک" اور "منیخانۂ سالک"۔ دوسرا میری نظر سے نہیں گزرا۔ "ہنجارِ سالک" ان کی زندگی میں مطبع بدر الدجیٰ، دلی میں چھپا تھا (نومبر ۱۸۷۱ء)۔ اس کے شروع میں سالک کے فارسی دیباچے کے علاوہ مولانا حالی کی فارسی تقریظ بھی ہے۔

انھوں نے رائے دولت رام حیدرآبادی کی فرمائش پر ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں اپنا جملہ کلام "کلیاتِ سالک" کے عنوان سے جمع کیا تھا۔ یہ راجہ گنیش پرشاد بہادر شاد کی مالی اعانت سے اکمل المطابع، دلی میں زیرِ طباعت تھا کہ اسی دوران میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اب مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور نے "کلیاتِ سالک" مطبع عالیہ، لاہور سے چھپوا کر نومبر ۱۹۶۶ء میں شائع کیا ہے۔ اسے کلب علی خان فائق نے مرتب کیا ہے۔ شروع میں ۵۸ صفحات کا مبسوط اور مفید مقدمہ ہے، اور پوری کتاب قیمتی حواشی سے مزین ہے۔ فارسی کلام افسوس کہ ضائع ہوگیا (کم از کم اب تک منظرِ عام پر نہیں آیا)۔ جو چند شعر تذکرۂ "روزِ روشن" میں شامل ہیں، ان کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔

نہایت قادر الکلام اور نغز گو شاعر تھے۔ طبیعت بہت مضمون آفریں پائی تھی۔ اس پر استاد دونوں ایسے ملے، جو اپنے اپنے رنگ میں بےنظیر تھے۔ مومن اگر حسن و عشق کی واردات کے بیان میں اپنا جواب نہیں رکھتے، تو غالب کلام کی گہرائی اور معمولی بات کو بھی ایک خاص انوکھے انداز سے کہنے میں مشہور ہیں۔ سالک کے کلام میں دونوں کے رنگ کی کامیاب مثالیں ملتی ہیں۔

سالک کو یہ مزید فخر حاصل ہے کہ غالب کی وفات کے بعد ان کے بیشتر مبتدی اور کم مشق

شاگردوں نے ان سے اصلاح لی۔
سالک شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔ یہ بھی اس "جلسۂ شطرنج" دلّی کے رکن تھے جو نواب علاء الدین احمد خان۔ نے ۱۸۶۶ء میں قائم کیا تھا۔
ایک روایت کے مطابق ان کی شادی حیدر آباد کے خاندان تاڑبن میں ہوئی تھی۔ دو بیٹے اور چار بیٹیاں (امراؤ بیگم، انوری بیگم، اکبری بیگم، رقیہ بیگم) اپنی یادگار چھوڑیں دونوں بیٹے شاعر تھے۔ بڑے محمد مرزا خاں[1] کا تخلص عابد تھا۔ وہ مدتوں حیدر آباد میں "دفتر ہوم سکرٹری میں محافظ دفتر" رہے۔ وہاں سے پنشن پانے کے بعد دلی چلے آئے تھے۔ "میخانۂ سالک" انھیں نے مرتب کیا تھا۔
دوسرے بیٹے حیدر مرزا تھے۔ یہ پہلے حیدر تخلص کرتے رہے، بعد کو اسے ترک کرکے قلندر کر لیا۔ نوجوانی میں حجاز چلے گئے تھے۔ وہیں غالباً مدینہ منورہ میں انتقال ہوا۔
سب سے چھوٹی بیٹی رقیہ بیگم کی شادی اورنگ آباد (ریاست حیدر آباد دکن) کے ایک وکیل سید احمد حسن مودودی سے ہوئی، جن کی پہلی بیگم (امۃ الجبیب) تین کمسن بچے (ایک بیٹی اور دو بیٹے) چھوڑ کر فوت ہو گئی تھیں۔ خدا نے انھیں[2] متعدد بچے ارزانی فرمائے، ان میں سے دو بیٹوں ابو الخیر مودودی اور ابو الاعلیٰ مودودی نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔ سب سے بڑی بیٹی امراؤ بیگم کی نواسی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی اہلیہ ہوئیں۔

---

[1] یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عرف یا گھر کا نام "اکبر" تھا۔ سالک نے اپنے چھوٹے بھائی رضوان کا جو مرثیہ کہا ہے، اس میں ایک شعر ہے:

آتے نہیں ہیں اکبر و حیدر بھی یاد کیا — دنیا سے رنگھرا ہوے کیوں، تم نے کیا کیا!

[2] سید ابو الاعلیٰ مودودی ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام خاندان کے مورث اعلیٰ خواجہ ابو الاعلیٰ مودودی چشتی کے نام پر رکھا گیا تھا، جو سکندر لودی کے عہد (۱۴۸۹ - ۱۵۱۷ء) میں چشت (خراسان) سے ہجرت کرکے ہندستان چلے آئے تھے۔
ابتدائی نجی تعلیم کے بعد مدرسۂ فوقانیہ، اورنگ آباد سے ۱۹۱۴ء میں دسویں کی سند لی۔ لیکن والد سید احمد حسن کی بعارضۂ فالج علالت اور بعد کو اسی سے ۱۹۲۰ء میں وفات کے باعث

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

(بقیۂ گزشتہ) اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔
انھوں نے ابتدا صحافت سے کی، مختلف اوقات میں، کبھی بڑے بھائی ابو الخیر مودودی کے ساتھ اور کبھی اکیلے، ہفتہ وار "مدینہ" (بجنور)، ہفتہ وار اور روزنامہ "تاج" (جبلپور)، ہفتہ وار "مسلم" (دلّی) اور روزنامہ "الجمعیۃ" (دلّی) کے مدیر رہے۔ پھر انھوں نے مولوی ابو مصلح حیدر آبادی سے ماہنامہ "ترجمان القرآن" خرید لیا اور اس کے ذریعے سے اپنے مخصوص دینی اور سیاسی افکار کی تبلیغ کرنے لگے۔
پٹھانکوٹ (ضلع گورداسپور۔ پنجاب) کے ایک صاحب چودھری نیاز علی نے محکمۂ انہار کی ملازمت سے پنشن پانے کے بعد منصوبہ بنایا کہ ایک اسلامی مرکز قائم کیا جائے، جہاں علما اسلام اور اسلامی علوم سے متعلق تحقیق کریں، تاکہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دینی اور اخلاقی انحطاط کا مداوا کیا جا سکے۔ اس کام کے لیے انھوں نے اپنی ۶۰۔۷۰ ایکڑ اراضی وقف کردی، اور علّامہ اقبال (ف: ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) کے مشورہ سے مولانا مودودی کو اس ادارے کی ذمّہ داری قبول کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۸ء میں مولانا مودودی اس مرکز میں پہنچ گئے۔ اس بستی کا نام پہلے جمالپور تھا، اب یہ دار الاسلام کے نام سے موسوم ہوئی۔
مولانا مودودی یہاں زیادہ دن نہ رہ سکے؛ چودھری نیاز علی سے انھیں کچھ سیاسی نظریات اور طریقۂ کار کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گئے، اس پر وہ لاہور منتقل ہو گئے، جہاں انھوں نے ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء کو اسلامیہ پارک (چوبُرجی) میں جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی؛ وہی خود اس کے صدر منتخب ہوئے۔
اب چودھری نیاز علی لاہور آئے اور اصرار کر کے جون ۱۹۴۲ء میں انھیں دار الاسلام واپس لے گئے۔ ملک کی آزادی اور تقسیمِ ملک تک وہ یہیں رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ذیلدار پارک، (اچھرہ) لاہور میں اپنا مرکز قائم کر لیا اور تصنیف و تالیف کے کام کے ساتھ جماعتِ اسلامی کے استحکام اور ترقی میں مصروف ہو گئے۔ اُن کی صحت خراب رہنے لگی تھی خصوصاً گھٹنے میں درد کے باعث وہ بیٹھنے سے معذور ہو گئے تھے۔ معدے میں بھی مستقل شکایت رہتی تھی۔ ان کے دوسرے بیٹے ڈاکٹر احمد فاروق امریکا کے شہر بفیلو میں مطب کرتے ہیں؛ مئی ۱۹۷۹ء میں، وہ باصرار انھیں علاج کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں عمل جرّاحی ہوا، اور بظاہر وہ رُوبصحت تھے کہ یک لخت حالت

(باقی آگے)

تم غیر کے ہوئے، تو رہا کیا جہان میں | گویا ہمارے واسطے کچھ بھی بنا نہ تھا

میرا ہو آشیانہ، اور آدھا جلا ہوا | بجھ بھی گئی تھی آگ، تو بجلی کو کیا ہوا

کہلاتے ہو کیوں وعدہ فراموش جہاں میں
آجاؤ کہ ہیں آپ میں اکثر نہیں ہوتا

نہیں اک بار بھی اب سننے کی طاقت دل میں
پہلے سو بار، ترا نام لیا کرتا تھا

سالکؔ! صنمکدہ سے نکالے گئے کہیں | حضرت ارادہ رکھتے ہو، کیوں خانقاہ کا!

سالکؔ! جو کوئی عشق میں، مجھ کو بُرا کہے | تکتا ہوں منھ کو اور یہ کہتا ہوں: "ہاں درست"

کیوں چلا آتا ہے ہر بات پہ رونا سالکؔ! | آج اُس کوچہ سے آتا ہے، مگر تو ہو کر

کس کو دل دیتے ہو، کیا کرتے ہو، دیکھو سالکؔ! | ہائے نادان بنے جاتے ہو، دانا ہو کر

اب تک بھی میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہوئے | سالک کا حال رات کو ایسا سُنا کہ بس

تم بھی وہی کہو، تو کہیں سب بجا درست | میں بھی وہی کہوں، تو کہے اک جہان غلط

آخر تو لائینگے کوئی آفت فغاں سے ہم | حجت تمام کرتے ہیں آج، آسماں سے ہم

تم آگئے تو ہوش کہاں، میزباں ہو کون | آج آپ اپنے گھر میں ہیں کچھ میہماں سے ہم

چپ چپ پڑے ہوئے تھے، ابھی خانقاہ میں | کچھ کھلے ہیں، بیعتِ پیرِ مغاں سے ہم

مایوس و ناامید ہیں، کیا مدعا سے ہم | کہتے ہیں، اور رکھتے ہیں کس التجا سے ہم

کاش! اے سپہر! تجھ سے ہی رکھتے تو سہل تھیں | وہ خواہشیں کہ رکھتے ہیں اس بیوفا سے ہم

کہنے کا غیر کے، تو کسی کو یقیں نہیں | پر تیری آنکھ، راز کی تیرے، امیں نہیں

کب دیکھیے قفس سے رہائی نصیب ہو | کیا آمدِ بہار کی، ہم آرزو کریں

پھرتے ہیں دادخواہ ترے حشر میں خراب | تو پوچھتا نہیں، تو کوئی پوچھتا نہیں

خدا کرے کہ سمجھ جائیں یہ کنایہ وہ | ابھی تو چرخِ بریں کا گلہ کیے جاؤں

(بقیہ گزشتہ) بگڑ گئی اور وہ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو وہیں بفیلو میں جاں بحق ہو گئے۔ لاش پاکستان آئی اور انھیں ۲۵ ستمبر کو ان کے مسکن (ذیلدار پارک۔ اچھرہ، لاہور) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ شروع میں شاعری بھی کی، طالب تخلص تھا۔ چند غزلیں ملتی ہیں (ایک شخص ایک کارواں (از مجیب الرحمٰن شامی): ۱۹-۴۵)

نقاب چہرے سے الٹو کہ میں کب تک — شکایتِ نگہِ نارسا کیے جاؤں
وہ دشمن دوست ہو یا آسماں ہو — اجل بن کر ہی کوئی مہرباں ہو
شکر کیجیے کہ نہیں تابِ تکلم مجھ کو — ورنہ اس طرح بھی، جو چاہو، کہو تم مجھ کو
غصۂ قاتل کا بڑھایا ہے یہ طعنہ دے کر — زندہ گو یا کہ نہیں چھوڑنے کے تم مجھ کو
رگ رگ میں نیشِ عشق ہے، اے چارہ گر مرے
یہ درد وہ نہیں، کہ کہیں ہو کہیں نہ ہو
گرچہ ہے آمدِ جاناں کی خبر بازاری — ہے مگر سالکِ مضطر کے سنا دینے کی
زباں کٹ جائے، گر لب سے تمہارا کچھ گلہ نکلے
مگر یہ تو کہوں گا، تم کو کیا سمجھا تھا، کیا نکلے
اُس کے آنسو ٹپک پڑے سالکؔ! — حال اس درد سے کہا تو نے
جو پاس ہیں میرے، وہ خدا جانے کہاں ہیں — تم دُور رہو، پر بیٹھے ہو گویا مرے آگے
ہم سے بھی، مل کر گیا، روتا ہوا سالکؔ ابھی
کیا ارادہ ہے، خدا جانے، کدھر جانے کو ہے
جان ہی دے کے عشق میں ہوئی خبر — آ گیا کچھ لیا دیا آگے

فارسی کا رنگ یہ ہے:

افروختنم ز آتشِ دل شمعِ آہ را — در سینہ سوختنم، نفسِ صبحگاہ را
زاہد باز اہلِ میکدہ پرہیز واجب است — از ما کنارہ گیر کہ آلودہ ایم ما
از ما مپرس، بہرِ خدا، داستانِ ما — در باب ازیں کہ تاب ندارد زبانِ ما
تا نظر کردم برویت، از نگاہم خوں چکید — تا سخن گفتنم زخوبیت، از لبم تبخالہ ریخت
جہاں ز تیغ جفائے تو سر بسر خون ست — بہر کجا کہ نہم پای، تا کمر خون ست
پنہاں زہمہ، او نظرے جانبِ ما داشت — رفتیم گر از جائے، بخندید کہ جا داشت
سوئے عاشق، نگہِ مہر فزا، نتواں کرد — می کنی ہر چہ باغیار، بما نتواں کرد
گر زندہ ام بہ ہجرِ تو، اے بے وفا، مرنج — مُردن بہ اختیارِ من سخت جاں نبود
در بہ بندم بشبِ وصل وچناں رقص کنم — راہ نایافتہ مردم سرِ دیوار آیند
جادہ پیمایاں کہ عزمِ کعبۂ دل کردہ اند — رفتہ اند از خویش و ہم در خویش منزل کردہ اند

شبِ وصال بہ غفلت گذشت، سالکؔ حیف
مثالِ عمر کہ در عالمِ شباب رود

ناز بر روشنیِ نیرِ اقبال مکن — تا دمِ صبح بود انجمن آرائیِ شمع
نشنید آتش دلہا دمی کز جوش بنشینم — بر افتد رسم نالیدن، اگر خاموش بنشینم
در گفتگوے عشق، لبِ راز بستہ ایم — از دل گرہ گشودہ، بر آواز بستہ ایم
روزِ وصلِ غیر و من اندر دعا — تا شود امروزِ او فردا ے من
اے بے خبر ز رنجِ فراق و نشاطِ وصل — دیر آمدی بسوے من و زود می روی

[روزِ روشن: ۵۵۴، ۵۵۵؛ خمخانۂ جاوید، ۴: ۳۷ - ۴۹؛ محبوب الزمن، ۱: ۵۱۰ - ۵۱۲؛ تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم: ۷۹ - ۸۰؛ کلیاتِ سالک مرتبہ کلب علی خاں فائق (دیباچہ)؛ ایک شخص ایک کارواں: ۱۹ - ۴۵؛ مکتوبِ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم بنام مؤلف]

سالم ـــــ میر احمد حسین

اٹھائے کوئی نہ فتنہ نیا قیامت میں
ٹٹولتا ہوں دلِ مبتلا کو تربت میں

[از خط منشی مہیش پرشاد مرحوم بنام مؤلف]

سجّاد ـــــ سیّد معین الدّین حیدر عرف سجّاد میرزا دہلوی

بہت نامی گرامی خاندان کے نام لیوا تھے۔ اودھ کے شاہی خاندان اور ان کے اجداد ایک ہی تھے۔ پدری سلسلہ برہان الملک سعادت خان، میر محمد امین نیشاپوری، نواب وزیر اودھ کے واسطے سے حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے، اور مادری بخشی الملک نواب مرزا نجف خان بہادر سے۔ یہ خاندان دلّی، لکھنؤ اور فیض آباد میں مقیم رہا ہے سب اوّل سجّاد مرزا کے دادا نواب مبارز الدولہ، ممتاز الملک حسام الدین حیدر خان بہادر حسام جنگ لکھنؤ سے دہلی آئے۔ یہ بیٹے تھے نواب سراج الدّولہ غیاث محمد خان نیشاپوری کے جو فارسی میں شعر کہتے تھے اور قیامت تخلص کرتے تھے (ف: ۱۲۲۸ھ۔ در زمیں پنہاں شدی اے آفتاب) نواب حسام الدّین حیدر خان بہادر خود بھی شاعر تھے، نامی تخلص تھا۔ انھوں نے میر مستحسن خلیق (والدِ میر انیس) اور میر تقی میرؔ دونوں سے مشورۂ سخن کیا۔ یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے غالب کی شاعری کے آغاز میں اُن کا کلام لکھنؤ میں اپنے استاد میر کو دکھایا تھا جس پر انھوں نے وہ مشہور فقرہ کہا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا تو بےنظیر شاعر بن جائیگا، ورنہ مہمل بکنے لگیگا۔" ان کے بیٹے ناظر حسین مرزا نے ان کا اردو کلام جمع کر کے شائع کیا تھا۔ اس دیوان پر غالب نے ایک دیباچہ فارسی زبان میں لکھا تھا جو ان کے کلیاتِ نثر میں بھی موجود ہے۔ نامی نے ۲۲ شوال ۱۲۶۲ھ (۱۳ اکتوبر ۱۸۴۶ء) کو بعارضۂ فالج وفات پائی۔ مدفن علی گنج (دہلی) میں درگاہ قدم مبارک کے بیرونی چبوترے پر تھا۔ اُردو کے مشہور شاعر نواب سیّد محمد خان رندؔ لکھنوی حضرت نامی کے علاّتی بھائی تھے۔

نامی کی تین اولادیں تھیں: مظفر الدّولہ ناصر الملک مرزا سیف الدّین حیدر خان بہادر

سیف جنگ؛ یہ ۱۸۵۷ء میں انگریز کی گولی کا شکار ہوئے۔ ان سے چھوٹی ایک لڑکی تھی، قدسیہ بیگم (عرف حسینی صاحبہ)۔ یوسف مرزا جن کے نام غالب کے خط ہیں، انھیں کے بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹے ذوالفقار الدین حیدر (عرف ناظر حسین مرزا) تھے۔ ناظر حسین مرزا اپنے بھائی سے ۱۴ سال اور زہن سے چار سال چھوٹے تھے۔ یہی سجّاد کے والد تھے۔

ناظر حسین مرزا کی ۲۷ برس کی عمر میں جہان آرا بیگم بنت نواب حیدر خان بہادر سے شادی ہوئی، جو لال قلعہ میں ملازم تھے۔ ناظر حسین مرزا اپنے خسر ہی کی جگہ تعینات ہوئے تھے؛ وہ بعد کو ترقی کر کے خواصی ہو گئے، حال آنکہ یہ عہدہ شاہزادوں کے لیے مخصوص تھا۔ ان کی چھ اولادیں ہوئیں: تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔ بڑے بیٹے یہی سیّد معین الدّین حیدر سجّاد میرزا تھے۔ ان سے چھوٹے سیّد زین العابدین حیدر عرف اکبر میرزا تھے، یہ ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۸/ ۱۸۴۹ء) میں پیدا ہوئے اور ۲۶ مارچ ۱۹۱۸ء کو فوت ہو گئے۔ ان سے چھوٹے سیّد غیاث الدین حیدر تھے۔ یہ ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے؛ ان کا سالِ وفات ۱۲۹۲ھ ہے۔ بڑی بیٹی کبریٰ بیگم ۱۲۶۷ھ میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ شاعرہ بھی تھیں؛ ذکی اور مخفی دو تخلص تھے۔ ان کا نکاح سیّد محمد میر سے ہوا تھا۔ چھوٹی کا نام صغریٰ بیگم تھا؛ ان کا میر تفضل حسین وکیلِ شاہی کے پوتے (اور میر نواب کے صاحبزادے) سیّد افضل حسین سے نکاح ہوا؛ انھیں کی بیٹی ذکیہ بیگم مولانا محمد حسین آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم سے منسوب تھیں (آغا محمد باقر؛ آغا محمد طاہر (ف: دلّی، ۱۹۵۷ء)؛ آغا محمد اشرف (ف: لندن، ۱۹۶۱ء)؛ تینوں بنیرگان آزاد انھیں آغا محمد ابراہیم کے بیٹے تھے) تیسری بیٹی رقیہ بیگم تھیں۔ ان کی ولادت ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸۔ ۱۸۵۹ء) میں ہوئی۔ تاریخ وفات ۳۰ جنوری ۱۹۲۴ء ہے۔

سجّاد کی ولادت (۱۲۶۲/ ۱۸۴۶ء) کے بعد حسبِ دستور ناظر حسین میرزا بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ نومولود کے لیے نام عطا فرمایا جائے۔ بہادر شاہ ظفر نے دریافت کیا کہ آپ نے خود کیا نام تجویز کیا ہے، تاکہ اگر وہی مناسب ہو، تو اسے قائم رکھا جائے۔ حسین میرزا نے عرض کیا کہ خادم کے ذہن میں تفاؤلاً زین العابدین حیدر عرف سیّد سجّاد میرزا نام آیا تھا، لیکن جو رائے عالی ہو، وہی نام رکھا جائیگا۔ اس پر بہادر شاہ نے فرمایا: اس لڑکے کا نام معین الدّین حیدر عرف

سجاد میرزا رکھو، خداوندِ کریم تم کو اولڑکا دیگا، اس کا نام زین العابدین حیدر رکھنا۔ حسین میرزا نے عرض کیا: بسر و چشم۔

سجاد ابھی پانچ چھ مہینے کے ہونگے کہ ان کی نانی (بیگم نواب حیدر خان) نے جن کے اپنی اولادِ نرینہ نہیں تھی، انھیں گود لے لیا۔ چنانچہ ان کی پرورش نانی اماں کی نگرانی میں ہوئی۔ سنِ شعور کو پہنچے تو حسین مرزا نے خود اُن کی اردو، فارسی، عربی کی تعلیم کا انتظام کیا۔ عربی شرح ملاّ تک پڑھی۔ فارسی نثر کے مسودے غالب کی خدمت میں بھی پیش کرتے رہے۔ غرض تعلیم کا سلسلہ ۱۵۔ ۱۶ برس کی عمر تک جاری رہا۔ اس کے بعد کچھ انگریزی پڑھنے کا بھی موقع ملا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ناظر حسین میرزا اور اُن کے خاندان پر جو افتاد پڑی، اس کی تفصیل غالب کے خطوط (مشمولۂ اُردوئے معلیٰ) میں ملتی ہے۔ حسین مرزا کو دلی چھوڑ کر اپنی جان کی خاطر ہرزہ گردی پر مجبور رہونا پڑا۔ انھوں نے لکھنؤ، رام پور، بھرت پور، گوالیار، بیکانیر، الور۔ غرض کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی؛ جمّوں تک کا سفر کیا۔ ان دنوں بیکانیر میں نواب ولایت حسین خان وزیر ریاست تھے۔ ان کی بدولت چندے تحصیلداری کی اسامی پر تعینات ہو گئے۔ یہاں شاید دو برس سے کچھ اوپر رہے تھے۔ لیکن یہاں سے بھی دانہ پانی اٹھا، تو پھر دلی آ گئے۔ حیدر آباد جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ فالج میں مبتلا ہو گئے، اور زیادہ نقل و حرکت سے معذور ہو گئے۔ جان تو بچ گئی، لیکن کہیں جانے آنے کے لائق نہ رہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس زمانے میں نواب ضیاء الدین نیر رخشاں نے حسین میرزا کی بہت مدد کی۔ ان کی وفات تک ماہانہ ان کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔

الور کے سفر کے دوران میں حسین مرزا کی میر بندہ علی عرف میرزا میر سے ملاقات ہوئی میر بندہ علی وہاں کے عمائد میں سے تھے اور حسین میرزا کی خاندانی عظمت اور دنیوی مرتبت سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے مناسب آؤ بھگت کی اور حتی الوسع راج کی طرف سے کچھ عارضی انتظام بھی کروا دیا۔ اسی زمانے میں معین الدین حیدر سجّاد میرزا کا نکاح میر بندہ علی کی صاحبزادی گوہر سلطان بیگم سے، اور خود حسین میرزا کی بڑی بیٹی کبریٰ بیگم کا ان کے بیٹے سیّد محمد میر سے ہوا۔ اس وقت سجّاد میرزا کی عمر بمشکل ۱۴۔ ۱۵

برس کی ہوگی۔

اُلور سے دلّی واپس آنے کے بعد سجّاد میرزا کا یہاں مشن ہائی اسکول میں داخلہ ہو گیا۔ صرف انگریزی کی کسر تھی، باقی سب مضامین تو وہ گھر پر پڑھ ہی چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد جلد ترقی کے مراحل طے کرتے چلے گئے اور تین سال بعد میٹرک کا امتحان درجۂ اول میں پاس کر لیا۔ اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کا ایک امتحان "جنرل ایگزیمی نیشن" کے نام سے ہوا کرتا تھا۔ سجّاد میرزا اس میں بھی شامل ہوئے، اور پنجاب بھر میں اوّل رہے۔

میٹرک کے بعد انھوں نے سان اسٹیفنس کالج میں داخلہ لے لیا، حال آں کہ اس وقت تک یہ دو بچّوں کے باپ بھی بن چکے تھے۔ لیکن مزید تعلیم ان کے مقدّر میں نہیں تھی۔ مشن اسکول کے پرنسپل پادری ر۔ ر۔ ونٹر صاحب تھے۔ تعلیم کے زمانے میں سجّاد اپنے انگریزی کے مضامین اور مسوّدے خاص طور پر بنظرِ اصلاح ان کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کے امتحان کے نتائج بھی بہت تسلّی بخش رہے۔ انھیں باتوں سے ونٹر صاحب ان سے بہت خوش اور ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ سجّاد ابھی کالج میں داخل ہوئے ہی تھے کہ مشن اسکول میں مشرقی زبانوں (اردو، فارسی) کے مدرّس کی جگہ خالی ہوئی۔ انھوں نے اس کی سجّاد کو پیشکش کی۔ یہاں مشاہرہ ۳۰/۴۰ روپے تھا، اور کالج میں صرف ۱۲ روپے ماہانہ وظیفہ ملتا۔ ان کے گھر کے حالات جیسے کچھ تھے، ان سے متعلق کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ تعلیم جاری رکھنے کی خواہش کے باوجود وہ یہ ملازمت قبول کر لینے کی طرف مائل تھے۔ دشواری یہ تھی کہ کالج کے پرنسپل صاحب سے اجازت کیونکر حاصل کی جائے، جو اُن پر بے حد مہربان تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا تو کہا کہ میں تمھارے لیے وظیفہ بارہ کی جگہ پندرہ روپے ماہانہ کر دوں گا۔ تم پڑھنے لکھنے میں بہت اچھے ہو، اپنی تعلیم جاری رکھو، پڑھائی کے بعد ترقی کا بہت میدان ہے۔ سجّاد نے پوری رُوداد ونٹر صاحب کے گوش گزار کر دی۔ ونٹر ان کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے پرنسپل سے خود بات کی، جس پر انھوں نے اجازت دے دی۔ اور سجّاد کالج سے اپنا نام کٹا کر مشن اسکول میں ملازم ہو گئے۔

ونٹر لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں کا بھی ایک اسکول چلاتے تھے۔ زیادہ دن نہیں گزرے

تھے کہ اس زنانہ مدرسے کے ہیڈ ماسٹر ہدایت اللہ صاحب کو حیدر آباد میں ملازمت مل گئی۔ جانے سے پہلے انھوں نے ونٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ میرے بعد سجّاد میرزا صاحب کو اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیں، ان سے بہتر آدمی اس جگہ کے لیے آپ کو نہیں ملنے کا۔ مسٹر ونٹر ان کی عالی خاندانی اور ذاتی کارکردگی کا مدّاح تو تھا ہی؛ اس نے ماسٹر ہدایت اللہ کا مشورہ بے عذر قبول کر لیا اور سجّاد کو ہیڈ ماسٹر بنا دیا۔ اس عہدے کی تنخواہ ۷۰ روپے ماہانہ تھی۔

ونٹر صاحب کی بیوی دلّی کے زنانہ اسکولوں کی پرنسپل تھیں۔ سجّاد کی ان سے بھی واقفیت پیدا ہوئی۔ جس گھر کے وہ نام لیوا تھے، وہ کسی سے مخفی نہیں تھا۔ اس پر ونٹر اور ان کی بیوی کی سرپرستی مستزاد۔ بہت جلد سجّاد مرزا مقامی انگریزی حلقوں میں متعارف ہو گئے، اور سب ان سے مہربانی اور لطف کا سلوک کرنے لگے۔ دلّی کے چیف کمشنر کرنیل ڈیوس خاص طور پر شریف دوست اور امیرانہ مزاج کے آدمی تھے؛ انھوں نے سجّاد میرزا کا نام نائب تحصیلداری کے لیے منظور کرا دیا۔ لیکن اگر قسمت میں "تہیدستی" لکھی ہو، تو "رہبر کامل" کی کوشش کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے! جب حکومت کی طرف سے نائب تحصیلداری کے لیے بلاوا آیا ہے، تو ان کی بیوی بسترِ مرگ پر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا پڑی تھیں؛ انھوں نے اپنی مجبوری لکھ کر معذرت کر دی۔

اس وقت تک ان کے پانچ بچے ہو چکے تھے۔ ایک بچہ عالمِ طفلی میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا؛ چار بفضلہٖ زندہ تھے اور سب کمسن۔ اسی زمانے میں ان کی بیوی گوہر سلطان بیگم عارضۂ تپِ دق میں مبتلا ہو گئیں، اور عین عالمِ شباب میں صبح ۹ شعبان ۱۲۹۲ ھ (۱۰ دسمبر ۱۸۷۵ء) کو جنّت سدھاریں۔ قدم شریف (دلی) میں مدفن نصیب ہوا۔ ناظر حسین میرزا نے بھاوج کی تاریخِ وفات کہی:

سردار دلھن، سیّدۂ نیک سرشت ‌ ‌ ‌ ‌ در عینِ شباب مُرد زار و ناشاد
تاریخِ وفاتِ وے چو از ما جستند ‌ ‌ ‌ ‌ گفتیم کہ: "خلد خوابگاہِ وے باد"
(۱۲۹۲)

اب دیکھیے تقدیر کا کرشمہ!

سیّد سجّاد میرزا اپنی والدہ کی گود میں ابھی دودھ پیتے بچّے تھے کہ ان کی خالہ (یعنی نواب حیدر خاں کی چھوٹی صاحبزادی) امّید سے ہوئیں۔ دونوں بہنوں کے دل میں خیال ہوا کہ اگر ان کے لڑکی پیدا ہو، تو اس کی سجّاد میرزا سے نسبت کر دی جائے، تاکہ رشتہ جاری رہے بلکہ اور استوار ہو جائے۔ اس زمانے میں (بلکہ اب بھی کہیں کہیں) بہنوں اور پکّی سہیلیوں میں اس طرح سے رشتے کر دیے جاتے تھے۔ خدا کی شان، لڑکی پیدا ہوئی۔ جب دونوں بچّے ذرا بڑے ہوئے، تو ناظر حسین میرزا نے اپنی بیوی (جہاں آرا بیگم) کے ایما پر پیغام دیا۔ اس پر ان کے ہم زلف سیّد سردار میرزا نے نہ حسین میرزا کی بزرگی کا خیال کیا، نہ ان کے مرتبے کا، اور بڑی تمکنت سے جواب دیا: "میرے جدّی خاندان میں کوئی لڑکا دستیاب نہ ہوا، تو میں سجّاد میرزا سے نسبت کر دوں گا۔" اس جواب سے ناظر حسین میرزا کو رنج تو ضرور ہوا ہو گا، لیکن اس کے بعد انھوں نے سردار میرزا سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔

خدا کی شان! سجّاد میرزا کا گوہر سلطان بیگم سے نکاح ہوا، اور وہ چار چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر جان بحق ہو گئیں۔ اُدھر سردار میرزا کا انتقال ہو چکا تھا؛ وہ اپنے خاندان کے کسی موزوں پیغام کی حسرت دل ہی میں لیے رخصت ہو گئے؛ اور سجّاد میرزا کی خالہ کی بیٹی ہنوز بن بیاہی بیٹھی تھیں۔ گوہر سلطان بیگم کے انتقال کے بعد خالہ نے سلسلہ جنبانی کی۔ سیّد سجّاد میرزا کو نکاح کی خواہش تو نہ تھی، لیکن وہ اپنے کمسن بچّوں کی طرف سے بہت متفکّر تھے۔ سیّد حسین میرزا کے اصرار پر وہ نکاحِ ثانی پر رضامند ہو گئے۔ لیکن بیوگی کا داغ بھی اس بیچاری کی قسمت میں لکھا تھا۔

اس دوران میں سیّد سجّاد میرزا ننانہ اسکول کی ملازمت چھوڑ چکے تھے۔ ونٹر صاحب کو اپنے ہاں خرچ کی تخفیف منظور تھی؛ انھوں نے سجّاد میرزا سے کہا کہ جلدی کی ضرورت نہیں، لیکن اگر کوئی اور مناسب ملازمت مل سکے، تو وہاں جا سکتے ہو۔ حسنِ اتفاق سے اسی زمانے میں دلّی عربک اسکول میں سیکنڈ ماسٹر کی اسامی خالی ہو گئی اور اس پر سیّد سجّاد میرزا کا تقرر ہو گیا۔ جس وقت ان کی یہ دوسری شادی ہوئی ہے، وہ اسی عہدے پر فائز تھے۔ شادی کے کوئی تین مہینے بعد عربک اسکول میں تقسیم انعامات کا جلسہ تھا۔ کمشنر صاحب بہادر کو صدارت کے لیے آنا تھا۔ اسکول کی طرف سے یہ فرض سجّاد میرزا کے ذمّے ہوا کہ یہ

جائیں اور کمشنر بہادر کو ان کی کوٹھی (بیرون کشمیری دروازہ) سے ساتھ لوا لائیں۔ یہ گھوڑے پر سوار ہو کر ان کی کوٹھی پر حاضر ہوئے۔ صاحب بہادر بگھی پر سوار تھے اور سجاد گھوڑے پر اُن کے ساتھ ساتھ۔ بدقسمتی سے پاؤں رکاب سے نکل گیا۔ سواری جانتے نہیں تھے، توازن بگڑ گیا اور یہ دھڑام سے سر کے بل زمین پر آ رہے۔ دماغ پر سخت چوٹ آئی۔ علاج معالجے میں کمی نہیں ہوئی۔ لیکن بےسود! وقت آن لگا تھا، جانبر نہ ہو سکے، اگلے ہی دن راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔ درگاہ شاہِ مرداں (علی گنج) میں مجلس خانے کے دالان کے باہر دفن کیے گئے تھے۔ میرزا عبدالغنی ارشد گورگانی نے تاریخ کہی: بیٹھ کر "رنج و غم" سے کھینچوں "آہ" ("رنج و غم" کے اعداد (۱۲۹۹) سے "آہ" کے (۶) کا تخرجہ ہے، جس سے ۱۲۹۳ برآمد ہوتے ہیں)

دوسری تاریخ میر شاہجہان کامل نے کہی:

ہے ہے ز پشت اسپ افتادہ (۱۲۹۳)

ناظر حسین میرزا کے دوست آغا علی حسن ندیم لکھنوی کے قطعۂ تاریخ میں حادثے کی پوری تفصیل ہے:

دادو بیداد است از جور و جفائے چرخ پیر
نوجواناں را بغلطاند بخوں ایں کینہ خواہ
لائق و فائق، سعید و ہم مطیعِ والدش
نورِ چشمِ اقربا، بہر پدر نورِ نگاہ
صاحبِ فہم و فراست، مالکِ علم و کتاب
پاک طینت، نیک سیرت، خوبصورت ہمچو ماہ
حیف، آں سجاد مرزا ایست و پنجم از رجب
یومِ اثنین اوفتاد از اسپ در اثنائے راہ
چوں فرس بگریخت پایش در رکاب آویختہ
بر زمیں برخوردہ، سر بشکست و شد قالب تباہ
آہ از ضربِ دماغ از حلق و ہم بینی و گوش
ہفت شش سیر خون آمد بیروں تا صبحگاہ (کذا)

ڈاکٹرہا و طبیباں روز و شب کردند سعی
بر نمی گردد اجل، چوں آید از امرِ الاہ
یازدہ ساعت، سہ شنبہ، الغرض کرد انتقال
شد بچشم والدِ ماجد ہمہ عالم سیاہ
بہرِ تاریخِ وفاتش زد رقم کلکِ ندیم
"نوجوانے مرد آہ، از رہوار افتادہ، آہ"
(۱۲۹۳)

گویا ۲۵ رجب ۱۲۹۳ھ کو حادثہ پیش آیا، اور اگلے دن سہ شنبہ ۲۶ رجب دن کے گیارہ بجے انتقال ہو گیا (۱۵ اگست ۱۸۷۶ء)۔

نواب ضیاالدین نیر رخشاں نے ۲۰ شعر کا قطعہ لکھا، جو نوحہ بھی ہے اور تاریخ بھی:

رفتی بہ جوانی، اے دریغا سجّاد! — از گرم روانی، اے دریغا سجّاد!
رہِ خلد بسر تاختی، افتادی از اسپ — بس تیز عنانی، اے دریغا سجّاد!
تو گوہرِ نایابی، کہ از چشمِ پدر — چوں اشک روانی، اے دریغا سجّاد!
وے گرم سخن کہ بود، با ما کا مروز — گویا تو نہ آنی، اے دریغا سجّاد!
در کنجِ مزار غافل از دردِ پدر — آسودہ چسانی، اے دریغا سجّاد!
کو آں نمطِ کلامِ لطف آمیزت — در عرضِ معانی، اے دریغا سجّاد!
دلجوئی کو دکانِ غم دیدہ کجا — با نرم زبانی، اے دریغا سجّاد!
فارغ دلی از ما و مگر، رنجِ پدر — دانم کہ ندانی، اے دریغا سجّاد!
داد شب و روز چشم و دل دریادت — خونابہ فشانی، اے دریغا سجّاد!
از بالشِ خشت، بر نمی داری سر — در خوابِ گرانی، اے دریغا سجّاد!
از پیشروی تو شرمساری ز پدر — خاموش از آنی، اے دریغا سجّاد!
از گریۂ خونیں ہمہ تن مردم را — در خون بنشانی، اے دریغا سجّاد!
از اشک بکامِ خشک فریاد کناں — شوراب چکانی، اے دریغا سجّاد!
چوں گنجِ مروّت و محبّت بودی — در خاک نہانی، اے دریغا سجّاد!
گو آں روشِ بیانِ دردانگیزت — در مرثیہ خوانی، اے دریغا سجّاد!
کو پرسشِ جمعِ دوستانِ ہمسال — با شستہ زبانی، اے دریغا سجّاد!

یک حرف زدن بطفلگاں نتوانی | باآں ہمہ دانی، اے دریغا سجّاد!
ماغمزدگاں بہ رنجِ ہجرِ تو و تو | شاداں بجنانی، اے دریغا سجّاد!
باما سخنے نزنی و سُوے عدم | تیز اسپ برانی، اے دریغا سجّاد!
بہرِ سنۂ فوت ہم بطرزِ نوحہ | باید کہ بخوانی: "اے دریغا سجّاد!"

یہی مادّۂ تاریخ ان کے کتبے میں لکھا گیا تھا۵ اگرچہ اس میں ایک زائد ہے (۱۲۹۳ھ)

نواب ناظر حسین میرزا بڑے باحوصلہ اور مستقل مزاج بزرگ تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اور اُس کے بعد اُن پر جو بیتی، اور برسوں انھیں جسم وجان کا رشتہ برقرار رکھنے میں جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، ان حالات میں دل ودماغ کو ماؤف ہونے سے محفوظ رکھنا کچھ انھیں کا کام تھا۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ خاندان کی تباہی نے انھیں پکا پھوڑا بنا دیا تھا۔ وہ اپنی قوتِ برداشت کی آخری حد تک پہنچ چکے تھے۔ یکے بعد دیگرے عزیزوں کی اموات نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ بڑے بھائی نواب مظفر الدولہ انگریز کی گولی کا نشانہ بنے۔ ابھی وہ ان صدمات سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ سب سے چھوٹے بیٹے سیّد غیاث الدّین حیدر عرف اصغر میرزا عینِ شباب کے عالم میں بعمر ۲۰ برس ۱۲۹۲ھ میں داغِ مفارقت دے گئے۔ اس نے بالکل حواس باختہ کردیا، اور واقعی ان کے دماغ میں اختلال کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس پر بمشکل سال بھر گزرا تھا کہ ۱۲۹۳ھ میں یہ سجّاد میرزا کا حادثہ پیش آیا، جس نے انھیں گویا زندہ درگور کردیا۔ یکشنبہ ۶ رمضان ۱۳۰۶ (۶ مئی ۱۸۸۹ء) ۷۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ علی گنج ہی میں مجلس خانے کی چار دیواری کے اندر پہلے دالان میں قبر تھی، اور لوح پر یہ تاریخ کندہ تھی:

حسین میرزا اُمرد در ششِ رمضاں | ازاں کہ بود زنسلِ امیرِ خیبر گیر
پے شمارہ سالِ وفات رضواں گفت | "بیا بکاخِ جناں اے امیر ابنِ امیر!"

(۱۳۰۶)

---

۵ اب شاہِ مرداں میں نہ کوئی قبر ملتی ہے، نہ کتبہ۔ سب کچھ تقسیم ملک کے ہنگامے اور اس کے بعد کے فسادات میں نذرِ تاراج ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

سیّد سجّاد میرزا کی جسمانی یادگار چار بچے تھے : تین لڑکے اور ایک لڑکی - ان کے نام حسب ترتیب یوں تھے : سیّد محمد میرزا ، سیّد حیدر مرزا ، سیّد صاحب میرزا ؛ لڑکی کا نام سجّادی بیگم تھا ، جو اپنے تینوں بھائیوں سے بڑی تھیں - سجّادی بیگم کے تین بچے ہوئے : سب سے بڑی لڑکی کنیز فاطمہ اور ان سے چھوٹے دو لڑکے : سیّد محمد حیدر ، اور سیّد محمد سلطان - کنیز فاطمہ کا نکاح سیّد حیدر میرزا حیدر دہلوی سے ہوا تھا - ان کے بیٹے سیّد مصطفےٰ میرزا شریر دہلوی آج کل کراچی میں مقیم ہیں -ؔ

افسوس کہ سجّاد میرزا کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا - تقسیم ملک کے وقت جب خاندان پاکستان گیا ہے ، تو دوسرے قلمی مسودات کے ساتھ ان کا دیوان بھی ایک صندوق میں مقفّل بحفاظت یہاں چھوڑ دیا گیا تھا - لیکن سالہا سال تک کسی نے صندوق نہ کھولا ، جس سے کاغذات کو دیمک چاٹ گئی - جو کلام بچ گیا ، شریر دہلوی کے بیان کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے : ایک قصیدہ حضرت صاحب العصر علیہ السلام کی شان میں (۲۰ اشعار) ، ۱۴ غزلیات ، ایک مثنوی (۱۳۷ شعر) چار سلام اور نوحہ - ان کی ایک نثری تصنیف "مجالس مولود" کے عنوان سے بھی محفوظ رہ گئی ہے - اس میں ائمۂ اطہار میں سے (۱) امیر المومنین حضرت علی ، (۲) بنت رسول حضرت فاطمۃ الزہرا ، (۳) حضرت امام حسن ، (۴) حضرت امام حسین ، (۵) حضرت امام محمد باقر ، (۶) حضرت امام محمد تقی ، (۷) حضرت امام حسن عسکری اور (۸) صاحب العصر کے سوانح حیات ہیں - ۷۹۵ صفحات کے اس مسودے کے ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف نے اسے دوم شعبان ۱۲۸۰ھ کو ختم کیا تھا - اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی -

سجّاد میرزا کو شاعری گویا ورثے میں ملی تھی - ان کے دادا نواب حسام الدین حیدر شعر کہتے اور نامی تخلص کرتے تھے - والد سیّد ناظر حسین میرزا نے باقاعدہ شاعری نہیں کی ، لیکن اس کوچے سے بالکل نابلد بھی نہیں رہے - چند شعر ان سے یادگار ہیں - انھوں نے

ؔ یہاں سجّاد میرزا کے حالات میں ان کے خاندان کی بیشتر تفاصیل اور تاریخیں جناب سید مصطفیٰ میرزا شریر دہلوی ہی کی مہیا کردہ معلومات پر مبنی ہیں ، جو انھوں نے مسودہ خاندانی حالات مرتبہ سید اکبر میرزا سے اخذ کی ہیں -

طالب علمی کے زمانے میں فارسی غالب سے پڑھی تھی۔ غالب کا اردو کلام انھیں کے ہاں جمع ہو رہا تھا، جو ۱۸۵۷ء کے فساد میں برباد ہو گیا۔

سجاد میرزا نے بہت کم عمری میں شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ مشورہ شروع میں غالب سے رہا۔ ایک سلام کا مطلع ہے:

حلقۂ زنجیر آہن اور پا سجاد کا
کیوں نہ دست بخس یارب شل ہوا حداد کا

اس کے مقطعے میں کہتے ہیں:

کیوں نہ ہو باغ سخن سجاد کا رشک بہار
خوشہ چیں ہے غالب مرحوم سے استاد کا

غالب کی وفات (۱۸۶۹ء) کے بعد کلام پر قربان علی بیگ سالک سے اصلاح لی۔

ان کے چھوٹے بھائی سید اکبر میرزا بھی شاعر تھے، اکبر تخلص تھا۔ پہلے مجروح و سالک سے اصلاح لی، بعد کو حالی سے مشورہ کرتے رہے۔

سجاد کے جملہ بقیۃ السیف کلام میں سے غزلوں کا انتخاب درج ذیل ہے:

آئینہ خانہ میں ہے محو خود آرائی کا
واہ، کیا خوب ہے، دعویٰ اُسے یکتائی کا

غیر کا کوچہ ہے اور گرد ہے لڑکوں کا ہجوم
ہے محبت میں یہ ساماں ترے سودائی کا

آپ کے پند و نصائح ہیں بجا سب، واعظ!
عقل اس وقت میں، اک نام ہے ہرجائی کا

انگلیاں شہر میں اٹھتی ہیں جدھر جاتا ہوں
اور ابھی دُور ہے عالم مری رُسوائی کا

کچھ بھی غیرت ہے تو در سے ترے پھر جائیگا غیر
دیکھ کر نقش، مری ناصیہ فرسائی کا

اب تصور میں بھی مجھ کو نظر آتے نہیں تم
ماجرا پوچھتے کیا ہو، شب تنہائی کا

غیر کو ڈھونڈنے اُس در پہ چلے جاتے ہیں
ہم نے اک رنگ تو ڈالا ہے شناسائی کا

یہ جو دیوانہ سا پھرتا ہے، وہی ہے سجاد
شہر میں شور تھا جس شخص کی دانائی کا

ممکن ہی نہیں جب کہ نظر آئے روئے دوست
اچھا کیا، جو ہم تے نہ کی جستجوے دوست

سو بار ہم تو راہ میں مل لیں، پہ کیا کریں
اتنا خیال ہے کہ رہے آبروے دوست

وہ دن خدا دکھائے، کہ دل کو قرار ہو
وہ مجھ کو ڈھونڈیں، غیر کو ہو جستجوے دوست

یہ نفی غیر ہے کہ نہیں مجھ کو رشک غیر
یوں محو دوست ہوں کہ نہیں آرزوے دوست

باتوں میں اس نے مجھ کو ملایا رقیب سے
حیراں ہوں، یہ سحر ہے، یا گفتگوے دوست

---

۵ شیدائی

آبِ بقا پلایا سکندر کو آپ نے — اے خضر! مجھ کو کیوں نہ بتاؤ گے کوئے دوست
ناصح! جو پھر کہو گے تو میں چھوڑ دونگا عشق — ہاں، ایک بار تم کو دکھلاؤں روئے دوست
سجاد کے مزار سے حسرت ٹپکتی ہے — اللہ، کس قدر تھی اُسے آرزوئے دوست

جس میں کچھ شکل و شمائل مری ملتے دیکھی — اس کو دھوکے سے مرے قتل کیا میرے بعد

میرے سیاہ حال کی تقریر ہے وہ زلف — روزِ سیاہ نالۂ شبگیر ہے وہ زلف

خدا کی قدرت کا ہے تماشا، نہ کہیے اس کو دیارِ دہلی
خدا کی رحمت کا ہے احاطہ، نہ کہیے اس کو حصارِ دہلی

سُنیں جو دہلی کے گلرخوں سے، جناں میں حورنہایہ دہلی
تو بے تامّل زباں سے نکلے، نثارِ دہلی، نثارِ دہلی

وہ مست و دلکش یہ سرزمیں ہے کہ اس کا ثانی کہیں نہیں ہے
فرشتے بیہوش ہوں فلک پر جو جائے اُڑ کر غبارِ دہلی

جو اہلِ دہلی کو دیکھتے تم، تو کہتے: خلدِ بریں یہی ہے
ارم سے کم تو نہیں ہے اب بھی، خزاں ہے گرچہ بہارِ دہلی

ذرا سے ویراں باغچہ پر تمھیں ہے کیا کیا غرور، واعظ!
ہمیں بھی اس کی کھلے حقیقت جو اس کو کیجے دوچارِ دہلی

سفر میں غربت کے دل تمھارا، کہو تو سجاد! بہلے کیونکر
نہ سیر کرنے کو سیرِ دہلی، نہ بات کرنے کو یارِ دہلی

ہیں تیغ بکف اور ارادہ ہے ادھر کا — کیونکر نہ کروں شکر محبت کے اثر کا
کہتے ہیں جسے مہر، یہ کیا چیز ہے یارب! — کیا عکس پڑا ہے یہ مرے داغِ جگر کا
ڈھونڈ آئے عدم تک بھی کئی بار ولیکن — ہم کو تو نہ مضمون ملا اس کی کمر کا
گل پھولیگا گر ہے یہی خونابہ فشانی — کچھ رنگ تو پلٹا ہے مرے دیدۂ تر کا
یہ زلفِ سیہ، یہ رُخِ روشن، قدِ موزوں — ان سب کے سوا دیکھنا انداز نظر کا
زاہد کو تو راضی کیا میخواری پہ ہم نے — رستہ بھی بتادے کوئی خمّار کے گھر کا
اک جنبش لب میں ابھی ہو جاؤنگا زندہ — کُشتہ ہوں فقط آپ کے اک تیرِ نظر کا

سجّاد! نہ لو نام محبت کا کسی کی
گر دل میں خیال آپ کے ہے نفع و ضرر کا

خزاں میں یاد آتا ہے سماں فصلِ بہاری کا
وہ کُو کُو قمریوں کی، شورِ مرغِ شاخساری کا
شبِ مہتاب ہو، اور باغ ہو اور یار پہلو میں
مرے دل سے مزا پوچھے کوئی پھر بادہ خواری کا
ترے عاشق کی پہروں اب تو آنکھیں بند رہتی ہیں
وہ اتنا شغل بھی جاتا رہا اختر شماری کا
وہ ملکِ جم کو مشتِ خاک سے کمتر سمجھتا ہے
اٹھایا جس نے تھوڑا سا مزا بھی خاکساری کا
ترے بہکانے سے میں بادہ خواری چھوڑ دوں ناصح!
معاذ اللہ! تقاضا کب ہے میری وضعداری کا
کہیں ایسا نہ ہو بہ جاؤ تم بھی جوشِ طوفاں میں
تماشا دیکھنا اچھا نہیں ہے اشکباری کا
تصوّر میں بنایا باغ اور اُس کی خوشی، واعظ!
جزاک اللہ، میں قائل ہوں تیری ہوشیاری کا
نگاہِ مست سے اس نے جو دیکھا صحنِ گلشن میں
گماں لوگوں کو گزرا آمدِ فصلِ بہاری کا
یقیں ہے انتظامِ دین و دنیا سلب ہو جائے
یہی عالم رہا کچھ دن جو دل کی بیقراری کا
خدا سجّاد کو بخشے میری آنکھوں میں پھرتا ہے
وہ عالم اس کی مایوسی کا اور امیدواری کا

جس کو ہووے عشق تیرے مصحفِ رخسار کا
معتقد ہو کس طرح وہ سُبحہ و زنّار کا
نام میں لیتا ہوں قاتل جب تری تلوار کا
جذبۂ شوقِ شہادت جسم میں پاتا ہوں میں
پھول جھڑتے ہیں زباں سے گفتگو میں آپ کی
معجزہ ہے، سحر ہے، یا ڈھنگ ہے گفتار کا

رنگ فق ہے، آنکھ میں آنسو ہیں دل میں درد ہے
کیا سناؤں حال یارو، عشق کے آزار کا
پھر وہی کنج قفس اور خانۂ صیاد ہے
دیکھ لے بلبل تماشا چار دن گلزار کا
میں نے حالِ دل کہا اُن سے تو ہنس کر بولے وہ
"آپ کو کس روز سے عہدہ ہوا اخبار کا"
پاؤں کے کانٹوں کا تو سجاد کو شکوہ نہیں
ہاں مگر آفت ہے یارو دل میں چبھنا خار کا

گھر میں مرے سے رہا جو وہ دلبر تمام رات
کیا کیا جلے رقیبِ بداختر تمام رات
وہ چاندنی میں سوئے تو ہم رشک سے جلے
دیکھا کیا انھیں مہِ انور تمام رات
یارب! اگر وہ غیر کے مہماں نہ تھے، تو کیوں
اک جوشِ غم رہا مرے دل پر تمام رات
مدت کے بعد وصل کی ٹھیری ہے ساقیا!
ہو دَورِ جام آج برابر تمام رات
اس وصل کو بھی ہجر میں شامل کریں گے ہم
باتوں میں کھو دی تو نے ستمگر تمام رات
وعدے کی شب بناؤ میں ان کی گزر گئی
شانہ تھا اور زلف معنبر تمام رات
سویا جو میں تصورِ مژگاں میں رات کو
دیکھا ہے میں نے خواب میں خنجر تمام رات
سجاد، وہ جو کعبہ نہ جائے، خدا کی شان
بیٹھا رہے صنم، ترے دَر پر تمام رات

اُٹھا دو شرم تمھیں اپنی ہی حیا کی قسم
تمھیں ہے ناز بہت جس پہ اس ادا کی قسم
بس ایک ہاتھ لگا دو، تجھ پہ میں قرباں
ستم شعار تجھے اپنی ہی جفا کی قسم
اگر ہے ایسی ہی وحشت تو اب کوئی دن میں
چلیں گے نجد کو، مجنوں کے نقش پا کی قسم
جو تم نہ کہتے تو ہم عشق چھوڑ ہی دیتے
پر اب نہ چھوڑیں گے ناصح! ہمیں خدا کی قسم
کہا جو میں نے کہ صاحب حجاب اب چھوڑو
کہا "نہ چھوڑیں گے ہرگز، ہمیں حیا کی قسم"
ترے فراق میں جینا محال ہے ہم کو
دلِ حزیں کی قسم، جانِ مبتلا کی قسم
ہماری کوئی دعا تو قبول ہو یارب!
جو بے اثر رہی اب تک اسی دعا کی قسم
مری وفا کا وہ عالم کہ عشق بازی میں
جہاں میں کھاتے ہیں عاشق مری وفا کی قسم
یہ سن اور اس پہ یہ تقویٰ، تمھیں سے ہو سجاد!
ولی تم اپنے زمانے کے ہو، خدا کی قسم

راضی ہوں کہ وہ مجھے ستائیں
پر بے خبری سے باز آئیں

گردش سے ذرا جو چین پائیں — پھر چرخ کو ہم مزا چکھائیں
صاحب، جو خفا نہ ہو تو دم بھر — ہم قصۂ دل تمھیں سُنائیں
واعظ! تیری حُوریں بھی ہیں کیا — یہ ناز، یہ عشوہ، یہ ادائیں
جتنی مانگوں شراب کم ہے — یہ سبزہ، یہ باغ، یہ گھٹائیں
کیا کیا شبِ وصل میں مزے تھے — بیباکی اِدھر، اُدھر حیائیں
حسرت ہے کہ جیتے جی پھر اک بار — لے لوں تیری زلف کی بَلائیں
اس سوز و تپش کی تاب کس کو — ہم داغِ جگر کسے دکھائیں

سجّاد! تیرا ہی حوصلہ ہے
کس سے یہ غم اُٹھائے جائیں

مجھے موقع ملا جانے کا اچھا بزمِ جاناں میں
مِری قسمت سے جھگڑا ہو رہا تھا غیر و درباں میں

عجب بیتابیِ دل ہے انھیں رہبر بناتا ہوں
اگر اغیار مل جاتے ہیں مجھ کو راہِ جاناں میں

انا الحق کہنے سے منصور کو کیوں دار پر کھینچا:
وہ قطرہ بحر سے کب کم ہے، جو مل جائے عمّاں میں

بتاؤ تم کہ اک صورت کو لے کر کیا کریں، واعظ!
تمھاری حُوریں کب ہیں یہ باتیں جو ہیں انساں میں

یہ کس کی یاد ہے دل کو کہ اک عالم کو بھولا ہوں
ہوا ہے مجھ کو لطفِ وصل حاصل کس کے ہجراں میں

ارادہ ہے ذرا دشتِ عدم کو دیکھیے چل کر
بہت تنگی سے گھبرایا ہے دل کوہ و بیاباں میں

وہی سجّاد، جو کل مسجدِ جامع میں واعظ تھا
اسے دیکھا ہے ہم نے آج بیٹھا بزمِ رنداں میں

کپڑے ہیں گو سپید، مگر کس پھبن کے ساتھ
سو رنگ کا بناؤ ہے اس سادہ پن کے ساتھ

عاشق ہوں مری راہ جُدا گانہ چاہیے
کیوں شیخ کے شریک ہوں، کیوں برہمن کے ساتھ

جب ہو قفس نصیب تو کیونکر نہ چُپ رہوں
وہ چہچہے چمن کے گئے سب چمن کے ساتھ

ہرگز گئی نہ وحشتِ دل بعدِ مرگ بھی
دستِ جنوں کو چھیڑ ہے جیبِ کفن کے ساتھ

کچھ کچھ شباہتِ قدِ جاناں جو اس میں ہے
اک انس ہو گیا مجھے سروِ چمن کے ساتھ

سجّاد کو بہشت میں، دہلی کی یاد ہے
اللہ کس قدر ہے محبّت وطن کے ساتھ

جو اُس بُت کی سیدھی نظر ہو گئی — تو پھر عمر اچھّی بسر ہو گئی
جلایا ہے جس نے فلک بارہا — وہی آہ، اب بے اثر ہو گئی
مرے دل کی حسرت تو نکلی نہیں — الٰہی، ابھی کیوں سحر ہو گئی
کیا ایک عالم کو مقتولِ ناز — جدھر تیری ترچھی نظر ہو گئی
ہوئی جب سے غیروں سے اُلفت تمھیں — میرے دل کی کچھ تو خبر ہو گئی
ارادہ ہے جائیں گے دشت و جبل — جو وحشت کی دُھن راہبر ہو گئی
تصوّر میں میرے جو گذرا وصال — تو شب کس قدر مختصر ہو گئی
نہ ہوگا فلک اور نہ ہوگی زمیں — جو میری ذرا چشم تر ہو گئی
شہادت مبارک دلِ دردمند! — وہاں تیغ زیبِ کمر ہو گئی

بس اب اٹھو سجّاد! سوئے بہت
جوانی کی شب کی سحر ہو گئی

جب غیر سے وہ گرمیِ صحبت نہیں رہی
پھر شکوہ کیا کہ مجھ سے محبت نہیں رہی

اب کیوں نہ ہو رقیب سے رنجش، مرے لیے
وہ سن نہیں رہا، وہ نزاکت نہیں رہی

گم گشتہ اس قدر ہوں تصور میں یار کے
دیدار کی بھی اب مجھے حسرت نہیں رہی
جوشِ جنوں میں گھر مرا ویراں ہوا تو ہو
صد شکر قیس سے تو خجالت نہیں رہی
کس دن خیالِ قامتِ دلکش نہیں رہا
کس وقت مجھ کو فکرِ قیامت نہیں رہی
کب جوش میں جنوں کے گریباں کیا نہ چاک
کب خضرِ راہ، دشت میں وحشت نہیں رہی
رنجش تو غیر سے ہے، نہ ہو مجھ سے گو ملاپ
اب آہِ نارسا کی شکایت نہیں رہی
کب مجھ کو پوچھا، ہائے، فراموش کار نے
جب مجھ میں عرضِ حال کی طاقت نہیں رہی
سجّاد! کس کے عشق کی اب آرزو کریں
وہ دل نہیں رہا، وہ طبیعت نہیں رہی

شیخ کے ساتھ عبادت ہی سہی — زر نہیں پاس تو طاعت ہی سہی
تجھ کو مسجد ہو مبارک، زاہد! — ہم کو میخانے سے الفت ہی سہی
ہم نہ چھوڑینگے طریقِ الفت — آپ کو ہم سے عداوت ہی سہی
لے چلے کچھ تو گلی سے تیری — تیرے دیدار کی حسرت ہی سہی
مجھ کو بازار میں تم قتل کرو — مجھ سے گمنام کی شہرت ہی سہی
قتل پر اپنے رضامند ہوں میں — تیرے صدقے میں شہادت ہی سہی
آج سرکار سے کچھ تو مل جائے — عرضِ احوال کی جرأت ہی سہی
نوکری گر نہیں قسمت میں ابھی — پاس رہنے کی اجازت ہی سہی
عشق، اور خواہشِ عزت سجّاد!
سب نے، اس کام میں ذلت ہی سہی

غزل (ناتمام)

بھروسہ تیری الفت پر ہمیں کیا کیا ہوا ظالم
سبب یہ تھا کہ میں سمجھا تھا تجھ کو باوفا ظالم
فقط صورت کے دیکھے سے نہ دیتا دل کبھی ہرگز
محبّت کی نگاہوں نے مگر مفتوں کیا ظالم
وہ ہر دم مے پلانا اور پہلو میں بٹھا لینا
وہ بوسے مجھ کو دینا اور وہ ناز و ادا ظالم
مجھے افسردہ گر پانا تو رونا اشکِ خونیں سے
وہ میرا روٹھ جانا اور تیری التجا ظالم
عجب حیراں ہوں غیروں نے ترے کیا کان میں پھونکا
کہ مجھ سے ہو گیا دم بھر میں تُو ناآشنا ظالم
حماقت کی بہت میں نے کہ تجھ کو باوفا سمجھا
تجھے تو جانتا تھا بانیٔ جور و جفا ظالم
میرا دل لے کے کی مجھ سے دغا، اچھا کیا تُو نے
مگر لِلّٰہ اوروں سے نہ کیجو اب دغا ظالم

[خاندانی حالات (قلمی)؛ خمخانۂ جاوید، ۴: ۸۲-۸۴؛ ایضاً ۴: ۳۱۰-۳۱۱؛ خطوطِ غالب (۲) ۸۶-۹۰؛ واقعات دارالحکومت دہلی، ۳: ۶۷-۷۲؛ خطوطِ سیّد مصطفےٰ میرزا شریر دہلوی]

سخنؔ ـــــ خواجہ میر فخر الدین حسین خان دہلوی

ان کے والد خواجہ جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب بیٹے تھے، ابو القاسم نظام الدین احمد رضوی المعروف بہ خواجہ فقیر چشتی مودودی کے، جن کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ خواجہ حسین مودودی کھاری چشتی سے ملتا ہے۔

سخنؔ بدھ ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۵۵ھ (۱۰ جولائی ۱۸۳۹ء) دلی میں پیدا ہوئے اور سن شعور تک یہیں مقیم رہے۔ ان کی والدہ کا ان کی کمسنی میں انتقال ہو گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نانی اماں کا قلعۂ معلیٰ سے کچھ تعلق تھا؛ چنانچہ والدہ کے انتقال کے کے بعد یہ انھیں کے پاس رہے۔ ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء) میں نانی فوت ہو گئیں۔ اسی دوران میں ان کے والد نے لکھنؤ میں دوسرا نکاح کر لیا تھا جس سے خاندان کے بیشتر افراد بھی لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے۔ شاہی میں یہ لوگ وہاں ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ نانی اماں کی وفات کے بعد سخنؔ بھی نقلِ مکان کر کے لکھنؤ چلے گئے اور وہاں اپنے چچا خواجہ محمد بشیر کے ساتھ رہنے لگے، جو عہدِ واجد شاہی میں ممالکِ محروسہ کی فوجداری کے مہتمم تھے۔ یہ عہدہ واجد علی شاہ کی جلاوطنی (۱۸۵۶ء) تک ان کے پاس رہا؛ اس کے بعد وہ اس سے برطرف ہو گئے۔ اب سخنؔ کے حقیقی پھوپھا مرزا محمد ابراہیم خلف الصدق مرزا محمد صدیق صاحب بہادر صدر امین سارن (ضلع شاہ آباد۔ بہار) انھیں اپنے وطن آرہ لے آئے، اور یہاں اپنی بڑی بیٹی تحفہ بیگم ان کے حبالۂ عقد میں دے دی۔ (۲۷ رمضان ۱۲۷۳ھ / ۲۱ مئی ۱۸۵۷ء)۔

سخنؔ نے ۱۰ جولائی ۱۸۶۱ء کو وکالت درجۂ اوّل کی سند حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ مدتوں آرہ میں وکالت کرتے رہے۔ لیکن اس میں انھیں کوئی خاص کامیابی حاصل

نہیں ہوئی۔ اس پر وہ حکام کی سفارش سے سرکاری ملازمت میں شامل ہو گئے۔ ۱۸۷۰ء میں وہ منصف درجۂ سوم مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۸ء ہزاری باغ میں منصف درجۂ اوّل رہے۔ یہیں ۱۸۸۸ء میں ان کی بیوی تحفہ بیگم کی وفات ہوئی۔ ہزاری باغ کے قیام کے دوران میں انھوں نے انگریزی سیکھ لی تھی۔ بالآخر ۱۸۹۲ء میں صدرِ اعلیٰ (سب جج) مقرر ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں انھیں منصف درجۂ اوّل کے اختیارات حاصل ہو گئے۔ قاعدے کے مطابق انھیں جولائی ۱۸۹۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونا چاہیے تھا، لیکن ڈسٹرکٹ جج مسٹر پام ڈڈ کی سفارش پر انھیں ایک سال کی توسیع دے دی گئی اور بالآخر یکم اگست ۱۸۹۷ء کو ملازمت سے الگ ہوئے۔ اس کے بعد ان کا مستقل قیام پٹنہ میں رہا۔

شروع میں ان کی زندگی بڑی آزادانہ اور لاابالیانہ رہی۔ آرہ کے قیام کے زمانے میں باقر علی باقر (شاگردِ غالب) سے ملاقات ہوئی؛ ان کے زیرِ اثر زندگی کا رُخ بدل گیا، اور انھوں نے حضرت شاہ قیام اصدق چشتی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

بچپن میں اُردو فارسی غالب سے پڑھی تھی۔ بعد کو جب شاعری کا شوق پیدا ہوا تو انھیں سے اصلاح بھی لینے لگے۔ غالباً ان کی غالب سے کچھ رشتہ داری بھی تھی۔ یہ انھیں اپنا "جدِ فاسد" یعنی نانا لکھتے ہیں، لیکن صحیح رشتہ متعیّن نہیں ہو سکا۔ وہ غالب کے صفِ اوّل کے شاگردوں میں سے تھے۔ اگرچہ سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی نے انھیں بھی اپنا شاگرد لکھا ہے، لیکن یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنے مشہورِ زمانہ "فسانۂ عجائب" میں دلّی کی زبان پر تعریض کی تھی۔ سخن نے "سروشِ سخن" کے تاریخی نام سے ایک افسانہ اس کے جواب میں لکھا اور حُبّ الوطنی کا حق ادا کر دیا۔

یہ کتاب ۱۲۸۱ھ میں مطبعِ نولکشور میں چھپی (گلِ گلستانِ بیخزاں: ۱۲۸۱ھ)

اسی طرح جب قاطعِ برہان کے قضیے میں مختلف اطراف سے غالب پر نظم و نثر میں بوچھار ہوئی، تو یہ بھی اپنے استاد کی طرف سے سینہ سپر ہو کر میدان میں نکل آئے۔ ہنگامۂ دل آشوب میں ان کے تین قطعے شامل ہیں۔ ۱۹۰۰ء (۱۳۱۸ھ) میں کلکتے میں انتقال کیا مولوی محمد وزیر، مالکِ مطبع گوہرِ آصفی کلکتہ نے تاریخ کہی:

سالِ رحلتِ آں، وزیرِ دل حزیں　　گفت: "دردا، آہ فخر الدیں حسین"
(۱۳۱۸)



خواجہ فخر الدین حسین خان سخن دہلوی

دوسری تاریخ شہرت عظیم آبادی نے لکھی:

سالِ وفات اون کا لکھ دولے شہرتؔ! شاعر و عاقل و شفیق و ولی (۱۳۱۸)

ان کا مدفن پٹنے میں موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کلکتہ سے یہاں لائی گئی تھی۔ سخن نے فسانۂ سرورشِ سخن کے علاوہ ایک اور نثری کتاب "تہذیب النفوس" بھی اپنے صاحبزادے خواجہ سید محمد محی الدین حسین کی تعلیم و تربیت کے لیے لکھی تھی۔ اس کے تین حصّے چھپے (نولکشور: ۱۸۷۲ء؛ ۱۸۷۴ء اور ۱۸۹۸ء) یہ مدتوں مدارس کے نصاب میں شامل رہی۔ اُردو دیوان ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں مطبع نولکشور لکھنؤ میں چھپا۔ اس کے شروع میں غالب کی لکھی ہوئی ایک نثری تقریظ بھی شامل ہے۔ فارسی کلام غالباً غیر مطبوعہ رہ گیا۔ پہلی بیوی تحفہ بیگم کے انتقال کے بعد انھوں نے ۱۸۹۰ء میں دوسری شادی کر لی تھی؛ یہ بیگم نجف علی صاحب وکیل کی بیٹی تھیں۔ دونوں بیگمات سے یہ اولاد ہوئی: پہلی بیوی سے دو بیٹے، خواجہ محمد محی الدین حسین (ولادت: ۱۸۶۴ء) اور خواجہ محمد سراج الدین حسین؎ (ولادت: ۱۸۷۵؛ وفات: ۱۹۲۴ء) اور تین بیٹیاں: بڑی بیٹی مرزا محمد سعید آروی کے عقدِ نکاح میں آئی تھیں؛ محمودہ بیگم (ف: ۱۹۳۲ء) شاہ محمد مہدی کے نکاح میں تھیں۔ اور سردار بیگم (ف: ۱۹۰۵) یہ محمد رضا کی بیوی تھیں۔ دوسری بیگم سے چار بیٹے ہوئے (معین الدین، رضی الدین، حمید الدین، حفیظ الدین اور دو بیٹیاں (عمدہ بیگم جن کا نکاح محمد یعقوب مونگیری سے ہوا تھا؛ ایک بیٹی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ بڑے قادر الکلام اور صاحبِ فن شاعر تھے۔ زبان اور محاورے کے مالک تھے۔ معاملہ خوب لکھتے تھے۔ ان کا دیوان سادگی اور رنگینی کا اچھا خوش نما مرقع ہے۔ اُردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

جلوہ فرما ہے تو ہر رنگ میں اے جانِ جہاں!
تو نے جس جامے کو پہنا، ہوا زیبا کیسا!

مجھ کو دیوانہ بنایا ہے تری الفت نے
لوگ سمجھاتے ہیں آ کر مجھے، کیسا کیسا!

؎ اولاد کی تفصیل اور ان کے ناموں کی تعیین خواجہ محمد سراج الدین حسین کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ سید منہاج الدین حسین (ولادت: یکم اپریل ۱۹۱۲ء) سے ہوئی۔

نہ منھ کھلواؤ سب کے سامنے، جانے دو، کیا حاصل! سبب تم جانتے ہو، میری رنجشہائے پنہاں کا

اُس کے آنے کی مسرّت ہے، مگر فکر یہ ہے کیا کہے گا، جو مرے حال کا پُرساں ہوگا

خوش و ناخوش بسر ہو جائیگی یہ زندگی لیکن جسے آرام کہتے ہیں، نہ یاں ہوگا نہ واں ہوگا

اب آپ جا کے کسی اور کو یہ دم دیجے یہاں تو آپ کے وعدوں کو بس سلام کیا

ہے دوستی عدو سے، تو اس کی طرف نہ دیکھ چڑھ جائے اس کو زہر نہ تیری نگاہ کا

وہ ناز ہیں کہ اٹھانے ہر اک کو مشکل ہیں وہ جَور ہیں کہ نہیں جن کی آسماں کو خبر

کسی کو کیا نظر آئے، نگاہِ ناز تری یہ تیر وہ ہے کہ جس کی نہیں کماں کو خبر

دم بھر میں ایک تیری "نہیں" نے مٹا دیے کیا کیا خیال تھے دلِ امیدوار میں

دیکھا مجھے تو غیر سے آنکھیں چُرا گئے کیا اس نگاہِ لطف میں پنہاں ستم نہیں؟

مہر و الفت ہی سہی، بغض و عداوت ہی سہی پھر مجھے دیکھتے تم کیوں ہو، اگر کچھ بھی نہیں

اک یقیں میرا کہ کچھ بھی نہیں، اور سب کچھ ہے اک ترا وعدہ کہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

یوں ناز تو ہر اک ترا قہر ہے، لیکن اک بات نئی ہے ترے بیباختہ پن میں

پھر اپنے گھر وہ بُلا گئے ہیں، غضب کا مژدہ سنا گئے ہیں
پھر ان کے دم میں ہم آ گئے ہیں کہ جن سے دھوکا اٹھا چکے ہیں

چاہتا ہوں، نہ بولوں اس سے مگر دل تو کم بخت مانتا ہی نہیں

تری طرح، کوئی پیماں شکن جہاں میں نہیں کہ جس کے قول میں انکار جس کی ہاں میں نہیں

ستم جو کچھ ہیں، مجھ پر ہیں، فقط ترے تغافل سے
اگر تو دوست ہے میرا، تو دشمن آسماں کیوں ہو

وعدۂ حشر پہ تسکین ہو کیونکر، دیکھو تم وہاں بھی تو یہ کہہ دوگے "نہیں یاد مجھے"

[خمخانۂ جاوید، ۴: ۱۳۹ - ۱۴۴، نوائے ادب (سہ ماہی بمبئی)
جولائی ۱۹۵۰ء؛ سروشِ سخن (خاتمہ)؛ نگار (اپریل ۵۳ ۱۹ء):
۴۳ - ۴۴، معاصر (۲): ۸۱ - ۸۲؛ مضمون خواجہ فخر الدین حسین سخن
دہلوی۔ از سمیع الحق مشمولہ آجکل (نئی دلی) فروری ۱۹۷۱ء: ۱۴-۱۷؛
ذکرِ غالب: ۱۸۰ - ۱۸۲]

سرور ـــــ دیبی پرشاد دہلوی

ان کا ایک قطعۂ تاریخ نواب محمد احمد خان بہادر رونق ٹونکی کے دیوان (رونقِ سخن) کے آخر میں نظر سے گزرا:

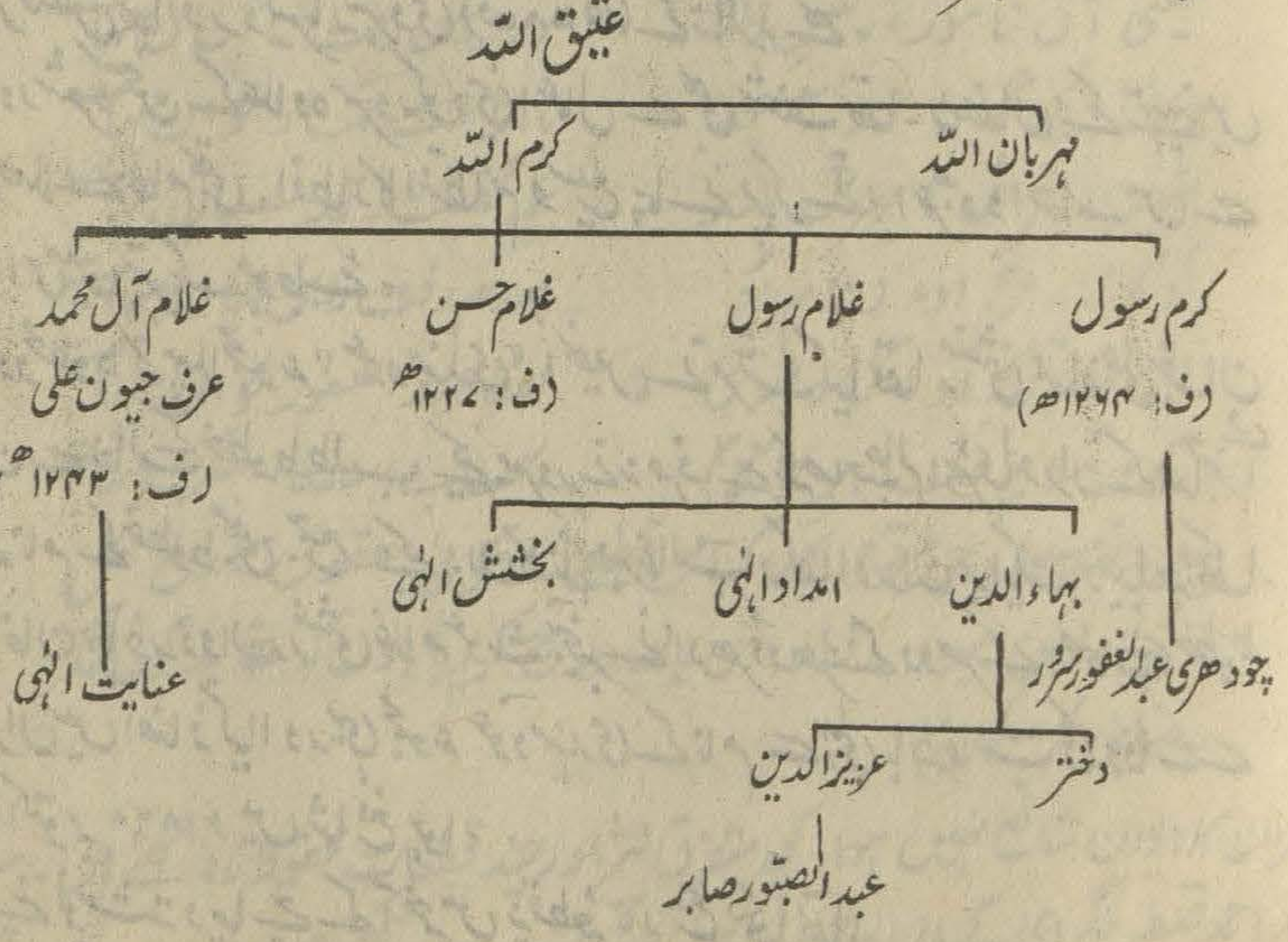
چو شد دیوانِ رونق طبع امسال
کہ از روے بقاے نام گردد
سرورا مشب بفکرِ سالِ اُو بود
کہ از عیشم چہا الہامَ گردد
بگفتا، ہاتفِ غیب از سرِ داد
کہ تا کارِ منِ ناکام گردد
زہے دیوانِ رونق طبع گردید
"آہی دل پذیرِ عام گردد"
(۱۳۳۵ھ = ۱۳۳۱ + ۴)

[رونقِ سخن]

سُرور ـــــ چودھری عبدالغفور مارہروی

ضلع ایٹہ (یوپی) کے تاریخی قصبہ مارہرہ میں تین خاندان اپنی گوناگوں حیثیتوں کے باعث ممتاز رہے ہیں: اول، شیوخ کمبوہاں؛ عہدۂ قانونگوئی اور منصبِ چودھرائی اُن کے لیے مخصوص تھا۔ دوم، شیوخِ انصاری؛ قضائت ان کے پاس تھی۔ اور سیوم، سادات واسطیہ؛ یہ حضرات دینی رُشد وہدایت کا منبع تھے۔

چودھری عبدالغفور گروہِ اوّل شیوخ کمبوہاں کے چشم وچراغ تھے۔ مراجعت کی سہولت کے لیے یہاں ان کا شجرہ دیا جا رہا ہے:



چودھری کرم اللہ اور چودھری غلام رسول وقار و اقتدار کے لحاظ سے اپنے اقران و اماثل میں

بہت بلند حیثیت کے مالک تھے۔ دونوں حینِ حیات موروثی عہدۂ چودھری و قانون گوئی پر متمکن رہے۔
چودھری غلام رسول نے پیر کے دن ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ (۱۳ مارچ ۱۸۷۱ء) رحلت کی۔ سیّد آل محمد مارہروی نے تاریخِ وفات کہی (دیوانِ تواریخ : ۱۷)

شد از یں عالم رئیسِ محترم — ہر کہ فوتِ اُو شنیدہ، ہائے گفت
بندۂ آلِ محمد، سالِ اُو — "بستم ذی الحجہ" "با یوائے" گفت

(۱۲۵۹ + ۲۸ = ۱۲۸۷)

دوسری تاریخ ان کے بھانجے کرم حسن نے کہی:

فخرِ دو جہاں، قبلۂ دل، کعبۂ جاں، ہائے (۱۲۸۷)

عبدالغفور سرور انھیں چودھری غلام رسول کے بھتیجے تھے۔ ان کے والد چودھری کرم رسول بھی اپنے والد کے عہدۂ قانون گوئی اور چودھر پر فائز رہے۔ سرور نے تعلیم اپنے چچا سے حاصل کی اور بعد کو ان کی شادی بھی اپنے چچا کی پوتی (یعنی ان کے صاحبزادے بہار الدین مؤلف اخبار المارہرہ کی دختر) نیک اختر سے ہوئی۔ افسوس کہ وہ لاولد رہے۔ اس پر انھوں نے اپنے سالے عزیز الدین کے بیٹے عبدالصبور کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ عبدالصبور کو بھی شعر گوئی سے دلچسپی تھی؛ صابر تخلّص تھا اور دلیر مارہروی (ف ۱۹۵۸ء) کے شاگرد تھے۔
علم و فن اور شعر و سخن کے علاوہ سرور کو دینی اعمال سے بھی شغف تھا۔ رمضان کے مہینے میں ان کے ہاں صلائے عام تھی۔ افطار کا انتظام وسیع پیمانے پر کرتے؛ اعزّہ و احباب میں سے جو چاہے، اس میں شریک ہو جائے۔
غالب کے اردو خطوط کا پہلا مجموعہ "عودِ ہندی" انھیں نے مرتّب کیا تھا۔ منشی ممتاز علی خاں میرٹھی نے ان سے غالب کے خطوط طلب کیے۔ سرور نے نہ صرف اپنے بلکہ صاحب عالم مارہروی اور ان کے صاحبزادے شاہ عالم کے نام کے خطوط بھی جمع کیے۔ ان کا نام مہرِ غالب رکھا اور ان پر ایک دیباچہ لکھا۔ لیکن بعد کو خان بہادر ذوالقدر منشی غلام غوث بیخبر نے اِدھر اُدھر کے دوسرے اصحاب سے خطوط وغیرہ لے کر ان میں اضافہ کیا اور یہی مجموعہ عودِ ہندی کے نام سے پہلی بار غالب کی وفات سے چار ماہ پہلے، اکتوبر ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا۔
سرور نے اپنے نوشتہ دیباچے کے آخر میں یہ قطعۂ تاریخ لکھا تھا:

انشا، ملو بصد مطالب لکھی — یعنی پئے عاشقانِ طالب لکھی

موسوم کیا جو "مہرِ غالب" سے سرور تاریخ بھی اس کی مہر غالب ، لکھی
(۱۲۷۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا کام ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں ختم کر لیا تھا اور "بقیہ" خطوط اور نثروں وغیرہ کے جمع کرنے میں مزید چھ برس صرف ہوئے۔

سرور کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی۔ ان کی وفات سے متعلق مندرجۂ ذیل قطعہ ان کے متبنیٰ بیٹے عبدالصّبور صابر کے دیوان میں ملتا ہے:

تاریخِ انتقال سراپا حسرت و ملال
قبلۂ کونین، ولیِ نعمتِ دارین، جناب چودھری محمد عبدالغفور
مرحوم و مغفور رئیسِ اعظم قصبہ مارہرہ

از زمیں تا بہ آسماں ہیہات یک جہاں راست ہر زماں ہیہات
می رسد از چہار سُو در گوش نالہ و زاری و فغاں ہیہات
بشرے ہست، کو نمی گرید ہر دم افسوس ہر زماں ہیہات
ہمنشیں! آں کہ رفت ذاتے کیست کہ بود مہر او چناں ہیہات
یعنی آں نامور، رئیسِ زماں در زمیں رفت ناگہاں ہیہات
دائما پنج گانہ در مسجد با جماعت نماز خواں ہیہات
شور از فرش تا بعرش بلند ہمہ گفتند قدسیاں، ہیہات
اُو کہ تاریخ او، ز نامِ اُو بعدم رفت زیں جہاں ہیہات
فکرِ تاریخِ اُو اگر داری لفظ عبدالغفور خواں ہیہات
رنج و آلامِ صابرِ ناکام بحساب است، بیکراں ہیہات

(میں نے بیسیوں جوڑ توڑ کیے، کہ اس قطعے سے کوئی معقول تاریخ نکل آئے، لیکن بیسود۔ قطعہ اس لیے درج کر رہا ہوں کہ شاید کوئی صاحب رہنمائی کر سکیں)

ظاہراً ان کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ کچھ متفرق نثر اور چند قطعات محفوظ رہ گئے ہیں۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی تقریب پر لکھتے ہیں:

مرے فرزند احمد کا وہ فرزند | دعا گو جس کا ہر فرزندِ بشر ہے
الٰہی، اس کو تو رکھیو سلامت | کہ نخلِ زندگانی کا ثمر ہے
نوید فرحتِ میلادِ مولود | سرورِ سینہ و نورِ نظر ہے
سُرورِ خوش دلِ شاداں نے تاریخ | لکھی فی الفور "یہ لختِ جگر ہے"

(۱۲۸۳)

صد شکر خدائے پاک، فرزند | دادہ بہ شفیق قدر دانم
زیں مژدۂ دل فزائے جاں بخش | شاداں شد روح و ہم روانم
ہر صبح دعائے عمر و جاہش | بر ذروۂ عرش می رسانم
تاریخش یافتم مسیحی | "نورِ نظر و نشاطِ عالم"

(۱۸۶۶)

حکیم امداد حسین مارہروی نے ۱۲۸۲ھ میں رحلت کی۔ سال بھر کے اندر ان کے بیٹے علی حسین بھی ۱۲۸۲ھ میں رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ سرور نے ایک قطعہ میں دونوں کا ذکر کیا:

وادریغا، وادریغا، وادریغا، وادریغ
ہائے ہا و ہائے ہا و ہائے ہا و ہائے ہا
در ہزار و دو صد و ہشتاد و دو ماہِ صیام
جانبِ فردوس شد فخرِ اطبّا رہگرا
پنج پورِ نامور از وے بگیتی یادگار
صاحبانِ عقل و علم و دانش و فہم و ذکا
سال نگزشتہ ز فوتِ والدِ والائے شاں
پورِ چارم را ربود ایوائے از عالمِ قضا
بود نامِ او مرکب از علی و از حسین
وہ چہ نام است ایں کہ بر وے باد جان و دل فدا
از وقوعِ ایں چنیں بس سخت و سنگیں واقعہ
رستخیزے گشت پیدا۔ محشرے شد رونما!

از یگانہ تا بہ بیگانہ دریں رنجِ عظیم
ہر یکے راہست برلب نعرۂ واحسرتا
دل بدرد آوردہ تاریخِ وفاتش نظم کرد
ہر کہ در مارہرہ باشعر وسخن بُود آشنا
ہم سرورِ خستہ ناشاد، از روے اُمید
(۱+)
گفت: "حشرش باحسین و باعلی رو زجزا"
(۱۲۸۲ = ۱۲۸۳)

مرزا حاتم علی مہر کے بیٹے مرزا سخاوت علی بیگ ضیا کی شادی پر سہرا کہا تھا:

محوِ نظّارہ نوشہ نہ ہو کیونکر سہرا
گلِ نرگس سے بنایا ہے سراسر سہرا
کچھ تو یہ بے ادبی سمجھا ہے سر پر سہرا
قصدِ پابوس جو رکھتا ہے سراسر سہرا
سوزنِ فکر سے گلہاے معانی کو پرو
کشتیِ عرض میں لایا ہوں رگا کر سہرا
ایک پھولوں کا تھا، اور کثرتِ نظارہ سے
دیکھ لو اور بندھا سہرے کے اُوپر سہرا
ہیں تتبع میں یہ غالب کے سب اشعار سُرور!
"دیکھیں، اس سہرے سے کہ دے کوئی بہتر سہرا"

[غالب اور عصرِ غالب: ۱۰۱ - ۱۰۵، عود ہندی (دیباچہ)؛ آج کل: فروری ۱۹۵۵ء؛ خط ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس ہندو یونیورسٹی)]

سُرورؔ — آغا غلام حسین خان تبریزی

غالب ایک خط میں سیف الحق منشی میاں داد خان سیاح کو لکھتے ہیں :

آغا غلام حسین خان صاحب کا قطعہ پہنچا۔ اس میں کچھ تو شعر اصلاح طلب بھی تھے ؛ اب اصلاح دے کون ! میں تو اپنی مصیبت میں گرفتار۔ بارے ایک میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ بسواری ریل میرے دیکھنے کو آیا تھا۔ اس کو موقع و محل بتا دیا ؛ جو میں کہتا گیا ، اسی طرح وہ بناتا گیا ! وہ قطعہ کا کاغذ بعد اصلاح کے اکمل المطابع میں بھیج دیا ؛ ہفتۂ آیندہ میں تم بھی دیکھ لو گے۔ (۱۱ جون ۱۸۶۷ء)

یہاں اشارہ انھیں سُرورؔ کی طرف ہے۔ سُرورؔ کی فارسی اور اُردو کی اچھی استعداد تھی۔ خوشنویسی بھی جانتے تھے اور سورت کے نواب میر افضل الدین قمر الدولہ حشمت جنگ بہادر کی سرکار میں میر منشی تھے۔

ے رستم علی خان سورت میں متصدّی تھے۔ وہ مرہٹوں کے خلاف جنگ کے لیے سورت سے چلے گئے ، تو ان کی جگہ ان کے بیٹے سہراب خان متصدّی ہو گئے۔ قلعدار بیلگر خان (مرزا گدا بیگ) نے انگریزوں کی شہ پاکر انھیں بیدخل کر دیا اور اپنے چھوٹے بھائی تیغ بیگ خان (عرف میرزا گل) کو متصدّی بنا دیا۔ دلّی کی مرکزی حکومت کمزور اور بےعمل تو تھی ہی ، اب تیغ بیگ خان نے اپنے نواب سورت ہونے کا اعلان کر دیا۔ تیغ بیگ خان کے بعد انگریزوں کی سازباز سے ان کے داماد میر معین الدّین (عرف سیّد اچھن) نواب بنے ، اور ۱۱۷۸ھ / ۱۷۶۴ - ۱۷۶۵ء میں ان کے انتقال پر اچھن کے بیٹے سیّد حفیظ الدّین احمد خان ان کے وارث ہوئے ، اور ان کے بعد ان کے بیٹے سیّد نظام الدّین۔ چونکہ سیّد نظام الدّین کے کوئی بیٹا

تاریخ کہنے میں خاص مہارت تھی۔ بعض کتابوں پر ان کے تاریخی قطعات ملتے ہیں۔ غالب کے محولۂ فوق خط میں بھی بظاہر کسی ایسے قطعے ہی کا ذکر ہے، جو انھوں نے اصلاح کے بعد اکمل المطابع سے چھپنے والے ہفتہ وار "اکمل الاخبار" میں اشاعت کے لیے بھیج دیا تھا۔ "تاریخ گجرات" کا قطعہ ملاحظہ ہو:

ہم دراں بزمِ خوشی رقاصہ ہاے دلربا
بردند از (نازو) ادا صبر و قرار از بزمیاں
الغرض در بزم شادی بُد بحدّے انبساط
از غناے خوشنواے دلربا را مشگراں
سائرین از دوستاں اوصافِ او را می کنند
از نباتِ وصفِ اُو ہستند ہمہ شیریں زباں
شیخ فاضل شادی ابنِ برادر زادہ است
مر ترا بادا مبارک، اے شفیق و مہرباں!
ایں ہمہ آرایش و زیبایش محفل تمام
آمد از عقلت نمایاں، اے زہے عقلت جواں
لازم آمد بر خودم، تا من نگارم تہنیت
زاں براے اُو نمودم تہنیت را من بیاں

(بقیۂ گزشتہ)
نہیں تھا، اس لیے ان کی وفات پر انگریزوں نے ان کے بھائی سیّد نصیر الدّین کو نواب تسلیم کر لیا۔ یہ افضل الدین خان انھیں نصیر الدین کے بیٹے تھے، ان کا ۱۲۵۸/ ۱۸۴۲ء میں انتقال ہوا۔
ضمناً یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ افضل الدّین خان کی چھوٹی بیٹی بختیار النّسا کی شادی میر سرفراز علی سہسوانی کے بیٹے میر جعفر علی سے ہوئی تھی۔ اس بیگم کی وفات کے بعد میر جعفر علی نے اور دو نکاح کیے۔ تیسری بیوی سے چھوٹی صاحبزادی رحیم النّسا کا نکاح غالب کے مکتوب الیہ میر غلام بابا خان سے ہوا تھا۔ غالب کا میر غلام بابا خان کے نام پہلا خط ان کے خسر میر جعفر علی کی وفات ہی پر لکھا گیا تھا۔ انھوں نے ۱۲۸۰/ ۱۸۶۳ء میں رحلت کی (سخنورانِ گجرات: ۲۶۹۔ ۲۷۰؛ اردوے معلّیٰ: ۵۔ ۶)

این نوید شادمانی چوں بگوشِ من رسید
غوطہ ور گشتم بہ بحرِ فکرِ سالش در زماں
عقل آمد رہبرم گفتا کہ سرورؔ گوش کن
"جشنِ فرخندہ" ز روئے جشن، گو تاریخِ آں
(۱۲۹۲ + ۳ = ۱۲۹۵ھ)

[نوٹ ۱۔ اس قطعے کے بعض اشعار ٹھیک سے نہیں پڑھے گئے

۲۔ فحوائے کلام سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سرورؔ نے خود نہیں، بلکہ سیّاح نے سرورؔ کا قطعۂ تاریخ غالب کی خدمت میں بھیجا تھا؛ یہ غالباً میر غلام بابا خان کے مقدمہ جیتنے کے بارے میں تھا۔ سیّاح اور سرور دونوں کا مقصد اور مصلحت ظاہر ہے۔ سیّاح چاہتے تھے کہ قطعۂ تاریخ "اکمل الاخبار" میں شائع کرا دیا جائے۔ اسی لیے غالب سیّاح کو اطلاعاً لکھتے ہیں: "آغا غلام حسین خان صاحب کا قطعہ پہنچا"۔ مشکل یہ تھی کہ قطعے میں "کچھ شعر اصلاح طلب بھی تھے"، اس لیے غالب کو اسے جوں کا توں اخبار کو بھیجنے میں تامّل تھا۔ لیکن اب اصلاح دے کون! وہ اسی حیص بیص میں تھے کہ تفتہ آ گئے، اور غالب نے انھیں "موقع و محل" بتا کر اصلاح دے دی، اور اسے اکمل الاخبار میں چھپنے کو بھیج دیا۔ سرور کو غالب کی اصلاح کا علم بھی قطعے کے چھپنے کے بعد ہوا ہوگا۔

اس سے میرا یقین ہے کہ سرورؔ، غالب کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے؛ ان کا صرف یہی ایک قطعہ غالب کی اصلاح سے مزیّن ہوا۔ بہرحال وہ ہوں گا گر شہیدوں میں تو شامل ہو گئے۔ اسی لیے میں نے ان کا نام یہاں درج کر لیا ہے]

[اُردوئے معلّٰی: ۲۵؛ سخنورانِ گجرات: ۱۶۵، ۱۸۹۔۱۹۰]

سرور ـــــ شیخ محمد امیر اللہ اکبر آبادی

یہ بیٹے تھے شیخ عبد اللہ کے۔ ۱۲۴۳ھ میں دہلی میں تھے۔ غالب کے علاوہ شیخ رحمت اللہ مجرم اکبر آبادی سے بھی اصلاح لی۔

[شاعر آگرہ نمبر]

سروش ـــــ صاحبزادہ عبد الوہاب خان بہادر رامپوری

رامپور کے حکمران خاندان سے تھے۔ ان کے والد صاحبزادہ عبد الرحمٰن خان بہادر تھے، اور دادا نواب غلام محمد خان بہادر غفران مآب، جو نواب یوسف علی خان بہادر فردوس مکان کے بھی دادا ہوتے تھے (خاندان کا مفصل حال نواب یوسف علی خان بہادر ناظم کے ترجمہ میں لکھا گیا ہے)۔

سروش ۱۲۳۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں مومن سے مشورہ کرتے رہے، پھر غالب سے اصلاح لی۔ اور ان کی وفات کے بعد خوشوقت علی خان خورشید سے استفادہ کیا۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

تھامنا دل کو، کہ آنکھوں کو نہ رونے دینا — ایک ہیں جھگڑے ہزاروں، کہو کیا کیا کرنا

قتل عالم کو کیا، ایک نظر میں تو نے — کون باقی ہے ستم گار، جو پُرساں ہوگا

سچ تو یہ ہے، لاکھ سر مارا کرو، ماتھا گھسو — کچھ کرو، لکھا نہیں مٹتا کبھی تقدیر کا

[انتخاب یادگار، ۲: ۱۷۲ - ۱۷۳؛
خمخانۂ جاوید ۴: ۱۸۹ - ۱۹۰]

سلطاؔن ـــــ مولوی محمد سلطان حسن خان بریلوی

بریلی کے مشہور خاندانِ مفتیان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد مفتی احمد حسن خان اضلاعِ ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ (حال یوپی) میں صدر الصّدور رہے۔ ان کا شعبان ۱۲۷۳ھ (مارچ/اپریل ۱۸۵۷ء) میں انتقال ہوا۔

غالب کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ جب وہ رامپور کے دوسرے سفر سے دسمبر ۱۸۶۵ء میں بعہدِ نواب کلب علی خان دلّی واپس آرہے تھے تو راستے میں مراد آباد کے نزدیک رام گنگا پار کرتے ہوئے انھیں ایک افسوسناک حادثہ پیش آیا تھا جس پر انھیں کپڑوں کی قلّت کے ساتھ مقامی سرائے میں رات بسر کرنا پڑی تھی؛ اور اگلی صبح مولوی محمد حسن خان صدر الصّدور انھیں سرائے سے اٹھا کر اپنے ہاں لے گئے تھے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے، ذکرِ غالب: ۱۲۶ - ۱۲۸) یہ مولوی محمد حسن خان انھیں احمد حسن خان کے برادرِ خُرد (اور محمد سلطان حسن خان کے سگے چچا) تھے۔ محمد حسن خان عالم آدمی تھے؛ ان سے متعدّد کتابیں یادگار ہیں۔ اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے؛ اسیر تخلص تھا۔ انھوں نے غالب کی وفات پر یہ قطعۂ تاریخ کہا تھا:

غالب کہ بود پیرِ مغانِ سخنوری | زیں دہر چوں بدارِ سلامت گرفت راہ
ساغر شکست و میکدۂ شعر شد خراب | مینا گریست زار کہ "غالب بمرد آہ"
(۱۲۸۵)

محمد سلطان حسن خان ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ - ۱۸۲۵ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علومِ دینیہ مولانا فضل حق خیر آبادی سے حاصل کیے اور ان میں خود استادانہ دستگاہ پیدا کی۔

سلطاؔن انگریزی عہد میں محکمۂ عدلیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ترقی کر کے صدر الصّدور بن گئے تھے۔ ملازمت کے آخری زمانے میں آگرے میں منصف تھے۔ یہاں بیمار پڑ گئے، تو

بریلی کے لیے روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں حضرت خواجہ باقی اللہ کو خواب میں دیکھا کہ دلّی آنے کے لیے فرما رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بریلی کے بجائے دلّی کا رُخ کیا۔ یہیں انتقال ہو گیا (۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ - ۱۸۸۲ء)؛ باون برس کی عمر پائی۔ درگاہِ حضرت باقی باللہؒ ہی میں دفن ہوئے۔ غلام رسول ویران (تلمیذِ ذوق) نے تاریخ کہی:

مولوی سلطان حسن خاں، عالمِ نیکو عمل چوں سفر کردند از دنیا سوے دار النّعیم
بہرِ سالِ رحلتِ ایشاں بگوشِ دل رسید ایں ندا از عالمِ بالا: "لھم اجر عظیم" (۱۲۹۹)

شعر گوئی کے علاوہ نجی طور پر طلبہ کو پڑھاتے بھی تھے۔ من جملہ اور طلبا کے غلام بسم اللہ بسمل بریلوی (تلمیذِ غالب) بھی ان کے شاگرد تھے۔ غالباً انھیں شاگردوں کی سہولت کے لیے عربی کے دو مشہور قصیدوں: بانت سعاد اور بردہ کی شرح لکھی تھی۔

مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی نے ان کے استاد مولانا فضل حق خیر آبادی کی کتاب "ہدیۂ سعیدیہ" پر کچھ اعتراض کیے تھے۔ سلطان نے ان کے جواب میں ایک رسالہ قلمبند کیا، جو مطبع "شعلۂ طور" کانپور میں محرم ۱۲۸۸ھ میں چھپا تھا۔

اولاد میں پانچ بیٹے اور ایک بیٹی اپنی یادگار چھوڑے۔ بیٹی قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (تلمیذِ غالب) کے صاحبزادے قاضی محمد خلیل حیران کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ ان کے دو بیٹے مفتی حسیب الحسن احسن اور حکیم مفتی عماد الحسن محو بھی شعر کہتے تھے؛ انھوں نے خاصا نام پیدا کیا۔ یہ محو ہی تھے، جنھوں نے غلام بسم اللہ کے حالات نواب صدر یار جنگ مرحوم کی فرمایش پر لکھے تھے۔ سلطان کے اخلاف آج کل پاکستان میں مقیم ہیں۔

غالب ایک خط میں غلام بسم اللہ کو لکھتے ہیں:

"آپ کے منصف صاحب کی بھی غزل میں اصلاح کم ہوئی ہے" (عودِ ہندی: ۱۷۶)

یہاں منصف صاحب سے یہی سلطان مراد ہیں۔

افسوس کہ سلطان کا کلام ضائع ہو گیا۔ ایک نعتیہ قصیدہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری (اردو کالج، کراچی) کے پاس محفوظ ہے۔ انھوں نے اس کی نقل عنایت فرمائی ہے، جو ہدیۂ ناظرین ہے:[۵]

---

[۵] اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ منشی مہیش پرشاد مرحوم نے مجھے بتایا کہ مفتی سلطان حسن خاں کا تخلص احسن تھا، اس لیے میں نے یہی نام کے تحت ان کا کتاب کی طبعِ اوّل میں ذکر کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ ان کا تخلص احسن نہیں، بلکہ سلطان تھا۔ لہذا یہ تبدیلی کی گئی ہے۔

خدا کے بعد رتبہ ہے تمہارا، یا رسول اللہ
ہوا تم سا نہ کوئی، اور نہ ہوگا یا رسول اللہ

تمہارے دامنِ دولت سے وابستہ ہے کل عالم
تمہارے دم کا ہے سارا کرشمہ یا رسول اللہ

تمہارے واسطے حق نے بنایا دونوں عالم کو
تمہیں دونوں جہاں کے ہو وسیلہ یا رسول اللہ

صفاتِ ظاہری و باطنی سب تم میں یکجا ہیں
جو قدرت کے خزانہ میں تھا، بخشا یا رسول اللہ

تمہیں ہو باعثِ ایجادِ کل اور ہو تمہیں سب کے
نجاتِ آخرت کا بھی ذریعہ، یا رسول اللہ

کہاں سے سایہ ہوتا آپ کو، اس ذاتِ واحد نے
بنایا نور کا اپنے نمونہ، یا رسول اللہ

پہنچ کر طور پر موسیٰ نے کی دیدار کی خواہش
جوابِ لن ترانی اُن کو آیا، یا رسول اللہ

سواری دے کے بھیجا حق نے خود اپنے مقرب کو
تمہیں گھر بیٹھے خلوت میں بلایا، یا رسول اللہ

نیاز و ناز کی باتیں ہوئیں کیا کیا نہ خلوت میں
دوئی کا درمیاں میں تھا نہ پردہ، یا رسول اللہ

تقرب کے جہاں تک تھے مدارج، وہ ملے تم کو
بچشمِ سر خدا کو تم نے دیکھا، یا رسول اللہ

فلک کو بھی شرف حاصل ہوا پائے مبارک سے
نہ تنہا کچھ زمیں نے فخر پایا، یا رسول اللہ

قسم کھائی خدا نے آپ کی عمر اور مسکن کی
سبحان اللہ، یہ رتبہ ہے تمہارا، یا رسول اللہ

اگر پاؤں اجازت تو کروں کچھ عرضِ حال اپنا
کہ اک قدرت سے رکھتا ہوں ارادہ، یا رسول اللہ

تمنا ہے، مدینہ کو برہنہ سر برہنہ پا
چلا جاؤں میں آزادانہ کہتا، یا رسول اللہ

کبھی میں شوق میں دوڑوں، کبھی میں وجد میں آؤں
تصوّر ہو بندھا مجھ کو تمہارا، یا رسول اللہ

کیا ہو پارہ پارہ میں نے اپنے جیب و داماں کو
بہاتا ہوں میں ان چشموں سے دریا، یا رسول اللہ

میں پہنچوں کعبۂ مقصود تک، اللہ اکبر جب
کھڑا ہوں سر جھکا کے دست بستہ، یا رسول اللہ

یکایک محو ہو جاؤں کبھی جو ہوش میں آؤں
کروں میں عرض جو کچھ ہو تمنا، یا رسول اللہ

در و دیوار سے لپٹوں، دل اپنا کھول کر رو دوں
پھروں میں گردِ روضہ کے تڑپتا، یا رسول اللہ

تڑپ کر پھر کسی ڈھب سے میں پہنچوں قبرِ اقدس تک
نکالوں دل کے میں ارمان کیا کیا، یا رسول اللہ

تمنا جس کو ہو چومے وہ جا کر سنگِ اسود کو
ملے مجھ کو ترے مرقد کا بوسہ، یا رسول اللہ

یہی ہے آرزو میری، مروں جا کر مدینہ میں
ملے مجھ کو وہاں اک قبر کی جا، یا رسول اللہ

بوقتِ نزع دم بھرتا ہوں میں ذاتِ مقدس کا
زباں پر ہو مری کلمہ تمہارا، یا رسول اللہ

جو مجھ کو قبر میں رکھیں، اکیلا چھوڑ کر لوٹیں
وہاں دیکھوں رُخِ انور کا جلوا، یا رسول اللہ

نہ پھر وحشت رہے مجھ کو، نہ دہشت ہو نہ تاریکی
یہ خلوت دے رہی ہو لطفِ تازہ، یا رسول اللہ

فرشتے قبر میں آکر اگر کچھ پوچھنا چاہیں — انھیں کچھ آپ فرما دیں اشارہ یا رسول اللہ
بدولت آپ کی مجھ کو نہ کچھ ہول قیامت ہو — بآسانی گذر ہو پل سے میرا یا رسول اللہ
نہ کھلنے پائیں محشر میں مرے دفتر گناہوں کے — یہ فرما دیجیے: ہے یہ ہمارا یا رسول اللہ
رہوں خوشحال، فارغ البال، جب تک میں رہوں زندہ — نہ پہنچے میرے دل کو کوئی صدمہ یا رسول اللہ
رہے آباد میرا گھر، جو ہیں میرے جگر گوشے — رہیں وہ پھولتے پھلتے ہمیشہ یا رسول اللہ
میں اچھا یا برا، جیسا ہوں، امت میں تمھاری ہوں — مری دونوں جہاں میں شرم رکھنا یا رسول اللہ
نوازش پر تمھاری، کر رہا ہوں ناز شیں، ورنہ — کہاں میں اور کہاں میری تمنا یا رسول اللہ
نہ کچھ فضل و ہنر مجھ میں، نہ کچھ حسن عمل میرا — تمھارے فضل کا اک ہے سہارا یا رسول اللہ
تمھارے فضل کا سب سے مجھے اک حق زائد ہے — نہیں امت میں بدکردار مجھ سا یا رسول اللہ
تمھیں دارین کے ملجا، تمھیں کونین کے ماویٰ — کہوں میں اور کس سے درد اپنا یا رسول اللہ
چھڑا کر کشمکش سے، اب بلا لو تم مدینہ میں — دکھا دو اب تو تم مجھ کو مدینہ یا رسول اللہ
مدینہ کی گدائی ہو کہیں سلطان کو حاصل — ملے بہر حسن اس کو یہ رتبہ، یا رسول اللہ
ادب ہے کہہ نہیں سکتا ہوں، جو کچھ اور کہنا ہے — مگر مالک ہو تم، ہوں میں تمھارا یا رسول اللہ

[غالب اور عصر غالب: ۱۳۵ - ۱۴۰؛
مخطوطہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی]

سوزاں ــــ حبیب الدّین احمد انصاری سہارنپوری

ان کے والد کا نام خواجہ معین الدّین انصاری تھا۔ سلسلۂ نسب مشہور صحابیِ رسول حضرت ابوایوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم بہت معقول تھی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد سہارنپور سے دلّی آ گئے۔ عاشق تن آدمی تھے، یہاں دلّی میں کوٹھوں کی سیر کرنے لگے۔ شاعری کا شوق پہلے سے تھا، اس رند منشی نے گویا سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ غالبؔ کی اصلاح نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ نظم و نثر دونوں خوب لکھتے تھے۔ چنانچہ قیامِ دلّی کے دَوران میں "اخبار الاخیار" کے ایڈیٹر بھی ہو گئے تھے۔ کئی کتابیں نثر میں یادگار چھوڑیں۔ جن میں سے تاریخِ عجیب در حالاتِ حکمائے یونان، تریاقِ مسموم، تاثیر القلوب، گنجِ شایگاں (قافیہ میں) قابلِ ذکر ہیں۔

اُستاد کے عاشق تھے۔ جب تک غالب زندہ رہے، انھوں نے دلّی چھوڑ کر کہیں جانے کا نام نہیں لیا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد یہاں سے دل اُچاٹ ہو گیا اور واپس سہارنپور چلے گئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

غالب سے کام تھا، سو وہ سوزاںؔ گزر گئے
دہلی میں اب جناب کا کیا کام رہ گیا!

اگرچہ معاش کا کوئی خاص ذریعہ نہیں تھا اور تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی، لیکن عجیب قانع طبیعت پائی تھی، کبھی ماتھے پر بل نہیں لائے، ہنستے کھیلتے زندگی کے دن گزار دیے۔ ۶۵ برس کی عمر تھی، جب ۱۸۸۹ء میں جاں بحق ہوئے۔

ایک مختصر دیوان ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ (مطبع انصاری، دہلی: ۱۳۰۰ھ باہتمام

عبدالرزاق بیگ) کلام کا بہت بڑا حصّہ غیر مطبوعہ رہ گیا، جس کے ان کی تنگدستی کے باعث چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ کلام سے بھی زندہ دلی اور شوخی ٹپکتی ہے:۔

اللہ میں ہوں اور یہ غمِ وصل یار کا
تو جانتا ہے درد، دلِ بیقرار کا

تیری نگاہِ مست، اثر دل میں کر گئی
ساقی! یہ جام لے کہ مرا کام ہو گیا

افسوس، کہ دل خوش نہ ہوا، مل کے کسی کے
ماتمکدۂ دہر میں، جو تھا، سو حزیں تھا

دھو سکے تو اپنے دل کا داغ دھو
شیخ! منھ کو ہر گھڑی دھوتا ہے کیا

توبہ کا ارادہ تو ہمارا ابھی ہے اے شیخ!
لیکن ذرا آ جائے بڑھاپا، ابھی کچھ اور

لطف کم کیجے کہ اس بندہ کے حق میں آپکا
اب ستم اچھا ہے اور لطف و کرم اچھا نہیں

حق تعالےٰ غم کسی کو دے، تو سوزاں عشق کا
ورنہ دنیا کا ہو یا دیں کا ہو، غم اچھا نہیں

جانتے ہیں پر افسوس، یہ ہم کو نہیں معلوم
جائینگے کہاں اور ہم آئے ہیں کدھر سے

آتی ہے تجھے دیکھ کے، کیا کیا مرے دل میں
پر کہہ نہیں سکتا ہوں میں ظالم ترے ڈر سے

بس اب عشقِ بتاں کر ترک سوزاںؔ!
خدا کا خوف کر، بندے خدا کے

جانے کس وقت وظائف سے ہوں فارغ سوزاںؔ
جامِ مے ساقیِ گلفام! لگا رہنے دے

[خمخانۂ جاوید، ۴: ۲۸۸ - ۲۸۹؛ یادگارِ ضیغم ۱: ۱۷۵، ۱۷۶؛
مکتوب ڈاکٹر حنیف نقوی، بنارس]

سوزاں و مدّاح ـــــــ شیخ محمد صادق علی گڈھ مکتیسری

اگرچہ گڈھ مکتیسر وطن تھا، لیکن سکندرہ راو (ضلع علی گڑھ) میں رہتے تھے۔ سرکاری ملازم اور پرمٹ کے محکمے میں درجۂ اوّل کے انسپکٹر تھے۔ اور کھاتے پیتے خوشحال اور عالم آدمی تھے۔ سوزاں اور مدّاح دو تخلّص کرتے تھے، نعت کہنے کا بھی شوق تھا غالباً التزام یہ تھا کہ عاشقانہ کلام میں سوزاں تخلّص تھا اور نعتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مدّاح۔ چنانچہ نعتیہ دیوان میں جو ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸-۱۸۶۹ء) میں چھپا تھا تخلّص شروع سے آخر تک مدّاح ہی استعمال کیا ہے۔ ایک تذکرہ بھی لکھا تھا، جواب نہیں ملتا۔

ان کے صاحبزادے نثار علی شہرت کسی زمانے میں نامی پریس میرٹھ میں ملازم تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

اُس کو بُلوایا تو ہے، لطف تب اے دل، آئے
ساتھ تلوار بھی لائے، جو وہ قاتل آئے

ایسا نہ ہو کہ ظلم سے بھی ہاتھ اُٹھائے یار
کیوں کہیے ناز اٹھانے کی طاقت نہیں رہی

ایک نعت کے دو شعر ہیں:

نگینِ دل ہمارا ہے مزیّن
نقوشِ نامِ ختمِ مرسلیں سے

صلہ مدحت کا لو، مدّاح چل کر
حضورِ خسروِ دنیا و دیں سے

[سخن شعرا: ۴۲۶؛ یادگارِ ضیغم: ۳۸۷؛
اُردو ادب، اکتوبر / دسمبر، ۱۹۵۴ء: ۱۱۲-۱۱۳]

سیاح، عشاق — منشی میاں داد خان اورنگ آبادی

ان کے والد منشی عبداللہ خان کا اورنگ آباد کے امیر لوگوں میں شمار تھا۔ اس لیے سیاح کا بچپن نہایت عیش و عشرت اور آرام و آسایش میں بسر ہوا۔ لیکن جب یہ سنِ رُشد کو پہنچے، تو سب جا داد ٹھکانے لگ چکی تھی۔ یار باش اور زندہ دل آدمی تھے۔ مزاج میں بہت نفاست تھی۔ خوش لباس ایسے کہ کپڑے دلّی میں سلواتے۔ عطر کا شوق اس درجہ کہ جس گلی کوچے سے نکل جاتے، وہ مہک اُٹھتا اور لوگ محض فضا کی خوشبو سے کہہ دیتے کہ سیاح اس طرف سے گذرے ہیں۔

فارسی زبان بے تکان بولتے تھے۔ طبیعت میں تیزی اور بذلہ سنجی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جہاں جاتے لوگوں سے بےتکلف دوستی پیدا کر لیتے۔ اپنے اہتمام سے مشاعرے کرتے، پڑھنے کا انداز بھی بہت دلکش تھا۔ انھیں باتوں سے لوگوں کو ان پر انگریزوں کا جاسوس ہونے کا شبہہ ہوا۔ آخر یہی روشنیِ طبع بلاے جان ثابت ہوئی ۱۸۷۸ء میں ان پر جعلی سکّے بنانے کا مقدّمہ قائم ہوا، اور یہ ماخوذ ہو کر قید کر دیے گئے۔

واقعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اچھے خطّاط اور فنِ مصوّری میں ماہر تھے، اس لیے انھیں قلب سازی سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ نا بکے، ۱۸۷ء میں یہ بمبئی سے حیدر آباد گئے۔ ریل کے اسٹیشن سے ٹکٹ خریدا اور سو روپے کا نوٹ بھنایا۔ اتفاق دیکھیے کہ ان کے بعد جو دوسرا مسافر آیا، اس نے بھی ٹکٹ کے لیے سو ہی کا نوٹ پیش کیا اور ستم یہ ہوا کہ اس دوسرے نوٹ کا نمبر بھی وہی تھا، جو سیاح کے نوٹ کا تھا۔ فوراً تفتیش شروع ہوئی اور آخر کار سیّاح حیدر آباد سے پکڑے آئے۔ مقدّمہ چلا اور چودہ سال قید کی سزا

ہوگئی۔ لیکن خوش قسمتی سے پوری مدّت قید خانے میں نہیں رہے۔ قید خانے کا منتظم ایک پارسی شخص تھا۔ اس نے قید کے ایام ہی میں اپنے لڑکوں کی تعلیم ان کے سپرد کردی۔ پھر جب ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کا دربار ہوا، تو ان سے قصیدہ لکھوا کر اپنی سفارش کے ساتھ اوپر بھیج دیا، جس سے سزا میں تخفیف ہوگئی اور یہ قبل از وقت رہا ہوگئے۔

شروع میں تخلص عشّاق تھا۔ جب غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انھوں نے اسے بدل کر سیّاح کر دیا۔ چونکہ انھوں نے ہندستان کے طول و عرض بلکہ عرب و عجم میں بہت سفر کیے تھے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا، اس لیے یہ تخلص ان پر خوب صادق آتا تھا۔ غالب نے انھیں سیف الحق خطاب بھی دیا تھا اور اپنی مشہور اردو کتاب "لطائفِ غیبی" ان ہی کے نام سے چھاپی تھی۔

۱۸۶۲ء میں نواب میر غلام بابا خاں سی، آئی ای (C. I. E.) رئیسِ سورت کی مصاحبت اختیار کر لی۔ نواب صاحب کی زندگی بھر تو بہت عافیت سے گزری، لیکن جب ۱۸۹۳ء میں ان کا انتقال ہوگیا، تو ان کا ستارہ بھی گردش میں آگیا۔ اس کے بعد کے دس بارہ سال بہت تنگی کی حالت میں بسر کیے۔ ان ایام میں ان کے ایک دوست اور مدّاح حکیم شیخ محمّد (یا محمود) میاں صاحب نے دستگیری کی اور ان کے کفیل

ے نواب غلام بابا خان ۴ شعبان ۱۲۵۰ھ (۶ دسمبر ۱۸۳۴ء) کو سورت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید اشی قاضی شہر اور درگاہِ سید جمال الدین کے سجادہ نشین تھے۔ جب ۲ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ (۸ مارچ ۱۸۴۸ء) کو ان کا انتقال ہوگیا، تو اس کے بعد غلام بابا خان کی تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی سید جمال الدین نے کی۔ اگرچہ خود شعر نہیں کہتے تھے، لیکن شاعروں اور ادیبوں کے قدر دان اور متکفّل تھے۔ غالب سے بھی خط و کتابت رہی اور گاہے ماہے ان سے سلوک بھی کرتے رہے۔

۱۲ شوال ۱۳۱۰ھ (۲۹ اپریل ۱۸۹۳ء) کو انتقال کیا۔ اور اپنے خاندانی قبرستان درگاہِ حضرت سید جمال الدین عرف خواجہ دیوانہ (دانا") میں مدفون ہوئے۔

(سخنورانِ گجرات: ۲۷۲-۲۷۵)



منشی میاں داد خان سیّاح اورنگ آبادی

رہے۔
تقریباً ۸۵ برس کی عمر تھی جب ۱۹۰۷ء میں سورت میں وفات ہوئی۔ وہیں محلّہ "بڑے خان کا چکلہ" میں خواجہ دیوانہ صاحب (یعنی سید جمال الدین) کی خانقاہ میں مدفون ہیں۔ سورت ہی کے ایک معزز خاندان میں شادی کر لی تھی۔ اس سے متعدّد اولادیں ہوئیں۔ لیکن مشیّتِ ایزدی کہ ان میں سے کوئی بچہ زندہ نہیں رہا۔ آخر عمر میں محلہ سید واڑہ (سورت) کے ایک شریف خاندان کی لڑکی کو گود لے لیا تھا اس کی پرورش کی اور اپنے سامنے اس کی شادی کر دی، اس کی اولاد موجود ہے۔
غالب کے محبوب شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اردوے معلّیٰ میں متعدّد خطوط ان کے نام کے موجود ہیں۔ غالب سے تلمذ کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

شاعروں میں ہو نہ کیوں فخر مدار اپنا
ہے تلمذ اسد اللہ سے ہم کو سیّاح!

سر پر نہیں ہے سایۂ بالِ ہما، نہ ہو
ظلِّ کرم ہے حضرتِ غالب کا بس مجھے

دیوان اگرچہ مرتّب کر لیا تھا، لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک مختصر رسالہ "سیرِ سیّاح" ۱۸۷۲ء میں شائع کیا تھا جس میں شمالی ہندستان میں اپنی سیاحت کا مختصر حال اور دو مشاعروں کی رُوداد درج کی ہے۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے کچھ مختصر کلام شائع کر دیا ہے، یہ بھی غنیمت ہے۔
یہ ضرب المثل شعر انھیں کا ہے:

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گذرے گی جو مل بیٹھینگے دیوانے دو

چند شعر ملاحظہ ہوں:

کبھی دیکھی مری صورت، کبھی تلوار کی صورت
لیا بوسہ جو ابرو کا، تو کیا کیا غیظ میں آکر

مسندِ فقر پہ زاہد نہ کرے کیوں کر تکیہ
ہم فقیروں کو ہوا فضلِ خدا پر تکیہ

لطف املاک و امارت ہوا میروں کو نصیب
فضلِ خالق سے فقیروں کا ہوا گھر تکیہ

کیا عجب گر ہوگئی رونے سے چشمِ تر سفید
ابر کالے، بعدِ بارش ہوتے ہیں اکثر سفید
خشک تھا یہ ناتوانی سے لہو اس جسم کا
ذبح قاتل کر چکا، لیکن رہا خنجر سفید

اس بیکسی میں، میری رفاقت جو تم نے کی
جان اپنی تم پہ کرتا ہوں، رنج و محن نثار

دیا ہے جس نے غمِ سیاح! راحت بھی وہی دیگا
ترقی ہوتی ہے دنیا میں، کہتے ہیں تنزّل سے

وجہِ بربادیِ عشّاق ہے آرائشِ حسن
اور الجھاتے ہیں خاطر کو سلجھ کر گیسو

آئے ہیں عیادت کے لیے، غیر کے ہمراہ
ساتھ اپنے، مری موت کو بھی لائے ہوئے ہیں

کہہ دو سنبھل کے میکدے میں آئے محتسب
ٹوٹینگے خُم ضرور، مگر اُس کے سر کے ساتھ

قفس میں سیرِ گلشن کی اگر مانگے دعا دل سے
صدائے خندۂ گل آئے، فریادِ عنادل سے

کہو گر جان، تو سمجھے کہ ہم کو بیوفا سمجھا
سمجھ اس بدگماں کی سارے عالم سے نرالی ہے

[میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام؛ سیرِ سیاح؛ سخن شعرا: ۲۳۰ - ۲۳۱؛ خمخانۂ جاوید، ۴: ۳۰۰ - ۳۰۳؛ معاصر (۴): ۱۲۳ - ۱۳۸؛ گلدستۂ سخن: ۴۷ - ۴۸]

سیّد ــــ مفتی سیّد احمد خان بریلوی

ان کا خاندان دراصل سنبھل کا رہنے والا تھا، لیکن انھوں نے نقل مکان کر کے پہلے بریلی میں اور بالآخر بدایوں میں توطن اختیار کر لیا تھا۔ فاضل آدمی اور حاذق طبیب تھے۔ خدا نے حسنِ ظاہری و باطنی دونوں سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ شجاعت میں بھی فرد تھے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انگریزی حکومت کی ملازمت کر لی تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے آغاز کے وقت وہ تحصیلدار تھے۔ شورش شروع ہوئی تو اپنے وطن بریلی آگئے۔ اب انھوں نے کھلم کھلا سیاسی ہنگامے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا شروع کیا اور خان بہادر خان حافظ الملک حافظ رحمت خان کے پوتے کی قائم کردہ حکومت میں بریلی میں مفتی مقرر ہو گئے۔ جب دوبارہ انگریزی تسلّط قائم ہو گیا تو یہ بھی گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور کالے پانی کی سزا ہو گئی۔ وہیں جزیرہ انڈمان میں انتقال ہوا۔ لاولد رہے۔

غالب کے ایک دوسرے شاگرد قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی سے ان کی حقیقی بھانجی منسوب تھیں۔ ممکن ہے یہ تعلق بھی غالب سے تلمذ کا ذریعہ ثابت ہوا ہو۔ جنون کے نام ایک خط میں غالب نے ان کا ذکر کیا ہے، اور منشی نبی بخش حقیر کے ایک خط میں بھی ان کا نام "سخن گرانمایہ" کی حیثیت سے ہے ۔ صرف دو منظوم دعائیں جو انھوں نے حضرت رسولِ کریم صلعم کے حضور میں قیامِ انڈمان کے زمانے میں لکھی تھیں، ملتی ہیں؛ بقیہ کلام اسی ہنگامے میں ضائع ہو گیا۔ انھیں کا انتخاب ملاحظہ ہو:

قسم ہے تجھے، اے نسیمِ سحر! مری بیکسی پر ذرا رحم کر
میسّر نہیں کوئی پیغامبر مدینے میں ہووے جو تیرا گزر

تو میری طرف سے زمیں چوم کر یہ کہنا بدرگاہ خیر البشر
نبی الوریٰ! یا نبی الوریٰ!
بہیں حالِ ما، یا نبی الوریٰ!

شہا! تیرے محکوم ہیں بحر و بر اشارے کے تابع قضا و قدر
جو آیا یمِ اعجاز کا موج پر تو سورج کو پھیرا، کیا شق قمر
کیا دم میں اعمیٰ کو صاحب نظر کیا رحم، اشتر کی فریاد پر
نبی الوریٰ! یا نبی الوریٰ!
بہیں حالِ ما، یا نبی الوریٰ!

بندھے بندِ آہن سے سب دست و پا رہا بند یک چند آب و غذا
نہ سننا تھا جو کچھ، وہ سب کچھ سُنا نہ ہونا تھا جو کچھ، وہ سب کچھ ہوا
لُٹا گھر، دیار و وطن بھی چھُٹا چھُٹے سب کے سب دوست اور آشنا
نبی الوریٰ، یا نبی الوریٰ!
ببیں حالِ ما، یا نبی الوریٰ!

غضب ہے، کہ سیّد پہ ہو یہ جفا جو مشہور عالم ہیں ہو آپ کا
نہ ہو حال پر اس کے فضلِ خدا نہ اعدا کو ہو اس کے اب تک سزا
تعجّب بہت ہے کہ ہے دیر کیا رہا کیجیے جلد، مولا رہا!
نبی الوریٰ، یا نبی الوریٰ!
ببیں حالِ ما، یا نبی الوریٰ!

دوسری نظم کے چند شعر ہیں:

اتنے میں تصوّر کو زرا رحم جو آیا
نقشے کئی تصویروں کے وہ سامنے لایا
اس غم میں کہ اس رشکِ قمر کو نہیں دیکھا
نالے بھی کیے کیا کہ بہت خوب سا رو دیا

کہنے لگا یوسف ہیں یہ موسیٰ ہیں، یہ عیسیٰ
میں نے کہا: ان میں سے کسی پر نہیں شیدا
جب سامنے کی اس نے شبیہِ شہِ بطحیٰ
بیساختہ اس وقت زباں سے مری نکلا
دل کو مرے تسخیر کیا اس عربی نے
مکّی، مدنی، ہاشمی و مطّلبی نے

جب حشر میں ہو ویگا بپا عرصۂ محشر
اور لائینگے تشریف وہاں سارے پیمبر
عشّاق سے فرمائیگا یوں خالقِ داور
دنیا میں کہو، کس کے لیے رہتے تھے مضطر
جو شخص کہ ہے بحرِ محبّت کا شناور
محبوب کا نام لائیگا اس وقت زباں پر (کذا)
میں عرض کرونگا: مرے مولا، مرے داور!
بیٹھا ہے ترے پاس جو یہ برسرِ منبر
دل کو مرے تسخیر کیا اِس عربی نے
مکّی، مدنی، ہاشمی و مطّلبی نے

[آئینۂ دلدار: ۱۲۸؛ یادگارِ بریلی: ۲۷-۲۸؛
غالب اور عصرِ غالب: ۱۲۷-۱۳۵]

سیّد — قاضی سرفراز علی شاہجہانپوری

شاہجہانپور کے سیّد امانت علی کے بیٹے، محلّہ قاضی خیل کے رہنے والے تھے۔ خاندان کا مسقط الرّاس ترمذ (وسط ایشیا) تھا، جہاں سے ان کے مورثِ اعلیٰ اللہ داد عہدِ عالمگیر (۱۶۵۸ - ۱۷۰۷ء) میں ہندستان آئے۔ شاہجہانپور کے مشہور قاضی صاحبان عبدالہادی اور سعد اللہ دونوں انھیں کے خاندان سے تھے۔ امانت اللہ ان قاضی سعد اللہ کے فرزندِ ارجمند تھے، ان کا سعد اللہ کی زندگی میں انتقال ہو گیا تھا، لہذا سعد اللہ کے بعد سرفراز علی قاضی مقرر ہو گئے۔

سرفراز علی ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں شاہجہانپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں ہوئی۔ اس کے بعد ان کے ماموں نیاز علی بلگرامی نے مزید تحصیل کے لیے انھیں دلی بھیج دیا۔ دلّی کے شعری ماحول کے صدقے انھیں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ سیّد تخلص اختیار کیا۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ لیکن اپنے مذہبی رجحان کے باعث کلام زیادہ تر حمد و نعت ہی میں کہا۔

نثر بھی لکھنے کا شوق تھا، اور اس میں بھی مناظرانہ قسم کی چیزوں پر زیادہ توجّہ مبذول رہی۔ پادری عماد الدّین پانی پتی کی مخالفانہ کتاب "نیاز نامہ" کا جواب "ہدایتِ شمامہ" لکھا تھا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ بھی انگریز مخالف سرگرمیوں میں شریک رہے۔ نواب خان بہادر خان نے انھیں شاہجہانپور میں منصف مقرر کر دیا تھا۔ امن بحال ہونے کے بعد یہ بھی گرفتار ہوئے اور کالے پانی کی سزا ہو گئی۔ روایت ہے کہ متھرا داس سرشتہ دار، حاکم پورٹ بلیر کی تحریک پر انھوں نے جزیرۂ انڈمان کی ایک مبسوط تاریخ مرتب کر کے

سررشتہ دار موصوف کے نام سے مشتہر کی۔ اس پر منتہر اداس نے انھیں حاکم جزیرہ کرنیل بروس کے پیش کیا۔ بروس فارسی پڑھنا چاہتا تھا اُس کو موقع مل گیا اور وہ ان سے فارسی پڑھنے لگا۔

پورٹ بلیر میں اور بھی کئی قیدی تھے، ان لوگوں سے اُجرت پر مشقت لی جاتی تھی اجرت کی شرح بہت کم بلکہ برائے نام تھی۔ ان قیدیوں نے اجرت میں اضافے کا مطالبہ کیا۔ اور جب شنوائی نہ ہوئی، تو مسکوٹ کر کے کرنیل بروس کے بنگلے پر چڑھ دوڑے۔ عین ممکن تھا کہ بلوائی بروس کو یا اس کے خاندان کو کچھ نقصان پہنچاتے۔ اتّفاق سے قاضی سرفراز علی اس وقت بنگلے میں موجود تھے۔ وہ فوراً باہر نکل آئے، انھوں نے ان لوگوں کو سمجھا بُجھا کے ٹھنڈا کیا اور ریوں بلا ٹل گئی۔

سیّد کرنیل بروس کے استاد تو تھے ہی، اس واقعے کے بعد وہ گویا ان کے محسن بھی بن گئے۔ انھوں نے صدر میں پورے واقعے کی رپورٹ لکھ کر پُر زور سفارش کی کہ سیّد کا قصور معاف کر کے ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا جائے۔ سفارش منظور ہوئی اور ان کی رہائی کے احکام پہنچ گئے۔ بروس چاہتا تھا کہ یہ وہیں انڈیمان میں کوئی ملازمت قبول کر لیں اور ہندستان نہ جائیں۔ لیکن سیّد نے اپنے اعزّہ سے ملنے اور وطن واپس آنے کو ترجیح دی اور بروس سے معذرت کر کے ہندستان چلے آئے۔

یہاں وطن میں طلبہ کو پڑھاتے رہے۔ پھر جب گورنمنٹ ہائی اسکول میں عربی کی تعلیم کا انتظام ہوا، تو یہ مدرّسِ دوم کے عُہدے پر مقرر ہو گئے۔

سیّد کو حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے عشق تھا۔ وہ مولوی عبدالرحمٰن نقشبندی سے بیعت تھے۔ مولوی عبدالرحمٰن موصوف کے پوتے مولوی عبدالغفور خان نے محفلِ میلاد کا انتظام کیا۔ سیّد بھی مدعو تھے۔ جب یہ نعت پڑھنے لگے تو ان پر کچھ ایسی بیخودی کی کیفیت طاری ہوئی کہ سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ اسی حالت میں فالج کا حملہ ہوا۔ چند دن بیمار رہ کر جمادی الثانی ۱۲۹۳ھ (جون/جولائی ۱۸۷۶ء) میں رہگرائے عالمِ جاودانی ہو گئے۔ محلہ چمکنی میں دفن ہوئے تھے۔

حمد و نعت میں ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ انھوں نے کریما کی تضمین بھی قلمبند کی تھی۔ لیکن یہ کہیں شائع نہیں ہوئی۔ روایت ہے کہ ۱۳۰۶ھ میں مولوی عبدالحکیم آروی

نے اس تضمین میں کچھ معمولی ردّ و بدل کر کے یہ اپنے نام سے شائع کر دی۔ لیکن چونکہ سیّد کی تضمین شہرت پا چکی تھی اور متعدّد حضرات کے پاس اس کی نقل موجود تھی، اس لیے عبدالحکیم آروی کے جعل کا پردہ چاک ہو گیا۔ لیکن اس بہانے یہ تضمین شائع ہو کر محفوظ ہو گئی۔

نمونۂ کلام میں یہی چند شعر ملے ہیں:

سیّد! اگر آ پڑے تجھے مشکل بھاری
کر جا کے مزارِ شہدا پر زاری
مردہ نہ سمجھ اُن کو، ذرا آنکھیں کھول
ان سوتوں سے ہے فیض کا چشمہ جاری

محشر میں خوف ہو گا جو رب کے عتاب کا
ہر شخص منھ تکیگا رسالت مآب کا
لب اس کے واں کھلینگے شفاعت کے واسطے
یارا جہاں نہ ہو گا سوال و جواب کا

جاں نثارِ قدمِ جانِ جہاں ہونے دو
عاشقوں میں مجھے بانام و نشاں ہونے دو
آگے اس ماہِ عرب کے نہیں پانے کے فروغ
حشر میں مجمعِ خوبانِ جہاں ہونے دو
سیّد! اس خانۂ دل میں نہ کرو آہ کو ضبط
درگہِ یار میں دیکھو نہ دھواں ہونے دو

[تاریخ شاہجہانپور میں صراحت سے ان کے تلمذِ غالب کا ذکر نہیں، لیکن چونکہ اُن کے ماموں سیّد نیاز علی نے اپنے دونوں بیٹوں (آل نبی فگار اور واجد علی) کو دلّی لاکر غالب کے حوالے کیا تھا اور سرفراز علی سیّد بھی انھیں کے ساتھ آئے تھے، اس لیے میرے خیال میں یہ بھی غالب ہی کے شاگرد تھے]

[تاریخ شاہجہانپور، ۲: ۲۶۶-۲۶۸]

شاداںؔ و خیالیؔ ــــــ میرزا حسین علی خاں دہلوی

میرزا زین العابدین خان عارف کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ جب عارف ۱۸۵۲ء میں واصلِ حق ہوئے، تو یہ صرف دو برس کے تھے۔ چونکہ ان کی والدہ کا چند ماہ پہلے انتقال ہو چکا تھا، اس لیے غالب کی بیوی امراؤ بیگم انھیں اپنے پاس لے آئیں۔ عارف کی والدہ بنیادی بیگم (جیسا کہ عارف کے ترجمے میں بیان ہوا ہے) امراؤ بیگم کی بڑی بہن تھیں حسین علی خان کے بڑے بھائی باقر علی خاں جو عمر میں اِن سے تین برس بڑے تھے، عارف کی وفات کے بعد اپنی دادی اماں بنیادی بیگم ہی کے پاس رہے تھے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد وہ بھی غالب کے پاس آ گئے۔

حسین علی خاں کی تعلیم و تربیت شروع سے غالب کی نگرانی میں ہوئی۔ چونکہ ان کی اپنی صُلبی اولاد کوئی نہیں تھی، اس لیے انھوں نے ان دونوں بچوں کی نہایت دلسوزی اور محبّت سے پرورش کیا اور ان کے ہر طرح کے ناز نخرے برداشت کیے۔ یہ ہر وقت ان کے گلے کا ہار بنے پھرا کرتے تھے۔ میرزا جہاں کہیں جاتے یہ ان کے ساتھ ہوتے؛ رام پور کے دونوں سفروں میں بھی ساتھ رہے۔

میرزا حسین علی خاں اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے۔ اُردو میں تخلص شاداںؔ تھا اور فارسی میں خیالیؔ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں تخلص راقمؔ تھا۔ بہت کمسنی میں لکھنا شروع کیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے خونی ہنگامے کے بعد جو معرکے کا مشاعرہ ہوا تھا، اور جس میں بیشتر مشہور حاضر الوقت شعرا نے حصّہ لیا تھا، اس کا مجموعہ "فغانِ دہلی" کے نام سے اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا (۱۸۶۳ء) اس مشاعرے کے وقت ان کی عمر ۹-۱۰ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس مجموعہ میں ان کا فقط

یہ ایک شعر شامل ہے ؎

مٹ گیا، خوب ہوا نام و نشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

غالب کی زندگی تک انھیں سے مشورہ کرتے رہے اور ان کے بعد کمتر حالیؔ سے اور بیشتر سالکؔ سے اصلاح لی۔ اسی زمانے میں بزمرۂ شعرا ملازم ہو کے رام پور چلے گئے۔ یہ خلد آشیان نواب کلب علی خان بہادر کا زمانہ تھا اور اس قدر دان کمال کا شہرہ سن کر ہر طرح کے علوم و فنون کے ماہر رام پور میں جمع ہو گئے تھے۔ لیکن نواب خلد آشیان نے ان تمام اصحاب کے ذمّے کچھ کام اور فرض لگا دیا تھا، تاکہ یہ لوگ احدیوں کی طرح مفت کی تنخواہ نہ کھائیں۔ شاداں بھی شروع میں پچیس یا تیس روپے کے ملازم ہو کے گئے۔ بعد کو اضافہ ہوا تو ساٹھ ملنے لگے۔

مئی ۱۸۷۶ء میں شاداںؔ کے بڑے بھائی باقر علی خاں کاملؔ عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ محبوب بھائی کی دائمی جدائی نے ان کا دماغی توازن بگاڑ دیا اور یہ نوکری چھوڑ کر دلّی چلے آئے، بلکہ ایک طرح کے مالیخولیا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انھیں یہ توہّم ہو گیا تھا کہ شاعر کے لیے دُبلا پتلا ہونا لازم ہے اور موٹا آدمی شاعر نہیں ہو سکتا، چونکہ داغؔ ماشاء اللہ خاصے تن و توش کے مالک تھے، اس لیے لالہ سری رام کی روایت کے مطابق شاداں کہا کرتے تھے کہ داغ کو کبھی شعر کہنا نہیں آئیگا کیونکہ شاعری اور فربہی میں بہت بُعد ہے۔ آخری ایام میں ان کا یہ وہم اس حد تک بڑھ گیا تھا، کہ کھانا پینا بالکل ترک ہو گیا؛ سیپیوں میں پانی پیتے تھے۔ قدرتاً تندرستی بالکل تباہ اور کمزوری حد سے سوا ہو گئی۔ اسی حالت میں یکم شوال ۱۲۹۶ھ (۷ ستمبر ۱۸۸۰ء) کو انتقال کیا۔ نساخؔ نے تاریخ کہی:

برفت آہ شاداںؔ زدُنیائے دُوں
خدایا مقامش، بفردوس باد
برائے سنِ رحلتش، خامہ ام
رقم کرد: ”شادانِ فرّخ نہاد“
(۱۲۹۶ھ)

سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائینتی اپنی خاندانی ہڑواڑ میں بڑے بھائی کے

پہلو میں دفن ہوئے۔ کلام جمع نہیں ہوا۔ بہت کچھ ضائع ہو گیا۔ کتابخانۂ رامپور کے ایک قلمی نسخے میں کچھ شعر ہیں، جن سے متعلق خیال ہے کہ خود شاداں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ سری رام صاحب خمخانۂ جاوید نے بھی مختلف ذرائع سے کچھ کلام فراہم کر کے اپنے تذکرے میں درج کیا ہے۔ بہرحال بہت کم کلام محفوظ رہ گیا۔ پختگی، محاورہ اور روزمرّہ، شوخی اور تازگی اس کے نمایاں وصف ہیں۔ افسوس، عمر نے وفا نہ کی، ورنہ بہت ترقی کی صلاحیت تھی۔

تیری ہر ادا پہ مرتا، ترے ہر سخن پہ جیتا — مجھے موت زندگی پر، اگر اختیار ہوتا
مری خاک ہو تسلّی، ترے وعدۂ غلط پر — تجھے گر ہنسی نہ آتی، مجھے اعتبار ہوتا

غیروں پہ ہیں وہ لطف کہ بڑھتے ہیں ہمیشہ — ہم پر یہ ستم ہے، کہ سوا ہو نہیں سکتا

شاداں نے دل لگا کے بتوں سے بُرا کیا — اس سے یہ رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا

پردہ اٹھا ہوا ہے رُخِ پُر جمال کا — اڑتا ہے آج رنگ، ہمارے خیال کا
کیا اس پہ پڑ گئی، کوئی اُس شوخ کی نگاہ — بدلا ہوا جو طور ہے قاصد کی چال کا
عالم نہ مجھ سے پوچھیے میرے خیال کا — آئینہ بن گیا ہوں، کسی کے جمال کا
بھڑکے اگر چراغ، تو ہستی تمام ہو — ہر چیز کا کمال ہے، باعث زوال کا

بھول جاؤ گے سب خوشی شاداں! — کسی غمگیں سے جب ملینگے آپ

کل ہو کے دو چار اس نگہِ شوخ سے یارب! — آنکھوں میں ٹھہرتی ہی نہیں میری نظر آج
دیکھا ہے مری بے خودیِ شوق کو تو نے — قاصد نہ رہیگی تجھے اپنی ہی خبر آج

شبِ ہجراں میں یہ تڑپا میں سحر ہونے تک — مل گیا خاک میں اس بُت کو خبر ہونے تک
گر یہی جنبشِ مژگاں کے اشارے ہونگے — دل نکل جائیگا پہلو سے نظر ہونے تک
تم تو آتے ہی رہے بہرِ عیادت، اور ہم — مر گئے چارۂ آزارِ جگر ہونے تک
دیکھیں وہ اچھے ہیں یا شمع ہے ان سے اچھی — رنگ کھل جائیگا اس کا بھی سحر ہونے تک
شام تک گریہ وزاری میں بسر ہوتی ہے — اور بھی جان پہ بنتی ہے سحر ہونے تک
جلد شاداں کی خبر لے کہیں، ظالم! ورنہ — گزریگا جان سے وہ تیرا گزر ہونے تک

میں اپنی داستانِ محبت جو کہہ چکا — وہ پوچھتے ہیں مجھ سے، یہ قصّے کہاں کے ہیں
دیکھا ہے میں نے خوب، مریدوں کو شیخ کے — اچھے وہی ہیں یار، جو پیرِ مغاں کے ہیں

پہلو میں میرے، اور یہ پیدا ہوا رقیب   آثارِ عشق رُخ پہ مرے رازداں کے ہیں
شاداں چھپائے لاکھ، یہ چھپتے بھی ہیں کہیں   آثار اس کے چہرے پہ عشقِ بتاں کے ہیں

اس کی شوخی سے کم نہیں شبِ وصل   گرچہ پہلا سا اضطراب نہیں
بیخودی کام آ گئی آخر   کہ انھیں مجھ سے کچھ حجاب نہیں
خیر ہو آج بزم کی، شاداں!   کہ وہ آتے ہیں اور نقاب نہیں

شرماتے ہو کہ نیند کا آنکھوں میں ہے خمار   کل کی سی بات ہی نہیں، طرزِ نگاہ میں

ہو چکی شیشے میں مے مجھ تک جو آیا دورِ جام   گردشِ قسمت تھی اپنی، گردشِ ساغر کے ساتھ

کہتے ہیں عہد شکن سمجھے ہو کیا تم مجھ کو   وعدے کے ساتھ جو آتا ہے تبسم مجھ کو
وہ ادا ہے، نہ وہ غمزہ، نہ وہ شوخی، نہ ادا   آج کچھ اور ہی آتے ہو نظر تم مجھ کو

اٹھ کر درِ جاناں سے کہو، کوئی کدھر جائے   جی سے نہ گذر جائے، تو دنیا سے گذر جائے
ساغرکشِ میخانۂ توحید ہوں ناصح!   وہ نشہ نہیں مجھ کو، جو باتوں سے اتر جائے
رنجوریِ الفت کا مری پوچھ نہ انجام   آغاز میں وہ درد ہے، جو حد سے گزر جائے

بس اب خاموش، کیا کیا کہہ چکے ہو   نکل جائے نہ کچھ میری زباں سے

فارسی کا کلام کہیں سے نہیں ملا۔ تذکرۂ انتخابِ یادگار میں یہ پانچ شعر ہیں۔ پہلے دو غزل کے اور آخری دو قصیدوں میں سے، جو خلد آشیاں نواب کلب علی خان کی مدح میں کہے گئے ہیں۔

آغوشِ گور تنگ شد از بے قراریم   اے دل! ز پہلوے کہ جدا گشتہ ایم ما
شرم می آید خیالی را بجنگِ آسماں   کایں جوانے ہست و او یک پیرِ دیرینہ سالہ است
چہ احتیاجِ نگہباں، بعہدِ دولتِ او   کہ پاسبانِ جہان است طالعِ بیدار
اگر غلط نہ کنم ناوکش خطا نکند   رہا کند سوے عنقا اگر بعزمِ شکار
غم نیز در خوشی ست، کہ فارغ شدہ ز کار   بر جائے خود بہ بسترِ خواب آرمیدہ است

[انتخابِ یادگار، ۲: ۱۲۷؛ خمخانۂ جاوید، ۴: ۳۷۹-۳۸۸؛
ذکرِ غالب: ۱۴۰-۱۴۲؛ فغانِ دہلی، ۱: ۱۵۵؛ نگار (رامپور)
فروری ۱۹۲۳ء: ۳۱-۴۸]

شاکر — سیّد محمد عبدالرّزاق مچھلی شہری

ان کا خاندان عربی الاصل تھا۔ ان کے آبا و اجداد جزیرۃ العرب سے پہلے غزنی آئے، جہاں اب تک ان کے سلسلے کی ایک خانقاہ موجود ہے۔ غزنی سے ان کے مورث قاضی ثناالدین نام شاہان شرقی (جونپور) کے زمانے میں وارد ہندستان ہوئے اور یہاں حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ بعد کو اس خاندان کی دو شاخیں ہوگئیں: ایک پھلواری شریف جالسی، اور دوسری مچھلی شہر میں۔ شاکر کا تعلق اسی موخرالذکر شاخ سے ہے۔ ان کے والد کا اسم گرامی سیّد عبدالوہاب تھا۔ شاکر ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ (مارچ ۱۸۳۵ء) میں پیدا ہوئے۔

شاکر عربی، فارسی کے فاضل تھے، جیسا کہ غالب کے ان کے نام کے خطوں سے بھی معلوم ہوتا ہے دونوں زبانوں میں بے تکان لکھتے اور گفتگو کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ علم انساب کے بھی بڑے عالم تھے۔ انھیں اپنے نسب کے تحفّظ کا بیحد خیال تھا۔ اپنا نسب نامہ بڑی کاوش سے جمع کیا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر عراق اور عرب اور افغانستان آدمی بھیج کر بصرفِ کثیر معلومات فراہم کیں؛ اور اس موضوع پر کچھ رسالے بھی مرتّب کیے تھے۔ چونکہ حضرت جعفر طیّار اور حضرت فاطمۃ الزّہرا بنت رسول اللہ صلعم کی بڑی صاحبزادی حضرت زینب کی نسل سے تھے، اسی لیے کبھی کبھی اپنے نام کے ساتھ جعفری الحیدری یا جعفری الزینبی لکھا کرتے تھے۔ اپنی غزلوں کے بعض مقطعوں میں بھی اس نسب کی طرف اشارہ کیا ہے:

اڑ کے میں پہونچونگا شاکر خلد میں — نسل سے ہوں جعفرِ طیّار کی

خاندانِ شاکرِ بیکس نہ کیوں مظلوم ہو — آلِ زینب ہے، اسے میراث زینب چاہیے

اس کے علاوہ حضرت غوث اعظم سیّد عبدالقادر جیلانی سے بہت عقیدت تھی۔ ایک شعر

میں کہتے ہیں:

محو بودم در تلاشِ کعبۂ امن و اماں — کو حش اللہ، آستانِ شاہِ جیلاںؒ یافتم

اسی غلو کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی وصیت میں لکھ گئے کہ میری اولاد میں سے کوئی فرد کسی غیر ہاشمی خاندان میں رشتۂ ازدواج قائم نہ کرے۔

۱۸۶۳ء میں وکالت کا امتحان دیا۔ اور اس میں کامیابی کے بعد گورکھپور میں وکالت شروع کی۔ اسی لیے غالب نے ایک خط میں اشرف الوکلاء کہہ کے خطاب کیا ہے۔ ۱۸۷۱ء میں گورکھپور سے الہ آباد منتقل ہو گئے۔ ۱۸۷۳ء میں سرکاری ملازمت قبول کر کے منصف بن گئے اور ترقی کر کے پہلے سب ججی اور پھر عدالتِ خفیفہ کی ججی کے عہدوں پر مامور رہے۔ دورانِ ملازمت میں بہت دن تک الہ آباد میں قیام رہا۔ یہیں غالب کے دوست اور مہربان خواجہ غلام غوث خان بہادر بیخبر[۵] سے ملاقات ہوئی۔

---

۵ خواجہ غلام غوث خان بیخبر، نجیب الطرفین خواجہ حضور اللہ بن خواجہ خیر الدین کشمیری کے بیٹے تھے، دادھیالی سلسلۂ نسب سلطان زین العابدین والیِ کشمیر تک پہنچتا ہے۔ ناںھیال کی طرف سے خواجہ داؤد خاکیؒ ان کے اجداد میں سے تھے۔ ان کے بزرگ خاندانِ مغلیہ کے زمانے میں بالعموم قضا کے عہدوں پر فائز رہے۔ جب ملازمت کا سلسلہ ہاتھ سے جاتا رہا تو تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔

بیخبر ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء میں نیپال میں پیدا ہوئے۔ چار برس کے تھے جب ان کے والد نقل مکان کر کے ہندستان آئے اور بنارس میں سکونت اختیار کی۔ چنانچہ بیخبر کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت اسی شہر میں ہوئی۔ پہلے لفٹنٹ گورنر غرب و شمال کے نائب میر منشی اور بعد کو میر منشی ہوئے۔ ۴۴ برس تک نیکنامی سے ملازمت کرنے کے بعد ۱۸۸۵ء میں پنشن پائی۔ "خان بہادر" اور "ذوالقدر" خطاب ملے۔ اردو سے کم اور فارسی سے زیادہ شغف تھا۔ فارسی نظم و نثر کا ایک مجموعہ "خونابۂ جگر" کے نام سے اور اردو خطوط "فغانِ بیخبر" (۱۸۹۱ء) کے نام سے ان کی زندگی میں چھپے۔ بقیہ کلامِ نظم و نثر ان کی وفات کے بعد ایک عزیز مولوی خواجہ حسین الدین بنارسی نے "رشکِ لعل و گہر" کے عنوان سے ۱۹۰۸ (۱۳۲۶ھ) میں شائع کیا تھا۔ ۱۸ شوال ۱۳۲۲ھ (۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء) کو الہ آباد میں انتقال کیا۔ وہیں حسن منزل کے قبرستان میں اپنی والدہ کی پائینتی دفن ہوئے۔ لوحِ مزار پر جو قطعۂ تاریخ ہے، اس کا آخری شعر ہے:

(بقیہ اگلے صفحے پر)

۱۸۹۴ء میں علی گڑھ میں تھے، جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد وہیں سکونت اختیار کر لی۔ تقریباً اسّی برس کی عمر میں، جون ۱۹۱۴ء میں اپنے وطن مچھلی شہر میں انتقال کیا۔ طلبِ علم اور علم دوست اصحاب سے استفادہ کا شوق آخیر تک نہیں چھوٹا۔ آخری ایام میں جب کہ کان آنکھ بالکل جواب دے چکے تھے، کتاب پڑھوا کر سنتے اور احباب کی خاطرداری میں مشغول رہتے۔ جسمانی یادگار تین صاحبزادے چھوڑے۔ سب سے بڑے سید محمد تقی تھے۔ یہ بھی تعلیم پوری کر کے سرکاری ملازم ہو گئے تھے؛ آخیر عمر میں ریاستِ جے پور میں نو برس تک وزیرِ مال رہے اور وہیں ۱۹۲۲ء میں انتقال فرمایا۔ ان سے چھوٹے سید علی نقی علی گڑھ میں ایڈوکیٹ اور مسلم یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر تھے؛ یہ ۱۹۲۳ء میں جنت سدھارے۔ سب سے چھوٹے محمد ہادی (ہادی مچھلی شہری) شاعر تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ اُردو مجموعہ کلام "نوائے دل" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ ان کا اواخر ۱۹۶۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ لیکن کبھی دیوان مرتّب کرنے کا خیال نہیں کیا۔ اس لیے چند غزلوں کے سوا سارا کلام ضائع گیا۔ ان ہی کا انتخاب درجِ ذیل ہے۔ پہلے فارسی سنیے، جس میں نمک زیادہ ہے:-

غالب کی مشہور غزل ہے ؎

دُودِ سودائی تتق بست آسماں نامیدمش — دیدہ بر خوابِ پریشاں زد، جہاں نامیدمش

اسی زمین میں شاکر کی ایک غزل ہے۔ اس کے چند شعر ہیں:

سر بمن دادند و من بارِ گراں نامیدمش — سُود ایں عالم نمودندم، زیاں نامیدمش
من سرودم نغمۂ وصفت ہزار آواشدم — غیر در مدحِ تو دم زد، باد خواں نامیدمش
روز بیم صدرہ بہ یُمنِ میہماں چوں دست داد — خویش را مہماں نوشتم، میزباں نامیدمش
حضرتِ دہلی مقامِ حضرتِ غالب چو شد — غیرتِ شیراز و رشکِ اصفہاں نامیدمش

(بقیہ گزشتہ) خوانش دیدہ گفت کہ ایں نو رسیدہ کیست — گفتند حوریانِ جناں "خواجۂ بہشت" (۱۳۳۲ھ)

(بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ بیخبر دائرہ شاہ محمدی، الٰہ آباد میں دفن ہوئے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ صحیح قبرستان حسن منزل ہی ہے)۔ (صحیفۂ زرّیں (آگرہ اودھ): ۱۰۳-۱۰۵؛ خمخانۂ جاوید، ۱: ۶۴۷-۶۴۸؛ انشائے بیخبر (دیباچہ)؛ مکتوب جناب جلال الدین مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۶۹ء از الٰہ آباد)

مولوی غلام امام شہید کا ایک بہت مشہور شعر ہے:

ہر کجا تخمِ محبت کاشتیم — خاک ہم برباد رفت و دانہ ہم

اسی زمین میں شاکر کی غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

بادہ ہست و شیشہ و پیمانہ ہم — کاش بودے ساقیِ مستانہ ہم
ہر یکے در دورِ چشمش شد خراب — میفروش و میکش و پیمانہ ہم
در شبِ ہجرِ تو داغِ دل گم است — شد خموش امشب چراغِ خانہ ہم
ہر کسے در عشقِ تو، از من برید — آشنا ہم، خویش ہم، بیگانہ ہم

دید شاکر ابروے خمدارِ یار
شکر کرد و سجدۂ شکرانہ ہم

قدسی کی مشہور نعت کی تضمین لکھی تھی، جس کی تعریف غالب نے اپنی اور آزردہ کی طرف سے لکھی ہے؛ یہ مجموعہ "حدیثِ قدسی" میں بھی شامل ہے۔ اور چند شعر ملاحظہ ہوں:

جبہہ اش را غیرتِ خورشیدِ تاباں یافتم — چشم را چشمک زنِ چشمِ غزالاں یافتم
خالِ مشکین ست بر لعلِ لبِ جاناں مقیم — زنگیے را حارسِ شہرِ بدخشاں یافتم

آفتابِ حشر باشد روے تو — نامۂ اعمالِ من گیسوے تو
مرحبا بر زخمِ دامن دارِ من — آفریں بر قوتِ بازوے تو
مثلِ خسرو گشت شاکر را ہمیں — "غمزۂ تو، چشمِ تو، ابروے تو"

بادہ و معشوق ایمانِ من است — مے پرست و بت پرستم یا علی
بادۂ وحدت مرا از خود ربود — سرخوشِ عہدِ الستم یا علی
نیست شاکر نشۂ افلاسِ تو — از ازل من فاقہ مستم یا علی

بے مہری و بے لطفی و کج خلقی و نفرت — کیا کیا نہ مرے یار نے اغیار سے سیکھا
گرنا کبھی، اٹھنا کبھی، رہ رہ کے چمکنا — بجلی نے مری آہِ شرر بار سے سیکھا

بادہ پیمائی میں مجھ سا رندِ مشرب چاہیے — قلزمِ مے میرے ساغر میں لبالب چاہیے

تاک میں ہوں ساغرِ سرشار کی — اس میں کیفیت ہے چشمِ یار کی
ہیچ ہے دنیا، ولے با ایں ہمہ — دھوم ہے عالم میں اس مردار کی

[اردوے معلّی (ماہنامہ) دسمبر ۱۹۱۲ء؛ مکتوبات ہادی مچھلی شہری بنام مؤلف۔]

شائق ــــ شاہ سردار گیلانی

یہ سیّد محمد شاہ گیلانی متوطّن لاہور کے بیٹے تھے۔ زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے؛ صاحبِ دیوان تھے۔ غالباً ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) مں انتقال ہوا۔

ندید از عشق خالی لامکاں را ہم نگاہ [کردم]
خدا ہم نیست بے معشوق، پیغمبر گواہ [کردم]

تشبیہ ... کاکلِ پُرپیچ و تاب کی
تصویر کیا کھنچی ہے مرے اضطراب کی

[تذکرۂ بشیر بحوالہ "مضمون" غالب اور تلامذۂ غالب"، از مشفق خواجہ مشمولہ اردو سہ ماہی، کراچی، ۴۵: ۱: ۲۳۸ - ۲۳۹]

شائق ـــــ سیّد شاہ عالم مارہروی

ان کے اجداد زیدی سیّد تھے۔ ان میں سے سید حسین حکومتِ وقت کے خلاف اظہار نارضامندی کے لیے بطور احتجاج ترکِ وطن کر کے واسط (عراق) میں آمقیم ہوئے۔ ان کی اولاد میں سیّد ابوالفرح واسطی سب سے پہلے محمود غزنوی کے ساتھ ہندستان آئے، لیکن مختصر قیام کے بعد وطن واپس چلے گئے۔ اس کے بعد ان کے پوتے سیّد محمد جعفری خاندانِ غلامان کے دوسرے بادشاہ التتمش (۱۲۱۱ - ۱۲۳۶ء) کے عہد میں واردِ ہندستان ہوئے۔ وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید تھے۔ التتمش نے انھیں بلگرام اور ملحقات کا علاقہ جاگیر میں عطا فرمایا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے اہل و عیال کو بھی واسط سے یہاں بلا لیا اور یوں یہ خاندان مستقلاً یہیں کا ہو گیا۔ میر عبدالواحد بلگرامی کے زمانے تک خاندان بلگرام ہی میں قیام پذیر رہا۔

سب سے پہلے جو صاحب بلگرام سے نکلے، وہ میر عبدالواحد کے بڑے صاحبزادے سیّد عبدالجلیل بلگرامی تھے۔ انھوں نے عہدِ جہانگیری (۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ء) میں بلگرام کو خیرباد کہہ کے مارہرہ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں ان کی خاصی آؤ بھگت ہوئی۔ ان کے معتقدین نے ان کے لیے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرادی، یہیں ان کی دوسری شادی بھی ہو گئی۔ ان کے انتقال (۸ صفر ۱۰۵۷ھ / ۵ مارچ ۱۶۴۷ء) کے بعد ان کی بلگرامی بیوی کے فرزند سیّد شاہ اویس سجّادہ نشین ہوئے۔ ان کی اولاد مارہرہ میں آج تک موجود ہے۔

شاہ اویس کے بڑے صاحبزادے شاہ برکت اللہ بڑے پایہ کے بزرگ ہوئے۔ ایک کثیر تعداد نے ان سے رُشد و ہدایت حاصل کی۔ شاہانِ وقت نے بھی ہر طرح سے عقیدت و

ارادت کا اظہار کیا۔ عوام و خواص کا بڑا طبقہ ان کے مریدوں میں شامل ہو گیا۔ محمد شاہ بادشاہ نے انھیں متعدد دیہات خانقاہ کے خرچ کے لیے معافی میں دیے۔ شاہ برکت اللہ اپنی روحانی صلاحیتوں کے علاوہ شعر کا بھی شوق رکھتے تھے۔ فارسی میں تخلص عشقی تھا اور ہندی میں پیمی۔ دونوں زبانوں میں قلمی دیوان ان کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ ان کا یوم عاشورہ محرم ۱۱۴۲ھ (۲۵ جولائی ۱۷۲۹ء) کو انتقال ہوا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ شاہ آل محمد بڑے اور شاہ نجات اللہ عرف شاہ میاں چھوٹے۔ مارہرہ میں اس خاندان کی دو درگاہیں ہیں۔ سرکار کلاں اور سرکارِ خرد؛ یہ بالترتیب انھیں دونوں حضرات سے منسوب ہیں۔

سید شاہ نجات اللہ ۱۱۱۷ھ (۰۶-۱۷۰۵ء) میں بلگرام میں پیدا ہوئے اور یکم شوال ۱۱۹۰ھ (۱۳ نومبر ۱۷۷۶ء) کو مارہرہ میں فوت ہوئے۔ ان کا عقدِ نکاح اپنے چھوٹے چچا سید شاہ رحمت اللہ کی بیٹی سے ہوا تھا؛ اولاد میں سید امام عرف شاہ گدا اور سید شاہ مقبول عالم عرف شاہ سوندھا اور ایک صاحبزادی ہوئے۔ ان کے علاوہ حرمہاے مختلفہ سے پانچ بیٹے اور تھے۔ لیکن سجادہ نشینی کا حق خاندانی بیگم کی اولاد یعنی دونوں مندرجہ صدر صاحبزادگان ہی کو ملا۔

شاہ سید امام کی ولادت ۱۱۳۸ھ (۲۶-۱۷۲۵ء) میں ہوئی اور وفات ۱۲۰۵ھ میں (۹۱-۱۷۹۰ء) انھوں نے اپنے پیچھے دو بیٹے چھوڑے۔ سید شاہ برکات بخش بھکاری صاحب اور سید نجات بخش فقیر صاحب۔

چھوٹے صاحبزادے سید مقبول عالم شاہ سوندھے ۱۱۴۰ھ (۲۸-۱۷۲۷ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کے صرف ایک بیٹا سید مخدوم عالم پیارے صاحب اور ایک بیٹی تھی۔ ۲۹ شعبان ۱۲۱۳ھ (۵ فروری ۱۷۹۹ء) ان کی تاریخ وفات ہے۔ ان کے بعد سید مخدوم عالم شاہ سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے: سید سلطان عالم اور سید صاحب عالم۔ یہی وہ سید صاحب عالم ہیں جن کے نام غالب کے خطوط عودِ ہندی اور اردوے معلّیٰ میں موجود ہیں۔ یہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ[۵] (۲۹ اکتوبر ۱۷۹۶ء) کو بلگرام میں پیدا ہوئے؛

۵ یہ "خاندانِ برکات" کی روایت ہے، جو خود ان کے خاندان کے ایک فرد کی تالیف ہے۔ اس کے مقابلے میں تذکرہ خازن الشعرا میں تاریخ ولادت ۱۶ ربیع الثانی ملتی ہے۔

لفظ "تاریخ" سے سالِ ولادت (۱۲۱۱ھ) نکلتا ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ غالب کو لکھا کہ میری پیدایش کا سال لفظ "تاریخ" سے برآمد ہوتا ہے، تو چونکہ غالب کی اپنی تاریخِ ولادت ۱۲۱۲ھ تھی انھوں نے لکھا:

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا
ان کی "تاریخ"، میرا "تاریخا"
(۱۲۱۱) (۱۲۱۲)

سیّد صاحب عالم کا عقدِ نکاح سیّد نجات بخش فقیر صاحب (بن سیّد شاہ گدا صاحب) کی دختر زینک اختر سے ہوا تھا۔ ان سے آپ کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹوں کے نام ہیں: شاہ سیّد عالم۔ سیّد شاہ عالم، سیّد مقبول عالم۔ یہی منجھلے ہمارے صاحب ترجمہ سیّد شاہ عالم شائق ہیں۔ غالب کے خطوں میں تینوں بھائیوں کا ذکر بار بار آیا ہے۔

سیّد صاحب عالم کی بڑی بیٹی سیّد عبدالحی عرف سیّد احمد بلگرامی سے منسوب ہوئیں۔ غالب کے ایک اور مشہور شاگرد سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی اسی بیٹی کی اولاد تھے۔

سیّد صاحب عالم شاعر بھی تھے۔ صاحب تخلص تھا۔ اردو میں کم اور فارسی میں زیادہ کہا اور اس فن میں میرزا محمد حسن قتیلؔ کے علاوہ اپنے ماموں سیّد افتخار علی بلگرامی ذرّہ تخلص سے مستفید ہوئے۔

قتیل پیدائشی ہندو تھے۔ اصل نام دیوانی سنگھ تھا۔ بعض لوگوں نے کائستھ لکھا ہے، حالانکہ وہ بھنڈاری کھتری تھے۔ والد کا نام درگاہی مل اور بزرگوں کا وطن بٹالہ (ضلع گورداسپور، پنجاب) تھا۔ قتیل کے پردادا نقلِ مکان کرکے باغپت چلے آئے تھے۔ قتیل ۱۱۷۰ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے اور ۱۴ برس کی عمر میں مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کی تعلیم سے متاثر ہو کر فیض آباد میں اسلام قبول کیا۔ مرزا محمد حسن نام ہوا۔ دو برس تک اسے مخفی رکھ کر ۱۷ برس کی عمر میں اعلانِ عام کر دیا۔ اپنے استاد شہید کی رعایت سے قتیل تخلص اختیار کیا۔ کچھ مدّت کے لیے نواب سعادت علی خاں کی سرکار کے متوسلین میں شامل رہے، نو امامیہ مذہب کے پیرو بن گئے۔ بمرضِ استسقاء بروز شنبہ ۲۳ ربیع الاوّل ۱۲۳۳ھ (۳۱ جنوری ۱۸۱۸ء) لکھنؤ میں بوقتِ صبح انتقال کیا۔ نساخ نے تاریخ کہی:

سالِ ترحیلِ قتیل اے نسّاخ گفتہ ام "شہرۂ آفاق قتیل" (۱۲۳۳ھ)

متعدد کتابیں لکھیں، جن میں سے رقعات اور چار شربت اور نہر الفصاحت زیادہ مشہور ہیں اور مدّتوں درس میں شامل رہیں۔ انشاء کی دریائے لطافت کی تصنیف میں بھی شامل رہے۔ مصحفی کے

سے بھی اصلاح لی۔ ۷۷ برس کی عمر میں ۲ محرم ۱۲۸۸ھ (۲۴ مارچ ۱۸۷۱ء) کو مارہرہ میں انتقال کیا اور وہیں درگاہ شریف کے گنبد میں غربی جانب دفن ہوئے۔ شاہ علی احسن، احسن مارہروی مرحوم ان کے پرپوتے تھے۔

افسوس کہ سید شاہ عالم کے زیادہ حالات نہیں ملے۔ وہ ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۲۰ اکتوبر ۱۸۸۵ء / ۱۱ محرم ۱۳۰۲ھ کو ہوا۔ لاولد فوت ہوئے۔ یہ بھی اپنے والد کے پہلو میں غربی دالان میں مدفون ہیں۔

ان کے بھانجے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی (شاگردِ غالب) کے ہاں ۹ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ کو صاحبزادہ ہوا، جس کا نام نور احمد رکھا گیا تو اس کی تاریخ ولادت کہی:

چوں نشوم شاد، کہ ناگہ زشرق — مژدہ رساں پیکِ صبا آمدہ
گفت، کہ در خانۂ شمس الضحیٰ — رشکِ سُہا، بدر الدجیٰ آمدہ
ہاں بوجود آمدہ پورِ صفیر — گو ہمہ تن ذہن و ذکا آمدہ
شائق شاداں پےِ تاریخِ طفل — گفت: "زہے شمس ضحیٰ آمدہ"

(لطف یہ ہے کہ خود صفیر کا تاریخی نام شمس الضحیٰ ہے)

[جلوۂ خضر، ۲: ۲۰۷، خاندانِ برکات: ۲۳ - ۳۴، قاموس المشاہیر ۲: ۲۵؛ غالب اور عصرِ غالب: ۱۱۱ - ۱۲۱؛ اردو ادب (اکتوبر، دسمبر ۱۹۵۴ء): ۱۱۳]

(بقیہ) بھی بہت گہرے دوست تھے۔ مصحفی نے تذکرہ عقدِ ثریا انھیں کی فرمایش پر لکھا تھا۔
دانشِ عشق: ۵۴۸ - ۵۵۰ ب؛ عقدِ ثریا: ۴۶؛ شمع انجمن: ۳۹۰ - ۳۹۱؛ خلاصۃ الافکار: ۵۷۳)

شائق ــــ خواجہ فیض الدین حیدر عُرف حیدر جان جہانگیر نگری

معززّ خاندان کے فرد، خواجہ خلیل اللہ خان کشمیری کے بیٹے[۵] اور جہانگیر نگر (ڈھاکہ) کے رہنے والے تھے۔ سر عبدالغنی سے بھی عزیزداری تھی۔ غالباً دلی اور کلکتے بھی آئے تھے، اور ممکن ہے کہ غالب سے ان کے قیام کلکتہ کے دوران میں ملاقات بھی ہوئی ہو۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ایک مختصر دیوان یادگار چھوڑا تھا، جواب نہیں ملتا۔ خطوط کا بھی ایک مجموعہ قلمی صورت میں موجود ہے۔

تجھے عرش کا جس نے تارا بنایا ‏ اسی نے بد اختر ہمارا بنایا
اُسی نے کیا ہم کو رسوائے عالم ‏ کہ جس نے تجھے عالم آرا بنایا
یہاں نالۂ بے اثر ہم کو بخشا ‏ وہاں دل ترا سنگِ خارا بنایا
دیا درد وہ ہم کو گردوں نے شائقؔ! ‏ کہ تدبیر جس کی، نہ چارا بنایا

جس کی ٹھوکر سے جی اُٹھے مُردے ‏ اس کی رفتار نے ہمیں مارا
یوں یہ تنِ خراب بنا، اور بگڑ گیا ‏ جیسا کہ بس حباب بنا، اور بگڑ گیا

مری فسق و فجور میں عمر کٹی، کوئی حسنِ عمل تو کیا ہی نہیں
یہی فکر ہے دیکھیے کیا ہو وہاں، بجز اس کے تو اور پناہ ہی نہیں

کوئی رفتۂ ملکِ عدم نہ پھرا، کہ جو پوچھوں وہاں کا میں حال ذرا
ہے مقام عجب، کہ وہ کیسی ہے جا، جو گیا سو وہاں سے پھرا ہی نہیں

مجھے بھائی تھی دستِ جنوں کی فضا، مرے دل میں بھرا وہ ذوق و مزا
گئے باغِ جنوں میں جو ایک ذرا، دلِ شائقِ خستہ لگا ہی نہیں

---

۵ نسخۂ دلکشا میں والد کا نام خواجہ علیم اللہ لکھا ہے، جو غلط ہے۔

کیا کہیں تجھ بن کیا کیا ہم نے ساری رات کی
انتظاری، بیقراری، آہ وزاری رات کی
یاد میں اس سرو قامت کے یہاں تک روئے ہم
جیسے خوں چشموں سے شائق! ہم نے جاری رات کی

صبا! اس سے کہیو کہ تجھ کو خبر ہے
بہت حال شائق کا تیرے بتر ہے
ہوا خواہ تھا میں کبھی جس چمن کا
یہ اڑتی سی پہنچی وہاں کی خبر ہے
نہ چلتی تھی جس جا نسیم سحر بھی
صبا کا وہاں آج شائق گذر ہے

شیشہ گر کیا ہے بنا تجھ سے جو پتھر شیشہ
اشک کا اس سے بناتا ہوں میں بہتر شیشہ

مت لے خدا کے واسطے خنجر ہاتھ میں
دل کو ہمارے پہلو سے لے چیر ہاتھ میں
سودا ہے اس کی کاکل پیچاں کا سر میں آہ
ہو زلف یار کی مری زنجیر ہاتھ میں

فارسی کا نمونہ یہ ہے۔ پہلے حافظ کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو:

چند گویم شکوۂ آرام را
چند نالم بخت نا فرجام را
مطربا جنبش کہ یا ہم کام را
ساقیا برخیز و در دہ جام را
خاک بر سر کن غم ایام را

ایک قصیدہ کے چند شعر ہیں، جو نواب سر عبد الغنی بہادر کے فرزند رشید نواب سر احسن اللہ بہادر کی ولادت پر لکھا تھا:

للہ الحمد، کہ آمد بجہاں عہد بہار
خرم و شاد و ہمہ تازہ و تر شد گلزار
از سما تا بہ سمک ہست ہجوم اقبال
ہمچو عنقا شدہ معدوم وجود ادبار
نازد از زادن او مادر گیتی بر خود
فخر صد فخر زماں راز وجودش پندار
ہر زماں گرد سرش چرخ بلا گرداں ست
ہست از بہر ہمیں گردش چرخ دوار
فکر تاریخ چو کردیم "امیر اعظم"
۱۲۶۲
ایں ندا آمدہ از غیب بگوش من زار

مسیح جہان است و جان منست ایں
ہمانا کہ روح و روان منست ایں
نہ پرسید گاہے ز حال درو نم
ادائے محبت بد گمان منست ایں
ہمیں بس بود خوں بہا، بعد قتلم
بفرما کہ "از کشتگان منست ایں"

[سخن شعرا: ۲۴۱؛ مشرقی بنگال میں اردو: ۳۰-۳۳؛ مشرقی پاکستان کے اردو ادیب: ۲۵-۲۹؛ نگارستان سخن: ۴۵؛ سراپا سخن: ۱۹۷؛ تواریخ ڈھاکہ: ۲۳۷؛ نسخۂ دلکشا: ۱۴۱؛ آثار غالب]

شررؔ ــــ سید محمد علی دہلوی

نصیر الدین نقش حیدر آبادی اپنے تذکرے "عروس الاذکار" (مرتبہ ۱۲۹۲ھ) میں لکھتے ہیں:

شررؔ تخلص سید محمد علی ابن میر ولایت علی ساکن دہلی، شاگرد اسد اللہ خان غالب، وارد حیدر آباد شدہ بود۔ او راست:

اس کے دہن پہ میرا دہن کل کی رات تھا میں مثلِ خضر مالکِ آبِ حیات تھا،

افسر صدیقی امروہوی، کراچی نے اس پر حاشیہ لکھا ہے:

عبد القادر مہر سقاف نے گلزار سخن میں ان کا نام غلام محمد علی لکھا ہے اور ایک غزل نقل کی ہے جس کا مطلع و مقطع یہ ہے:

دیکھا ہوں کسی کے گوہرِ دنداں کو خواب میں
نیساں کا حال ہے مری چشمِ پُر آب میں
راحت ملیگی مجھ کو شرر! زیرِ خاک بھی
مرجاؤں گر میں دوستیِ بوتراب میں

[مضمون "تلامذۂ غالب" از تحسین سروری مشمولہ سہ ماہی صحیفہ، لاہور۔ جولائی ۱۹۷۰ء ص ۵۳]

شفق ـــــ انور الدّولہ، سعید الملک نواب محمد سعد الدّین خان صولت جنگ (عُرف منجھلے صاحب) رئیسِ کالپی

بڑے عالی خاندان کے نام لیوا تھے۔
آصف جاہِ اوّل ان کے جدِّ اعلیٰ تھے، جن کے والد میر شہاب الدّین غازی الدین خان فیروز جنگ نے اپنی زندگی میں اجمیری دروازہ، دلّی کے باہر اپنا مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ اسی عمارت میں بعد کو مشہور مدرسہ غازی الدین خان کی بنیاد رکھی گئی، جو بتدریج ترقی کر کے دلّی کالج کہلایا۔
آصف جاہ اوّل کے پوتے وزیر الملک، عماد الملک میر شہاب الدین خان غازی الدین خان بہادر ثانی تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ نظام تخلص تھا۔
عماد الملک دورِ مغلیہ کے ایامِ زوال و انحطاط کی بہت اہم شخصیّت ہے۔ شاہ احمد شاہ اسی کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوا۔ اس نے بادشاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں اور اسے تخت سے اُتار کر اس کی جگہ عالمگیر ثانی کو بٹھا دیا۔ لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ اس کا سارا اقتدار دربار کی سازشوں کی نذر ہو گیا، اور اسے دلّی سے جان بچانے کی خاطر نکلنا پڑا۔ وہ بھرتپور سے ہوتا ہوا فرخ آباد پہنچا۔ نواب نے کچھ علاقہ جاگیر میں عطا کیا اور یوں قدرے عافیت کا سامان ہو گیا۔ لیکن یہاں کا دانہ پانی بھی زیادہ دن قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ اب کی نکلے تو مرہٹوں کی پناہ میں پہنچے۔ ظاہر ہے کہ دربارِ دلّی اور اس کے امرا کی ریشہ دوانیاں مرہٹوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھیں: یوں عماد الملک کو چین کا سانس نصیب ہوا۔ مرہٹوں نے انھیں کالپی اور کدورہ کا علاقہ جاگیر میں دے دیا جس سے یہ خاندان مستقلاً یہیں کا ہو گیا۔ عماد الملک کا ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰۔ ۱۸۰۱ء) میں انتقال ہوا۔

شفق انھیں عماد الملک کے پر پوتے تھے۔ یعنی عماد الملک کے بیٹے نواب ناصر الدولہ بہادر ناصر تخلص تھے، اور ناصر کے بیٹے نواب احمد بخش خان بہادر بیتاب۔ یہی بیتاب ہمارے صاحب تذکرہ کے والد تھے۔

شفق جس خاندان کے چشم و چراغ تھے، اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کی تعلیم کا معقول انتظام ہوا ہوگا۔ جب شعر گوئی کا شوق ہوا، تو اوّل سید امجد علی قلق[۱] سے مشورہ رہا، بعد کو بذریعۂ خط و کتابت غالب سے اصلاح لیتے رہے، لیکن دونوں میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ شفق نے ۱۲۹۸/ ۱۸۸۰- ۱۸۸۱ء میں انتقال کیا۔ اپنے پیچھے اولادِ جسمانی میں چار بیٹے چھوڑے۔

صاحبِ دیوان تھے۔ دو مثنویاں، "چشمۂ فیض" (۳۸۴ شعر) اور "شعلۂ جانسوز" مطبوعہ ہیں (مطبع مسیحائی، کانپور) حضرت رسول کریم کی مدح میں ایک مولود منظوم "مخزن السعادت" ۱۸۵۳ء میں شائع کیا تھا۔ ایک "قصۂ مہر و ماہ" نظم اردو میں تصنیف کیا تھا (۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۸-۱۸۴۹ء) ان کے علاوہ ایک "مثنوی بہار" بھی تھی؛ اس کی تاریخِ تصنیف میر امجد علی قلق نے کہی تھی:

"بلبلِ طبعِ شفق زد ایں نوا   طرفہ دیرِ حسن و عشق جانفزا"

ان کے چھوٹے بھائی خواجہ نور الدین خان عرف سانولے صاحب بھی شاعر تھے (۱۲۴۴ء) اور شفیق اور فروغ دو تخلص کرتے تھے۔ یہ بھی شفق کی طرح قلق ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ شفق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آرزو دل کی رہا اے شوقِ شہادت نکلی   سخت جانی سے مری خنجرِ قاتل ٹوٹا

ہوا ہے کس سے الٰہی، مقابلہ دل کا   کہ رشکِ ساغرِ جم ہے ہر آبلہ دل کا

ہاتھ دکھلا کے مجھے دیوانہ و مفتوں کیا   ہیں لکیریں یا کہ ہے نقشِ محبت ہاتھ میں

[۱] سید امجد علی قلق جناب سید محمد علی کے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن دہلی تھا۔ لیکن نقلِ مکان کر کے لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے۔ قلق خود کدورہ کابیں میں رہتے تھے۔ کلام پر اصلاح فخر الملک نواب میر منّو بیتاب سے لی۔ صاحبِ دیوان ہیں۔ (سخن شعرا: ۳۸۷)

یاد ہے چشمۂ خنجر کی روانی مجھ کو کر دیا نزع میں کس لطف سے پانی مجھ کو

ایسا تھا شوقِ وادیِ وحشت کہ دوڑ کر بوسے ہمارے آبلوں نے خار کے لیے
یہ ضعف ہے کہ سانس کا لینا محال ہے بارِ گراں ہے روح تنِ زار کے لیے

مقامِ عشق میں غفلت ہے عین ہشیاری کہ رہنمائے زلیخائے زار خواب ہوا

بگولے لیتے ہیں تعلیم مجھ سے، ہرزہ گردی کی
کہ آندھی ہوں میں، صحرائے جنوں کی خاک اڑاتے ہیں

حوصلے دل میں تڑپنے کے ہیں کیا کیا دیکھیے ذبح کر کے رقصِ بسمل کا تماشا دیکھیے

گھر سے وحشت میں نکلتے ہی وطن بھول گئے
یہ فضا دشت کی دیکھی، کہ چمن بھول گئے

[گلستانِ سخن: ۲۸۹ - ۲۹۰؛ سخن شعرا: ۲۴۸ - ۲۴۹، ۲۵۰، ۳۶۶؛ خمخانۂ جاوید، ۵: ۲۰۶؛ نادراتِ غالب، ۱: ۱۶۴؛ ایضاً، ۲: ۱۴۳ - ۱۴۴؛ تحریر غالب نمبر (۱۸): ۱۴۱ - ۱۴۶؛ مکتوب ڈاکٹر حنیف نقوی، بنارس]

شوخی ـــــ مولوی مظفر حسین خیرآبادی

[دیباچۂ دیوانِ اثر (امام الدین خان چشتی)؛ کتاب ہذا: ۳۱]

شوخیؔ، شوخ ـــــــــ نادر شاہ خان رامپوری

ان کے والد محمد ضامن خان، رام پور کے پٹھان تھے، لیکن شوخیؔ دلّی میں پیدا ہوئے۔ مولانا ابو الکلام آزادؔ نے ان کی غالب سے ملاقات اور شاگردی کا دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب میرزا ۱۸۶۰ء میں فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خان بہادر کی دعوت پر رام پور تشریف لے گئے، تو شوخیؔ وہاں موجود تھے۔ یہ غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصلاح کی درخواست کی۔ میرزا کا یہ اصول تھا کہ چونکہ میں دربارِ رام پور کا وظیفہ خوار ہوں، اس لیے رام پور میں والیِ رامپور کی اجازت کے بغیر کسی کو شاگردی میں قبول کرنا ٹھیک نہیں۔ انھوں نے شوخیؔ کو بھی یہی جواب دیا اور ان کے کلام پر اصلاح دینا منظور نہ کیا۔ شوخیؔ اس جواب سے مایوس تو بہت ہوئے، لیکن ہمت نہیں ہارے۔ چند دن بعد جب پھر خدمت میں حاضر ہوئے، تو میرزا نے کہا کہ شراب کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے، اور یہ صرف مراد آباد میں مل سکتی ہے اور ملازموں میں کوئی بھی اس اہم خدمت کے سرانجام دینے کا اہل نہیں۔ شوخیؔ نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ گھر آئے، منّت سماجت کر کے والد سے دام لیے اور ایک کی جگہ پانچ بوتلیں لا کر غالب کی خدمت میں پیش کر دیں۔ جب غالب نے قیمت ادا کرنا چاہی، تو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اگلے دن جب یہ پھر حاضر ہوئے تو میرزا نے پوچھا کہ بھئی، وہ تمھاری غزل کہاں ہے، جس پر تم اصلاح لینا چاہتے تھے! انھوں نے جھٹ سے کاغذ جیب سے نکال کے سامنے رکھ دیا۔ میرزا نے جگہ جگہ اصلاح دی اور ساتھ ساتھ اصلاح کے وجوہ بیان کرتے گئے۔ اس کے بعد جب میرزا دلّی چلے آئے، تو یہ دلّی میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ شوخیؔ نے غالب سے زیادہ استفادہ نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ دس پانچ غزلوں پر اصلاح لی ہوگی۔

شوخی کے علاوہ کبھی کبھی شوخ تخلص بھی کرتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں سررشتہ دارِ بند و بست کی حیثیت سے ڈیرہ دون میں ملازم رہے تھے۔ بعد کو وسطِ عمر میں طلبِ معاش کے لیے بنارس گئے، اور وہاں کلکٹری کے دفتر میں پہلے نائب ناظر اور بعد کو پیشکار مقرر ہو گئے۔ میرزا قادر بخش صابر ان دنوں بنارس میں مقیم تھے۔ شوخی ان سے مشورہ کرنے لگے۔ اس کے بعد کلکتے چلے گئے اور وہاں کچھ تجارت کا سلسلہ شروع کر دیا، مولانا آزاد سے ان کی ملاقات یہیں ہوئی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں وفات پائی۔ متوسط درجہ کا کلام ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

نہ رکھ اے شوخ! حاسد سے توقع شعر گوئی کی
تکلم کا گماں کیا جنبشِ لبہائے الکن پر

کاٹے ہیں کس صفائی سے اس مبتلا کے ہاتھ
جی چاہتا ہے چومیے اس بیوفا کے ہاتھ

مرتے ہی مجھ سے ہاتھ اٹھایا، ہزار حیف!
اٹھے نہ فاتحہ کو کبھی بے وفا کے ہاتھ

ہر ہر سخن میں جان نہ دینے کا ہے گلہ
اک بات آ گئی ہے بتِ خود نما کے ہاتھ

بختِ مراد مثلِ زلیخا جواں ہوا
پیری میں دل لگا کسی یوسف لقا کے ہاتھ

رنگِ حنا گھٹا تو بڑھا، شوخی! اور حسن
اس سیمتن کے ہو گئے گویا طلا کے ہاتھ

بنا کروں کوئی میخانہ، جی میں ہے شوخی!
کہ بعدِ مرگ زمانے میں یادگار رہے

کچھ روز جوانی کے مزے لینے دے، زاہد!
دو چار برس میں تو قیامت نہیں ہوتی

حضرت شوخ ہو رہے ہجر میں مرنے کے قریب
نوجوانوں کو یہ آزار برا ہوتا ہے

[خمخانۂ جاوید، ۵: ۶۶-۶۷؛ نقشِ آزاد: ۳۲۱-۳۲۶؛ یادگارِ ضیغم: ۲۱۳-۲۱۴؛ ماہی صحیفہ، لاہور جولائی ۱۹۷۰ء ص ۵۷]

شوکت ——— نواب یار محمد خان بھوپالی

ان کے والد ماجد میاں فوجدار محمد خان، نواب سکندر بیگم والیۂ بھوپال کے حقیقی ماموں تھے۔ شوکت ۲۷ صفر ۱۲۴۹ھ (۱۶ جولائی ۱۸۳۳ء) کو پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تکمیل مولوی سید محمد عبداللہ متوطن خوشاب (پنجاب) اور اخوند منشی احمد علی صاحب بوہرہ اور مولانا محمد عباس شروانی رفعت سے کی۔ دیگر فنون مثلاً ادب و آداب، طبابت اور تلوار زنی سید علی اکبر خان غازی سے اور سواریِ اسپ و فیل، سکندر محمد خان رسالدار بھوپال سے حاصل کیے۔ غرض کہ استعدادِ علمی کے علاوہ سپہگری میں بھی طاق تھے۔ بڑے جاگیردار اور متموّل ہونے کے باوجود ہمیشہ مقروض اور تنگدست ہی رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حد درجہ کشادہ دست اور مہمان نواز ہونے کے علاوہ بیحد عیش پرست بھی تھے۔ ایسی زندگی کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کفایت نہیں کر سکتا۔

غالب کے تعلقات ان کے والد میاں فوجدار محمد خان سے بہت دوستانہ تھے۔ غالب کے قدیم اُردو کلام کا مجموعہ جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے، انھیں کے کتابخانے سے دستیاب ہوا تھا۔ شوکت نے غالب کے علاوہ ان کے شاگرد مولانا محمد عباس شروانی رفعت سے بھی اصلاح لی۔ شوکت کا انتقال ۱۸ اگست ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ بھوپال ہی میں بیرسیہ روڈ پر نواب یاسین محمد خان کے باغ میں مدفن ہے۔ اس باغ میں مغرب کی طرف یاسین محمد خان کا عظیم الشان مقبرہ ہے۔ اس کے اندر کی قبروں کے زینے کے پاس، نیچے کی طرف جالی دار پختہ قبر ہے۔ قبر پر کتبہ نہیں ہے۔

متعدد تصانیف اپنے پیچھے چھوڑیں۔ جن میں سے زیادہ مشہور دیوانِ شوکت۔ تذکرہ فرح بخش، انشائے نورِ چشم، گلدستۂ نرگس، گلدستۂ رحمت۔ عید گاہِ شوکت، مراسلاتِ شوکت،

چار باغ شوکت، ہفتخوانِ شوکت، قرابادینِ شوکت، بازنامہ، فیل نامہ، فرس نامہ ہیں۔ نظم و نثر کی کتاب شہنشاہ نامہ بھی ان سے منسوب ہے۔ لیکن بعض اصحاب کا خیال ہے کہ یہ ان کی نہیں، بلکہ محمد عباس شروانی رفعت کی تصنیف ہے۔ اس شبہہ کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ تصنیفات سے ان کے مذاق کی بوقلمونی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

یوں ہر اک کوچۂ سفّاک سے باہر نکلا — کوئی بسمل، کوئی زخمی، کوئی مضطر نکلا
آ گئی موت، مگر ہم کو یہ حسرت ہی رہی — دم نہ بیمار کا، عیسےٰ کے قدم پر نکلا

تم نے خرامِ ناز جو اے دلربا کیا — ہر ہر قدم پہ فتنۂ تازہ بپا کیا
یاں ملکِ جان و دل تہ و بالا ہوا کیا — واں آج لامِ زلفِ چلیپا بندھا کیا
دل پہ، جگر پہ، جان پہ کوہ و الم گرا — اس بیوفا سے دل کو لگایا، بُرا کیا
جوں جوں ترقیوں پہ رہی واں بہارِ حسن — یاں دل پہ اپنے داغِ جنوں کا بڑھا کیا
پھونکا ہے سوزِ غم میں دلِ بیقرار کو — پارے کو قائم آگ پہ نامِ خدا کیا
شوکت! نہ کیوں بلند مضامیں ہوں آپ کے — خالق نے تم کو صاحبِ فکرِ رسا کیا

ہست اور نیست میں ہے سب کو کلام — عقل حیراں، دہانِ تنگ میں ہے
تیرِ مژگاں کا جو اثر دیکھا — توڑ ایسا کہاں خدنگ میں ہے!
عشق میں کس کو رنجِ رسوائی — کب کوئی فکرِ نام و ننگ میں ہے

فارسی میں یہ رنگ ہے:

در دلم از آں سرو قد، رفتار می باشد لذیذ — از لبِ شکر فشاں، گفتار می باشد لذیذ
بے محابا، دست ہا انداختن، در گردنم — ایں ادائے طرفہ، اے میخوار می باشد لذیذ
مے ز دستِ دیگرے زہر ست در کامِ دلم
شوکتا جام از کفِ دلدار می باشد لذیذ

[فرح بخش، ۲۸-۳۷؛ آثار الشعرا: ۱۴۰-۱۴۳؛ غالبیات چند عنوانات: ۴۳-۶۱، مکتوب ناوم سیتاپوری بنام مؤلف؛ انشای نورِ چشم؛ شہنشاہ نامہ: ۱۰۵-۱۰۶]

شہابؔ ـــــ شہاب الدّین خان رامپوری

حکیم نصیر الدّین خان کے صاحبزادے تھے۔ تقریباً ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ریاست رامپور میں ایک پلٹن کے حوالدار تھے۔ فنِ طب میں بھی کچھ شُدبُد رکھتے تھے۔

فتنۂ دہر ہو، بیٹھے ہی رہو
گر اُٹھو گے تو قیامت ہو گی

تو بھول گیا ہے مجھے، اے سروِ گل اندام
اک دم میں تری یاد سے غافل نہیں ہوتا

[انتخاب یادگار: ۱۸۵؛ یادگارِ ضیغم: ۳۱۴]

شہیر —— افتخار الشعرا حافظ خان محمد خان رامپوری

مولوی غلام محمد خان خلفِ حافظ غلام حسین خان رام پوری کے صاحبزادے تھے۔ ۱۲۶۲ھ میں نرسنگھ پور کندیلی میں پیدا ہوئے؛ "نورِ چشم راحت جان" تاریخِ ولادت ہے۔ ان کے والد سرکارِ انگریزی میں معزز عہدوں پر ملازم رہے۔ ملازمت کا زیادہ زمانہ صوبجاتِ متوسط کے مختلف مقامات پر تحصیلداری میں گذرا۔ پنشن لینے کے بعد وہ چھندواڑہ میں مقیم ہو گئے تھے اور وہیں کچھ جاداد بھی خرید لی تھی، جو شہیر کو ورثے میں ملی۔

شہیر کو شعر گوئی کا شوق اوائل عمر سے تھا حسنِ اتفاق سے غالب کا سا استاد میسر آگیا اور یہ شعر و سخن کے رموز سے خوب آگاہ ہو گئے۔

شہیر غالب کی وفات کے بعد ۱۸۷۲ء میں بھوپال میں ساٹھ روپے مشاہرے پر ملازم ہو گئے۔ چندے نواب صدیق حسن خان بہادر کے دونوں صاحبزادوں مولوی نورالحسن خان اور مولوی علی حسن خان کے اتالیق رہے، بلکہ مولوی نورالحسن خان کلیم تو بعد کو اپنے کلام پر اصلاح بھی انھیں سے لیتے رہے۔ شہیر کا سرمایۂ ناز ذخیرہ وہ فارسی قصیدے ہیں، جو انھوں نے نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال اور ان کے شوہرِ نامدار امیر الملک نواب صدیق حسن خان بہادر کی مدح میں کہے ہیں۔ وہ نظم و نثر میں غالب کی پیروی کی کوشش کرتے تھے۔

جب ۱۸۷۴ء (۱۲۹۰ھ) میں نواب شاہجہان بیگم کو حکومتِ انگریزی کی طرف سے "تاجِ ہند" (Croun of H,ind) کا تمغہ ملا، تو شہیر نے ایک معرکے کا قصیدۂ تہنیت نذر گزرانا۔ اس پر انھیں ممدوحہ کی طرف سے خطاب "افتخار الشعرا" عنایت ہوا۔ اس قصیدے کا مطلع ہے:

مضمونِ اوجِ عرش، مگر من در آورم خواہم کہ سدرہ را بہ نشیمن در آورم

۱۳۱۸ یا ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۰ - ۱۹۰۱ء) میں بھوپال میں لاولد فوت ہوئے۔ سیفیہ کالج کے متّصل قلندر شاہ کے تکیہ میں مدفن ہے۔

شہیر اگرچہ شروع میں اُردو میں بھی شوق کرتے رہے، لیکن بھوپال آنے کے بعد ان کی توجہ تمامتر فارسی پر مبذول رہی۔ بھوپال میں ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد تھی۔ نواب صدّیق حسن خان کے بڑے بیٹے نورالحسن خان کے نام سے ایک تذکرۂ شعرا بعنوان "طور کلیم" چھپا ہے۔ محمد عبّاس شروانی رفعت (شاگردِ غالب) اپنی بیاض میں لکھتے ہیں کہ یہ تذکرہ دراصل محمد خان شہیر کا لکھا ہوا ہے'۔

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

میں نامدارِ ہجر، عدو کامگارِ وصل
وہ کام کر گیا ہے، تو میں نام کر گیا

پوچھو نہ اہلِ عشق کو، کیا ہیں، کہاں کے ہیں!
اچھے ہیں جس طرح کے ہیں، جو ہیں، جہاں کے ہیں

بزمِ جاناں میں جو جاتا ہوں، تو فرماتے ہیں:
"ایک یہ بھی مرے ایّام کی شامت آئی"

کوئی ہو، ان کی وحشتِ دل کا علاج ہو
اک ہم اگر نہیں، نہ سہی، غیر ہی سہی

فارسی کلام کا انتخاب یہ ہے:

بیطاقتی و ماو دلِ مستمند ما
اے پُر غرورِ ما، بتِ ما، خود پسندِ ما

ہنگامِ وصلِ یار چہ باکے ز چشمِ زخم
در آتشِ فراق بسوزد سپندِ ما

رفعت در اوفتادنِ استادگاں بود
پستی بہ برزخ اَوج فروشد بلندِ ما

آشفتۂ دو زلف محمد شدم شہیر!
مارا ببامِ عرش رساند کمندِ ما

اے فلک! ایں نہ تلافی شبِ ہجراں را
برنگ در باختہ امشب بزبر دستیِ ما

اے شہیر! آہ ز معراجِ وصال افتادیم
آسماں اَوج فروشے ست سرِ پستیِ ما

بروئے خاک، عجب افتادہ ہستم
کہ تازمانہ در افگند بر نداشت مرا

جفائے چرخ، حریفِ دلِ شہیر نشد
قضا بدستِ ستم پیشگاں گذاشت مرا

چمن ترا، زِ دلِ داغدارِ ہجراں گشت
فغاں کہ عشق مرا کشت و در بہاراں کُشت

قتیلِ خنجرِ بیدادِ جاہلاں نہ شدم
شہیر! قطعِ نگاہِ سخن شناساں کُشت

دوش گلچینِ گلستانِ بہارش بودم
گہ بگلشن نگہے، گاہ بداماں نظرے

کاش می ساخت کسے با دلِ سوزاں یک چند
شمع ہم سوختہ آخر ز شبستاں برخاست

آیینہ را در آتشِ غیرت بسوختم
کِش جلوۂ خریدم و حیرت فروختم

نہ گل نہ غنچہ، نہ گلزار را نشاں باقی ست
ز بلبلاں خس و خاشاکِ آشیاں باقی ست

تو باش و شکوۂ بے مہریِ گل، اے بلبل!
بہارِ باغ اگر بگذرد، خزاں باقی ست

گماں مبر، زمن اے سوزِ غم! کہ نادارم
بیا کہ مغز اگر سوخت، استخواں باقی ست

گذشت غالبؒ و رفت از جہاں بہادر شاہ
شہیر باد، کہ نوابؒ قدرداں باقی ست

طبعم ازیں جنوں، بجنونِ دگر کشد
را ہم زخارہ بسوے نیشتر کشد

نمکیں فروش یار و چو دیوانگاں مرا
ایں اضطرابِ دل بسوے رہگذر کشد

اے کہ چشم، بہ تماشاے سراپاے تو شد
حسنِ تو وسوسہ فرماے تمنّاے تو شد

کس ز بزمت نہ رفت امشب بہ سامانے کہ من رفتم
فغاں بر لب، قلق در دل، شکایت بر دہن رفتم

نبود بہر دو عالم بہ ازیں دو کار کردن
زمن اضطراب دیدن، ز تو بیقرار کردن

ہمہ عمر خویش عیشے کہ بخواستم، ندادند
من و زیں پس آرزوے غمِ روزگار کردن

ز کجا کہ سرمہ سازد پے چشمِ یار ما را
کہ فلک نخواست خاکِ سرِ رہگذار کردن

چو صفا دریغ بارشد بحدورتست قانع
کہ تواں شہیر! ما را بدلے غبار کردن

ایجہ سراغِ من بری، در نہ پاش بنگری
چوں منِ خاک پاے را، نعش کجا، مزار کو

[صبح گلشن: ۲۳۰ - ۲۳۸؛ شمع انجمن: ۲۴۹ - ۲۵۱؛ طور کلیم: ۵۹ - ۶۰؛ آثار الشعراء: ۱۴۳ - ۱۴۵؛ غالبیات، چند عنوانات: ۹۸؛ مکتوب جناب نادم سیتاپوری بنام مولف]

ؒ نواب والاجاہ، امیر الملک سیّد محمد صدّیق حسن خان بہادر مراد ہیں۔

شیر ــــ سیّد محمد شیر خان بہاری

قصبۂ بہار شریف کے روساء میں شمار تھا۔ سیّد محجوب شیر صولت رئیسِ اعظم آباد کے خویش تھے۔ انجمن رفاہِ عام بہار کے سکریٹری رہے۔ حج بھی کیا تھا۔ شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ میرزا غالب کے علاوہ وحید الہ آبادی سے بھی مشورہ کیا۔

ہم کو دلیلِ عشقِ حقیقی ہوا مجاز ۔۔۔ آوارگی نے کام دیا خضرِ راہ کا

کس رنگ پر ہے حسن مرے گلعذار کا ۔۔۔ سر سے قدم تک ایک ہے عالم بہار کا
سیماب و برق کو نہیں لاتا خیال میں ۔۔۔ جو حال دیکھتا ہے ترے بیقرار کا

[یادگارِ ضیغم : ۲۰۹ ؛ تاریخِ شعرای بہار : ۱۲۵]

ـہ مولوی وحید الدین محمد وحید خلفِ اوسط مولوی امیر الدین عرف امر اللہ کٹرہ (ضلع الہ آباد) کے رہنے والے تھے ("بیاضِ سخن" میں والد کا نام غلام حسین لکھا ہے، جو ٹھیک نہیں ہے) نہایت عالی اور باوقار خاندان کے نام لیوا تھے۔ غالباً ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً پہلے خود آتش سے اصلاح لی اور پھر شیخ بشیر علی بشیر (شاگردِ آتش) کے شاگرد رہے؛ اپنے زمانے کے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی اور اکبر داناپوری انہی کے نامور شاگرد تھے۔ وحید کی موت نہایت افسوسناک طور پر ہوئی۔

ان کے پڑوس میں ایک شخص گلّو میاں کے مکان میں آگ لگ گئی (رمضان ۱۳۰۹ھ) اور درمیان کے بہت سے مکانوں سے ہوتی ہوئی یہ وحید کے مکان تک پہنچ گئی۔ یہ اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر باہر نکل آئے۔ یہاں انھیں خیال آیا کہ دیوان جو کہ عمر بھر کی کمائی تھی، وہ تو اندر ہی رہ گیا۔ چنانچہ یہ اسے لانے کے لیے واپس چلے گئے۔ جاتے وقت کسی نے انھیں دیکھا نہیں۔ یہ اندر گئے تو مکان دھوئیں سے بھر چکا تھا۔ دیوان ہاتھ میں لیے باہر نکلنے کی کوشش کی، لیکن راستہ نہ سوجھا۔

شیفتہ و حسرتی ــــ نواب محمد مصطفیٰ خان دہلوی

ان کے والد عظیم الدولہ سرفراز الملک، نواب مرتضیٰ خان بہادر، مظفر جنگ بنگش تھے اور والدہ مشہور جرنیل محمد اسمٰعیل بیگ ہمدانی کی صاحبزادی اکبری بیگم تھیں۔ نواب محمد خان بنگش رئیس فرخ آباد اور نواب مرتضیٰ خان کا خاندان دراصل ایک ہی تھا۔ سب سے

(بقیۂ گزشتہ)

جب دیر تک کسی نے انھیں نہ دیکھا، تو ان کی تلاش شروع ہوئی کچھ لوگ مکان کے اندر گئے، تو دیکھا کہ دیوان ہاتھ میں ہے، اور کرسی پر بیٹھے ہیں۔
کٹرہ میں ان ایام میں ایک طبیب حکیم ابوعلی مرزا یعقوب علی تھے۔ فوراً ان سے رجوع کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ۷۲ گھنٹے اسی طرح پڑے رہیں، ہوش میں آجائینگے۔ لیکن ان کا وقت آ گیا تھا۔ اب کیا ہوتا تھا! اس کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔

سرآہ از شعلۂ آہ سوخت   مکرّر ز دلہا۔ بر آمد "دخان"
آ   (۶۵۵ × ۲ - ۱ = ۱۳۰۹)

(یادداشت مولانا ابوسعید ایرانی فتحپوری سعید بر دیوانِ قلمی مملوکہ محمد وسیم خاں شروانی)
یہ حادثۂ جانکاہ شنبہ ۱۱ رمضان ۱۳۰۹ھ (۹ اپریل ۱۸۹۲ء) کو پیش آیا تھا۔ دوسری تاریخ شاہ علیم الہ آبادی کی ہے:

تشنہ کامی گفت تاریخش کلیم!   "جائے پاکش بر لبِ کوثر بود"
(۱۳۰۹)

دیوان کا انتخاب انجمن ترقیِ اردو (ہند) نے "انتخابِ وحید" کے عنوان سے ۱۹۳۹ء میں چھاپا تھا، اس کے شروع میں مختصر حالات بھی ہیں۔

پہلے شیفتہ کے دادا ولی داد خان فرخ سیر کے عہد میں قسمت آزمائی کے لیے بنگشات (کوہاٹ، علاقۂ سرحد) سے واردِ ہندستان ہوئے اور فرخ آباد میں مقیم ہو گئے۔ جب سلطنتِ دلّی میں خلل رونما ہوا تو نواب مرتضیٰ خان، مہاراجا جسونت راے ملکر کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ ایک پلٹن کی کمان، ان کے سپرد ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب لارڈ لیک، ہلکر کی سرکوبی کے درپے تھا۔ نواب مرتضیٰ خان کی کوشش اور حسنِ تدبیر سے یہ لڑائی صلح وصفائی پر ختم ہوئی۔ لارڈ لیک ان کی خدمات سے بہت خوش ہوا، اور ان کے صلے میں انھیں ۱۸۱۳ء میں تین لاکھ سالانہ کی جاگیر ہوڈل وپلول (ضلع گوڑگانواں) حینِ حیات عطا ہوئی۔

نواب مرتضیٰ خان کی بلند ہمتی نے اسی پر قناعت نہ کی اور انھوں نے اگلے ہی سال ۱۸۱۴ء میں جہانگیر آباد (ضلع میرٹھ) کا علاقہ اپنے ہونہار فرزند محمد مصطفےٰ خان کے نام پر خود خرید لیا۔ جو پہلے راجہ کھودس راے کی ملکیت تھا اور مالگزاری ادا نہ کیے جانے کی پاداش میں نیلام ہو رہا تھا۔

جب نواب مرتضیٰ خان کی وفات ہوئی تو ہوڈل وپلول کی جاگیر انگریزوں نے واپس لے لی، لیکن خاندان کی گزشتہ خدمات کا خیال کر کے اس کی جگہ بیس ہزار روپیہ سالانہ زرِ نقد کی صورت میں مقرر کر دیا۔ البتہ جہانگیر آباد کا علاقہ چونکہ نواب مرتضیٰ خان کا اپنا خریدا ہوا تھا، وہ بدستور ان کے خاندان میں رہا۔

نواب مصطفےٰ خان ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم کے تمام مدارج بھی مختلف اساتذہ کی نگرانی میں یہیں طے ہوئے۔ وہ عربی اور فارسی دونوں میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی میاں جی مالامال سے پڑھی، جو اپنے زمانے کے مشہور اہل اللہ میں سے اور ممتاز معلّم تھے۔ حدیث اور فنِ تجوید حاجی محمد نور دہلوی نقشبندی سے حاصل کیے۔ دورانِ حج میں حدیث کے چند سبق شیخ عبداللہ سراج حنفی اور شیخ محمد عابد سندھی سے لیے اور ان سے سند حاصل کی۔

اپنے زمانے کے رئیسوں کی عام روش کے مطابق ان کی ابتدائی زندگی بھی بےراہ روی اور لغزشوں سے پاک نہیں تھی۔ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے ان کے حالات میں نارنول والی رمجو[۵] کا ذکر کیا ہے۔ غالب سے ان کا شراب کا لطیفہ مشہور ہی ہے کہ ایک دن جاڑے کے موسم میں

---

۵ یہ دو بہنیں تھیں: رمجو اور جنگلو۔ دونوں بڑی طرحدار اور یکتاے روزگار تھیں۔ رمجو چندے شیفتہ

سر شام شیفتہ ان سے ملنے کو گئے، تو میرزا اس وقت "ساغر و مینا" سے شوق کر رہے تھے۔ انھوں نے شیفتہ کو بھی دعوت دی۔ انھوں نے جواب دیا: "حضرت! میں نے توبہ کر لی ہے۔" تو غالب بولے: "ارے غضب کیا، کیا جاڑوں میں بھی"۔ اسی زمانے کا شعر ہے:

ماحسرتی! ز شیوۂ غالبؔ گرفتہ ایم آمیختن بہ بادۂ صافی، گلاب را

بہر حال بعد کو "شوقِ صنم" اور "خواہشِ صہبا" تمام منہیات سے توبہ کر لی۔ ۱۸۳۹ء (۱۲۵۴ھ) میں حجِ بیت اللہ کی غرض سے حجاز تشریف لے گئے۔[۵] اس سفر کے حالات انھوں نے فارسی سفر نامہ "ترغیب السالک الی احسن المسالک" میں بیان کیے ہیں؛ اس کا دوسرا فارسی نام "رہ آورد" ہے؛ اس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس سفر میں انھیں مختلف طرح کے حادثے پیش آئے۔ یمن کی بندرگاہ حُدیدہ سے کچھ آگے جہاز ایک زیرِ آب پوشیدہ چٹان سے ٹکرا کر غرق ہو گیا اور تمام مسافر کشتیوں کے ذریعہ ایک قریب کے ویران جزیرے پر اُتار دیے گئے۔ شیفتہ یہاں سے خشکی کے راستے یمن کا علاقہ عبور کر کے حجاز پہنچے

(بقیہ گزشتہ) کے پاس رہی جنگلو میر رحیم مختارکارِ عدالت فوجداری کے گھر پڑ گئی تھی۔ چرخہ والوں (دلی)، میں ان کا عالیشان مکان اب تک موجود ہے؛ مشن اسکول کے برابر والی عمارت ہے۔ یہ ان سے سیٹھ لچھمی نرائن نے خریدی اور موخر الذکر نے بعد کو حکیم احسن اللہ خان بہادر کے ہاتھ بیچ ڈالی۔ رنجو شعر بھی کہتی تھی؛ بزاکت تخلص تھا۔ مرنے کے بعد سلطان جی میں دفن ہوئی۔

[گلشنِ بیخار ۲۲۸ - ۲۲۹؛ چمن انداز، ۱۵۰؛ سخن شعرا: ۵۸۰]

۵ روایت ہے کہ شیفتہ نے اسی سال حج کیا جس سال منشی کرامت علی شہیدی بھی وہاں گئے تھے۔ اور اسی سفر میں شیفتہ کی موجودگی میں شہیدی کا انتقال مدینہ کے باہر ہوا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ مکّہ معظمہ سے مدینہ منوّرہ کے سفر میں دونوں ایک ہی محمل میں تھے۔ شہیدی اسہال کے مریض تھے، اور بہت کمزور ہو رہے تھے۔ ضعف سے غش پر غش آ رہے تھے۔ جب مدینے کا سواد نظر آنے لگا، تو شیفتہ نے ان سے کہا: شہیدی آنکھیں کھولو، دیکھو گنبدِ خضرا سامنے نظر آ رہا ہے۔ شہیدی نے آنکھ کھولی۔ روضۂ مبارک پر نظر ڈالی اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے روضۂ رسول کے درختوں پر جا بیٹھا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(صلائے عام دسمبر ۱۹۲۹ء: ۲۷)

اور زیارتِ بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور آخر دو برس کی غیر حاضری کے بعد ۵ فروری ۱۸۴۱ء (۲۳ ذی الحجہ ۱۲۵۶ھ) کو واپس دلّی پہنچے۔

شیفتہ کو بزرگانِ دین کی خدمت کا شروع سے بہت شوق تھا۔ سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسے شاہ محمد اسحاق محدّث سے بیعت کی۔ ان کے وصال کے بعد شاہ غلام علی نقشبندی (سجادہ نشین و خلیفۂ حضرت میرزا جانِ جاناں مظہر) کے دونوں خلفاء شاہ ابوسعید اور شاہ احمد سعید کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوئے اور ان سے فیوضِ باطنی حاصل کیے۔ آخر میں حضرت شاہ عبدالغنی مجدّدی سے سلسلۂ نقشبندیہ میں سلوک کی تکمیل کی اور انھیں سے مسندِ خلافت لے کر خود صاحبِ اجازت ہوئے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب اپنے مریدوں کو تکمیل کے لیے ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔

---

۵ دلّی میں چتلی قبر سے ترکمان دروازے کی طرف جائیں تو میر جہدی کی خانقاہ کے آگے الٹے ہاتھ کو کوچہ میر ہاشم کے آخری سرے پر شاہ غلام علی کی خانقاہ ہے۔ ان کا اصلی نام شاہ عبداللہ تھا۔ لیکن مشہور شاہ غلام علی کے نام سے ہوئے۔ نسباً ساداتِ علوی میں سے تھے۔ اصلی وطن بٹالہ (ضلع گورداسپور، پنجاب) تھا۔ آپ کے والد شاہ عبداللطیف، شاہ ناصرالدین قادری کے مُرید تھے (جن کا مزار شیدی پورے، دہلی میں محمد شاہی عیدگاہ کی پشت پر ہے) شاہ غلام علی ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ ولادت "مظہرِ جُود" ہے۔ ۲۰ برس کے تھے کہ بٹالہ سے دلّی پہنچے اور میرزا جانجاناں مظہر کی بیعت کی۔ اور ان کی وفات کے بعد سجّادہ نشین ہوئے۔ تمام عمر قناعت اور توکل سے بسر کی اور قرآن اور حدیث اور فقہ کا درس دیتے رہے۔ خود سندِ حدیث حاجی محمد افضل سے لی تھی، جو میرزا مظہر کے بھی حدیث میں استاد تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، علی تخلص تھا۔ تصوّف میں ایک کتاب "سیدالمرشدین" بھی آپ سے یادگار ہے۔ شنبہ ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ (۱۶ اکتوبر ۱۸۲۴ء) کو واصلِ حق ہوئے۔ اسی خانقاہ میں اپنے مرشد میرزا مظہر کے پہلو میں دفن ہیں۔ "نور اللہ مضجعہ" تاریخِ وفات ہے۔

ان کے خلیفہ شاہ ابوسعید مجدّدی، حضرت مجدّد الف ثانی سرہندی سے پانچویں پشت میں علم قرأت و تجوید میں یکتائے زمانہ تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے ملنے اور قرآن سننے کو آتے تھے۔ حج سے واپسی پر شنبہ یکم شوّال ۱۲۵۰ھ (۳۱ جنوری ۱۸۳۵ء) کو ٹونک میں وصال ہوا۔ نعش دلّی آئی اور اب شاہ غلام علی کے پہلو میں محوِ خواب ہیں۔ "بنور اللہ مضجعہ" سے تاریخ نکلتی ہے۔ ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے احمد سعید صاحب سجّادہ نشین ہوئے "مظہرِ یزداں" تاریخِ ولادت ہے۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح کلام اللہ اور حدیثِ رسول کے عاشق تھے۔

شیفتہ بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ ہوا یہ کہ چونکہ جہانگیر آباد غیر محفوظ جگہ تھی، یہ احتیاطاً وہاں سے اٹھ کر اپنے دوست عبداللطیف خان رئیس خان پور کے یہاں آن مقیم ہوئے۔ ٹھاکروں نے موقع دیکھ کر جہانگیر آباد کو لوٹ لیا؛ اور ان کے مکانات کو نذرِ آتش کر دیا، جس میں دوسرے اثاث البیت کے ساتھ ان کا قیمتی کتابخانہ بھی جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔ بارے رام پور کی فوج جو تلنگوں کی گوشمالی کے لیے دلّی جارہی تھی، یہاں سے گزری اور اس کی مدد سے ٹھاکروں کو بے دخل کیا گیا؛ اور یوں جہانگیر آباد پر نواب مصطفیٰ خاں کا دوبارہ قبضہ ہوا۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ان پر مقدمہ قائم ہوا، کہ تم نے اپنی جاگیر کو یوں غیر محفوظ چھوڑ کر گویا باغیوں کی اعانت مجرمانہ کی تھی۔ جاگیر ضبط ہو گئی اور ابتدائی عدالت نے سات برس قید کی سزا دی۔ بارے اپیل میں بری ہو گئے۔

ان کی رہائی کے لیے (نواب والاجاہ امیر الملک) مولوی صدّیق حسن خان (بھوپال) نے بعض انگریزی حکّام کے توسّط سے خاص کوشش کی تھی۔ ان کا مقدمہ مولوی مومن علی خان سندیلوی صدر الصّدور کی عدالت میں تھا۔ نواب صدّیق حسن خان نے ان کے نام سفارشی خط لکھا۔ خدا کے فضل سے شیفتہ رہا ہو گئے، لیکن جائداد ضبط ہو گئی۔ رہائی کے بعد انھوں نے نواب صاحب کو شکریے کا خط لکھا اور لکھا کہ نجاتِ صوری تو ہو گئی، لیکن نجاتِ معنوی ابھی باقی ہے، یعنی جب تک ذریعۂ معاش پیدا نہ ہو زیست محال ہے۔ اس پر نواب صاحب نے دوسرا خط

(بقیہ گزشتہ)

سادی عمر درس و تدریس میں گزاری۔ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہیں ۲ ربیع الاوّل ۱۲۷۷ھ کو وفات پائی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روضے کے قریب دفن ہوئے۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی یعنی شاہ ابو سعید کے دوسرے بیٹے شاہ عبدالغنی صاحب سجّادہ نشین ہوئے، جو اس سلسلۃ الذہب کے لیے بھی باعثِ فخر تھے۔ ۲۵ شعبان ۱۲۳۵ھ (۸ جون ۱۸۲۰ء) کو پیدا ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں مکّہ معظمہ جاکر علمِ حدیث شیخ محمد عابد سندھی سے حاصل کیا اور واپسی پر شاہ محمد اسحاق سے تکمیل کی سند لے کر خود درس دینے لگے۔ مشہور محدّث اور عالم مولانا رشید احمد گنگوہی انھیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد، ہجرت کر کے مدینۂ منوّرہ چلے گئے، جہاں ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں انتقال فرمایا اور اپنے بڑے بھائی شاہ احمد سعید کے جوار میں دفن ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلیہ راجِعُون

(تذکرۂ اہل دہلی: ۱۱-۲۱؛ واقعات دار الحکومت دہلی ۲: ۱۵۳-۱۵۴)

صدر الصدور موصوف کے نام لکھا، تو نصف جاداد بھی واگذاشت ہوگئی۔
مصیبت کس پر نہیں آتی، لیکن بہت کم ہیں، جو اس حالت میں بھی اپنی وضعداری اور آن قائم رکھ سکتے ہیں۔ شیفتہ کے بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس میدان میں بھی فردِ فرید کا مقام رکھتے تھے۔ مثلاً، ۱۸۵۷ء کے ایام میں جب جیل میں تھے، انھوں نے بہت کوشش کر کے اپنے مہربان قدیم ٹربیل صاحب کو بُلا بھیجا، جو پہلے بلند شہر میں کلکٹر اور پھر میرٹھ میں جج رہے تھے اور اب بھی کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ مدّعا یہ تھا کہ صحیح واقعات بتا کے اُن کے ذریعے سے اپنی صفائی کرالیں۔ اتّفاق سے وہ صبح کے وقت پہنچے، جب شیفتہ نمازِ فجر کے لیے نیّت باندھ چکے تھے۔ سورۂ دہر کی تلاوت شروع کی اور باوجود اطلاع کے نیت نہ توڑی۔ ٹربیل صاحب انتظار کے بعد واپس چلے گئے۔
اسی طرح کا اور ان ہی ایام کا ایک اور واقعہ ہے:
ایک دن پاپیادہ بیڑی پہنے سڑک پر جا رہے تھے۔ آسمان کی طرف دیکھ کے فرمایا: "تیری شانِ کریمی کے قربان کہ اتنی ہی سزا دی، ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا۔"
شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ نے ان کے ضبط اور استقلال کا ایک حیرتناک واقعہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ نواب شیفتہ کو مرض سرطان لاحق ہوگیا۔ ڈاکٹر نے عمل جرّاحی تجویز کیا۔ وہ آتا اور ناقص گوشت کاٹتا، جس سے قدرتی طور پر سخت تکلیف اور درد ہوتا۔ اوپر سے دیکھنے والے برداشت نہ کر سکتے، ان کے ماتھے پر بَل بھی نہ آتا۔ ایک دن بڑے صاحبزادے (رشحی) بے اختیار ہو کر رونے لگے تو فرمایا: "میاں! اس جسمِ خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمّتی ہے۔ انسان کو اپنی مصیبت پر صبر کرنا چاہیے۔"
شیفتہ کے غالب سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ غالب کو ان پر ناز تھا؛ وہ ان کی رائے کو خاص وقعت کی نظر سے دیکھتے اور ان کے پایۂ سخن سنجی کے معترف تھے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

غالب بفنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل، تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

ایک دوسری جگہ ان کی مضمون آفرینی اور دقتِ نظر کی یوں داد دیتے ہیں:

غالبؔ ز حسرتی چہ سرایم، کہ در غزل
چوں اُو تلاشِ معنی و مضموں، نکردہ کس

غالب نے اپنے زمانے کے مشہور اور مستند فارسی دانوں کا اپنی ایک غزل میں ذکر کیا ہے، اس میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

هند را خوش نفسانند سخنور، که بود — باد در خلوتِ شاں، مشک فشاں، از دمِ شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی و انگاه — حسرتی اشرف و آزردہ بود، اعظمِ شاں باد
غالبِ سوختہ جاں، گرچہ نیرزد بہ شمار — ہست در بزمِ سخن، ہمنفس و ہمدمِ شاں

جب ۱۸۴۷ء میں غالب پر جو آخانہ قائم کرنے کے سلسلے میں ابتلاء آیا اور وہ چھ ماہ کے لیے قید خانے بھیج دیے گئے، تو یہ شیفتہ ہی کی ذات تھی جس نے دامے، درمے، قدمے، ہر طرح غالب کی خدمت کی۔ حالاں کہ اس زمانے میں میرزا کے بعض نہایت عزیز دوست، اور رشتہ دار بھی پیٹھ دکھا گئے تھے۔ غالب نے قید کے دوران میں جو تاریخی نظم لکھی تھی، اس میں شیفتہ کی ان خدمات کا پرزور اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

خود چرا خوں خورم از غم، کہ بہ غمخواری من — رحمتِ حق، بہ لباسِ بشر آمد، گوئی
خواجۂ ہست دریں شہر، کہ از پرسشِ وے — پایۂ خویشتنم، در نظر آمد، گوئی

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است
گر بمیرم، چہ غم از مرگ، عزادارِ من است

غالب نے ان کی مدح میں ایک مستقل قصیدہ بھی لکھا تھا، جو ان کے فارسی کلیات میں موجود ہے۔

آزردہ نے ۱۸۵۷ء کے بعد جو مرثیہ دہلی مرحوم کا لکھا تھا اور ''فغانِ دہلی'' میں شامل ہے۔ اس کے ایک بند میں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے — سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جان پہ بن آتی ہے — مصطفیٰ خان کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں نہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اسی طرح ایک غزل میں بھی جو اسی زمانے میں کہی تھی، لکھتے ہیں:

رہے ہم نہ کچھ مصطفیٰ خاں کے غم میں
نہ فکرِ سخن، نہ پڑھانے کے قابل

شیفتہ کی تعلیم اور استعداد کا ذکر ہو چکا ہے۔ وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ پہلے مومن سے، اور ان کی وفات کے بعد غالب سے اصلاح لی۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا بہت سا کلام اس ہنگامے میں تلف ہو گیا۔ کلیات ان کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خان کے اہتمام سے نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اُردو، فارسی نظم و نثر سب شامل ہے۔

گارسین دتاسی لکھتا ہے کہ انھوں نے ابن جوزی کے مولد محدث کا بھی عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا، جو لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ میری نظر سے نہیں گزرا۔

شیفتہ بلند پایہ نقادِ سخن بھی تھے۔ اُردو شاعری کا مشہور فارسی تذکرہ "گلشن بیخار" انھیں کی تصنیف ہے، جو ۱۸۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں مختلف شاعروں کے کلام پر جیسی جچی تلی تنقید کی ہے، وہ مذاقِ سخن بدل جانے کے باوجود آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے اور جب

یں رہے کہ اس تذکرے کی تالیف کے وقت ان کی عمر کیسی سال سے زیادہ نہیں ن کی ژرف نگاہی اور اصابتِ رائے کی داد دینا پڑتی ہے۔ مثلاً نظیر اکبر آبادی لکھتے ہیں:-

اشعار بسیار دارد کہ بر زبانِ سوقیین جاری ست و نظر بآں ابیات در اعدادِ شعرأ نشایدش شمرد۔

ے پران کے زمانے میں بھی کافی لے دے ہوئی تھی اور اب بھی بعض لوگوں کی زبان شکایت آجاتا ہے کہ صحیح معنی میں نظیر ہی وہ شاعر ہے جس نے ملک کے عوام کے کی ترجمانی کی اور شیفتہ کا اسے نظری کر دینا ان کی اپنی کوتاہ نظری کا ثبوت ہے۔

قطع نظر کہ جس ماحول میں شیفتہ نے تربیت پائی تھی، اس میں نظیر کی شاعری حد درجہ رغیر ثقہ شمار ہوتی تھی اور اس لیے وہ اس رائے کے علاوہ جو انھوں نے ظاہر کی، وسری رائے دے ہی نہیں سکتے تھے، میرے خیال میں یہ بہت اچھا ہوا کہ اس زمانے وں نے عام طور پر نظیر کو پسند نہ کیا۔ کیونکہ پسند بالعموم تقلید کا پیش خیمہ ہوا کرتی

رغیر ثقہ شمار ہوتی تھی اور اس لیے وہ اس رائے کے علاوہ جو انھوں نے ظاہر کی، وسری رائے دے ہی نہیں سکتے تھے، میرے خیال میں یہ بہت اچھا ہوا کہ اس زمانے وں نے عام طور پر نظیر کو پسند نہ کیا۔ کیونکہ پسند بالعموم تقلید کا پیش خیمہ ہوا کرتی
رغیر ثقہ شمار ہوتی تھی اور اس لیے وہ اس رائے کے علاوہ جو انھوں نے ظاہر کی، وسری رائے دے ہی نہیں سکتے تھے، میرے خیال میں یہ بہت اچھا ہوا کہ اس زمانے

ترقّی رک جاتی اور وہ مبتذل ہو کر رہ جاتی۔ وجہ ظاہر ہے: "نہ ہر کہ مو بتراشد قلندری داند"
سنجیدگی سے ظرافت اور طنز کو نباہنے کے لیے بڑے سلیقے کی ضرورت ہے، جو بہت کم لوگوں
کے حصّے میں آتا ہے۔ یہ نظیر ہی تھے جو اس رنگ کو نباہ گئے۔ اگر ان سے کم درجہ کا شاعر
ان موضوعات پر قلم اٹھاتا تو یقیناً منہ چڑانے لگتا اور مسخرہ ہو کے رہ جاتا۔ اگر کسی کو اس
رائے سے اختلاف ہو، تو وہ آج بھی تجربہ کر کے دیکھ لے۔

شیفتہ نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیگم سے صرف ایک صاحبزادہ جناب محمد علی خان رشکی
ہوئے (جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں) جناب افضل بیگم دوسری بیوی سے دو لڑکے نقش بند خان
اور نواب محمد اسحاق خان اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ یہ نقش بند خان ہی تھے، جن کی تعلیم
کے لیے حالی مقرّر ہوئے تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے، مہجور تخلص تھا۔ ان کا انتقال پچیس برس[1]
کی عمر میں یکشنبہ ۵ نومبر ۱۸۷۷ء (۲۸ شوال ۱۲۹۴ھ) کو دن کے گیارہ بجے ہوا۔
حالی نے قرآنِ کریم کی ایک آیت سے تاریخ نکالی: "وَحُلُّوٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ" (سورۂ دہر)
دو صاحبزادیوں میں سے بڑی منوّر جہاں بیگم مسرّت عرف بڑی بیگم کا عقدِ نکاح نواب شاہجہان
بیگم والیۂ بھوپال کے چھوٹے بھتیجے نواب عالمگیر محمد خان نمودؔ سے ہوا تھا۔ ان کا دیوان بعنوان
"گلستانِ مسرّت" شائع ہو چکا ہے (مفید عام، آگرہ ۱۳۱۷ھ)۔
دوسری کا نام مشرف جہان بیگم ثروت (عرف چھوٹی بیگم) تھا، یہ نمود کے چھوٹے بھائی صمد محمد
خان کی بیوی تھیں۔ ان کا مجموعۂ کلام بھی "گلستانِ ثروت" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔
(مفیدِ عام، آگرہ ۱۳۱۷ھ)

شیفتہ کا بعمر ۶۳ برس اواخر ستمبر یا اوائل اکتوبر ۱۸۶۹ء (۱۲۸۶ھ) میں انتقال ہوا[2]۔ ذیابطیس
کا عارضہ ایک زمانے سے سوہانِ روح تھا۔ "آخری وقت ہاتھ پر ایک کالا دانہ نکلا جو موت کا
بہانہ بن گیا"۔ دلّی میں نواب مصطفٰے خان کی دو حویلیاں مشہور ہیں: ایک جامع مسجد کے
جنوب کی طرف چتلی قبر کے قریب ہے، اسے "چھیا میم کا چھتّہ" بھی کہتے ہیں۔ یہاں اب حویلی کا
نام بھی نہیں رہا، چھوٹے چھوٹے مکان بن گئے ہیں، محلّے کا نام البتہ رہ گیا ہے۔ دوسری

۱۔ یہ عمر تذکرہ میں لکھی ہے۔ لیکن ایک معاصر اخبار (لٹن گزٹ، دہلی، شمارہ ۷، نومبر ۱۸۷۷ء)
میں عمر بوقتِ وفات ۲۳ برس کی لکھی ہے۔

۲۔ اکمل الاخبار ۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء بحوالہ تاریخِ صحافت اردو، ۲ (۱): ۲۳۵

کوچۂ چیلان میں علی جان والوں کی عمارت کے برابر میں ہے۔ شیفتہ وفات کے وقت اسی کوچۂ چیلان والی حویلی میں مقیم تھے۔ مولانا حالی نے بہ ادنیٰ تغیر قرآن مجید کی ایک آیت "وجزاھم بما صبروا جنات وحریراً" (سورۂ دہر) سے تاریخِ وفات نکالی۔ یہی لوحِ مزار پر کندہ ہے۔ اپنا کفن آبِ زمزم سے دھو کر خود حجاز سے ساتھ لائے تھے۔ اسی میں کفنائے گئے، اور درگاہ سلطان جی میں اپنی خاندانی ہڑواڑ میں سپردِ خاک ہوئے۔

قطعۂ تاریخ وفات ہے:

چو رئیس ابنِ رئیسِ نامدار | کرد رحلت زیں جہانِ بے بقا
سالِ تاریخِ وفاتش فی البدیہہ | ملہمِ غیبی بمن کردہ عطا
کز سرِ زاری بباید گفت ایں | "رحمتِ حق بر محمد مصطفےٰ"

(۷ + ۱۲۷۹ = ۱۲۸۶ھ)

شیفتہ کے چھوٹے بھائی محمد اکبر خاں بھی شعر کہتے تھے۔ اکبر تخلص تھا اور مومن ہی سے اصلاح لیتے تھے۔

شیفتہ کے کلام سے متعلق کسی رائے کا اظہار کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ وہ یک فنے تھے یعنی غزل کے سوائے اور کوئی صنفِ کلام ان کے یہاں نہیں ملتی۔ لیکن انھوں نے غزل کو اس طرح نباہا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اگرچہ اس زمانے کے عام رنگ سے الگ کچھ زیادہ کلام نہیں، لیکن جہاں اس سے ہٹ کے کہا ہے، خوب کہا ہے۔ زبان اور اسلوبِ بیان اور خیالات ہر لحاظ سے شیفتہ کا کلام زندہ رہنے کا حقدار ہے۔ پہلے انتخابِ اردو ملاحظہ فرمائیے:

ایک دن شام ہماری بھی سحر کر دیگا | وہی جو شام کو ہر روز سحر کرتا ہے

کچھ انتظار مجھ کو نہ کے کا، نہ ساز کا | ناچار ہوں کہ حکم نہیں کشفِ راز کا

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر | کیا کوئی اور ستم یاد آیا!

دیکھتے ہم بھی، کہ آرام سے سوتے کیونکر | نہ سُنا تم نے کبھی، ہائے فسانہ دل کا
ہم سے پوچھیں، کہ اسی کھیل میں کھوئی ہے عمر | کھیل جو لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا
شیفتہ! ضبط کرو، ایسی بھی کیا بیتابی | جو کوئی ہو، تمھیں احوال سنانا دل کا

نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے چین | دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

وہ مجھ سے خفا ہے، تو اسے یہ بھی ہے زیبا | پر شیفتہ! میں اس سے خفا ہو نہیں سکتا

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقّع سے کُھلی
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

محبّت نہ ہرگز جتائی گئی
رہا ذکر کل اور ہر باب کا

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہونگے، تو کیا نام نہ ہوگا!

سب باتیں انھیں کی ہیں سچ بولیو قاصد!
کچھ اپنی طرف سے تو تصرّف نہیں کرتا

کیا حال تمھارا ہے، ہمیں بھی تو بتاؤ!
بیوجہ کوئی شیفتہؔ! اُف اُف نہیں کرتا

دامن تک اُس کے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ
جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنادیا

مشّاطہ کا قصور سہی، سب بناؤ میں
اُس نے ہی کیا نگاہ کو، پُرفن بنادیا!

اظہارِ عشق اُس سے نہ کرنا تھا شیفتہؔ!
یہ کیا کیا، کہ دوست کو دشمن بنادیا

حسرت سے اس کے کوچہ کو کیونکر نہ دیکھیے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

کیا جانے گذری غیر پہ کیا اس کی بزم میں
آئے وہ اس طرح کہ مجھے پیار آگیا

یار کو محرومِ تماشا کیا
مرگِ مفاجات نے یہ کیا کیا

عرضِ تمنّا سے رہا بیقرار
شب وہ مجھے، میں اسے چھیڑا کیا

غیر ہی کو چاہے ہیں اب شیفتہؔ!
کچھ تو ہے جو یار نے ایسا کیا

یاد نے جس کی بھلایا سب کو
اس کی ہیں یاد، بھلاؤں کیونکر

آشفتہ زلف، چاک قبا، نیم باز چشم
ہیں صحبتِ شبانہ کے ظاہر نشاں ہنوز

جو بات میکدے میں ہے، اک اک زبان پر
افسوس مدرسے میں ہے بالکل نہاں ہنوز

اے تابِ برق! تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہیں خار وخس آشیاں ہنوز

آمد آمد میں اس قدر شورش
دیکھیے کیا کریں بہار میں ہم

وہ تو سو بار اختیار میں آئے
پر نہیں، اپنے اختیار میں ہم

بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوۂ دلِ شورش ادا سے ہم

کم التفاتیوں کا ہے وہم اہلِ بزم کو
شرمندہ ہوگئے تری شرم وحیا سے ہم

گہ ہم سے وہ خفا ہیں، گہے ان سے خفا ہم
مدّت سے اسی طرح نبھی جاتی ہے باہم

کہتا ہوں جو، غیر سے نہ ملیے
کہتا ہے کہ "کیا میں بیوفا ہوں؟"

طوفانِ نوح لانے سے، اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں، اگر کچھ اثر کریں

اہلِ زمانہ دیکھتے ہیں عیب ہی کو بس
کیا فائدہ کہ شیفتہؔ عرضِ ہنر کریں

شیفتہ! عشق کی یہ دھوم، اور اب تک حضرت! / دل بیتاب نہیں، دیدۂ بیخواب نہیں

الفت چھپا کے اور بھی شرمندہ میں ہوا / اظہارِ عشق غیر سے وہ منفعل نہیں
جو حال پوچھنا ہے، تم اس سے ہی پوچھ لو / مجھ کو دماغِ قصۂ غمہاے دل نہیں

دل کا گلہ، فلک کی شکایت، یہاں نہیں / وہ مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں
ہم آج تک چھپاتے ہیں یاروں سے رازِ عشق / حالانکہ دشمنوں سے یہ قصہ نہاں نہیں
رنگیں ہے بیگناہوں کے خوں سے سوادِ شہر / حال آنکہ واں ہنوز سرِ امتحاں نہیں

اُس نوبہارِ حسن کو بدنام مت کرو / تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں / گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
دونوں کا ایک حال ہے، یہ مدعا ہو کاش! / وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا / وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں
قطع نظر جو نقش و نگارِ جہاں سے ہو / دیکھو وہ آنکھ سے جو نہ دیکھا ہو خواب میں
بیباک شیوہ، شوخ طبیعت، زباں دراز / ملزم ہوا ہے، پر نہیں عاجز جواب میں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ! / طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

ہے دل کو شکرِ وفاے عدو سے بیتابی / کروں میں کچھ گلہ، لطف اگر عتاب نہ ہو
حجاب منظرِ مقصود ہے طلسمِ خودی / جو یہ طلسم نہ ٹوٹے تو فتحِ باب نہ ہو

ہر شیوے سے ٹپکے ہے ادا، ناز تو دیکھو / ہر بات میں اک بات ہے، انداز تو دیکھو

ہائے وہ شیفتہ کی بیتابی / تھام لینا وہ تیرے محمل کو

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت / دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ! / ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی / میں کیا کہوں، کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

لطف اور وہ آپ رہے، ہم کو ستم بھی بس ہے / نہ سہی وہ بھی ہمیشہ، کوئی دم بھی بس ہے

دل لگایا تو ناصحوں کو کیا! / ق / بات جو اپنے جی میں آئی، کی
شیفتہ وہ، کہ جس نے ساری عمر / دینداری و پارسائی کی
آخر کار مے پرست ہوا / شان ہے اس کی کبریائی کی

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا / قاصد! وہ بہت الم کرینگے

اتنی بھی بُری ہے بیقراری
اب آپ سے اُنس کم کرینگے
ناشکیبی کی دعا مانگینگے

صبر کی ہم کو ضرورت ہی سہی
از دحامِ غم و اشک و حرماں
پھر بھی فرصت ہے تو فرصت ہی سہی
میری خاطر سے چاؤ شیفتہ! اولٰ
خیر، ان سے تمھیں نفرت ہی سہی

زیاں ہے عشق میں ہم خود بھی جانتے ہیں مگر
معاملہ ہی کیا ہو، اگر زیاں کے لیے
فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں، پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے

نہ پوچھو شیفتہ کا حال صاحب!
یہ حالت ہے کہ اپنے میں نہیں ہے

پھر بلا سے کوئی بیٹھے، شیفتہ!
اٹھ گئے جب آپ کوئے یار سے

ناصح! تری زبان، ترے بس میں جب نہ ہو
انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے
ایسی رغبت سے کرے قتل، گماں کا ہے کو تھا
شیفتہ! اس کو تو لو، تم سے محبت نکلی

ان کی فارسی دانی اور ذوقِ سخن سے متعلق آپ غالب کی رائے ملاحظہ فرما چکے ہیں؛ بالکل اہلِ زبان کا رنگ ہے۔ کلام کا نمونہ دیکھیے:

تہدید بر بپا کردی شیخ شہر ما را
امروز ساغرے، خوردیم آشکارا
در دہر، جز خرابات، جائے دگر نیابی
آنجا کہ خندہ آید، بر پادشہ گدا را

تا دیدہ نہ بندی، نتوانی کہ ببینی
آں جلوہ کہ مشہود شود اہلِ نظر را

نہ بیم محتسب، نے خوف قاضی، نے غمِ فردا
نمی دانم، کہ از مے چیست لذت گبر و ترسا را
بکنجے صبحدم صاحب دلے می گفت بازاری
بعصیاں ہائے پنہاں بخش، طاعت ہائے رسوا را

خندہ چہ خوش شیوہ ایست، از پسِ خشم و عتاب
لذتِ دیگر بود، زخمِ نمک سود را

رازِ نہفتہ گفتم اگر ساقیا! مرنج
می گفتمت کہ بادہ مدہ ایں قدر مرا

رحم ست بر کسے کہ دراں کوئے می رود
در دست نامۂ من و بر لب سلامِ ما

سحر بہ مہرِ دل افروز کردہ ام امشب
ہزار عشرتِ نوروز کردہ ام امشب

از پے صید تو صد دام بہر جائے ہست
جرم من چیست، مرا نیز تمنائے ہست
خار را خوار نگیری، کہ گلش در جیب است
قطرہ را سہل مپندار، کہ دریائے ہست
کیست کایں مژدہ برد معتقدانِ او را!
خلوت و حسرتی و شاہدِ رعنائے ہست

بے تابم و یار را خبر نیست
می نالم و نالہ را اثر نیست

در انجمنت بسر رسیدم — در عشق تمیزِ پا و سر نیست
ماییم و فغاں، کہ در محبت — دستورِ ترانہء دِگر نیست
چشمِ بد دُور، از جمالش — می بینم و طاقتِ نظر نیست

پردہ داری چو نہ شد، بتکدہ بدنام افتاد — ورنہ پوشیدہ بصد جا بُت و زُنّارے ہست

یار را دل ربودنم ہوس ست — برق اندر کمینِ شستِ خس ست
شیوۂ چند، لازمِ رندی ست — زاں یکے ارتباط با عسس ست
نگہے، غمزۂ، شکر خندے — اندکے التفات از تو بس ست

زباں زبانہ فشان و نفس شرر ریز ست — مرا گناہ نباشد، مےِ مُغاں تیز ست
غم و سرور نباشد بیک دل اندر جمع — برنجِ عشقِ تو نازم کہ راحت انگیز ست

گر بمستی فتدم، رغبتِ طاعت در دل — مسجدے ہم بسر کُوے مُغاں می بایست

آناں کہ در سکوت، دل از کف ربودہ اند — آیا چہا کنند، اگر گفتگو کنند

نازم اندازِ بتاں را، کہ دل و صبر و شکیب — ہمہ بُردند عیان و بہ نہانم دادند
چوں بہ پیری کنم، اے شیخ! ز رندی توبہ — کارسازانِ قضا، بختِ جوانم دادند
شب کہ در بزمِ تو جز غیر کسے بار نداشت — آتش از شمع گرفتند و بجانم دادند
حسرتی! از اثرِ نشہ، توفیق مپرس — درِ میخانہ زدم، کعبہ نشانم دادند

گفتمش، عشق تو ام حوصلہ می فرساید — گفت، عشق ست، چرا حوصلہ فرسا نبود

حسرتی! اسیرِ زجاں گشتہ، خبر باید داشت — کہ مبادا بہ درِ آں ستم ایجاد رسد

تو مپندار کہ ایں کم نگہی عشوہ گری ست — حسرتی! سادہ رخاں شرم و حیا نیز کنند

شہیدِ جلوۂ نازِ تو جاں شکار انند — اسیرِ حلقہء دامِ تو رَم شعار انند
چہ بودۂ تو، کہ آزادگاں بہ بندِ تو اند — تو کیستی کہ گدائے تو شہریار انند
خرابِ حوصلہء آں قرابہ نوشانم — کہ خم بہ بادہ کشیدند و ہوشیار انند
بکوش و نامۂ خود را سپید کُن، زاہد! — ترا از آں چہ، کہ رنداں سیاہ کار انند

جانم بلب رسیدہ و چشم براہ تست — دارم ز عمرِ رفتہ، اُمیدِ وفا ہنوز

عمرِ کوتاہ دادہ اند مرا — گو شبِ غم بُوَد دراز، چہ باک!

بر آں سرم کہ ز ہر نیک و بد کنارہ کنم — خورم شراب و در رُخِ نیکواں نظارہ کنم

نہ چوں عشق سازگارم، بہ مزاجِ دردمنداں — نہ چو حسن اعتبارم، بہ نگاہِ خود پسنداں
بُرخ چو آفتابت، نگہِ قمر عذاراں — بکمندِ عنبر بیت، سرِ عنبریں کمنداں
شبِ وصلِ غیر رفتم، پےِ اکتسابِ نفرت — چو ہجومِ عیش دیدم، شدہ شوقِ من دو چنداں
زحسرتی، ننالم، زجفاے طالعِ بد — بمذاقِ یار تلخم، چو فغانِ دردمنداں

دل دادہ نہ، دردِ دلِ زار چہ دانی! — دردام نہ، حالِ گرفتار چہ دانی!

اے چشم چہ دیدی، از نگاہش — بے وعدہ در انتظار چونی!

رُباعیات

من تشنہ و سیراب زصہباے خودم — من کعبۂ خویشم و کلیساے خودم
با غیر خودم ہیچ سروکارے نیست — من عاشق و معشوقِ خود آراے خودم

چندے بحریم شہریاراں رفتم — چندے بدرِ زُہد شعاراں رفتم
دیدم ہمہ لہو و سہو و کبر و طامات — ناچار بکوے میگساراں رفتم

[دیباچہ کلیات شیفتہ؛ صبح گلشن: ۱۲۱ - ۱۳۲؛
شمع انجمن: ۱۳۴ - ۱۳۶؛ خمخانۂ جاوید، ۵:
۱۵۵-۱۶۲؛ نقوش (جون ۱۹۵۶): ۱۷۲؛ معارف
(ستمبر ۱۹۵۴ء): ۱۸۸ - ۲۱۲؛ تاریخ صحافت اردو،
۲ (۱): ۲۳۵]

صاحب دہلوی ـــ نواب سیّد شیر زمان خان

دودمانِ عالی کے نام لیوا تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے انھیں حافظ احسان جیو کا پوتا لکھا ہے، لیکن یہ درست نہیں معلوم ہوتا، اگرچہ وہ تھے غالباً اسی خاندان سے۔ البتّہ سعادت یار خاں رنگین ان کے نانا تھے۔ یہ چھوٹے بیٹے تھے نواب شیر علی خان الملقّب بہ فتح نصیب خان کے۔ ان کے اجداد میں دین و دنیا کا قابلِ رشک اجتماع ملتا ہے۔ سیّد علی ہمدانی ان کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ ان کی اولاد میں نواب حمید الدّین خان عہدِ عالمگیری میں سپہ سالارِ افواجِ شاہی ہوئے۔ پھر نواب شرف الدّین محمد خان بہادر بخشی الممالک صوبہ دارِ کشمیر تھے۔ ایک اور بزرگ مجد الدّولہ عبدالاحد خان بہادر بہرام جنگ شاہ عالم ثانی کے وزیر تھے۔ غرض ان کی خاندانی عظمت سے کسی کو انکار نہیں۔

سیّد شیر زماں خان ۱۲۴۰ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اقتضائے وقت کے پیشِ نظر انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان کے فرزندِ ارجمند سیّد وزیر الزّماں خان نے عین جوانی میں حیدر آباد کی راہ لی اور وہاں افواج آصفیہ میں لفٹنٹی کا عہدہ قبول کر لیا۔ سیّد شیر زمان خان جب حکومت انگریزی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو یہ بھی اپنے بیٹے کے پاس حیدر آباد چلے گئے اور پھر اپنی موت تک یہاں سے نہیں نکلے۔ یہیں ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴-۱۸۹۵ء میں بعمر ۷۲ سال وفات پائی۔

سیّد شیر زمان خان نے فارسی کی تعلیم مکمل کی، تو اس کے بعد شاعری کا شوق ہوا، جو اس وقت دلّی میں ہر کہ و مہ کا دل پسند مشغلہ تھا۔ اس زمانے میں ہر طرف ذوق کا ڈنکا بج رہا تھا، یہ بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ ان کی شاگردی اور ان سے اپنی ارادت کا اظہار کئی اشعار میں کیا ہے:

الٰہیٰ رکھ مرے استاد کو قائم قیامت تک ہمیشہ رہوے سر پر ان کے سایہ ابرِ رحمت کا

طفیلِ خاکِ پائے حضرتِ ذوق اب تو اے صاحب!
گیا عرشِ معلّیٰ پر دماغ اپنی طبیعت کا

ایک قطعہ میں لکھتے ہیں:

سب ہیں مقر کہ افصحِ ہندوستاں ہیں ذوق سودا و میر رتبے جن کے ہیں کمتر آج
ہندوستاں سے کشورِ ایران تک کہیں کہتے ہیں ذوق سا نہیں پیدا اسخنور آج
شاگرد ہوں میں ایسے کا، صاحبؔ ابر اسکر زورِ سخن یہ جس کا ہے، اللہ اکبر آج
آتش زباں ہوں فیض سے میں اس کے اس قدر کیا ہے عجب کہ ہوویں عدو خاک جل کر آج

نومبر ۱۸۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہو گیا، تو یہ غالب کے حلقۂ "تلامذ میں شامل ہو گئے" لکھتے ہیں:

بعد مُردنِ ذوق کے کم ہو گیا تھا ذوقِ شعر
ہوتے ہی شاگردِ غالبؔ، پھر وہ غالب ہو گیا

پھر ایک رباعی میں لکھتے ہیں:

غالب کا کلام سب سے غالب پایا اشعار کا اون کے سب کو طالب پایا
صاحب! شاگردِ ذوق و غالب ہو کر اللہ اللہ، عجب مراتب پایا

غالب کے فوت ہو جانے کے بعد دونوں استادوں کو یوں یاد کرتے ہیں:-

شاگرد ہوں میں ذوق سے عالی دماغ کا کیوں فتح کوئی میرے سخن سے نکال دے
فیضانِ روح گر نہ ہو غالب کی صاحبا! پھر کون اس ردیف کٹھن سے نکال دے

ان کا دیوان ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا تھا۔ ان کی وفات کے بعد سید وزیر الزمان کی فرمایش پر محمد وحید الدین خان نے اسے مرتّب کیا اور یہ ۱۳۱۹ھ میں مطبع مقتشِ دکن، حیدر آباد میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس کے نسخے بھی کمیاب ہیں۔ ایک نسخہ جناب آغا حیدر حسن مرزا کے ذاتی کتاب خانے میں دیکھنے میں آیا۔ اس کے شروع میں صاحب کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ زبان اور ضلع جگت پر خاص توجّہ ہے، جو احسان کا بھی طرۂ امتیاز تھا۔ مذہبیت کا بھی جا بجا میلان ملتا ہے۔ نعتِ رسول کے علاوہ حضرت غوثِ اعظم، سید عبد القادر جیلانی سے اپنی عقیدت

کا اظہار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی بزرگ دسوندے شاہ لودیانوی کے مُرید تھے۔
دیوان کے آخر میں تین قصیدے ہیں: ایک حضرت علی کی منقبت میں اور دو نظامِ
ششم نواب محبوب علی خان کی مدح میں۔ مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

کب زخمِ دل ہمارا منّتِ کشِ رفو ہے — کب دردِ دل ہمارا محتاج ہے دوا کا

کوئی گر پوچھتا ہے اون سے: صاحب کس کا بندہ ہے
تو کہتے ہیں وہ، کس انداز سے کھا کر قسم "میرا"

پکڑ کر ہاتھ میں شمشیر جب وہ مہ جبیں اُٹھا — فلک پر الاماں، شورِ قیامت بر زمیں اُٹھا

کہ دی جب بات تیرے کی تو بگڑ نا کیا تھا — جو کیا خوب کیا، اس کا مکرنا کیا تھا

مرتبہ ملتا ہے شاہوں کو گدائی کا یہاں — رتبہ ہے اقلیمِ الفت میں گدا کو شاہ کا

کیوں نہ میں اس رشک سے مر جاؤں لو تو ہی — میرا کہنا ٹال کر، کہنا کیا بدخواہ کا

جو سمجھتے ہیں، وہی سمجھے ہیں اوس کو صاحبا! — کام حکمت سے نہیں خالی کوئی اللہ کا

ناصح! نہ مجھ سے پوچھ کہ کیوں تجھ کو کیا ہوا — جو کچھ ہوا، درست ہوا، اور بجا ہوا

افسانہ میرے درد کا سُن کر کہا، تو یہ — قصّہ ہے یہ تو روز کا صاحب! سنا ہوا

انساں پھرے، زمیں پھرے، آسماں پھرا — تیری نظر کے پھرتے ہی سارا جہاں پھرا

جس دن سے تیرے رام ہوئے، اے بتِ فرنگ!
آرام نے تو ہم سے اوسی دن سے رم کیا

پوشیدہ میں رکھتا تھا سدا رازِ محبت — افسوس کہ اِس چشم نے کی پردہ دری آج

شرابِ شوق پیتے ہیں، نہیں کچھ کام ہے مے سے
الٰہی! کام میں رہوے نصیبِ دوستاں ہو کر

تم کہتے رقیبوں سے یہاں اور، وہاں اور — کھلواؤ نہ موکھ میرا کہ میری ہے زباں اور

واں مجھ سے وہ بدظن ہے، یہاں اوس سے میں بدظن — واں وس کو گماں اور ہے، یاں مجھ کو گماں اور

کیا ٹھہرے عدو سامنے روباہ کی مانند — صاحب! یہ سمجھ لیں کہ یہ ہے شیرِ ژیاں اور

بندے بتوں کے اور ہیں، ہم تو خدا کے ہیں — بیجا کے نوکر اور ہیں، یہاں تو بجا کے ہیں

قیدی جفا کے جھیلنے والے جفا کے ہیں — بس اے جفا شعار! یہ معنی وفا کے ہیں

سامان جو تھیں نظر آتے گھٹا کے ہیں — یہ تو دھوئیں ہماری ہی آہِ رسا کے ہیں

کس کس کو میں بتاؤں، کہ بارِ غمِ فراق
دل پر نہیں، جگر پہ نہیں، جان پر نہیں

زرا آنکھوں میں اس کو رکھنا صاحب!
کہیں یہ طفلِ اشک ابتر نہ ہووے

عقدہ جو تیرے جعد کا رشکِ قمر کھلے
عشاق کے دلوں کی گرہ سر بسر کھلے

جان ان کی آسمان کو پرواز کر گئی
لیکن کبھی نہ تیرے اسیروں کے پر کھلے

شعلہ ہے یا برق ہے، یا نور پیراہن میں ہے
کس لطافت سے وہ رشکِ حور پیراہن میں ہے

اگرچہ عشق کی منزل کڑی ہے
سہی جاوے گی، جو سر پر پڑی ہے

جب پھنسے دامِ محبت میں، تو راحت کیسی
جھیلنی پڑتی ہے، پڑ جائے مصیبت کیسی

ابھی تو عشق کی ہے پہلی ہی منزل، صاحب!
چار دن میں یہ بنی آپ کی صورت کیسی

[گلستانِ سخن: ۳۲۵؛ بزمِ سخن: ۷۳؛
خمخانۂ جاوید، ۵: ۲۳۹؛ دیباچۂ دیوان]

صاحب ـــــ محمد حسین بریلوی

نومسلم تھے۔ ان کے والد کا نام بہادر سنگھ تھا۔ فارسی اور ریاضی میں بھی اچھی مہارت تھی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹۔۱۸۹۰ء) میں انتقال ہوا۔

بوسۂ مژگان وابرو کا چکھا تا ہے مزہ
لب سے زخمِ دل کا مل جانا تری تلوار کا

قیس سے جو دشت بالکل صاف تم نے لے لیا
بستیوں پر چل کے دعویٰ اب کرو کہسار کا

اسیرِ پنجۂ خورشید، ماہ را دیدم
گرفت دستِ نگارِیں چو جامِ مینا را

[یادگارِ ضیغم (قلمی)]

صادق (عزیز) ــــــ مولوی محمد عزیز الدّین بدایونی

شیخ صدّیقی تھے۔ نسب محمد بن قاسم بن محمد کے واسطے سے حضرت ابوبکر صدّیق خلیفۂ اوّل تک پہنچتا ہے۔ خاندانی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اجداد میں سے قاضی کمال الدّین فرشوری خاندانِ غلامان کے سلطان التتمش کے عہد میں اوّل بلگرام آئے اور پھر ان کے عزیزوں میں شیخ یوسف فرشوری اپنے اہل و عیال سمیت وہاں سے بدایوں منتقل ہوئے۔ ان کے اخلاف میں شیخ محمد اکرم فرشوری اور ان کی اولاد نے بہت ترقی کی۔ شیخ محمد اکرم کے پانچ بیٹے ہوئے، ان میں سے دوسرے کا نام محمد فصیح الدّین تھا۔ انھیں ۲۱ سنہ جلوس محمد شاہی میں فصیح اللہ خان خطاب اور دو ہزاری ذات اور دو صد سوار کا منصب عطا ہوا۔ ساتھ ہی سرکارِ بدایوں کی سوانح نگاری کی خدمت تفویض ہوئی۔ بدایوں، اور ڈی اور کرنال اور پانی پت میں ان کی جاگیر تقریباً دس لاکھ دام کی تھی۔

محمد فصیح اللہ خان کے اکلوتے بیٹے شیخ مؤیّد الدین عرف حافظ ابو المؤیّد خان تھے۔ اس خاندان میں خانی کا خطاب صرف ان دو باپ بیٹوں کو ملا۔ حافظ ابو المؤیّد خان عربی اور فارسی میں منتہی تھے۔ ہمیشہ طلبہ کی جماعت ان کے ہاں مقیم رہتی، جن کے قیام و طعام کا انتظام بھی ان کے ذمّے تھا۔ اور اد و وظائف سے جو وقت بچتا، وہ تعلیم و تدریس میں صرف ہوتا۔ ان کا ۱۱ ربیع الثّانی ۱۲۵۵ھ (۲۴ جون ۱۸۳۹ء) کو انتقال ہوا۔

حافظ ابو المؤیّد خان کے بیٹے اساس الدّین احمد تھے، جن کا ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۹۹ھ (۳۰ جنوری ۱۸۸۰) کو انتقال ہوا۔ ان کے دو بیٹے تھے، حکیم محمد سعید الدّین اور مولوی محمد عزیز الدّین۔ خان بہادر محمد رضی الدین بسمل صدّیقی فرشوری بدایونی جن کی کتابیں "انساب شیوخ فرشوری" اور "تذکرۃ الواصلین" مشہور ہیں، انھیں حکیم محمد سعید الدّین کے فرزندِ رشید تھے۔ وہ شعر

بھی کہتے تھے پہلے تخلّص کامل تھا، بعد کو اُسے ترک کر کے سعید کر لیا تھا۔ ۲۷ رجب ۱۳۱۶ھ (۱۱ دسمبر ۱۸۹۸ء) کو فوت ہوئے۔ میرزا زین العابدین خاں عارف کے شاگرد تھے۔

دوسرے صاحبزادے محمد عزیز الدّین، یہی ہمارے صاحب ترجمہ ہیں۔ وہ ۱۷ صفر ۱۲۴۴ھ (۲۹ اگست ۱۸۲۸ء) کو پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت اپنے جدّ امجد حافظ ابوالمؤید خاں کی نگرانی میں دلّی میں ہوئی۔ عربی اور فارسی میں منتہی تھے۔ خوش خطی میں میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انگریزی حکومت کی ملازمت میں شامل ہو گئے۔ ۱۸۵۵ء میں وکالت درجۂ اعلےٰ کی سند لے کر دلّی میں وکیل ضلع مقرر ہوئے اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک یہیں رہے۔ اس کے بعد شاہجہانپور کا نیا ضلع تشکیل ہوا، تو یہ وہاں وکیلِ سرکار بنا کر بھیج دیے گئے۔ یہ ان کی کامیاب وکالت ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد منصف مقرر کر دیے گئے۔ وہ اس حیثیت سے پیلی بھیت میں بھی رہے۔

تقریباً دس برس تک بمشاہرۂ چار سو روپیہ منصفِ درجۂ اوّل رہنے کے بعد ۵۵ سال کی عمر میں پنشن پر اس عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

بعمر ۶۶ برس ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ (۴ جنوری ۱۸۹۴ء) رحلت کی اور بدایوں میں قدیم باغِ فرشوریاں کے قبرستان (فرشوریِ ٹولہ میں) دفن ہوئے۔

انھوں نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی نجابت النسا، دخترِ شیخ عابد علی تھیں۔ یہ سوا سال کا ایک بیٹا چھوڑ کر فوت ہو گئیں۔ اس بچے کا نام محمد ابوالحسن تھا۔

محمد ابوالحسن اپنے خاندان میں پہلے شخص تھے جنھوں نے انگریزی پڑھی۔ مدرسۃ العلوم، علی گڑھ میں مدرّس مقرر ہوئے اور اس کے بعد سر سیّد کے پرائیوٹ سکتّر بھی رہے۔ اخیر میں ریاست حیدر آباد میں ہائی کورٹ میں رجسٹرار رہے، بعد کو ضلع بیدر کے جج اور بلدہ حیدر آباد میں چیف مجسٹریٹ مقرر ہو گئے تھے۔ مصنّف بھی تھے۔ "اعجاز القرآن"، "تنقید لسان الغیب" وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔

صادق کی دوسری بیوی مقبول النسا، دخترِ شیخ مجیب اللہ تھیں۔ ان کے بطن سے تین بیٹے (محمد وہاب الدّین احمد، محمد وہاج الدّین اور محمد ضیاء الدّین) اور ایک بیٹی افضل بانو پیدا ہوئیں۔

محمد وہاب الدین بھی شعر کہتے تھے؛ طالب تخلص تھا۔ اپنے والد ہی سے اصلاح لی۔ ان کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی تھی۔

"قاطع برہان" کے قضیے میں غالب نے ایک کتاب "قاطع القاطع" کے مصنف منشی امین الدین پر ازالۂ حیثیت عرفی (دفعات ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱ تعزیرات ہند) کا مقدمہ دائر کیا تھا۔ یہ مقدمہ دسمبر ۱۸۶۷ء میں دائر کیا گیا تھا۔ اس مقدمہ میں یہی محمد عزیز الدین ان کی طرف سے وکیل تھے۔ غالب نے مختار نامہ ۱۴ دسمبر کو داخل عدالت کیا تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، غالب کو آخر کار راضی نامہ کرنا پڑا تھا۔ ان کی طرف سے عزیز الدین نے ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو اس کی اطلاع عدالت کو دی تھی، جس پر مقدمہ خارج اور داخل دفتر کر دیا گیا تھا۔

عزیز الدین یہاں دلّی میں لال کنوآں کے علاقے میں رہتے تھے۔ جہاں آج کل سنیما ایکسلیر ہے، اس سے نیا بانس کی طرف جائیں، تو بہت سی چھوٹی چھوٹی گلیاں اُلٹے ہاتھ پڑتی ہیں؛ ان میں سے کوچہ پنڈت میں داخل ہوں تو آگے چل کر سیدھے ہاتھ کو "گلی عزیز الدین وکیل" ملتی ہے۔ یہ انھیں کے نام سے منسوب ہے؛ اور گمان غالب ہے کہ ان کی سکونت اسی گلی کے کسی مکان میں رہی ہوگی؛ اس کے سرے پر نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

گزر کیسے ہو ایسے آستاں تک
تصوّر بھی نہیں جاتا جہاں تک

یہی گر آہ و نالہ ہے، تو صادق!
رہیگا دم نہ تاثیرِ فغاں تک

قاتل جو اپنا ہے، وہی اب سوگوار ہے
اس موت پر حیات فدا، جان نثار ہے

ہماری آتشِ شوق اور بھڑکی
چلے جس وقت وہ دامن اٹھا کے

سارے اندازِ ستم، ختم نہ کر تو مجھ پر
کچھ تو دشمن کے لیے طرزِ جفا رہنے دے

ہے یہ تنہائی میں، مجھ سوختہ جاں کی غمخوار
شمعِ مرقد کو مری بادِ صبا رہنے دے

لے گئی دل اک نظر میں اس کی چشمِ نیم خواب
مست ہم سمجھے تھے اس کو یہ بہت ہشیار ہے

وہ حکم سناتے ہیں مجھے قتل کا ہنس کر
کچھ لطف کا انداز بھی ہے ان کی جفا میں

صادق یہ تمنّا ہے کہ جب تک ہو مری زیست
معشوق رہے بغل میں، دل یادِ خدا میں

[تجلیاتِ سخن (نظامی): ۳۳-۳۴، ۳۶؛ گلستانِ سخن: ۳۱۶؛ انساب شیوخ قدوائی: ۸۵، ۱۰۹؛ غالب و عصرِ غالب: ۱۵۴-۱۵۹؛ یادگارِ ضیغم: ۲۲۷، ۲۳۷؛ سخنِ شعرا: ۲۱۷-۲۷۴؛ خمخانۂ جاوید، ۵: ۲۵۰؛ ایضاً: ۳۴۸]

صفیر — سیّد فرزند احمد بلگرامی

ان کے والد سیّد عبدالحی عرف میر سیّد احمد آحمد تخلص حسینی واسطی سیّد تھے۔ چالیس واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب حضرت رسول کریم صلعم سے جا ملتا ہے۔ بزرگوں کا وطن شروع میں ضلع ہردوئی کا مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام رہا، بعد کو خاندان کو انتھ میں منتقل ہو گیا جو آرہ (ضلع شاہ آباد۔ بہار) کے قریب سادات کی مشہور بستی ہے۔ صفیر پیر ۷ اپریل ۱۸۳۴ء (۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ) اپنی ننھیال مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے: "شمس الضحیٰ" سے تاریخِ ولادت نکلتی ہے۔ دوسرا تاریخی نام 'غلام حسنین' بھی تھا، جو ان کے نانا حضرت سیّد عالم صاحب نے رکھا تھا، لیکن یہ مشہور نہیں ہوا۔ پانچ برس کی عمر تھی جب یہ اپنے والد کے ہمراہ آرہ آئے، اور اس کے بعد ساری عمر یہیں گذار دی۔

اس عہد کے رواج کے مطابق ان کی تعلیم بھی گھر پر ہوئی۔ اس زمانے میں انھوں نے درسی کتب کے علاوہ خطّاطی پر خاص توجّہ دی اور اس میں بھی نستعلیق اور شکستہ اور نسخ میں خاصی مہارت پیدا کی۔

صفیر نے شاعری گویا ورثے میں پائی۔ دادھیال اور ننھیال دونوں طرف کے اجداد پشتوں سے شاعر تھے۔ پردادا کے والد سیّد خورشید علی فارسی میں شعر کہتے اور خورشید تخلص کرتے تھے؛ پہلے فصاحت تخلص کرتے رہے، جسے ان کے استاد غلام علی آزاد بلگرامی نے بدل کر خورشید کر دیا۔ شیخ علی حزیں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ احیاناً اردو سے بھی شوق کرتے تھے۔ ساری عمر انگریزی ملازمت میں بسر ہوئی۔ پیر ۱۲ صفر ۱۳۰۱ھ (۴ دسمبر ۱۸۸۶ء) بلیا میں رحلت کی۔ نعش آرہ آئی اور یہیں دفن ہوئے۔

صفیر کے پردادا سیّد بندہ علی بندہ تخلص تھے۔ انھوں نے حیدرآباد (دکن) میں ملازمت



سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی

کرلی تھی۔ ان کا شنبہ ۹ ذی قعدہ ۱۲۵۳ھ (۴ فروری ۱۸۳۸ء) کو گھوڑے سے گرنے سے حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ اپنے مکان حیدرآباد ہی میں مدفون ہوئے۔

صفیر کے دادا سید غلام یحییٰ فارسی کے شاعر یحییٰ تخلص کرتے تھے۔ انھیں نظم سے زیادہ نثر سے مزاولت تھی۔ صفیر کے والد سید احمد صفر ۱۲۳۲ھ (دسمبر ۱۸۱۶ء / جنوری ۱۸۱۷ء) میں مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سید بندہ علی نے انھیں اپنے پاس حیدرآباد بُلا لیا، اور ان کے انتقال تک سید احمد کا وہیں قیام رہا۔ جب دادا نے رحلت کی، تو ان کی وطن کو واپسی ہوئی۔ آخر کار یہاں کلکٹری میں ملازمت مل گئی۔ پہلے مظفر پور (ضلع ترہٹ) میں محافظ دفتر رہے بعد کو مونگیر میں ڈپٹی مقرر ہو گئے تھے۔

سید احمد کے تاج پور ضلع ترہٹ کے قیام کے زمانے میں تین برس صفیر بھی اپنے والد کے ساتھ رہے۔ میر سید احمد کا بعمر ۶۴ سال جمعرات ۲۸ شوال ۱۲۹۶ھ (۱۵ اکتوبر ۱۸۷۹ء) آرہ میں انتقال ہوا۔ صفیر نے والد کی تاریخ وفات کہی: سالِ وفات گفتم: داخل بخلد زیبا (۱۲۹۶)۔ وہ اُردو میں بھی شعر کہتے تھے، عاصی تخلص تھا۔

میر سید احمد کا نکاح حضرت صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ کی بڑی صاحبزادی سے ہوا تھا۔ اپنے پیچھے تین بیٹے اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ فرزند احمد بھائیوں میں سب سے بڑے تھے؛ چھوٹے بھائیوں کے نام اولاد احمد اور خورشید احمد تھے۔

صفیر کا کوئی ۱۴ برس کا سن تھا کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا اور اپنے پھوپھا سید محمد مہدی خبر بلگرامی سے اصلاح لینے لگے۔ یہ سلسلہ چھ برس تک جاری رہا پھر لکھنؤ جا کر شیخ امان علی سحر کے شاگرد ہوئے۔ پانچ برس بعد غدر کے زمانے میں مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے، تو مرزا دبیر سے مشورہ کرنے لگے؛ اور ایک مدت تک ان کے ساتھ پٹنہ میں رہ کر مشق سخن کی۔ انھوں نے پے در پے سات تخلص اختیار کیے۔ قلب، آثم، اثیم، صبا، نالاں، احقر اور صفیر۔ آخر میں صفیر ہی سے زیادہ مشہور ہوئے۔

مرزا غالب کے مکتوب الیہم میں مارہرہ شریف کے سجادہ نشین حضرت صاحب عالم بھی ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہوا، یہی صاحب عالم صفیر کے نانا تھے۔ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں صفیر نے غالباً نانا جان کے ایما پر اپنی فارسی اور اُردو غزلیں اصلاح کے لیے غالب کی خدمت میں دلی بھیجیں۔ دو سال بعد مئی ۱۸۶۵ء میں اپنے ماموں جناب شاہ عالم شائق کے ساتھ دلی پہنچ کر غالب کی

خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بہت دن تک ان کے پاس رہ کر استفادہ کیا۔ عبدالرّؤف عشرت کی روایت ہے کہ غالب کی وفات کے بعد صفیر چندے غلام حسنین قدر بلگرامی سے بھی مشورہ کرتے رہے۔ لیکن ظاہرا یہ بات غلط ہے۔

صفیر کی زبان میں لکنت تھی، جس سے بزمِ مشاعرہ میں پڑھنے میں تکلیف ہوتی تھی بعض دفعہ پڑھتے میں سانس پھول جاتی اور لیٹ جانا پڑتا تھا۔ اس لیے بالعموم ان کے پیچھے گاؤ تکیہ لگا دیا جاتا تھا، تاکہ اس کے سہارے آرام سے بیٹھ سکیں۔

بروز یکشنبہ ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء (۲۱ رمضان ۱۳۰۷ھ) کی دوپہر پٹنہ میں ہیضہ سے انتقال کیا۔ نعش خشکی کے راستے آرہ لائی گئی اور یہاں میر گنج کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ "شہر رمضان المبارک" تاریخ وفات ہے۔

صفیر نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے صرف ایک بیٹا سیّد نور احمد زندہ رہا، یہ شعر بھی کہتے تھے۔ گرامی تخلص تھا اور اپنے والد ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ صفیر کا دوسرا عقد آرہ میں ہوا۔ ان بیوی سے دو بیٹے ہوئے؛ سیّد غنی حیدر اور سیّد ولی حیدر گہر۔ نور احمد گرامی کا بعمر ۳۲ سال ۱۰ جون ۱۸۹۸ء کو انتقال ہوا۔ انھوں نے دو صاحبزادے اپنی یادگار چھوڑے۔ سیّد عنایت احمد اور سیّد وصی احمد۔ دونوں انگریزی عہد میں ملازم رہے۔ سیّد وصی احمد کے دو نثری مضمون بہت مشہور ہیں۔ ملکِ خطا کے شاہزادے، اور "س، ش، ص"۔ آخری مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سلطان اور رشاد دونوں صفیر کے شاگرد تھے۔ دونوں بھائی شعر بھی کہتے تھے۔ بڑے بھائی کا تخلص دلگیر تھا، ان سے چھوٹے سیّد محمد وصی احمد فانی تخلص کرتے تھے۔ ان کا ۱۴ نومبر ۱۹۷۶ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ سیّد مرتضیٰ حسین بلگرامی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) انھیں گرامی کے نواسے ہیں۔

صفیر نظم و نثر دونوں پر یکساں حاوی تھے اور اس میں شک نہیں کہ بدرجۂ غایت قادر الکلام اور زود گو تھے۔ متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات ان کی یادگار ہیں۔ ان کا تذکرہ جلوۂ خضر اور دس جلدوں میں بوستانِ خیال کا اردو ترجمہ بہت مشہور ہیں۔ اردو کے آٹھ دیوان تھے جن میں سے دو صفیر بلبل (۱۲۸۰ھ) اور خمخانۂ صفیر (۱۲۹۶ھ) ان کی زندگی میں چھپ گئے تھے۔ تین دیوان فارسی کے تھے، چار فارسی کی مثنویاں اور چھبیس اردو

کی ۔ قصائد، رباعیات، قطعات اور واسوختوں کے مجموعے ان کے علاوہ ۔ کلام بہت پختہ ہے ۔ زبان پر قدرت ہر ایک شعر سے ہویدا ہے۔

ایک لطیفہ بھی سنیے :

نساخ نے انیس و دبیر کے کلام پر اعتراض کیے اور انھیں 'انتخاب نقص' کے تاریخی نام سے شائع کیا۔ لکھنؤ کے حضرات اس پر بہت بھنّائے ۔ ادھر عظیم آباد کے بہت سے لوگ صفیر سے بگڑے ہوئے تھے کیونکہ انھوں نے کئی شاعروں کو غلط طور پر اپنا شاگرد کہا تھا۔ انھوں نے لکھنؤ والوں کو لکھا کہ ہم نساخ کا کلام بھیجتے ہیں، اس کی دھجیاں اڑائیے ۔ اور ستم یہ کیا کہ نساخ کے کلام میں بہت سا صفیر کا کلام مخلوط کر دیا ۔ اسیر مرحوم نے تو اس پر کچھ لکھنے سے انکار کر دیا، لیکن بعض دوسرے شعرائے لکھنؤ نے اس پر خردہ گیری کی؛ "اور تفضیح" اور "گستاخی معاف" کی قسم کے رسائل شائع ہوئے ۔ اس طرح گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا، اور نساخ کے ساتھ صفیر کا کلام بھی معرضِ بحث میں آگیا۔ اسی کا جواب "طومارِ اغلاط" کے نام سے دیا تھا۔

کلام کا مختصر انتخاب یہ ہے:

رازِ خلوت کا بیاں، کس نے کیا، کیا جانیں
ایک ہیں، ایک ہو تم، بس کوئی آیا نہ گیا

بادۂ عشرت ہوش ربا تھا، رات جو میں نے جام لیا
بارے یہ جرأت ساقی نے کی، دوڑ کے مجھ کو تھام لیا

قتل کیا تو خجلت کیسی، چھپ سکتا تھا خون کہیں
جس نے سنا احوال ہمارا، اس نے تمھارا نام لیا

دیکھنے مجھ کو آجاتے، تو بات تو ہوتی کہنے کو
عمر تو آخر ہو ہی چکی تھی، تم نے عبث الزام لیا

میں، اور تمھیں خلق میں بدنام کروں، حیف!
یوں تم پہ کھلے میری زباں، ہو نہیں سکتا

عذر کرتے ہو تو قصور ہوا
کہ دو منھ سے کہ رنج دور ہوا

اے صفیر! اس سوزِ غم سے کون عاشق بچ سکے
جل بجھا کل رات دیکھی تم نے پروانے کی بات

بھلا، تم تو بھلے ہو، میں برا ہوں
محبت جھوٹ، میرا چاہنا جھوٹ

تبسم سے، تکلم سے، حیا سے
مجھے مارا ابھی تو کس کس ادا سے

تعذیر میں میری نہ کمی کر، ستم ایجاد
وہ آج ہی ہو جائے، جو کچھ روزِ جزا ہو

قابو میں دل نہیں ہے، بھلا آپ کس لیے
تسکین دیتے ہیں مجھے، سمجھائے جاتے ہیں

کیا یاد آگیا انھیں صبحِ شبِ وصال
منھ میرا دیکھ دیکھ کے شرمائے جاتے ہیں

آئے وہ میرے گھر، تو رقیبوں کو لے کے ساتھ
یارب، قبول یوں بھی کسی کی دعا نہ ہو

بہار میں گل و بلبل سے کیا ہے سرگوشی
یہ کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوتی

اتنا تو یاد ہے کہ وہ آئے تو بیٹھے تھے
معلوم کچھ نہیں ہے کہ پھر ہم کہاں رہے

قصہ ہمارا تم سے سُنا بھی نہ جائیگا
تم کیا سنوگے، ہم سے کہا بھی نہ جائیگا

کل جو اُٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں اُٹھانے کے لیے

اب فارسی کے چند شعر دیکھیے:

ہستم صفیر گوہر بحرین عقل و دیں
واز سلسلہ مسلسل نسل پیمبری
زیبد مرا کہ ناز کنم بر عطاے حق
کو تا کجا رساند ز پاکیزہ گوہری
ز اولادِ پاک زید شہیدم، زہے شرف!
یعنی حسینی و حسنیم و حیدری
از پیروِ ائمۂ اثنا عشر منم
مشرب کہ حیدری شدہ مذہب کہ جعفری
"شمس الضحیٰ" کہ سالِ ولادت بود مرا
مارہرہ است مولدِ پاکم ز برتری
شکرِ خدا کہ موطنِ من بلگرام شد
در ہند اوست مطلع شمسِ ہنروری
آرہ کہ گشت مسکنِ من یافتم بدل
یوسف نہالست درچہ کنعان ز مشتری
الکن اگر شدم، چہ غم؛ ایں کلک دو زباں
دارد یکے ز من، دگر از خود بساحری
اوستادِ من بشیوۂ اُردو بود سخر
کز ناسخ است یافتہ تمغاے شاعری
در مرثیہ دبیر بود اوستادِ من
مقبولِ کبریا شدہ از مدحِ حیدری
غالب بود ہنرور شعرم بہ پارسی
گو ہست در زمانہ علَم با ہنروری
دارم بدل ذخیرہ از ینہا صنوفِ علم
چوں ابر مخزنِ گہر نکتہ پروری
از نثر و ہم ز نظم بسے قسم قسم را
دارم ز کلکِ خویش نگارش بہ زیوری

شاہد اِن دہر تا با ساغرِ مُل ساختند
آنچہ ماند از بیخودی، صرف تغافل ساختند
آتش افشاندند از برقِ تبسم، نو گلاں
اخگرے بردند او آہِ گرمِ بلبل ساختند

آہ از حالِ منِ محزون وناپرسانیش
داستہانہا از پےِ فریادِ بلبل ساختند
پیش داور چیست خونِ حسرتِ مارا جواب
ایں کہ سفّاکاں بقتلِ من تامّل ساختند
ذرہ ذرہ اصلِ خورشید ست، در علم الیقین
جزوہا چوں جمع شد، موسوم با کُل ساختند
شمع را رونق نباشد، با وجودِ آفتاب
پیشِ رُوے تو چراغِ طور را گل ساختند

تا خیالِ حیدرِ صفدر بچشم آید، صفیر!
حلقۂ چشم زنقشِ پاے دُلدل ساختند

من گشتۂ ایں شیوہ کہ دیدن نگزارند
وز سینہ بلب آہ کشیدن نگزارند
رشکم بحریفانِ سیہ مست کہ از شوق
تا موسمِ گل بادہ رسیدن نگزارند
فریاد از آناں کہ چو الزار سرِ طور
گیرند نقاب از رُخ و دیدن نگزارند
فریاد ازیں دام نگاہاں کہ چو آہو
از پیش برانند و رمیدن نگزارند
ایں خوش نگہاں از نظرِ شوخ و سیہ مست
میخانہ فروشند و خریدن نگزارند

ایں لالہ رُخاں، آہ، صفیر! از سرِ شوخی
از چہرۂ من رنگ پریدن نگزارند

مرا در سینہ جز غم نیست باقی
دلے بود است، آں ہم نیست باقی
بیا ظالم! دمے بنشیں ببالیں
کہ چندانے بمرگم نیست باقی
عزیزاں! بر سرِ نعشم مگریید
چو او خندید، ماتم نیست باقی
بیا ساقی! غنیمت داں دمے چند
نماند جام، چوں جم نیست باقی
صفیر! از وصلِ جاناں میشوی شاد
توقف غیرِ یک دم نیست باقی

طائرِ جانم بہ بندِ پیچ و تابِ دیگر ست
رقصِ بسمل دیگر و ایں اضطرابِ دیگر است
بر تغافل می زنی گاہِ سوالِ مطلبم
ایں سخن را، جانِ مشتاقاں! جوابِ دیگر است
دشمنم می گفتی و دیدی کہ جاں دادم بہجر
بندہ اکنوں آرزومندِ خطابِ دیگر ست

از حسنِ عارضِ تو خجل آفتاب شد
امروز حسنِ مطلع اُو را جواب شد
چوں از رُخِ تو زلف، صبا یک طرف فگند
یک روز ماندہ بود ز عمرم حساب شد

از تپِ ہجر تو دل سخت عذابے دارد
کُشتنم گرچہ گناہ است، ثوابے دارد

قطعۂ فخریہ

تلمیذِ غالبِ شیوا بیاں منم
سازم نوائے غالبِ شیوا بیاں دہد

نہ کردہ ام بخدمتِ او زانوئے ادب
بے خدمتِ چنیں نہ نوائے چناں دہد

آں بحرِ فیض گر بزمیں شد نہاں چہ غم
چہ امروز فیضِ روحِ دمیم ہر زباں دہد

[جلوۂ خضر، ۱: ۲۱۹ - ۲۲۱؛ ایضاً، ۲: ۲۱۲ - ۲۲۶؛
تاریخِ شعرائے بہار: ۱۲۶ - ۱۳۱؛ بہار اور اُردو
شاعری، ۱۱۵ - ۱۲۰؛ خمخانۂ جاوید، ۵: ۳۳۹ -
۱۴۳؛ آبِ بقا: ۷۶ - ۷۹؛ یادگارِ ضیغم: ۱۷۱؛
ماہنامہ آجکل، فروری ۱۹۵۶ء: ۲۷ - ۳۳؛
ایضاً، فروری، ۱۹۵۷ء: ۲۱]

صوفیؔ ـــ سیّد ابو محمّد جلیل الدّین حسین عرف شاہ فرزند علی منیری

یہ خاندان اصل میں ضلع پٹنہ کے موضع شرف آباد یا رتھوکار ہنے والا تھا لیکن صوفی شب ۹ شوال ۱۲۵۳ھ (۶ جنوری ۱۸۳۸ء) کو اپنی نانھیال منیر شریف (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی شاہ اولاد علی نے "مظہرِ حق" سے تاریخ نکالی۔ ان کے والد کا نام سیّد شاہ محمد علی تھا۔ منیر حضرت مخدوم یحییٰ منیری کے مزار کی وجہ سے اہلِ دل میں دور و نزدیک مشہور ہے۔ شاہ فرزند علی کا سلسلۂ نسب، دادھیال کی طرف سے حضرت سیّد علیم الدّین گیسو دراز دانشمند نیشاپوری (دیباجی الحسینی) سے اور ناتھیال کی طرف سے مخدوم شاہ خلیل الدّین برادر مخدوم الملک شاہ شرف الدین بہاری (خلف الرّشید حضرت مخدوم یحییٰ منیری) کے واسطے سے حضرت امام محمد تاج فقیہ فاتحِ منیر تک پہنچتا ہے۔ سیّد علیم الدّین گیسو دراز، حضرت امام جعفر صادق کے پانچویں صاحبزادے محمد دیباج کے واسطے سے رسولِ کریم صلعم سے بارھویں پشت میں تھے۔

صوفی نے ۶ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ (۲۵ فروری ۱۹۰۱ء) کو اسلام پور (ضلع پٹنہ) میں انتقال کیا اور وہیں اپنے سسرالی خاندان کی خانقاہ کی مسجد کے بغل کے جنوبی حصّے میں دفن ہوئے۔ شاہ احتشام الدین حیدر مشرقی نے تاریخ کہی:

شاہ فرزند، عمّ و استاذم — آں کہ شانے بفقرِ اُو افزود
داشت صوفی تخلص اندر شعر — بود شعرش ہمہ ثنا و درود
سالِ نقلش ز دل ہمی جستم — صورتِ مدّعا ولے نہ نمود
ناگہ از ہاتفم رسید بگوش — "صوفیِ وقت و مرشدِ دیں بود"
(۱۳۱۸)

انھوں نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے تین صاحبزادے، سیّد شاہ محمد عبدالقادر

صاحب سجادہ نشین خانقاہِ اسلام پور، حکیم حاجی شاہ محمد عمر صاحب عم امر اور شاہ سید علی صاحب کامل اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ دوسری بیوی سے جناب شاہ اسد اللہ صاحب منیری تھے۔ ان کی اولادِ امجاد اسلام پور اور منیر شریف میں موجود ہے۔

صوفی کا خط بہت پاکیزہ اور خوبصورت تھا۔ ان کی تصنیفات کے قلمی نسخے ان کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ فارسی میں بہت اعلیٰ استعداد تھی۔ عربی بھی اچھی جانتے تھے۔ تاریخگوئی میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ نظم و نثر میں متعدد اُردو فارسی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ جن میں سے مخدوم الملک شاہ شرف الدین کی سوانحمری "وسیلۂ شرف" مشہور تالیف ہے۔ "راحت روح" اردو نثر میں تصوف سے متعلق تمثیل ہے۔ اردو، فارسی کے دیوانوں کے علاوہ تین اُردو کی مثنویاں "لواء الحمد"، "روشِ عشق" اور "کششِ عشق" چھپ چکی ہے۔ لواء الحمد میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ ہے۔ لواء الحمد میں لکھتے ہیں:

فخرِ عالم، گہرِ تاجِ رسُل — خواجۂ کون و مکاں، مرجعِ کُل
قرۂ باصرۂ عینِ حضور — اوّلیں موجۂ دریائے ظہور
نورِ حق، جلوۂ ربّ، شانِ الٰہ — ہے تو بندہ، مگر اللہ اللہ

آخری شعر پر غالب نے چار صاد بنائے اور اسے بہت پسند کیا۔

استاد کی مدح میں ان کے مخالفوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

ہیں شعر کے معرکے میں صفدر غالب — ہاتھ ان کے ہے کھیت یہ ہیں سب پر غالب
اس نام کا پاس ہے خدا کو صوفی — پھر ہوں اسد اللہ نہ کیونکر غالب

سب تیغِ زباں سے انھیں پہچانتے ہیں — غالب ہیں وہ، سب اہلِ سخن جانتے ہیں
یہ شیرِ خدا کے نام کی ہے برکت — لوہا اسد اللہ کا سب مانتے ہیں

صوفی غالب کے آخری دور کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ (۸ مئی ۱۸۶۶ء) کو منیر شریف سے غالب کی مدح میں ایک فارسی قصیدے کے ذریعہ اپنی درخواست تلمذ بھیجی۔ اسی کے ساتھ مذکورۂ صدر تینوں مثنویاں اور کچھ اور کلام بھی اصلاح کے لیے روانہ کیا۔ اس قصیدہ کے چند شعر دیکھیے (بعد اصلاح غالب):

بنورِ خویش خرد جُست دوش راہِ کمال — بکوچۂ دلم افروخت طبع شمعِ خیال

قرار و صبر بہ تعظیمِ اُو ز جا برخاست
نگاہِ شوق دوید از برائے استقبال
خیال گفت کہ یوسف بخوابم آمدہ است
نہ دیدہ بود بہ بیداری ایں چنیں چو جمال
شگفت گفت کہ روزے بخاک بودن تو
دہد ثمر کہ بہ آمد ز خستہ تو مراد نہال
زہے مکانِ فلک پایۂ رفیع الشان
خہے مکینِ فلک رتبۂ ستودہ خصال
نہادہ عینک شمس و قمر بدیدہ، فلک
بشرق و غرب بگرد دیدہ روز و شب مہ و سال
فلک جناب اسد اللہ خان والا جاہ
بصد ہزار رتبہ مسند نشین جاہ و جلال

غالب نے قصیدے کی رسید لکھی اور ان کا تلمذ قبول کر لیا اور اپنی تصنیفات کے نسخے ہدیۃً بھیجے (یہ خط چھپا ہوا موجود ہے)

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

قدمبوسی تری کرتا، زمینِ آستاں ہو کر
خجل ہے آسماں قسمت سے اپنی آسماں ہو کر
اٹک کر رہ گئے زہاد، ہم مے پی کے چل نکلے
گئی ہے راہ کوئے یار کی باغِ جناں ہو کر

گر حسبِ خواہ، گردشِ ایام چاہیے
تو دورِ جامِ مے سحر و شام چاہیے
تقویٰ کی رُت بدل گئی، رندی کے دن پھرے
شیشہ بغل میں، ہاتھ میں جام چاہیے
کل ہم کریں گے عرض کہ رحمت کی نذر کو
ہدیہ گناہ لائے ہیں، انعام چاہیے

لاکھوں دنیا میں ہوں، زہد اور عبادت والے
کہیں دو چار ہی نکلیں گے محبت والے
باتیں اچھی ہیں، برائی ہے تو بس اتنی ہے
نیک اپنے کو سمجھتے ہیں نصیحت والے

جلوے کو تیرے حشر کا کیوں انتظار ہے
جلوہ ترا ہے حشر کا ساماں کہیں جسے
خوش ہوں جنوں سے میں کہ وہ کرتے ہیں التفات
ہے صبحِ عید، چاکِ گریباں کہیں جسے
صوفی! ابتائے منزلِ جاناں کی راہ کون!
اب چپ ہے وہ جرس، دلِ نالاں کہیں جسے

فارسی کی ایک غزل کے چند شعر ہیں۔

در سینہ، دلِ نہاں نہ گنجد
رازم بہ دروں، ازاں نہ گنجد
از قیدِ وجود، ہر کہ وارست
در دائرۂ جہاں نہ گنجد

ساقی قدحے، کہ عجب وپندار | در خاطرِ کشاں نہ گنجد
عشق آمد وحکمِ عقل برخاست | بیک ملک، دو حکمراں نہ گنجد
شورے کہ مراست در سر از عشق | در گنبدِ آسمان نہ گنجد

[معارف (اعظم گڑھ) جون ۱۹۳۲ء؛ ہندستانی: ۱۹۳۵ء: ۲۳، ۳۳؛ تاریخ شعرائے بہار: ۱۳۱، ۱۳۳؛ اردو (کراچی) جولائی تا اکتوبر ۱۹۵۰ء؛ حضرت صوفی منیری کے نثری کارنامے: ۳۱ - ۵۹]

صوفی ـــــ حکیم محمد علی نجیب آبادی

ریاستِ جے پور سے ملازمت کا تعلق تھا ؎

بیٹھے یوں غیر تری مسندِ کمخواب کو داب
بارِ غم کیوں کہ نہ ہوئے، سرِ احباب کو داب

ضیا ـــــ منشی نور محمد

"جناب منشی نور محمد صاحب ضیا تلمیذ غالب مرحوم

اور پہلو میں مجھے کیا چاہیے | اک حسیں اچھے سے اچھا چاہیے
کچھ مریضِ عشق کی بھی ہے دوا | حضرتِ موسیٰ سے پوچھا چاہیے
ہم نیا لائیں کہاں سے روز دل | روز ان کو اک کھلونا چاہیے
آئے دن اس ماہرو کے واسطے | چاند تارے کا دوپٹا چاہیے
مانگ لے مجھ سے وہ آ کر، اے ضیا! | جس کو مضموں کا خزانا چاہیے"

[ماہنامۂ "جلوۂ یار"، میرٹھ، مئی ۱۹۰۹ء (ص ۱۴) بحوالہ "غالبیات: چند عنوانات" (ص ۱۹۷ - ۱۹۸)]

طاؔلب ـــــ سردار محمد خان

افسوس کہ نہ حالات معلوم ہو سکے، نہ کلام ہی دستیاب ہوا۔ صرف اتنا پتہ چلا کہ اُردو کے مشہور ڈراما نویس پنڈت نارائن پرشاد بیتاؔب ان ہی کے شاگرد تھے۔

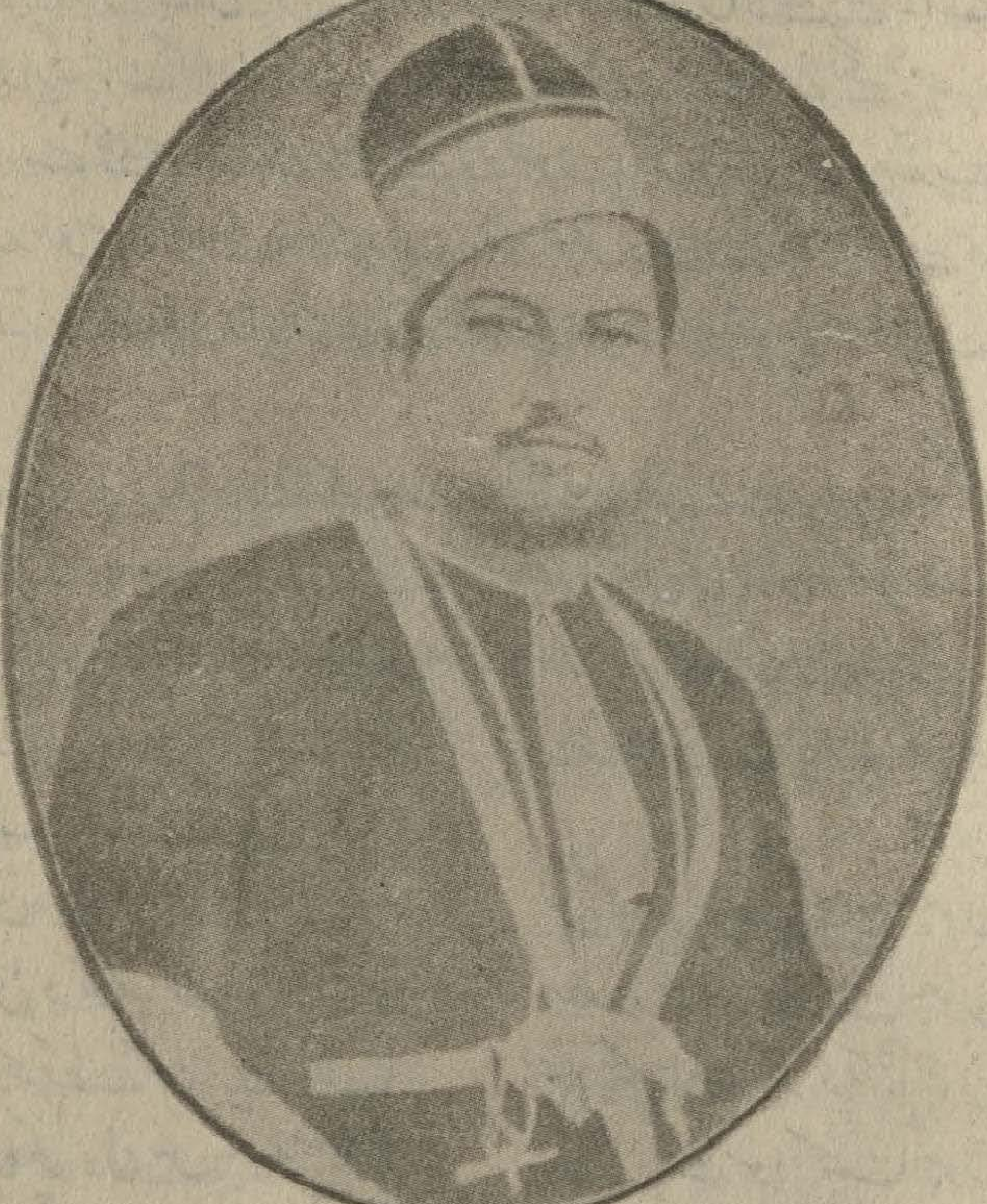
[خمخانۂ جاوید، ۱: ۶۴۱]

طاؔلب ـــــ میرزا سعید الدّین احمد خان عرف نواب احمد سعید خان دہلوی

نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں کے دوسرے بیٹے یعنی میرزا شہاب الدین احمد خان ثاقب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب حضرت کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ ایک مرثیے کی بیت میں کہتے ہیں:

المختصر کہ خادمِ شاہِ نجف ہیں ہم
مشکلکشا ہیں جن کے سلف، وہ خلف ہیں ہم

تعلیم و تربیت اپنے والدِ نامدار کی نگرانی میں پائی۔ چندے دلّی کے سرکاری اسکول میں زیرِ تعلیم رہے۔ لیکن ۱۸۷۳ء میں شادی کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نیر رخشاں کے رسوخ سے اوّلاً دلّی میں ۱۸۷۵ء میں آنریری مجسٹریٹ اور پھر مارچ ۱۸۷۹ء میں لفٹننٹ گورنر، پنجاب سر رابرٹ ایجرٹن کی مردم شناسی کے طفیل عارضی (E. A. C.) بھرتی ہو کر فیروز پور میں تعینات ہوئے۔ سال بھر بعد ۱۸۸۰ء میں محکمانہ امتحان پاس کر لیا تو ملازمت میں مستقل کر دیے گئے۔ کچھ دن کرنال میں رہے۔ وہ اسی عہدے پر ہوشیار پور میں تھے، جب ۲۷ جون ۱۸۸۵ء کو



میرزا سعید الدین احمد خان طالبؔ دہلوی

نیر درخشاں کا انتقال ہوا ہے۔ اس پر مستعفی ہو کر دلّی چلے آئے۔ پھر کوئی ملازمت نہیں کی اور خانہ نشین ہو گئے۔ اس دوران میں دہلی میونسپل کمیٹی کے ممبر نامزد ہو گئے تھے۔

نہایت خوش رُو اور جامہ زیب شخص تھے۔ گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا۔ عام طور پر کاٹھیاواڑ اور بالوترے کی نسل کے گھوڑے اپنی سواری میں رکھتے تھے۔ اتنے ماہر شہسوار تھے کہ سرِ بازار گھوڑے کو الف کر کے اسے پچھلی ٹانگوں سے چلانے لگتے۔ جب سوار ہو کر چاوڑی بازار سے نکلتے، تو لوگ باگ تماشا دیکھنے کو کوٹھوں پر نکل آتے تھے۔ مہذب، متین، وضع کے پابند، وسیع الاخلاق اور منکسر مزاج تھے۔ خوش دل اور بذلہ سنج ایسے کہ جس مجلس میں پہنچ جاتے، وہ زعفران زار بن جاتی۔ شعر بھی نہایت دل آویز انداز میں پڑھتے تھے۔

آخری عمر میں پانو پر ورم آجانے کے باعث زیادہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بروز یکشنبہ ۳۱ اگست ۱۹۱۹ء (۴ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ) کو انتقال کیا، اور درگاہِ قطب صاحب میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی ہڑواڑ یعنی صندل خانہ کے صحن میں دفن ہوئے۔ ان کا نکاح اپریل ۱۸۷۲ء میں بادشاہ بیگم دختر سید احمد شاہ نواب سردھنہ سے ہوا تھا۔ قربان علی بیگ سالک نے اس کی تاریخ کہی:

نیرِ رخشاں، وہ گردوں اقتدار	جن کو مہرِ پُر ضیا کہتا ہوں میں
مظہرِ خلق و کرم لکھتا ہوں میں	مصدرِ جود و سخا کہتا ہوں میں
اس کو بحرِ لطف کہنا ہے بجا	پھر یہ کہتا ہوں کہ "کیا کہتا ہوں میں!"
آپ ہی کچھ دل میں ہو کر منفعل	لاکھ دریا سے سوا کہتا ہوں میں،
پوچھتے ہیں تجھ سے کیا اہلِ جہاں	مژدۂ راحت فزا کہتا ہوں میں،
اس کے فرزندِ سعادتمند کو	کد خدا حق نے کیا، کہتا ہوں میں
انعقادِ بزمِ عشرت خیز کو	جشنِ بہجت انتما کہتا ہوں میں
دُور پھینکا اُس سے تو نے کیوں مجھے	اے فلک، تجھ کو بُرا کہتا ہوں میں
کیا ہوا آنکھوں سے گر دیکھا نہیں	دل شریکِ بزم تھا، کہتا ہوں میں

بسکہ اس شادی کی عشرت عام ہے
"عشرتِ شادی" "بجا" کہتا ہوں میں
(۱۲۸۵ + ۴ = ۱۲۸۹)

لاولد فوت ہوئے۔

نومشقی کے ابتدائی زمانے میں ثاقب اور غالب سے اصلاح لی۔ ان کی وفات کے بعد چند دن سالک اور مولانا حالی سے مشورہ کرتے رہے اور آخر کار اپنے والد کے کہنے پر میر مہدی مجروح کو کلام دکھانے لگے۔ اگرچہ کبھی کبھی اپنے خاندانی ورثے کے زیر اثر فارسی کی ترکیبیں بھی لکھ جاتے ہیں، لیکن بالعموم دلی کی صاف ستھری زبان، محاورہ، روزمرہ اور بلاغت ان کے کلام کے امتیازی نشان ہیں۔ افسوس کہ دیوان شائع نہ ہوا۔ اس کا قلمی نسخہ لوہارو ریاست کے کتب خانے میں تھا اور یہ اب کتب خانۂ رضائیہ رام پور میں محفوظ ہے۔ چند شعر درج ہیں:

یہ سب کچھ ہے طفیل حضرت غالب
وگرنہ ہم میں طالب! خاک طاقت ہے

بہار آئی، یہ سن کر یوں ہوئی محوِ طرب بلبل
کہ ہر کنجِ قفس، اس کی نظر میں اک گلستاں تھا

اُس سے ستم کی وجہ کوئی پوچھتا نہیں
پُرساں ہے اک زمانہ، ہمارے ہی حال کا

طالب کی لو خبر، کہ وہ بیمارِ ناتواں
دنیا میں کوئی دم کے لیے میہماں ہے اب

محتسب نے خوب پی، پیرِ مغاں کے ہاتھ سے
راہ پہ آیا، جو پہنچا مرشدِ کامل کے پاس

ساقیا! ہے بزمِ آخر، دور بھی ہے آخریں
دیکھنا، محروم رہ جائیں نہ اک ساغر سے ہم

اُس کے دَر سے اٹھے اٹھائے ہوئے
ناتوانی ذرا سنبھال ہمیں

اٹھایا جو رخ سے بزم میں اس نے نقاب کو
شوخی نے کچھ بڑھا دیا لطفِ حجاب کو

اپنے بیگانے ہوئے سب، لطفِ ساقی دیکھ کر
پھر گیا ہم سے زمانہ گردشِ ساغر کے ساتھ

مگر چل گیا وارِ تیرِ نگہ کا
خلش دل میں ہے اور پیکاں نہیں ہے

ترے ساتھ تھے، دل کے ارمان سارے
نہیں جب سے تو، کوئی ارماں نہیں ہے

جب یہ چاہا کہ لکھوں میں سوئے دلبر کاغذ
اشکِ خونیں سے ہوا بادۂ احمر کاغذ

نامہ بر کی نہیں پروا کہ رہِ الفت میں
شکلِ تیرِ نظر اُڑ جائیگا بے پر کاغذ

خط کے لکھنے میں پڑا عکس جو عارض کا ترے
ارغوانی تھا، مگر ہو گیا اصفر کاغذ

دلِ خونیں کو نہ کیوں بھیجیں عوض نامے کے
خطِ عاشق کو سدا چاہیے احمر کاغذ

یار کی زلفِ پریشاں کا، جو نقشہ کھینچے
کم سے کم چاہیے بہزاد کو گز بھر کاغذ

نہیں اس میں گنجائشِ کینِ دشمن — وہ دل جس میں تیری محبت بھری ہے
نہیں فکر کچھ، ہم جو بیٹھے ہیں خالی — صراحی تو مے کی لبالب بھری ہے

یہاں تو وہی کی وہی سوجھتی ہے — زمانے کو کیونکر نئی سوجھتی ہے
قیامت کے وعدوں پہ تم جی رہے ہو — تمھیں زاہدا! دور کی سوجھتی ہے
یہاں حال پر ہے ہنسی اپنے آتی — وہ سمجھے، کہ اس کو خوشی سوجھتی ہے

ہیں دلفریب نقش و نگار جہاں والے — کیا اس کا اعتبار رہے، جو مستعار ہے

فغانِ دہلی، (مرتبہ منشی محمد تفضل حسین خان کوکب) میں ان کا یہ قطعہ بھی شامل ہے:

دلّی والوں کی زباں پر ہے بیانِ دہلی — اور فلک پر ہیں ملک مرثیہ خوانِ دہلی
بارے آباد ہوا پھر سے جہانِ دہلی — بنتے جاتے ہیں، جو ٹوٹے ہیں مکانِ دہلی
شہرِ دہلی تھا عجب رشکِ وہ خلدِ بریں — ہمنشیں! تجھ سے کروں خاک بیانِ دہلی
فتنۂ غدر کو ہنگامۂ محشر کہیے — نالۂ صور سے ملتی ہے فغانِ دہلی
سارے عالم میں پھرا، اور سُنی سب کی زباں — پر نہ طالب نے کہیں پائی زبانِ دہلی

ایک نعت کے چند شعر ہیں:

نوعِ بشر میں کیونکہ نہ وہ انتخاب ہو — جس کا ازل سے رحمتِ یزداں خطاب ہو
کُھلتا کسی پہ بھید نہ شانِ نزول کا — الحق کہ تم ہی کاشفِ اُمّ الکتاب ہو
تم سے ملے، تو مل گئے گویا خدا سے ہم — سچ ہے کہ لطفِ خاص سے تم بہرہ یاب ہو
سب آفتابِ حشر کی ٹھنڈی ہوں گرمیاں — ماہِ منیر میرا، اگر بے نقاب ہو
سکتہ ہے تیرے عکس کو بھی تیرے سامنے — آئینہ کہہ رہا ہے کہ تم لاجواب ہو
بندے ترے گناہ کریں جب کہ بیشمار — اللہ، کیوں کرم نہ ترا بیحساب ہو
بیڑا ہے پار، طالب! اگر یہ شرف ملے — آنکھیں ہوں میری اور درِ بوتراب ہو

(گلدستۂ سفینۂ نجات، دہلی یکم دسمبر ۱۸۹۹)

زمانے کی حیا سے ہوگیا ہمراہ قاتل بھی — اٹھا جس دم جنازہ طالبِ مہجورِ جاناں کا
کسی نے اُس سے یوں پوچھا کہ کس کے ساتھ جاتے ہو — تو بولا: ہے جنازہ ایک بیچارے مسلماں کا

(مشاعرۂ دہلی (۱) ۱۲۹۷ھ)

[خمخانۂ جاوید، ۵: ۱۴۱ - ۱۸۱؛ فغانِ دہلی؛ ماہِ نو، کراچی، جنوری، فروری ۱۹۶۹ء؛ "پچاس برس پہلے کی دہلی"، ساقی، جنوری ۱۹۴۶ء]

طالب — سید شیر محمد دہلوی

خمخانۂ جاوید میں دو جگہ اس تخلص کے تحت بالترتیب سید شیر محمد اور منشی شیر محمد خان کا ذکر ہے۔

سید شیر محمد کو غالب کا شاگرد (۵: ۴۰۲-۴۰۳) لکھا گیا ہے، اور شیر محمد خان کو حافظ عبد الرحمن احسان کا (۵: ۴۱۰-۴۱۱)۔ طبقات الشعرائے ہند (ص ۴۱۸ - ۴۱۹) اور گلستانِ بیخزاں (ص ۱۵۱) میں صرف آخر الذکر کا نام ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ دونوں شخص واحد ہوں۔ بہر حال احتیاطاً میں نے صرف مقدم الذکر کا نام یہاں لیا ہے، اور شیر محمد خان کو ترک کر دیا ہے۔

اُس چشمِ سرمگیں سے ملائی نہ آنکھ بھی — لڑنا پڑا ہے اب تو خدایا، قضا کے ساتھ
رنگت نہ ہاتھ پاؤں کی جائے تمام عمر — میرا لہو ملا کے ملو تم حنا کے ساتھ
بچتا کسی طرح سے کوئی شیفتہ نہیں — کیا لاگ ہے اجل کو ترے مبتلا کے ساتھ

طالب یہاں جو کرنا نہ تھا، وہ بھی کر چکے
اب دیکھیے بنے گی وہاں کیا خدا کے ساتھ

[خمخانۂ جاوید، ۵: ۴۰۲-۴۰۳]

طالب ـــ خان بہادر ڈاکٹر محمد حفیظ اللہ اکبر آبادی

شاہی زمانے میں ان کے آباد اجداد اسلحہ سازی میں مہارت رکھتے تھے، اور یہ ایک طرح سے خاندانی پیشہ ہو گیا تھا۔ طالب نے عربی تعلیم اپنے طور پر کی۔ اپنے استاد بھائی محمد اقبال حسین عاشق کے دیوان "افکارِ عاشق" (شامل دیوان) کی جو تقریظ لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو اور فارسی دونوں میں لکھتے تھے۔ اُردو نثر میں بھی اچھی مہارت تھی۔ ۱۹۱۶ء میں انتقال ہوا (؟)

"جو بھلا کرتا ہے، اس کا بھی بھلا ہوتا ہے" اُس کے کوچے میں یہی ہم نے صدا رکھی ہے

لے چلا پھر خیالِ یار مجھے سوے صحرا دکو ہسار مجھے
پھر جنونِ شباب کا ہے جوش مے اُلفت کا ہے خمار مجھے

[شاعر، آگرہ نمبر، ۸۹]

طالب ـــ مولوی محمد ریاض الدین

گلدستہ "ارمغان" سے ان کے پانچ شعر دستیاب ہوئے۔ ان میں سے آخری دو خمخانۂ جاوید میں بھی نقل ہوئے ہیں:

میں یادِ زلف میں جو غریب الوطن ہوا مارِ سیاہ جادۂ راہِ ختن ہوا
مہمان میرے گھر جو بُتِ گلبدن ہوا خلوتکدے کا رنگ بہارِ چمن ہوا
وہ چُپ رہے جو سُن کے سوالِ وصال کو عالم میں لاجواب ہمارا سخن ہوا
کیا اور وصف زاہدِ میکش کا کیجیے بد عہد اس قدر ہے کہ توبہ شکن ہوا
طالب! پسِ فنا نہ ہوا کوئی پردہ پوش میرا لباسِ عمر ہی آخر کفن ہوا

[گلدستۂ ارمغان، حیدر آباد، دسمبر ۱۸۹۶ء: ۱۲؛ خمخانۂ جاوید ۵: ۴۱۱]

طاؔلب (شریف) ـــــ حکیم سید محمد شریف سیتاپوری

سیتاپور کے رہنے والے، حکیم مفتی سید اولاد علی کے فرزند ارجمند طبابت میں اپنے والد کے شاگرد اور حاذق طبیب تھے۔ ان کے والد بھی شعر کہتے اور جریح تخلص کرتے تھے۔ ان کا انتقال غدر ۱۸۵۷ء سے ۸۔۹ برس قبل (۱۸۴۸/ ۱۸۴۹ء میں) ہوا۔ انھوں نے ساری عمر مدّاحیِ اہلبیت رسولِ اکرم میں صرف کردی۔ ان کے ان قصائد کا نامکمل مجموعہ نادم سیتاپوری کے پاس تھا۔

یہ مشہور جعفری نیشاپوری خاندان کے نام لیوا تھے۔ سلسلۂ نسب ۳۲ واسطوں سے امامِ ثامن حضرت جعفرِ صادق تک پہنچتا ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ سید شاہ اسمٰعیل نیشاپور سے ترکِ وطن کرکے ہندستان وارد ہوئے، اور پنجاب اور اودھ کے مختلف مقامات میں سکونت اختیار کرتے ہوئے بالآخر عہدِ شاہجہانی میں یہ خاندان سیتاپور میں مقیم ہوگیا۔

بزرگوں کا چھوڑا ہوا کافی ورثہ تھا۔ سید اولاد علی کے پاس کچھ زمینداری بھی تھی لیکن ان کی وفات کے ساتھ ہی ہوا کا رُخ بدل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ قرض چھوڑ مرے تھے۔ طالب ان جھمیلوں کی تاب نہ لاسکے اور انھوں نے سب چیزوں سے دامن جھاڑ کر لکھنؤ کی راہ لی۔ حاذق طبیب تھے، خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ یہاں پہنچے، تو شاہی خاندان کے کسی مریض کا علاج کیا۔ شافیِ مطلق نے اپنے فضل سے اسے تندرستی ارزانی فرمائی۔ اس پر ان کی شہرت ہوئی اور یہ واجد علی شاہ کے اخیافی بھائی نواب سلیمان قدر کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔

انھوں نے ابتدا میں شریف تخلص اختیار کیا اور مزاولت بھی زیادہ فارسی سے رہی۔ ان ایام میں مشورہ اپنے والد سے رہا۔ لیکن جب غالب سے رجوع کیا تو ان کے تخلص کے وزن پر طالب

اختیار کرلیا اور شریف ترک کر دیا۔ اپنے اُستاد کے عاشق زار تھے۔
معلوم نہیں، لکھنؤ کی سکونت کب اور کیوں ترک کی۔ ممکن ہے جب ۱۸۵۶ء میں خاندانِ اودھ پر زوال آیا اور واجد علی شاہ کلکتے سدھارے ہیں، تو یہ وہاں سے چلے آئے ہوں۔ پھر سرکارِ انگریزی میں ملازمت کر لی۔ معلوم ہوتا ہے، لاہر پور (ضلع سیتاپور) میں بحیثیت سب رجسٹرار قیام رہا۔ جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو اپنے مکان پر آ گئے۔ ان کی زمینداری میں ایک گاؤں اکرکی تھا (اب بھی ہے) زیادہ طور پر یہیں رہتے تھے۔
۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۳۶ (۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء) کو اچانک اپنے وطن سیتاپور میں انتقال کیا۔ وفات کے وقت عمر کم و بیش سو برس کی ہو گی۔ تکیہ مدار اشاہ، محلّہ قضیارا، سیتاپور میں سپردِ خاک ہوئے۔ اولادیں تو بہت ہوئیں، لیکن ان میں سے صرف ایک بیٹا مفتی سیّد احمد شریف اور ایک بیٹی زندہ رہے۔ احمد شریف گہر تخلص کرتے تھے؛ جون ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔ مختصر دیوان یادگار رہ گیا ہے، اس کا انتخاب نادم سیتاپوری نے چھپوایا تھا، اسی سے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

ثابت قدمی کر دلِ شیدا ابھی کچھ اور
واں ہیں ستم حوصلہ فرسا ابھی کچھ اور

بسمل بخوں طپیدہ کہ رنگ پریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں

موجِ صبا پہ بوے گلِ نو دمیدہ ہوں
اک آہِ سرد و نالۂ دردآرمیدہ ہوں

بیتابیِ اپنی طالبِ دلِ خستہ کیا کہوں
نالہ سے رعد، آہ سے برقِ طپیدہ ہوں

تیرے دیوانے کو ہے صحرا کا یوں دامن عزیز
جس طرح یعقوب کو یوسف کا پیراہن عزیز

یوں رقیبِ روسیہ سے اور ہم سے ربط ہے
خار کو رکھتا ہے جیسے دامنِ گلشن عزیز

کبھی دل آپ کو رسوا نہ کرتا
مگر مجبور رمز تا کیا نہ کرتا

جو بھولے سے بھی ہوتی پرسشِ حال
دلِ شوریدہ گھبرایا نہ کرتا

پہلے حیاتِ خضر مہیّا کرے کوئی
پھر انتظارِ وعدۂ فردا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت شمعِ تجلّی کا دے فروغ | شوقِ دلِ کلیم تو پیدا کرے کوئی

طالب! وہ جس کے عیب کو چاہے صفت کرے | داغِ سفید کو یدِ بیضا بنا دیا

جامہ کیسا! نہ رہا رشتۂ جاں بھی تن میں | رہ گیا دستِ جنوں سر بگریباں ہو کر
نابلد ہوں میں دشتِ جنوں سے بالکل | لے چل، اے وحشتِ دل! خضرِ بیاباں ہو کر

واعظ سُنا رہا ہے جو دوزخ کی گرمیاں | کچھ اس میں جورِ یار سے گرمی سوا ہے کیا!
بلبل بوقتِ خندۂ گل نالہ کش نہ ہو | اتنا تو دیکھ لے کہ چمن کی ہوا ہے کیا

باردر گر نہ ہوا نخلِ تمنا، نہ سہی | کیا شجر ہوتے ہیں سب پھولنے پھلنے والے
سخت ہو کیسی ہی منزل، مگر آگے پیچھے | بیٹھتے اٹھتے پہنچ جاتے ہیں، چلنے والے

کچھ کم نہیں شاہی سے ترے در کی گدائی | سایہ تری دیوار کا، سایہ ہے ہُما کا

طالب! آئے بھی، گئے بھی لوگ، اُن کی بزم سے | اور تو وقفِ کشاکشہائے درباں ہی رہا

ہے حُسن و تخیّل میں اک فرق بہر صورت | واں زلف پریشاں ہے، یاں فکر پریشاں ہے

زندگی اُس کی، نصیب اس کا، زمانہ اس کا ہے | جو ہے بیخوفِ عدو، دن رات ہم پہلوئے دوست
طالبِ خلدِ بریں، طالب! ہو کس کے واسطے | دل تمنائے جہاں رکھتا نہیں جز کوئے دوست

فروزاں ہے جو دل میں داغِ عشقِ شعلہ رُویاں کا | گماں ہوتا ہے دُودِ آہ پر، دُودِ چراغاں کا
یہی ہے زورِ گردستِ جنونِ فتنہ ساماں کا | نگہباں ہے خدا ہی صبحِ محشر کے گریباں کا

فروغِ شعلۂ حسنِ رُخِ پُرنور کے آگے
تجلّی اک چراغِ مُردہ ہے گورِ غریباں کا
دہن سے ہر نفس کے ساتھ اک شعلہ نکلتا ہے
فضائے سینہ جولانگاہ ہے کس برقِ تاباں کا
لگی ہے جس کی لو تجھ سے اسے کیا خوفِ صرصر ہو!
چراغِ لالہ کو فانوس ہے دامن بیاباں کا

تمھاری دوستی ہی میری بربادی کو کافی ہے
ضرورت کیا ہے جو دشمن بنے یہ آسماں پھر بھی
بہت جانکاہیوں سے کوششیں کیں طرزِ غالب میں
ہوا ممکن نہ اے طالب! وہ اندازِ بیاں پھر بھی

حمدیہ فارسی مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ثنا ہا ہمہ ایزدِ پاک را
کہ درگنہِ او حسرت ادراک را
دو رنگ آفرینندۂ روز و شب
ثریا عطا سازِ تاکِ عنب (؟)
فرازندۂ کاخِ گرداں سپہر
فروزندۂ گوہرِ ماہ و مہر
دہد نطق و ہم فہم و سمع و بصر
کنی تا کہ ادراکِ نفع و ضرر
سفید و سیاہ و بہ نقشِ کبود
بسے رنگہائے گزین وا نمود
عطا می کند آنچہ می شایدت
کہ ہر یک بہ ہر لحظہ کار آیدت
معین و مددگارِ ہر مستمند
رہانندۂ عاجزاں از گزند
ادا کے شود شکرِ احسانِ او
خوش آنکس کہ پوید بفرمانِ او

[مضمون "غالب کا ایک گمنام شاگرد" از نادم سیتاپوری
مشمولہ نگار رامپور، فروری ۱۹۶۳ء ص ۲۲-۳۰]

طرار —— مرزا سرفراز حسین دہلوی

صرف اتنا معلوم ہوا کہ پنڈت جگموہن ناتھ ٹکو فدا ان کے شاگرد تھے۔

[بہارِ گلشنِ کشمیر، ۲: ۶۱]

طرزی (ثاقب) — مولانا سید قطب الدین دلاور علی جعفری ہاپوڑی

دلاور علی نام اور قطب الدین لقب تھا۔ نسباً حسینی سید تھے یعنی یہ بیٹے تھے سید امداد علی بن اللہ بخش بن سید اویس بن سید محمد بن عبدالکریم کے؛ اسی طرح سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق تک پہنچتا ہے۔ اس خاندان میں سب سے پہلے سید عبدالکریم ہی ہرات سے دلی آئے۔ اس زمانے میں حضرت حسن رسول نما زندہ تھے اور ان کی مجلس علم و ارشاد مرجعِ انام تھی۔ سید عبدالکریم نے بھی ان کی خدمتِ بابرکت میں رہ کے علوم ظاہری و باطنی حاصل کیے۔ پھر ان سے خرقۂ خلافت پایا اور خود ہاپوڑ میں رہ کے مسندِ رشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔

طرزی کے والد سید امداد علی بلند شہر میں وکیلِ سرکار تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں یہ نواب ولی داد خان رئیس مالاگڑھ (ضلع بلند شہر) کے کارمختار اور نائب الریاست تھے۔ جب ہنگامہ ختم ہوا، تو نواب ولی داد خان پر بھی بغاوت کا الزام عائد ہوا اور انھیں موت کی سزا دی گئی۔ سید امداد علی بھی گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس گئے۔ بارے، جان تو بچ گئی لیکن جاداد کے ہاتھ گئی اور یہ ضبط ہو کر نیلام ہو گئی۔ اس کے بعد یہ الور جا کر سررشتہ دار کلکٹری ہو گئے۔

ان کے والد کا ۱۲۹۳ھ میں انتقال ہوا۔ والدہ اس سے پہلے ۱۲۹۰ھ میں رحلت کر چکی تھیں۔ طرزی نے دونوں کے مرثیے لکھے۔ والد کے مرثیے میں ان کے اوصاف بیان کرتے ہیں:

ز صبح تا بمسا، در تلاوتِ قرآں — ز شام تا بسحر، در وظائف و اوراد
ہنردرے کہ بگیتی، بخطِ نستعلیق — ربودہ گوے ز عبدالرشید و میر عماد
کسے بخطِ شفیعا، باو نبود عدیل — کسے بخطِ شکستہ، چو او نبود استاد

زہے، زبخشش وجود تو، شہرت آبا | خہے، بخوے نکوئی تو نازشِ اجداد

......

شدم بامر تو آں کہ بکشورِ میوات | اگرچہ کوہِ غمے بر سرِ دلم افتاد
نبودم از تو جدا ہیچ گاہ در ہمہ عمر | بروزِ واقعہ ماندم جدا کہ شرمم باد
میانۂ نود و سہ پس از ہزار و دو بیست | زسالِ ہجرتم ایں سخت واقعہ رُوداد

(۱۲۹۳ھ)

والدہ کے مرثیے میں لکھتے ہیں:

مادرِ مشفقم کہ در شفقت | مثلِ اُو مادرِ زمانہ نزاد
نود افزوں زیک ہزار و دویست | رخت بر بست ازیں خراب آباد

(۱۲۹۰ھ)

طرزی نے غالب و حسرتی (شیفتہ) و آزردہ کی وفات کے بعد ایک مرثیے میں تینوں کو یاد کیا ہے؛ اس میں لکھتے ہیں:

نادیدہ ہیچ عیش بسی سالہ زندگی | ناچیدہ برگِ گل، زگلستانِ روزگار
گاہے زموتِ حسرتی و غالب، آہ کش | گاہے بمرگِ حضرتِ آزردہ سوگوار

آزردہ، غالب اور حسرتی تینوں کا آگے پیچھے ۱۲۸۵ھ اور ۱۲۸۶ھ میں انتقال ہوا۔ اگر طرزی نے یہاں "سی سال" سے محض طویل زمانے کا استعارہ نہیں کیا، بلکہ واقعی اپنی عمر ظاہر کی ہے، تو اس سے معلوم ہوگا کہ وہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ - ۱۸۴۱) میں پیدا ہوئے؛ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳-۱۸۷۴ء) میں جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا ہے، تو ان کی عمر ۳۳ - ۳۴ سال کی ہوگی؛ اور والد کے انتقال (۱۲۹۳ھ) کے وقت ۳۶ - ۳۷ سال کی۔

طرزی بلند شہر ہی میں پیدا ہوئے اور ان کی ابتدائی تعلیم بھی اسی جگہ ہوئی۔ جب یہاں سے فارغ ہوئے تو تکمیل کے لیے دلّی پہنچے اور مفتی صدر الدّین خان صدر الصّدور سے منطق اور ریاضی، اور مولانا مملوک العلی نانوتوی سے حدیث اور ادبِ عربی اور مولوی سید الدین سے فارسی پڑھی۔ درسیاتِ متعارفہ کے علاوہ طب اور مصوّری اور خوشنویسی میں بھی مہارت پیدا کی۔ طب حکیم امام الدّین خان سے پڑھی۔ خوشنویسی میں میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ فنِ سپہگری میں بھی ماہر اور خصوصاً بنوٹ کے اُستاد تھے۔ شطرنج بھی بہت اچھی کھیلتے تھے۔

پتنگ بازی کا بھی شوق تھا۔
دلّی میں تعلیم ختم کرنے کے بعد ہاپوڑ کے سرکاری اسکول میں صدر مدرس (ہیڈ ماسٹر) مقرر ہوئے۔ ریاضیات میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ یہاں ایک دن ڈپٹی انسپکٹر مدارس سے کسی ریاضی کے مسئلے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہ گھر پر آئے اور استعفےٰ لکھ کر بھیج دیا۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب نے کتنا کہا، کہ میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے، آپ استعفیٰ واپس لے لیں لیکن یہ اپنی ضد پر قائم رہے اور نوکری ترک کر دی۔ اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ اور وہاں بندوبست میں ناظر اوّل مقرر ہو گئے، پھر منصرم بن گئے اور بندوبست ختم ہوتے تک اسی عہدے پر رہے۔ اس زمانے میں فارسی کے مشہور شاعر خواجہ عزیز الدین عزیز زندہ تھے۔ طرزی اور ان کے درمیان بہت گہرے دوستانہ تعلّقات پیدا ہو گئے (عزیز کے کلیات میں بھی ایک خط طرزی کے نام موجود ہے)۔
جب سیّد امداد علی کا انتقال ہوا، تو طرزی اپنے والد کی جگہ الور میں سر رشتہ دار کلکٹری مقرر ہوئے۔ یہاں سے تحصیلدار ہو کے رام گڑھ گئے اور آخیر میں ترقی کر کے ۱۸۸۷ء میں ریاست کے چیف مجسٹریٹ ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے پنشن لی اور اس کے بعد مستقلاً ہاپوڑ میں رہنے لگے۔ یہیں چند روز بعارضۂ بخار علیل رہ کر ۴ شوال ۱۳۲۹ھ (۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء) کو واصل بحق ہوئے۔ ان کے دوست قاضی محمد علیم سہنوی نے تاریخ کہی:

چو واحسرتا! طرزیِ خوش بیاں	بحق جانِ خود داد و در قبر خُفت
بہجری علیم حزیں سالِ فوت	"غم طرزیِ پاک دل آہ" گفت
	(۱۳۲۹ھ)

عیسوی تاریخ ہوئی:

رفتہ بخلد بریں طرزیِ شیریں بیاں	باد بُرد حش لبیے رحمتِ تو، یا خدا!
سالِ مسیحی علیم گفتہ پے یادگار	"وائے دریغا بمرد طرزیِ اہلِ صفا"
	۱۹۱۱ء

ہاپوڑ ہی میں مدفون ہیں۔ لوحِ قبر پر علیم ہی کا لکھا ہوا یہ کتبہ ہے:

یا غفار، واحد و واجب

آہ طرزی زجہاں رفت وکنوں (۱۳۲۹)	اندریں قبر دریغا خُفتہ
بہرِ تاریخ، علیم ایں مصرع	"تربتِ طرزیِ نامی گفتہ"
	(۱۳۲۹ھ)

بڑی آن بان اور وضع کے بزرگ تھے۔ بعض معمول ایسے تھے، جن میں عمر بھر فرق نہیں آیا۔ مثلاً روزانہ بعدِ ظہر کپڑے بدل لیتے تھے۔ تیسرے روز صافہ یا اچکن یا انگرکھا بدلتے۔ ساری عمر کوٹ، شیروانی وغیرہ استعمال نہیں کی۔ جوتا ہمیشہ زردمخمل کا پہنتے اور مہینے کی پہلی تاریخ کو اُسے بدل ڈالتے، حالانکہ ٹوٹنا تو درکنار، ابھی یہ میلا بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسے لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں!

اپنے پیچھے اولادِ جسمانی کوئی نہیں چھوڑی۔ دو بیٹے تھے: سعید اور سیّد احمد۔ ان کے لیے ایک قطعے میں دعا کرتے ہیں، لیکن افسوس، دونوں نے داغِ مفارقت دیا۔

دو فرزندم سعید و سیّد احمد — کہ نورِ دیدہ و آرامِ جانند
سعید و نیک خوی و نیک بختند — تو گوئی با سعادت توامانند
الٰہی، برخورند از عمر و دولت — ہمیشہ تا جہاں ماند، بمانند

ان کے چھوٹے بھائی سیّد نظام الدین تھے۔ یہ حافظِ قرآن اور شاعر بھی تھے، نظام اور نظامی دو تخلص کرتے تھے۔ طرزی نے اس کے بعد ان کے بڑے بیٹے سیّد احمد کو متبنّیٰ کر لیا۔ ان کا بھی اگست ۱۹۴۸ء میں انتقال ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے لاہور میں ڈاکٹری کرتے تھے۔ خاندان کی ایک شاخ ہاپوڑ میں بھی ہے۔

دلّی کی تعلیم کے دوران ہی میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ وہ فضا ہی ایسی تھی کہ کوئی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر یہ تو اپنی تعلیم کے سلسلے میں مفتی صدر الدّین آزردہ کے ہاں جاتے آتے ہی رہتے تھے۔ ان ہی کے واسطے سے غالبؔ، صہبائیؔ، شیفتہؔ اور دوسرے اساتذۂ وقت سے مراسم پیدا ہوئے۔ آغاز میں ثاقبؔ تخلص کرتے اور آزردہ سے اصلاح لیتے رہے۔ اُستاد نے ثاقب بدل کر تخلص طرزی کر دیا (تذکرہ یادگارِ ضیغم میں نام ثاقب ہی کے تحت ہے) غالباً اسی زمانے میں غالبؔ سے مشورہ کرنے لگے[۵]۔ اردو میں بھی کچھ نہیں کہا، ہمیشہ

---

۵ تذکرۂ ضیغم میں ہے: "فنِ شعر میں غالب مرحوم دہلوی اور مہر گوپال تفتہ سکندر آبادی کے شاگرد ہیں۔" اظہر ہاپوڑی مرحوم جو طرزی کے ملنے والے، بلکہ ان کے کچھ رشتے دار بھی تھے، تفتہ کے تلمذ کے منکر تھے۔

فارسی لکھا کیے۔ شروع میں عام روش کے مطابق مذہب سے کچھ زیادہ تعلق نہیں تھا۔ چنانچہ شاعری میں بھی وہی رسمی عاشقانہ اور فلسفیانہ مضامین لکھتے رہے لیکن آخر میں مولانا شاہ بہاء الدین امروہی کے ہاتھ پر بیعت کرکے ان باتوں سے ہاتھ اٹھالیا اور پرانی قسم کے پکے حنفی مولوی بن گئے۔

فارسی کے دو دیوان (ایک غزلیات کا، دوسرا قصاید کا) اور ریاضیات میں ایک کتاب "تہذیبِ اقلیدس" مطبوعہ موجود ہیں۔ قصائد میں ایک قصیدہ غالبؔ کی مدح میں بھی ہے۔ بہت پختہ اور مرصّع کلام ہے۔ ہر ایک شعر سے ان کی قدرتِ زبان اور نکتہ آفرینی کا ثبوت ملتا ہے۔

ان کی غزلیات میں واقعی غزل ہے یعنی سادہ زبان اور دلی جذبات اور خلوص؛ نہ پیچ، نہ فلسفہ، نہ دور از کار استعارہ اور تشبیہ۔ وہ جو متاخرین نے غزل کو الفاظ کا گورکھ دھندا بنا دیا ہے، اس کا طرزیؔ کے کلام میں کہیں نشان نہیں۔ ان کا کلام دیکھ کر سعدیؔ اور خسروؔ یاد آجاتے ہیں۔ نمونہ دیکھیے:

آخر اے یارِ سفر کردہ! کجائی، باز آ
بیش ازیں نیست مرا تابِ جدائی باز آ

طرزیؔ! الحق کہ قیامت نرسد پیش از وقت
مگر آں وقت کہ از یار شود یار جُدا

بُردی از خانہ بحیلہ غیر را بیرونِ در
سُوے من باز آمدی، نازم باحسانِ شما

از غمِ دوریم، آرامِ دلِ زار کجاست
باشد آرامِ دل از یار، وے یار کجاست!

حاش اللہ کہ ترکِ تو در آید بخیال
ایں خیال، اے بُتِ طنّاز! نمی دانم چیست

غیر گوید سخن تلخ و بسویت نگرد!
دانم ایں جرأتِ بیجاش بایمائے ہست

طرزی! چو بود رنجشِ بیجا ازیں طرف
شرمندہ پیشِ او شدم از گفتگوے صلح

قسمت ایں بود کہ در راہ بمانم وز دور
من بحسرت نگراں باشم و محمل برود

مگر چہ دل بر سر صد شکوۂ بیداد رود
چوں کنی نیم نگاہے، ہمہ از یاد رود

آہ ازاں حیلہ کہ از ہم نفسے می آید
مضطرب گشتن و گفتن کہ کسے می آید
از پئے رخصتم از بزم مگر خاستہ
کہ ازیں نوع ترا حیلہ بسے می آید
اں قدر ہست نصیبم ز گلستاں طرزیؔ
کہ نسیمے ز شگافِ قفسے می آید

ز بیتابیِ وشوق از اوّلِ شب تا سحر طرزیؔ
رود ہر لحظہ زاں کوے وہماں دم باز می آید

طرزیؔ آورد ز ہر باب سخن وقتِ وداع
تا بتقریبِ سخن ہمرہِ محمل برود

بہر کس بے سبب ہم گفتگوے می کنم تا دیر
کہ باشد حیلۂ از بہرِ ماندن زیرِ دیوارش

باُو آہستہ گوئیم حرفِ مطلب، چوں کسے آید
باواز بلند از مصلحت حرفِ دگر گوئیم

باہمہ رشکِ رقابت، ہر دم آیم سوے تو
نیست آں صبرم کہ یک ساعت نہ بینم روے تو

تا بوصلِ خویشتن اُمید وارم کردہ
زاں شکایت ہا، کہ کردم، شرمسارم کردہ

[خطوطِ مولانا معشوق حسین اطہر ہاپوڑی مرحوم د
سید محمد جمیل ہاپوڑی بنام مؤلف؛ یادگارِ ضیغم: ۹۳،
۹۴؛ دودِ چراغِ محفل]

ظفر — ظلِّ سبحانی ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تاجدارِ دہلی

ظفر کے خاندان کا حال کیا لکھا جائے کہ اس سے ہندستان کی تاریخ کے صفحات روشن ہیں۔ مختصر اً یہ کہ ہندستان میں جس خاندانِ مغلیہ کی ابتدا ۱۵۲۶ء میں بابر کے ہاتھوں پڑی تھی ظفر اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے۔ ظفر کے دادا شاہ عالم ثانی آفتاب تخلص کا نام اس لحاظ سے مشہور ہے کہ غلام قادر روہیلے نے ان کی آنکھیں نکلوا دی تھیں اور انھیں کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو لال قلعہ دہلی پر وہ تصرّف حاصل ہوا جس کا نتیجہ "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ شاہ عالم ۱۸ نومبر ۱۸۰۶ء (۷ رمضان ۱۲۲۱ھ) کو رہگرائے عالمِ بقا ہوئے اور ان کے بعد ان کے دوسرے بیٹے اکبر شاہ ثانی جلوہ آرائے سریرِ سلطنت ہوئے ظفر ان ہی اکبر شاہ ثانی کے بڑے بیٹے تھے۔ بدھ ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ (۳۰ اکتوبر ۱۷۷۵ء) لال قلعہ میں ایک ہندو لانی لال بائی کے بطن سے پیدا ہوئے۔

اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے بعد قانونی طور پر ظفر کو ولی عہدِ سلطنت ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اکبر شاہ اپنے دوسرے بیٹے جہانگیر کو ولی عہد مقرر کرنا چاہتے تھے، جو ان کی چہیتی بیگم نواب ممتاز محل کے بطن سے تھے۔ جب انگریزوں نے انھیں اس سے منع کیا کہ یہ ناانصافی ہے، تو اس پر انھوں نے جھلا کے کہہ دیا کہ سراج الدین میرا بیٹا ہی نہیں۔ ان ذہنی اور روحانی صدموں کے سامنے بھی ظفر کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ ان کا مقولہ تھا۔ "خدا دارم، چہ غم دارم"۔ قادرِ مطلق خدا دیکھ رہا تھا اور انسانِ ضعیف البنیاں کی خام خیالیو پر ہنس رہا تھا۔

جہانگیر کے مزاج میں شورش بہت تھی، شامتِ اعمال انھوں نے ایک دن انگریز ریذیڈنٹ آرچبولڈ سیٹن پر طپنچہ داغ دیا۔ بارے وار خالی گیا اور ریذیڈنٹ کی جان بچ گئی۔

لیکن ان کے ماتھے گئی۔ یہ گرفتار کر کے الٰہ آباد بھیج دیے گئے۔ یہی واقعہ دلّی کے مشہور میلے "پھول والوں کی سیر" کا باعث بن گیا۔ ہوا یوں کہ اُن کی والدہ نواب ممتاز محل نے منّت مانی کہ میرزا جہانگیر رہا ہو کر آجائینگے تو میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤنگی۔ جب یہ الٰہ آباد سے واپس آئے، تو یہ منّت پوری کی گئی۔ پھول والوں نے ایک جدّت کی کہ چھپر کھٹ میں پھولوں کا ایک پنکھا بھی لٹکا دیا۔ یہ چھپر کھٹ بڑی دھوم دھام سے قطب صاحب پہنچایا گیا اور بادشاہ کی چہیتی بیگم کی خاطر سے قلعے اور شہر کے لوگ اُمنڈ کے تماشا دیکھنے کو آئے۔ جنگل میں منگل ہو گیا، اور ایک میلا سا لگ گیا۔ اکبر شاہ کو یہ بہت پسند آیا۔ حکم دیا کہ ہر سال ساون کے مہینے میں اسی طرح چھپرکھٹ نذر دیا جائے۔ چنانچہ یہ میلہ اب تک ہر سال دلّی میں ہوتا ہے۔

میرزا جہانگیر آنے کو تو آ گئے، لیکن ان کے مزاج کی وحشت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جلد ہی پھر ایسی حرکت کی واپس الٰہ آباد بھیج دیے گئے، جہاں کثرتِ شراب نوشی سے ۱۸۲۱ء (۱۲۳۶ھ) میں انتقال ہو گیا۔ شاہ نصیر نے تاریخ کہی۔ "ماتم جہانگیر ست آہ" (۱۲۳۶ھ) وفات کے وقت عمر صرف ۳۱ برس تھی۔ لاش الٰہ آباد سے دلّی لائی گئی اور سلطان جی کی مسجد کے صحن میں ایک خاص مجحر کے اندر دفن ہوئی۔

انگریزوں نے اب اعلان کر دیا کہ ہم ظفر کے سوائے کسی اور کو ولی عہد تسلیم نہیں کرینگے۔ ظفر نے لکھا:

کیسی تدبیر ظفر، جب وہ کرے اپنا کرم
کام بگڑے ہوئے بن جائیں یونہی آپسے آپ

اکبر شاہ ثانی ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو ۸۲ برس کی عمر میں عالمِ جاودانی کو سدھارے اور اُن کی جگہ ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی، ظفر تخلص تختِ دہلی پر جلوہ آرا ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۶۲ برس کی تھی۔ صہبائی نے تاریخ کہی:

از نشۂ دولت بہادر شاہی — شد پُر زمے طرب، ایاغ دہلی
بنشست بہ تختِ دولتِ روز افزوں — نزہت بفزود از و بہ باغ دہلی
تاریخ جلوس آں شہِ والاقدر — آمد بہ لبِ خرد: "چراغ دہلی"

(۱۲۵۳ھ)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شاہی نام کی تھی۔ کہنے والے تو ان کے دادا کے وقت ہی سے کہنے لگے



ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفرؔ دہلوی

تھے "عملداری شاہ عالم، از دہلی تا پالم" (پالم دلّی سے سات کوس پر ہے) ظفر تک پہنچتے پہنچتے یہ اور بھی مختصر ہو گئی۔ لال قلعہ، دلّی کے باہر حکومت اور انتظام کمپنی بہادر کا تھا۔ یہ صرف قلعہ کی چار دیواری کے اندر تک کے بادشاہ تھے۔ کارکنانِ قضا و قدر کے ترکش میں ابھی ایک اور تیر باقی تھا۔ انھیں اس بوڑھے، خدا ترس، دیندار بادشاہ کا یہ گوشۂ عافیت بھی نہ بھایا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں دیسی فوج نے انگریزوں کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یہ فوج میرٹھ سے آ کر دلّی پر قابض ہو گئی اور بہادر شاہ کے شہنشاہِ ہندستان ہونے کا اعلان کر دیا۔ ابھی اس اعلان پر مشکل سے چار ماہ گزرے تھے، کہ ستمبر میں انگریزوں نے ہندستانی فوج کو شکست دی اور دوبارہ شہر اور قلعہ پر بھی مسلّط ہو گئے۔ بہادر شاہ نے قلعے سے راہِ فرار اختیار کی اور اپنے دادا ہمایوں بادشاہ کے مقبرے میں پناہ لی۔ مخبر نے انگریزوں کو پرچہ دیا کہ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں چھپا بیٹھا ہے۔ کپتان ہاڈسن انھیں شہر لانے کے لیے پہنچا۔ بادشاہ نے پہلے تو انکار کیا، وہ بھلا کیسے اس کا اعتبار کر لیتے۔ لیکن ہاڈسن کے وعدہ کرنے اور مرزا الٰہی بخش کے سمجھانے بجھانے پر کہ اُن کی جان پر آنچ نہ آئیگی، اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ ان کی جان کی امان کی ضمانت انگریز جرنیل ولسن نے بھی دی۔ دیکھا جائے تو وہ سپردگی کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے! قصّہ کوتاہ یہ پکڑے آئے اور زینت باڑی (لال کنواں) میں نظر بند کر دیے گئے۔ ایّامِ نظر بندی میں پانچ روپیہ یومیہ خرچ کے لیے ملتے تھے۔

جب ملک میں دوبارہ ہر جگہ انگریزوں کا پورا تسلّط ہو گیا اور کسی طرف سے خطرہ نہ رہا تو سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب کی منظوری سے ظفر پر مقدمہ قائم ہوا اور انھیں ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو دیوانِ خاص میں ایک فوجی کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا۔ فردِ جرم یہ تھی:

(۱) فوجی باغیوں (جرنیل محمد بخت خان) کی امداد و اعانت۔

(۲) شاہزادے مرزا مغل اور دوسرے اشخاص کو حکومتِ انگریز کے خلاف جنگ کرنے پر اُبھارنا اور ان کی مدد کرنا۔

(۳) انگریزی حکومت کی رعایا ہونے کے باوجود اپنی بادشاہت کا اعلان اور حکومت کے خلاف جنگ۔

(۴) اُنچاس[۴۹] عیسائیوں کا قتل کرانا اور قاتلوں کی اعانت مجرمانہ۔

سب سے پہلے تو جو فوجی عدالت ظفر کے مقدمہ کی سماعت کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی، اُسے ظفر پر مقدمہ چلانے کا کوئی اختیار ہی نہیں تھا، نہ ملکی قانون کی رُو سے، نہ بین الاقوامی قانون کے تحت۔ ظفر انگریزوں کی رعایا نہیں تھے۔ ہندستان میں وہ خود قانون کے بنانے والے اور اس کے نافذ کرنے والے تھے۔ چونکہ وہ شاہِ ہندستان کی حیثیت سے سلطنت اور اس کے مرکز تھے، اس لیے وہ قانون سے بالا تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ظفر نے مقدمہ کی کارروائی میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ لیکن آخر میں ایک بیان دیا جس میں جرم سے انکار کیا اور کہا کہ میں مجبورِ محض اور باغیوں کا قیدی تھا۔ القصّہ بنا بنایا کیا تھا۔ مقدمہ ۹ مارچ کو ختم ہوا۔ کمیشن نے فیصلہ کیا کہ ظفر نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے تمام معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غدّاری کی اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصّہ لیا، اس لیے یہ سزائے موت کے مستحق ہیں۔ کمیشن نے اپنا فیصلہ سر جان لارنس کے پاس کلکتے بھیج دیا اور اس نے اپنی سفارشات کے ساتھ اسے مرکزی حکومت کو کلکتے بھیج دیا۔ آخری حکم یہ صادر ہوا کہ ظفر کو جلاوطن کر کے زنگون بھیج دیا جائے۔ ان کی ملکہ زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کو اختیار ہے کہ بادشاہ کے ساتھ چلے جائیں یا کلکتے میں نظر بند رہیں۔ ان دونوں نے ظفر کے ساتھ جانے کو ترجیح دی۔

یہ مختصر قافلہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں کلکتے سے زنگون پہنچا۔ انگریزوں نے چھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا، جو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ چار سال نہایت عُسرت اور مصیبت میں بسر کرنے کے بعد، ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو مغرب کے قریب بعارضۂ فالج جان بحق ہوئے۔ اِنّا للہ وَ اِنّا الیہ راجعون۔ نسّاخ نے تاریخ کہی:

واے ویلا، چوں بہادر شاہ مُرد — عالمے شد باغم و بار نج جُفت
سال ترحیلش مَلک از آسماں — ناگہاں "بخشایشِ اللہ" گفت
(۱۲۷۹)

موت کے وقت عمر ۸۷ برس کی تھی۔ وہیں زنگون میں بدھوں کے مشہور شوڈگون پگوڈا کے نواح میں بہادر شاہ ظفر روڈ پر آخری آرامگاہ ہے۔ آرامگاہ تو کیا، چشمِ بصیرت کے لیے سامانِ صد عبرت ہے۔ ایک مختصر چوکھنڈی کے اندر سنگ مرمر کا سادہ سا تعویذ ہے۔ اُن کے دائیں طرف ملکہ زینت محل محوِ خواب ہیں۔* دوسری طرف کی قبر کس کی ہے، اس کا تعین نہیں، لیکن یقیناً

* زینت محل کی وفات ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو زنگون میں ہوئی اور جوان بخت کی ۱۸۸۴ء میں مولمین (شمالی برما) میں۔

یہ بھی ہو گی شاہی خاندان ہی کے کسی فرد کی۔ پچھلی جنگ سے پہلے ایک تحریک شروع ہوئی تھی۔ کہ قبر ان کے شایانِ شان تعمیر کر دی جائے۔ کافی سرمایہ بھی جمع ہو گیا تھا اور کام بھی ہونے لگا تھا کہ جنگ شروع ہو گئی۔ شاید شاہی خاندان ہی کے کوئی نام لیوا قبر کے مجاور رہیں۔ اس وقت قبر کے سرہانے یہ کتبہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاندانِ مغلیہ کا آخری چراغ

حضرت ابوظفر سراج الدّین بہادر شاہ ظفر رحمۃ اللہ علیہ

۱۸۳۷ جلوس تا ۱۸۵۸ء

آج بتاریخ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق تاریخ ۱۴ جمادی الاوّل ۱۲۷۹ھ دن جمعہ کو وہ روح جو نواسی سال بہادر شاہ کے جسم میں موجود رہی۔ زندگی کے تمام تماشے دکھا کر وداع کی تیاری کر رہی ہے۔ دن ڈھل چکا ہے اور دن کے ساتھ ہی بادشاہ کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔ رنگون کی خاک اس کو آغوش میں لیتی ہے جو خاندانِ تیموریہ کا آخری چراغ تھا، جس نے جہان آباد میں جنم لیا۔ وہ وطن سے ہزار کوس دور ایک معمولی پلنگ پر دم توڑ رہا ہے۔ سکرات طاری ہے، سانس اکھڑ چکا ہے، جس کی زندگی سچ مچ کا میلہ تھا جس نے زندگی کا ہر لمحہ جمگھٹوں میں گذارا، آج صرف تین آدمی، ایک بیوی اور دو بچے اس کے دمِ واپسیں میں ساتھ ہیں۔ آفتاب ابھی غروب نہ ہوا تھا کہ اس بادشاہ نے فانی دنیا کو اپنی عشرت کی تصویر دکھا کر دنیا سے کوچ کیا اور شاہ جہان آباد کا یہ گوہرِ آبدار رنگون کی خاک میں ابدی نیند سو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

تاریخ وفات

چودہ جمادی الاولیں، جمعہ کا روز وقتِ عصر
حالتِ قید و بیکسی، تھی یہ گھڑی بہت کٹھن

وقت نے شاہِ ہند سے عرض کیا وطن سے دور
خلد ہے آپ کا وطن اے "ظفر جلا وطن"

(۱۲۷۹ھ)

ظفر کی رسمی تعلیم بہت اچھی تھی۔ سب سے پہلے حافظ ابراہیم (شمس العلماء منشی ذکاءاللہ کے دادا) ان کے اتالیق مقرر ہوئے۔ قاری محمد خلیل نے قرآن پڑھایا۔ مرصّع قلم سیّد جلال الدین حیدر اور ان کے والد میر ابراہیم علی دونوں سے خوشنویسی کی مشق بہم پہنچائی اور سند تکمیل حاصل کی۔ اس کے علاوہ مردانہ فنون میں تیراندازی، تیغ زنی، نشانہ بازی، بانک بنوٹ، لکڑی، شہسواری میں مہارتِ تامّہ رکھتے تھے۔ شہسواری سے متعلق مشہور تھا، کہ ان کے زمانے میں ہندستان بھر میں صرف ڈھائی سوار تھے۔ سالم ایک یہ خود اور ایک ان کے چھوٹے بھائی مرزا جہانگیر اور آدھے کوئی اور بزرگوار۔ ان علوم کے علاوہ اپنے زمانے کے عام ذوق کی رعایت سے بیٹر بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی کا بھی شوق تھا۔

ظفر نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا۔ سب سے پہلے میر قدرت اللہ قاسم (صاحبِ تذکرۂ مجموعۂ نغز) کے صاحبزادے میر عزت اللہ عشق سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد جب دلّی میں شاہ نصیر کا طوطی بولنے لگا، تو یہ بھی اُن سے اصلاح لینے لگے۔ جب نصیر دکن گئے، تو میر کاظم حسین بیقرار سے مشورہ کرنے لگے۔ لیکن اس شاہِ سخن کی استادی کا شرف ازل سے شیخ محمد ابراہیم ذوق کی قسمت میں لکھا تھا۔ ۱۸۰۸ء میں بیقرار بھی ماؤنٹ سٹوارٹ الفنسٹن کے ساتھ میر منشی بن کے کابل سدھارے اور یوں میدان ذوق کے لیے خالی ہو گیا۔ چار روپیہ مہینا تنخواہ مقرر ہوئی، اور ذوق ولی عہدِ سلطنت کے استاد بن گئے۔ تھوڑے دن بعد ترقی ہوئی تو آٹھ ہو گئے۔ جب ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے تو مشاہرہ تیس روپے مقرر ہوا۔ بعد کو اور اضافہ ہوا تو ایک سو روپے ماہانہ ہو گیا، جو انھیں موت تک (۱۸۵۴ء) ملتا رہا۔

ذوق کے انتقال کے بعد غالب استادِ شہ مقرر ہوئے۔ انھوں نے تین برس تک یہ خدمت انجام دی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رونما ہوا۔ وہ بساط ہی الٹ گئی، نہ قلعۂ معلّے رہا، نہ اُستاد رہے، نہ شاگرد۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

ظفر نے طبیعت بہت دردمند پائی تھی۔ اگرچہ انھوں نے آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی اپنے ارد گرد عیش و عشرت کے سامان دیکھے۔ بعد کو خود ولی عہدِ سلطنت بنے، لیکن زوالِ حکومت اور انگریزی اقدام نے خاندانِ شاہی کا حال بہت پتلا کر دیا تھا۔ شاہ عالم ثانی کو بسر اوقات کے لیے ساٹھ ہزار روپیہ ماہانہ ملتا رہا جس میں سے ظفر کے والد اکبر شاہ کو حصّہ رسدی

دس ہزار ملتے تھے۔ جب اکبر شاہ تخت پر بیٹھے، تو ان کے اختیارات میں اور بھی کتر بیونت ہوئی۔ ۱۸۳۲ء میں پہلے دلّی صوبۂ غرب و شمال کی عملداری میں شامل ہوئی اور ۱۸۳۵ء میں سکّہ بھی کمپنی بہادر کا چلنے لگا۔ الغرض ظفر کی تخت نشینی (۱۸۳۷ء) سے پہلے ہی خاندان مغلیہ کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ بادشاہ کا اختیار لال قلعے میں بھی کامل نہیں تھا۔ ان سب انقلابات نے ظفر کی حسّاس طبیعت پر بہت اثر کیا۔ ان کا رجحان شروع سے مذہب اور تصوّف کی طرف تھا۔ وہ حضرت مولانا فخر الدّین کے گھرانے کے مُرید تھے اور آخر میں خود بھی لوگوں کو مُرید کرنے لگے تھے۔ یہ شوق اس حد تک بڑھا کہ انھوں نے گلستانِ سعدی کی ایک شرح لکھی، جس میں تصوّف کے نکات بیان کیے؛ اور اُن کے ایماء پر مفتی میر لال نے ایک کتاب سراج المعرفت اوراد و اشغال کے بیان میں لکھی۔ غرض جیسا کہ غالب نے کہا ہے، واقعی شاہی اور درویشی ظفر کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔ ان کے کلام میں یہ تمام داخلی اور خارجی اثرات نمایاں ہیں۔

* حضرت مولانا فخر الدّین چشتی، ۱۷ ربیع الاول ۱۱۲۶ھ (۲۲ مارچ ۱۷۱۴ء) کو پیدا ہوئے۔ وہ مولانا نظام الدّین اورنگ آبادی کے چھوٹے بیٹے تھے جو نگرام کے رہنے والے اور حضرت مخدوم شیخ سعدی کاکوروی کی اولاد میں سے تھے، اور اپنے مرشد سرگروہ چشتیہ نظامیہ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے حکم سے اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے تھے۔ مولانا فخر الدین نے خرقۂ خلافت اپنے والدِ ماجد سے پایا اور انھیں کے ارشاد کے مطابق ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں پہلے اجمیر اور پھر دہلی آئے۔ یہ محمد شاہ کا زمانہ تھا۔ سب ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔ خود بادشاہ اور وزراء و اُمراء کمالِ عقیدت و نیاز سے اُن کی مجلس میں حاضر ہوتے۔ ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ (۷ مئی ۱۷۸۵ء) بروزِ شنبہ بوقتِ عشا واصل حق ہوئے۔ "حق پسند فخر الدین" اور "خورشیدِ دوجہانی" تاریخ ہوئی۔ مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مجرے کے باہر محوِ خواب ہیں۔ مزار مرجعِ انام ہے۔ ان کے صاحبزادے حضرت مولانا غلام قطب الدین بھی بلند پایہ بزرگ تھے وہ بھی ان سے تھوڑی مدّت بعد ۱۷ محرم ۱۲۰۰ھ (۲۰ نومبر ۱۷۸۵) کو خدا کو پیارے ہوئے۔ غالب کے دوست (اور ظفر کے پیر) مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے انھیں قطب الدین کے بیٹے تھے۔ ان کی وفات منگل کے دن ۱۵ صفر ۱۲۶۸ھ (۱۰ دسمبر ۱۸۵۱ء) کو ہوئی۔ (تاریخ "کالے صاحب کو سرخرو پایا" از مومن) حضرت میاں کالے کے بیٹے میاں نظام الدین کا ذکر غالب کے خطوں میں آیا ہے، ان کا انتقال ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں ہوا ("خداجوے وخدادان آہ" تاریخ ہے۔ (تذکرۂ اہلِ دہلی: ۲۳-۲۶)

موئے کو مارے شاہ مدار، شاہی اور دنیوی اختیارات کا یہ عالم تھا۔ لے دے کے ایک شاعری رہ گئی تھی، لیکن تذکرہ نگاروں نے یہاں بھی اُن سے انصاف نہ کیا۔ آزاد نے حق پوشی سے کام لے کر ظفر کی عمر بھر کی کمائی اپنے استاد ذوق کی جھولی میں ڈال دی اور لکھ دیا کہ:

مسودۂ خاص ہیں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی آدھ مصرع، فقط بحر اور ردیف قافیہ معلوم ہو جاتا تھا، باقی بخیہ۔ یہ (یعنی ذوق) ان ہڈیوں پر گوشت و پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔

کئی مصنفوں نے ان کے اس بیان کی قلعی کھولی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ ذوق کی اُستادی مسلّم اور ان کا کلامِ ظفر پر اصلاح دینا بھی تسلیم، لیکن اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ ظفر کے چاروں مطبوعہ دیوانوں میں سے ساڑھے تین ذوق نے خود کہہ کر ظفر کے حوالے کر دیے تھے اور خود بیچارے ظفر ساری عمر دو مصرعے تک ٹھیک موزوں نہ کر سکے، تو اس سے بڑا ظلم اور بہتان اور ہو نہیں سکتا۔ ایک معاصر تذکرہ نگار مولوی کریم الدین اپنے انتخاب شعرا، "گلدستۂ نازنیناں" (۱۱۸ - ۱۱۹) میں ذوق کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ "حالتِ صبا سے آج تک یہ عادت طبیعت میں متمکّن ہے کہ جو شعر کہتے ہیں، کسی کو نہیں دیتے۔" اس شہادت کی موجودگی میں کون باور کریگا کہ ذوق نے اپنا سارا کلام ظفر کی نذر کر دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ حالی نے بھی غالباً استاد پرستی کے جذبے میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ بلکہ رہی سہی کسر انھوں نے پوری کر دی۔ انھوں نے جو روایت ناظر حسین مرزا کی زبانی نقل کی ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ غالب خود کہہ کر کلام ظفر کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔

ظفر نے اُس لال قلعے میں آنکھیں کھولیں، جہاں کی زبان اردوئے معلّیٰ کہلائی۔ اس لیے یہ کہنا محض سخن گسترانہ بات نہیں کہ اُردو ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ پھر یہ بیان ہو ہی چکا ہے کہ وہ ایک خانوادۂ فقر و تصوّف کے مرید اور خود بھی صوفی صافی بزرگ تھے۔ اس لیے ان کے کلام میں تصوّف کی چاشنی کا ہونا تعجب کا مقام نہیں۔ ظفر نے اپنی عمر میں پانچ استادوں سے اصلاح لی۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے کم از کم تین اپنے اپنے رنگ کے بے مثل استاد ہیں۔ ان اصحاب کی مشکل پسندی اور زبان اور محاورہ پر قدرت کسی سے مخفی نہیں۔ ظفر کے کلام میں ان سب کے رنگ کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ کسی سے بھی اتنے متاثر نہیں ہوئے کہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھے ہوں۔ وہ نصیر کی

طرح ٹیڑھی بیڑھی اور سنگلاخ زمینوں کو بھی پانی کر دیتے ہیں۔ وہ ذوق کی طرح زبان اور محاورے اور روزمرہ کے بھی بادشاہ ہیں اور فنی پہلو سے بھی ان کا کلام بے عیب ہے۔ غالب کا اصلاحی کلام ہم تک نہیں پہنچا کیونکہ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا۔ لیکن ظفر کے ہاں خیال آرائی، جدت آفرینی اور مشکل پسندی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ چونکہ ان کی نشو و نما ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس کی اخلاقی پستی افسوسناک حد تک پہنچ چکی تھی، اس لیے ظفر کے ہاں عریان اور فحش اشعار بھی ہیں، اگرچہ خال خال؛ لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود ان کے کلام کا ایک اپنا خاص رنگ ہے۔ یہ ہے ان کا حزن و ملال اور سوگواری، اور یہی ان کا اصلی اور مستقل رنگ ہے اور اسی رنگ کے اشعار کی اُن کے کلیات میں فراوانی ہے۔ باقی تمام رنگ خارجی اثرات کا نتیجہ ہیں؛ لیکن یہ چیز اُن کی داخلی ہے۔ اُن کے چار ضخیم دیوان ان کی زندگی میں، بلکہ غدر سے پہلے ہی چھپ چکے تھے۔ ہر صنفِ سخن میں کلام موجود ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

دنیا میں بلا سے، اگر نام نہ پایا — ہم نے یہی پایا کہ بُرا نام نہ پایا

ضبطِ فریاد کروں، گریہ کو روکوں، لیکن — دل بیتاب کو تھاموں، یہ نہیں ہو سکتا

ظالم، ترے چُپ رہنے کا عقدہ نہیں کھلتا — کیا جانئے کہ ہے دل میں ترے کیا نہیں کھلتا

دل نہیں مانتا، ناصح! یہ مانے تو کام چلے — تو نے جو کچھ مجھ سے کہا، سب سچ ہے میں نے مان لیا

خیر تو ہے کیا ہوا! بگڑی کہیں اُس یار سے — آج کیوں تو اے ظفرؔ! پھرتا ہے گھبرایا ہوا

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

کیا ذکر کچھ کلام میں داعظ کے ہو مزا — محفل میں وصفِ بادہ و ساغر کہے بغیر

داغ دل میں، آگ لختِ دل میں، چشمِ تر میں آگ — عشق کی سوزش سے ہی پھیلی ہوئی گھر گھر میں آگ

برسوں گذر رہے کہ ہوئی خاک ہماری برباد — اب تو اس کوچہ میں اے بادِ سحر خاک نہیں

دل دے کر اُن کو، ایسی اذیت ہوئی ہمیں — اب دل کبھی نہ دینگے نصیحت ہوئی ہمیں

منّت کشِ اجل نہ ہوئے ہم، کہ ہو گیا — کام اپنا، ایک تیری نگاہِ عتاب میں

نہ جانا چاہیے کوچے میں اس کے، سچ کہا تو نے — پر اے غمخوار، کیا کیجے، نہیں دل اپنے قابو میں

ترے ہاتھ سے دشتِ وحشت کی میں جنوں! کب تلک خاک چھانا کروں
خرد کچھ کہے ہے، جنوں کچھ مجھے کہو، میں کہا کس کا مانا کروں

نہیں معلوم، ظفر اس سے ہوئیں کیا باتیں چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

آشنا ہو تو آشنا سمجھے ہو جو نا آشنا، تو کیا سمجھے
ہم اسی کو بھلا سمجھتے ہیں آپ کو جو کوئی بُرا سمجھے
اے ظفر! وہ کبھی نہ ہو گمراہ جو محبّت کو رہنما سمجھے

تری آنکھوں نے، خدا جانے کیا کیا جادو ہم بھی دانا تھے، پر اب پھرتے ہیں دیوانے سے

جو درد ہوتا تو غل مچاتا، جو سایہ ہوتا تو سر ہلاتا الٰہی دل کو مرض یہ کیا ہے، نہ منھ سے بولے نہ سر کھیلے

وہ آئے یا نہ آئے، پر دلِ بیتاب کو اپنے تسلّی میں یہ دیتا ہوں، اب آتا ہے اب آتا ہے
کہاں تک روئیگا، اے دیدۂ تر! رُک اشکوں کو ہماری آبرو کو، خاک میں، تو کیوں ملاتا ہے

موت آئے تو ٹل نہیں سکتی اور آئی نہیں، تو پھر کیا ہے
نہیں رونے میں گر ظفر! تاثیر جگ ہنسائی نہیں، تو پھر کیا ہے

[تاریخِ عروجِ عہدِ انگلشیہ؛ بہادر شاہ ظفر؛ بہادر شاہ کا مقدمہ؛ مجموعۂ نغز ۱/۱:
۳۷۲ - ۳۷۳؛ آبِ حیات (حالاتِ ذوق)، یادگارِ غالب: ۲۲؛ خمخانۂ جاوید،
۵: ۴۶۹ - ۴۷۷]

ظہیر — لالہ پیارے لال دہلوی

قوم کے کائستھ تھے۔ مجذوب سے آدمی تھے؛ ہمیشہ فکرِ شعر میں غرق رہتے۔ عین جوانی میں ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۴ء) میں انتقال کیا۔ کبھی اجمیر میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا تھا، جہاں ان کی بشاش (مؤلفِ تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود) سے ملاقات ہوئی تھی۔ غالباً پہلے کلام پر اصلاح مومن سے لی۔ غالب انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔

رات دن ایک سا رہتا ہے اُجالا میرے گھر — آتشیں آہ ہے، یا آٹھ پہر کی بتی
پڑ گئی رکھتے ہی ناسورِ جگر میں ٹھنڈک — اُس کا پیکاں بھی ہے کیا خوب اثر کی بتی
شبِ فرقت کا اندھیرا نہ گیا، پر نہ گیا — کام کچھ موم کی آئی، نہ اگر کی بتی ۵
رات گھر اس کے، دیے میں کہیں جلتی تھی ضرور — تار ہائے نگہِ اہلِ نظر کی بتی

شمع کی مجھ کو ضرورت نہیں واللہ ظہیر!
میری روشن ہے ہر اک مصرعِ تر کی بتی

[تذکرہ آثار الشعرائے ہنود: ۹۱-۹۲؛ تذکرۂ بشیر مشمولہ سہ ماہی "اردو" کراچی، ۴۵: ۱: ۲۴۱؛ بہارِ سخن ۲۶۷-۲۶۸]

---

۵ شبِ ہجراں کا اندھیرا نہ گیا، پر نہ گیا — کام کافور کی آئی، نہ اگر کی بتی (تذکرۂ بشیر)

عارفؔ ــــ میرزا زین العابدین خان دہلوی

ان کے والد شرف الدولہ نواب غلام حسین خان بہادر سہراب جنگ تھے اور وہ بیٹے تھے نواب فیض اللہ خان بہادر کے، اور وہ نواب قاسم جان کے جو عارف جان کے بھائی تھے جن کی اولاد میں نواب احمد بخش خان بہادر (والی لوہارو) اور الٰہی بخش خان معروف تھے۔

نواب غلام حسین خان شعر بھی کہتے تھے، مسرور تخلص تھا۔ موسیقی خصوصاً ستار نوازی میں طاق تھے۔ غالب کے ہم زلف تھے یعنی ان کا پہلا نکاح میرزا الٰہی بخش خان معروف کی چھوٹی صاحبزادی بنیادی بیگم سے ہوا تھا۔ اس نکاح کا نتیجہ دو صاحبزادے تھے ــــ زین العابدین خان عارفؔ اور حیدر حسین خان۔ لیکن بعد کو میاں بیوی میں بگاڑ ہو گیا، اور نوبت علیحدگی تک پہنچی۔ چنانچہ مسرورؔ نے ایک مکان بیوی کے نام ہبہ کر دیا اور وہ اپنے طور پر الگ رہنے لگیں۔ اس کے بعد مسرورؔ نے ایک عورت سنگی بیگم سے نکاح کر لیا؛ غلام حسن خان محو اسی دوسری بیوی کے بطن سے تھے۔ مسرورؔ نے اکتوبر ۱۸۴۵ء میں انتقال کیا۔ غالبؔ نے ان کی مروت اور مہر و محبت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں پیدا ہوئے۔ میاں بیوی میں ناچاقی کے باعث بیٹے کی تعلیم و تربیت کا بار کلیتہً ان کی والدہ کے سر پر آ پڑا۔ لیکن اس نیک بخت بی بی نے اسے ہمت سے اٹھایا۔ ان کی تعلیم کے تمام مراحل گھر پر طے ہوئے۔ دوسرے علوم و فنون کے علاوہ خطِ نسخ کے بھی استاد تھے۔ اور اس فن میں یاقوت رقم خان ثانی میر جلال الدین خوشنویس کے شاگرد تھے۔ استاد کی توجہ اور اپنی محنت سے سال کے اندر اندر ایسی مشق بہم پہنچائی کہ استاد نے اصلاح دینا چھوڑ دی اور سند لکھ دی۔

جب غالبؔ کے اپنے بچوں میں سے کوئی زندہ نہ رہا تو انھوں نے عارفؔ کو بیٹا بنا لیا۔ غالب کو

ان سے جو شدید محبت تھی وہ ان کے اردو فارسی کلام سے ظاہر ہے۔ عارف نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا اور اپنے نانا میرزا الٰہی بخش خان معروف کے تخلص کی رعایت سے عارف تخلص اختیار کیا۔ طبیعت میں غضب کی آمد تھی اور بڑے پُرگو تھے۔ شروع میں شاہ نصیر سے اصلاح لی اور تھوڑی مدت میں ان کے رنگ میں ایک دیوان بھی "مطلع مہرِ سعادت" کے نام سے مرتب کرلیا۔ گلدستۂ نازنیناں (۲۲۲ - ۲۴۲) میں کلام کا جو انتخاب درج ہے وہ سراسر نصیر کے رنگ میں ہے۔ اسی طرح کی سنگلاخ زمینیں ہیں، شرمسار ہو کے چلے، اشکبار ہو کے چلے؛ برابر بجلی، گوہر بجلی؛ قبا میں بل پڑا، پارسا میں بل پڑا۔ نظر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں، گہر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں؛ بیمار اٹھے اور بیٹھے، اغیار اٹھے اور بیٹھے وغیرہ۔ لیکن جب نصیر دکن سدھارے، تو عارف نے غالب سے استفادہ شروع کیا۔ رنگِ سخن بھی بدل دیا اور پہلا دیوان بھی نظری کردیا۔ اب وہ شاعری میں غالب کی پیروی کرنے لگے اور دوسرا دیوان مرتب کیا۔ انہی خوبیوں کے باعث میرزا ان پر فخر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عارف اردو میں میرے صحیح جانشین ثابت ہونگے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعۂ مدحیہ میں لکھتے ہیں:

اے کہ میراث خوارِ من باشی   اندر اردو کہ آں زبانِ من است

ارمغانی، ز مبدءِ فیّاض   باد آنِ تو، ہر چہ آنِ من است

لیکن افسوس کہ اس ہونہار نوجوان کی جوانا مرگی کا داغ بھی غالب کی قسمت میں لکھا تھا اور اُن کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔

عارف نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلا نواب شمس الدین احمد خان والیٔ لوہارو کی ہمشیرہ نواب بیگم (بنت فخر الدولہ نواب احمد بخش خان) سے ہوا۔ یہ ستوالسنہ بچہ پیدا ہونے پر زچگی میں فوت ہوگئیں، تو اس کے بعد دوسرا مرزا محمد علی بیگ نجارالی کی صاحبزادی بستی بیگم عرف نواب دلھن سے ہوا۔ عارف کو اس بیوی سے حد درجہ محبت اور شفتگی تھی۔ جب یہ بھی جنوری ۱۸۵۲ء میں دردِ گردہ کی تکلیف سے رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئیں، تو عارف کی دنیا اندھیر ہوگئی۔ طبیعت پہلے ہی کئی دن سے نڈھال رہتی تھی، یوں بھی دُبلے پتلے اور کمزور قوام کے تھے، اس صدمے نے اور پست کردیا۔ بیماری نے جلد ہی تشویشناک صورت اختیار کرلی اور پھیپھڑوں پر حملہ ہوا۔ موت سے چند دن پہلے خون کی قے ہوئی اور یوں بیوی کی وفات کے تین چار ماہ بعد یہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ جب مرض الموت میں غالب

عیادت کو گئے، تو مزاج پوچھنے پر یہ شعر پڑھا:

آنکھوں میں دم ہے، مثلِ چراغِ سحر ہوں میں
کو لگ رہی ہے، جان کو کیا انتظار ہے

ان کی قبر بھی مزارِ غالب کے احاطے میں ہے۔ عارف کی موت پر غالب نے وہ درد ناک نوحہ لکھا تھا، جو اردو نظم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس کا پہلا شعر ہے:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور

میر قربان علی بیگ سالک نے تسکین، مومن اور عارف تینوں کی تاریخِ وفات ایک قطعے میں لکھی ہے:

برس دن میں، موئے یہ تین شاعر — کہ جو تھے حضرتِ دہلی کے ساکن
نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخِ رحلت — رہی فکر اس کی سالک کو بہت دن
کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب — اِرَم میں عارف و تسکین و مومن

(۲۴۱ + ۳۵۱ + ۵۴۰ + ۱۳۶ = ۱۲۶۸ھ)

نسّاخ نے تاریخ کہی:

مُرد امروز میرزا عارف — دوستانش شدند باغمِ جُفت
سالِ مرگش چو از خرد جُستم — "خلدِ اعلا مقامِ عارف" گفت (۱۲۶۸ھ)

عارف بھی مذہباً غالب کی طرح اثنا عشری شیعہ تھے۔ اپنے پیچھے دو خُرد سال بچے باقر علی خان اور حسین علی خان چھوڑے۔ ان دونوں کی پرورش بھی غالب نے کی (ان کے حالات کے لیے حسین علی خان شادان کا ترجمہ ملاحظہ ہو) افسوس کہ عارف کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ اس کا ایک نسخہ لوہارو کے کتب خانے میں تھا اور اب رضا لائبریری رام پور میں منتقل ہو گیا ہے۔ دو نسخے لالہ سری رام مرحوم مؤلف خمخانۂ جاوید کے کتابخانے میں تھے جو اب ہندو یونیورسٹی بنارس کے ذخیرے میں ہیں۔ ایک انتخاب کتابخانۂ سالار جنگ حیدرآباد میں بھی ہے۔ مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

اے فلک! خانہ خرابی کی ہے پروا کس کو — دشت میں رہتے ہیں، مدت ہوئی، گھر چھوڑ دیا
مت کہو وہ بات، عارف جو گراں خاطر پہ ہو — کیا مزا ہے، گر جبینِ آشنا میں بل پڑا

صبحِ ہجراں کی مصیبت جو یہ ہوتی معلوم
میں شبِ وصل کی ہرگز نہ تمنّا کرتا
سخت شرمائے ہیں اتنا نہ سمجھتا تھا انھیں
چھیڑنا تھا، تو کوئی شکوۂ بیجا کرتا

دیکھ کے ایک بار ہی اس کو، یہ بیخود ہوئے
پھر نہ ہوا حشر تک، بارِ دگر دیکھنا

جو کعبے میں ہے، وہی بتخانے میں جلوہ
اک پردہ ہے سو شیخ حرم اُٹھ نہیں سکتا

اب تلک آئینہ شاید آپ نے دیکھا نہیں
آپ جو کہتے ہیں" ہم رکھتے نہیں، اپنا جواب"
میں تو مرجاتا وہیں، غیرت سے کوہِ طُور پر
اس طرح سے صاف گر ملتا مجھے، موسیٰ! جواب

چرخ تک جاکے نہ بدنام ہو، اے نالۂ دل!
بیٹھ جانے کو ہے یہ سقفِ کہن آپسے آپ

باتیں ہزار پیچھے بناتے ہیں بیٹھ کر
مقدور کیا کہ بول سکیں رُوبروئے دوست

گو زخمہائے تن مرے بھر آئے چارہ گر!
اے بیخبر! جراحتِ پنہاں کا کیا علاج!

ساغر اک ہاتھ میں، اک ہاتھ میں مینائے شراب
ہے یہ انداز ترا، ساقیِ سرشار پسند

ہم بیکسوں کا آن کے تو ہی ثواب لے
اے موت! رحم کر، مرے حالِ تباہ پر

چُپ پڑے رہتے تو کیوں یاں سے اُٹھائے جاتے
ہائے کیوں شور مچایا تری دیوار کے پاس!

اک دیکھنا ہے، کہیئے تو اس کو بھی چھوڑ دیں
رکھتے نہیں ہیں آپسے، اس کے سوا غرض

پھر دشمنوں کی خاک شکایت کریں بھلا
جب دوست دیکھ سکتے نہیں آرزوئے دل

اُٹھتا قدم جو آگے کو، اے راہبر نہیں
پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں!

مانا، یہ ناصحا! کہ نہ اس سے ملا کریں
بہتر تو ہاں یہی ہے، مگر دل کو کیا کریں
تکلیف آپ آنے کی کیوں آشنا کریں
بیٹھے ہوئے وہیں مرے حق میں دعا کریں
خود ہیں خجل کہ جیتے رہے اس کے ہجر میں
اپنا یہ منھ نہیں ہے، کہ اس سے گلا کریں

لذّتِ درد سے محفوظ وہ ناکام نہیں
جس کو بیتابیِ دل باعثِ آرام نہیں

زاہدا! میکدے کی راہ سے گذرا مت کر
رہن ہو جائے نہ یہ جُبّہ و دستار کہیں!

جنگ تھی عشق وہوس میں، کام اپنا ہو گیا
ہے ہماری مثل وہ، گھن پس گیا آٹے کے ساتھ

عارف! بتا کہ سر ہے یہ کس دن کے واسطے
پھرتا ہے آج تیغ وہ عریاں لیے ہوئے
آج کیا تیغ بکف اس کو سُنا ہے، عارف!
آپ اس وقت جو یوں جاتے ہیں گھبرائے ہوئے

لذّتِ درد سے بیچارہ نہیں ہے واقف
لے گیا چھین کے غمخوار نمکداں مجھ سے

آغازِ دردِ عشق کے انجام کو نہ پوچھ
یہ ابتدا ہے وہ، کہ نہ جس کی خبر ملے

گھر کے لُٹتے ہی سے تم غم میں پڑے ہو عارف! اور کیا کیا وہ ابھی کرتے ہیں، دیکھا کیجے
چین اک دم نہیں بیتابیِ دل سے، عارف! کس نے رکھ دی ہے، مرے سینے کے اندر بجلی
رہتی غمِ فرقت میں کچھ بھی جو توانائی شہرت مری افغاں کی تا عرش بریں جاتی
اُمید ہے کب، عارف! نالے کی رسائی کی یہ بیل منڈھے چڑھتی، معلوم نہیں ہوتی
اوروں کو ہو تو ہو، ہمیں مرنے سے ڈر نہیں خطرے کے ہم ہی جاتے ہیں، اگر نامہ بر نہیں
اس ضعف کا بُرا ہو، کہ ناکام رہ گئے آج اس کا، اپنے ہاتھ سے، دامن نکل گیا
مانا یہ ناصحا! کہ نہ اس سے ملا کریں بہتر تو ہاں یہی ہے، مگر دل کو کیا کریں
جبہہ سا دیکھیے جبریل کو جس جا عارف! شک نہیں وہ ہی درِ آلِ عبا ہوتا ہے
ہوتا سلوک برہمن و شیخ میں اگر کتنی قریب دَیر سے کعبہ کی راہ تھی

اپنے استاد غالب سے عقیدت کا اظہار کئی جگہ کیا ہے، بلکہ ان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی ان کے دیوان میں موجود ہے۔ لکھتے ہیں:

حضرتِ غالب کی شاگردی کا دونی ہے یہ فیض
عقلِ اوّل کے جو عارف، ہو گئے استاد ہم
عارف ہوئے ہیں حضرتِ غالب کے خوشہ چیں
کیونکر نہ ایک رکن ہوں ملکِ سخن میں ہم

فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

بہ ہجرِ یار چہ باک از شنودنِ پند ست گرفتم ایں کہ نہ تلخی بہ زہر مانند ست
نزاکت ست ترا، باعثِ درستیِ عہد دگر نہ شیوۂ خوباں، شکستِ سوگند ست
ہزار سال کند مشق دیدنِ خورشید بدیدنِ رُخِ تو، ہر کہ آرزو مند ست
کسے ز دوست شکایت کند، خدا نکند بلطفِ دشمن و عارف بجورِ خورسند ست
دمے بہ پرسشِ من گر زباں بجنباند کلاہِ گوشہ، من آسماں بجنباند
ز دردِ دل بدرت آنچناں فرو گویم کہ موجِ آبِ سرشک، آسماں بجنباند

[نادراتِ غالب ۲: ۶۸؛ سخنِ شعرا: ۱۳۴؛ ذکرِ غالب: ۱۳۵-۱۳۷؛ روزِ روشن: ۴۲۱؛ خمخانۂ جاوید، ۵: ۵۰۹-۵۱۷؛ گلدستۂ نازنیناں: ۲۲۲-۲۴۴]

عاشق ــــ ماسٹر شنکر دیال اکبر آبادی

ان کے والد گردھاری لال بن چھبیلے رام بن خوشحال رائے تھے۔ خاندان کے مورث موضع سانڈی کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ یہ خاندان شروع میں شاہانِ اودھ کی ملازمت سے سرفراز رہا۔ حکومتِ اودھ کی طرف سے انھیں "رائے زادہ" کا خطاب ملا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بعض خدمات کے عوض میں سرکارِ انگریزی کی طرف سے بھی "بہی خواہِ گورنمنٹ" کا خطاب عطا ہوا۔ اسی زمانے میں ان کے جدِ اعلیٰ ترکِ وطن کر کے بازنگر (ضلع ایٹہ) میں مقیم ہو گئے۔ عاشق کے خسر نرگوپال دیوان ہرچرن لال تھے۔ دیوان صاحب موصوف کے اجداد بھی سرکارِ اودھ میں ممتاز عہدوں پر متمکن رہے اور "دیوان" کا خطاب حاصل کیا۔ یہ ۱۸۵۷ء کے زمانے کی خدمات کے انعام میں بدایوں کے تحصیلدار مقرر ہوئے تھے۔ منشی گنگا پرشاد آگرہ ہائی کورٹ کے مشہور وکیل، عاشق کے بہنوئی تھے۔

عاشق کی رسمی تعلیم بہت اچھی تھی۔ انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کی۔ وکالت میں بھی بی، ایل کی سند لی۔ آگرہ کے ممتاز امیر، آنریری مجسٹریٹ اور آگرہ کالج کے ٹرسٹی تھے۔ شہر کے کامیاب وکیلوں میں سے تھے۔ ساری عمر فارسی میں کہا۔ اُردو پر توجہ نہ کی۔ ۷۰ برس کی عمر میں ۳ فروری ۱۹۱۸ء کو انتقال کیا۔ جسمانی یادگار دو صاحبزادے بابو پربھو دیال اور بابو کرشن دیال چھوڑے۔ چھوٹے بابو کرشن دیال وکالت کرتے تھے۔ بڑے بابو پربھو دیال عرف شام بابو بھی شعر کہتے تھے۔ شام تخلص تھا اور آگرے کے مشہور شاعر مولانا سید نثار علی شاہ نثار (متوفی ۲۷ اپریل ۱۹۲۱ء) کے شاگرد تھے۔ مدتوں نظام دکن کے چھوٹے صاحبزادے شاہزادہ معظم جاہ شجیعؔ کے مصاحب رہے۔ دونوں کا انتقال ہو گیا۔

افسوس کہ عاشق کا کلام مہیا نہ ہو سکا۔ صرف ایک اُردو کا شعر ملا:

پھر تمنا کو ہوا جوش کہ اصرار کرے　　پھر تغافل نے نکالا، نیا طرزِ انکار

[نہالستانِ نثار: ۲۲]

عاشق ــــــ منشی محمد اقبال حسین دہلوی

منشی نور الدین احمد دہلوی کے فرزندِ ارجمند تھے۔ دلّی میں اجمیری دروازہ اور حوض قاضی کے درمیان شاہ تارا کی گلی میں سکونت تھی۔ ۱۸۵۸ء میں ریاستِ لوہارو میں ملازم ہو گئے تھے اور یہی غالب سے رسم و راہ کا ذریعہ ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۶۸ء میں ریاستِ بیکانیر میں چلے گئے اور آخرکار ۱۸۸۴ء میں ایجنٹ گورنر جنرل ریاست ہائے راجپوتانہ کے وکیل حاضر باش کے عہدے پر فائز ہو کر مدتوں اجمیر میں مقیم رہے۔

بڑے دلچسپ بزرگ تھے۔ لالہ سری رام مرحوم نے ان کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی قابلیت اور قادر الکلامی سے متعلق بہت کچھ غلط فہمی تھی۔ استادوں کی غزل پر غزل کہتے اور قافیے سے قافیے کا جواب دیتے چنانچہ داغ کے دیوانِ ثانی "آفتابِ داغ" کا جواب ترکی بہ ترکی اور قافیہ بہ قافیہ لکھا اور لطیفہ یہ کہ جہاں ایک جگہ داغ کے دیوان میں کتابت کی غلطی سے قافیہ غلط چھپ گیا ہے، آپ نے بھی اسے اسی طرح غلط باندھ دیا ہے، اس دیوان کا نام "افکارِ عاشق" ہے۔ اس کے آخر میں امیر مینائی کے دیوان "مراۃ الغیب" کی ردیف الف کی غزلیات کا بھی قافیہ بہ قافیہ جواب شامل ہے۔ امیر مینائی نے ایک قصیدہ "مناظرۂ شانہ و آئینہ" کے نام سے لکھا تھا۔ عاشق نے انہی قافیوں میں "مناظرۂ زلف و رُخ" کے نام سے نواب محبوب علی خان نظامِ دکن کی مدح میں قصیدہ لکھا ہے۔

بیان الحقائق کے مصنف کا بیان ہے کہ جن دنوں عاشق بیکانیر میں مقیم تھے، انھوں نے اپنے "دو مطبوعہ دیوان جو مرزا خان داغ کے ہر دیوان اور ہر غزل کے ردیف وار جواب میں تصنیف کیے تھے، مولانا سید عبید اللہ فرحتی (مصنفِ کتاب کے والدِ بزرگوار) کے آگے بہ مرادِ اصلاحِ کلام رکھ دیے۔ چنانچہ موصوف نے بہ اندک توجہ بہت سے مواقع پر اصلاح پسندیدہ کی جب کو مولوی اقبال مرحوم نے بہ منت و سپاس قبول کر کے مکرر انطباعِ دو اوین کا تہیہ و اہتمام کیا۔"

عاشق کے دماغ میں سنک تو ضرور تھی اور اُن سے کوئی فعل بھی بعید نہیں، لیکن انھیں اپنی ہمہ دانی کا جو غرّہ اور اپنی شاعرانہ عظمت کا جو زعم تھا، اس کے پیشِ نظر یہ روایت حد درجہ مشکوک ہے۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

عاشق نہایت زُود گو اور نظم و نثر پر یکساں حاوی تھے۔ اُردو کے تین دیوان: اسرارِ عاشق افکارِ عاشق، اعجازِ عاشق اور فارسی کا ایک "ترانۂ عشق" (بشمولِ افکارِ عاشق) چھپے ہوئے موجود ہیں۔ زبان واقعی بہت صاف ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

اچھا میں بُرا سہی و لیکن — تم اپنی کہو، تمھیں ہوا کیا

مر کے پردہ رہ گیا عاشق کا، یہ اچھا ہوا — دربدر، کوچہ بکوچہ، مدتوں سے خوار تھا

ہائے کس ناز سے کہتے ہیں وہ ہر دم مجھ سے — "اپنی صورت تو ذرا دیکھو، تمھیں چاہیں کیونکر"

کرتے ہیں مجھ کو ہی وعظ و پند، ناحق رات دن — حضرتِ واعظ، اُسے کچھ جا کے سمجھاتے نہیں

انھیں غصّہ کہ میری بزم میں یہ کس لیے آیا — مجھے یہ غم کہ وہ پہلو میں کیوں دشمن کے بیٹھے ہیں

شوخی نے رخنے ڈال دیے ہیں حجاب میں — سَو بے حجابیاں ہیں تمھارے حجاب میں

وہ دل ہے خاک، جس میں تری آرزو نہ ہو — وہ گُل ہے خار، جس میں محبّت کی بُو نہ ہو

توبہ تو کر چکا ہوں، مگر کچھ کچھ اِن دنوں — دیتی ہے دم بہار کی آب و ہوا مجھے

گر ہماری بندگی ہے ناقبول — تو بتوں کی بھی خدائی ہو چکی

[گلستانِ سخن: ۲۵۲؛ خمخانۂ جاوید، ۵: ۵۲۹-۵۳۳؛ بیان الحقائق: ۴۲]

عاشق ـــــ محمد عاشق حسین خان اکبرآبادی

محمد مشتاق حسین خان کے بیٹے اور آگرے کے رہنے والے تھے ؎

شورسُن کر وہ دریچے سے نظر کرتے ہیں
آج نالے مرے ممنونِ اثر کرتے ہیں

[سخن شعرا: ۳۱۸]

عاصیؔ ـــ منشی شیام لال

ان کے والد منشی سندر لال ویش اگروال تھے۔ اس خاندان کے لوگ اسلامی عہد میں مدّتوں قانونگوئی کے عہدے پر مامور رہے۔ ۱۸۵۷ء کی افتاد کے بعد ان لوگوں نے راجپوتانہ کی مختلف ریاستوں میں ملازمت کرلی۔ اس طرح منشی سندر لال بھی بوندیل کھنڈ پہنچ گئے۔ شیام لال بھی غالباً یہیں پیدا ہوئے۔

شیام لال مدّتوں بوندیل کھنڈ ایجنسی میں منشی کے عہدے پر فائز رہے۔ بعد کو ریاستِ پالدیو میں کامدار مقرر ہوگئے۔ سب لوگ ان کی ایمانداری، خدا ترسی اور مستعدی سے مطمئن تھے۔ شعر کے علاوہ نثر بھی لکھتے تھے۔ ان کی مرتبہ تاریخ بوندیل کھنڈ چھپ چکی ہے (نو گاؤں پریس، ۱۸۸۴ء) اس کی تاریخ ہائے طباعت شیخ کاظم حسین صدّیقی نے کہی تھیں۔ عیسوی تاریخ ہے۔

هم از برائے آں که دہی دادِ نکته سنج | هم در جوابِ آں که کند سال را سوال
کاظم! بگو که رتبۂ اعلانِ عام یافت | "ملکِ بندھیل کھنڈ" ز "تاریخ شام لال"

کتاب کے آخر میں عاصی کا مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ درج ہے (۲۷۰ + ۱۶۱۳ = ۱۸۸۳) جس سے ان کا تلمذِ غالب بھی ثابت ہوتا ہے؛

تاریخ ایک اور مری طبع زاد ہے | اظہارِ سالِ عیسوی جس سے مراد ہے
تحقیق معتبر سے لکھا ہے تمام حال | دل ہر بشر کا دیکھنے سے جس کے شاد ہے
دعویٔ سخنوری کا نہیں مجھ کو زینہار | کرتا ادب سے عرض یہ خاکی نہاد ہے
حاصل مجھے لیاقتِ ذاتی نہیں، ولے | غالب سے فیضیاب یہ ہندی نژاد ہے
عاصی! ہے تعمیہ سے عیاں سالِ عیسوی | "تاریخ بےمثال" پہ ہاتف کا "صاد" ہے
(۱۸۸۴ء = ۱۷۹۴ + ۹۰)

[تاج التواریخ نیز تاریخِ بوندیل کھنڈ بحوالۂ نشیدِ کاظم: ۸۹؛ ہماری زبان (علی گڑھ) ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء: ۴]

عاقلؔ ـــــ سیّد محمد سلطان دہلوی

بزرگوں کا وطن برست (ضلع کرنال) تھا، لیکن نقلِ مکان کرکے دلّی میں آرہے تھے۔ چنانچہ عاقل یہیں ۱۳ مئی ۱۸۵۴ء (۱۵ شعبان ۱۲۷۰ھ) کو پیدا ہوئے۔ نجیب الطرفین تھے۔ دادھیال اور ننھیال کے سلسلے نواب حامد علی خان بہادر اور نواب نجف علی خان بہادر تک پہنچتے ہیں۔ فارسی میں منتہی تھے اور عربی صرف و نحو کے بھی چند رسالے دیکھے تھے۔

غالبؔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو فوت ہوئے ہیں۔ گویا اس وقت عاقل کی عمرِ عزیز پندرہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اتنی کم عمری میں انھوں نے غالبؔ سے کتنا استفادہ کیا ہوگا؛ شاید چند ابتدائی غزلیں دکھا سکے ہوں۔

عاقل عالمِ جوانی میں بنارس گئے۔ وہاں میر وزیر علی[۵] پھکیت سفید پوش اپنے فن کے ماہر تھے؛ یہ عاقل کے خالو بھی ہوتے تھے۔ عاقل نے ان سے پھکیتی سیکھی اور ان کی دخترِ بلند اختر کو اپنے حبالۂ عقد میں لائے۔ اسی زمانے میں صاحبِ عالم مرزا قادر بخش صابرؔ گورگانی سے مشورہ کرنے لگے، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اکثر بنارس میں مقیم رہتے تھے۔ صابرؔ کی قدرتِ کلام اور مہارتِ فن اور زباندانی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ چنانچہ عاقل نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا اور اتنی مشق بہم پہنچائی کہ خود استاد کو ان کی شاگردی پر ناز تھا۔

---

۵ اکثر اصحاب نے ان کا نام وزیر حسین لکھا ہے، لیکن صحیح غالباً وزیر علی ہے، جیسا کہ "تذکرہ رسول پور برشط" (ص ۱۸۰) میں ہے۔

ان دنوں حیدر آباد میں ہُن برس رہا تھا، عاقل نے بھی قسمت آزمانے کو (۱۸۸۲-۱۸۸۳ء میں) دکن کی راہ لی۔ صاحبِ استعداد ہونے کے علاوہ آدمی موقع شناس تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی لسّانی اور جادو بیانی سے ہر مجلس میں نفوذ حاصل کر لیا۔ ایک اخبار "ہزار داستان" نکالنے لگے۔ پھر اس سے قطع تعلق کر کے ایک "مطبع آصفی" قائم کیا اور یہیں سے ۱۳۰۱ھ میں "اخبار آصفی" شائع کرنے لگے۔ تھوڑے دن بعد نواب نظام یار جنگ بہادر خانخاناں کے کہنے سے مطبع اور اخبار کو خیر باد کہا، اور ان کے ہاں معتمدی کے عہدے پر مقرر ہو گئے۔ زیادہ مدت نہیں گذری تھی کہ نواب صاحب موصوف نے اپنے سابق معتمد مولوی بلگرامی کو بحال کر دیا اور اب ان کے لیے ایک اور عہدہ تجویز کیا۔ یہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ بارے نواب بہرام الدولہ میر داور علی نے دستگیری کی، لیکن یکایک عاقل طاعون کا شکار ہو گئے۔ صرف ۲۷ برس کی عمر میں ۱۴ اگست ۱۸۹۱ء (۸ محرم ۱۳۰۹ھ) کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ وصیت تک نہیں کر پائے۔ دو صاحبزادے، فرخ سلطان اور جعفر سلطان اپنی یادگار چھوڑے۔ اس کے بعد خاندان دو جگہوں میں تقسیم ہو گیا۔ جعفر سلطان کو ان کے نانا میر وزیر علی اپنے ساتھ بنارس لے گئے۔ فرخ سلطان حیدر آباد ہی میں رہے، نظام یار جنگ اور بہرام الدولہ نے ان کی سرپرستی کی۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ کامل تخلص تھا۔ بہرام الدولہ کی توجہ سے عاقل کا دیوان بھی شائع ہوا تھا (مطبع انوار الاسلام: ۱۳۱۹ھ) چند شعر ملاحظہ کیجیے:

یہاں ہے ضبط مانع، صبر واں قفلِ دہاں ہوگا
ہمارا آپ کا انصاف، یاں ہوگا نہ واں ہوگا

جب کہا میں نے، کہ کب آئیے گا ہنس کے بولے یونہی مر جائیے گا

چھیڑ کی حد ہے، چلو چپ بھی رہو ہم جو چھیڑینگے، تو گھبرائیے گا

نہ زندہ، نہ مردہ، نہ دنیا، نہ دیں کا مجھے تو نے رکھا نہ ظالم کہیں کا

تم نہیں، غیر سہی، غیر نہیں، مرگ سہی مدعا یہ، کہ کوئی جان کا خواہاں ہوتا

شرما کے منھ پھرانا، لڑانا نگاہ کا ظالم یہ سیدھی سی ہے ادا بانکپن میں کیا!

کیوں آئینے پہ پیار کی پڑتی ہیں نگاہیں ہو جائے نہ تم کو کہیں، اے جان! نظر آج

نکلے ہیں پریشان درِ میخانہ سے واعظ کچھ بات ہی ایسی ہے جو گھبرائے ہوئے ہیں

زمانے میں رہی تعلیم خود بینی سکندر سے — رہیگا سلسلہ جاری یہ آیینے کے جوہر سے
کہتا ہے کہ ہے حسنِ بتاں، قدرت اللہ — یہ شیخ ریاکار، اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

[محبوب الزمن، ۲: ۸۰۹ - ۸۱۱؛ یادگارِ ضیغم ۲۴۸ - ۲۴۹؛ تزکِ محبوبیہ (۲) دفتر ہفتم: ۱۲۵ - ۱۲۶؛ خمخانۂ جاوید، ۵: ۵۵۶ - ۵۵۸؛ تذکرۂ رسولپور بر شط: ۱۸۰ - ۱۸۲]

عبّاس — عبّاس علی

جاورہ ریاست سے ایک گلدستہ "افتخار" شائع ہوتا تھا۔ ان گلدستوں میں شعرا کا کلام چھپتا رہتا تھا، جس کے لیے طرح کا پہلے سے اعلان کر دیا جاتا تھا۔ "افتخار" دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے (۳: ۱۲) میں اعلان شائع ہوا ہے:

مصرع طرح

مصرع طرح	قافیہ	ردیف
جناب عبّاس علی صاحب تلمیذ غالب مرحوم		
یاالٰہی کون ہے وہ جس کی آمد دل میں ہے	دل	میں ہے

اس سے زیادہ ان سے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔

عرشی ـــــ سیّد احمد حسن قنّوجی

ان کا سلسلۂ نسب ۳۴ واسطوں سے حضرت امام حسین علیہ السّلام سے جا ملتا ہے۔ اس خاندان میں بہت برگزیدہ ہستیاں گذری ہیں جن میں سے آٹھ یعنی امام حسین، امام زین العابدین، امام محمد باقر، امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم، امام علی رضا، امام محمد تقی اور امام علی نقی علیہم السلام ائمۂ اہل بیت اور زمرۂ اثنا عشر آلِ اطہار میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اور کئی اہل اللہ اور صُلحا اس خاندان میں ہوئے۔ مثلاً مخدوم جہانیان جہاں گشت (۷۸۵ھ) اور سیّد جلال معروف بہ گل سرخ بھی ان کے بزرگوں میں سے تھے۔ خلافت عبّاسیہ کے زمانے میں اور بعد کو بھی بزرگوں کا وطن بغداد رہا۔ سب سے پہلے جو بزرگ بغداد چھوڑ کر بخارا گئے، وہ سیّد محمد تھے، جو عرشی سے ۲۳ پشت اُوپر ہیں۔ ان سے تیسری پشت میں سیّد ابو عبداللہ حسین گل سرخ ہوئے، جو اپنے زمانے کے مشہور ولی اللہ تھے۔ یہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی (۶۶۱ھ) کے خاص مُرید تھے اور اس خاندان کے پہلے مورث ہیں جو ہندستان آئے۔ شیخ الاسلام کے ارشاد پر انھوں نے سرحدی علاقے میں اُوچہ کے مقام پر سکونت اختیار کر لی اور ساری عمر خلقِ خدا کی رشد و ہدایت میں بسر کر دی۔ ان کے صاحبزادے سیّد احمد کبیر تھے، جن کے نام پر آج بھی جاہل لوگ گائے ذبح کیا کرتے ہیں۔ ان ہی سیّد احمد کبیر کے بڑے صاحبزادے حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت تھے جن کے حالات سے تذکروں کے صفحات روشن اور اہل اللہ کی محافل گرم ہیں۔ مخدوم جہانیاں کی چوتھی پشت میں جلال ثالث اوچہ سے نقلِ مکان کر کے دلّی آ گئے، جس کا سبب بھائیوں کی باہمی کشمکش کے علاوہ بادشاہِ وقت بہلول لودھی کی ارادت بھی تھی۔ بادشاہ نے جاگیر میں انھیں قنّوج کی سرکار دے دی۔ جب سے یہ خاندان قنّوج میں رہنے لگا۔ جب قنّوج کا تعلق حکومتِ دلّی سے منقطع ہوا، اور یہ علاقہ اودھ میں شامل ہو گیا تو اس

خاندان کے بزرگوں نے "النّاس علیٰ دین ملوکہم" کے مصداق مذہبِ امامیہ اختیار کر لیا۔ پانچ پشت تک یہ لوگ شیعانِ علی میں شامل رہے۔ آخر میں خاندان کے ایک فرد سیّد عزیز اللہ شمالی ہند میں اسلامی سلطنت کے زوال اور تباہی سے متاثر ہو کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں اُن کی مناسب آؤ بھگت ہوئی۔ سیّد اولاد علی خان انور جنگ ان ہی عزیز اللہ کے پوتے اور ہمارے صاحبِ تذکرہ عرشی کے دادا تھے۔

سیّد اولاد علی خان کو سرکارِ نظام سے نواب انور جنگ بہادر کا خطاب اور گولکنڈہ کی قلعہ داری عطا ہوئی۔ پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر ان کے خالصہ میں تھی۔ نواب انور جنگ نے اپنے پیچھے فرزندِ نرینہ صرف ایک سیّد اولاد حسن بخاری چھوڑے جو قنّوج ہی میں مقیم تھے۔ وہ بخلاف اپنے والد اور دوسرے اعزّہ کے اہلِ سنّت والجماعت کے مسلک پر قائم تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے حیدر آباد جا کر اپنے والدِ مرحوم نواب انور جنگ کے ترکے کا مطالبہ نہیں کیا کہ خدا معلوم یہ جاداد کسبِ حلال سے جمع ہوئی ہے یا نہیں! اگر وہ چاہتے تو منھ مانگا بیش قرار منصب اور جاہ و منالِ دنیوی انھیں مل سکتا تھا۔

مولانا سیّد اولاد حسن (۱۸۰۵ء۔۱۸۳۸ء) عالمِ باعمل تھے۔ ابتدائی تعلیم مولوی عبدالباسط قنّوجی سے حاصل کی، اور تکمیل دلّی جا کر شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدّین کی خدمت میں کی۔ یہاں سے علومِ دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ کے حصول کے بعد حضرت سیّد احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ جب سیّد صاحب سرحد کی طرف گئے، تو یہ بھی اُن کے ہمرکاب تھے۔ آخر اپنے مرشد سے اجازت اور سندِ خلافت لے کر یہ قنّوج واپس آ گئے، اور یہیں بقیّۂ عمر مخلوق کی ہدایت اور تعلیم میں گذار دی۔ اُن کی شخصیت علم و عمل کے امتزاج کا عجیب و غریب نمونہ تھی۔ ان کی تقریباً پندرہ تصنیفات دستیاب ہوئی ہیں جو سب کی سب مذہبی مسائل سے متعلق ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے اور حسن تخلص کرتے تھے۔

سیّد اولاد حسن نے مفتی محمد عوض (ساکن بانس بریلی) کی صاحبزادی نجیب النساء بیگم سے نکاح کیا۔ اس عقد سے دو صاحبزادے، سیّد احمد حسن عرشی اور سیّد صدیق حسن اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ سیّد اولاد حسن ۱۸۳۸ء (۱۲۵۳ھ) میں فوت ہوئے "مات بخیر" تاریخ وفات ہے۔ محلّہ شیخ پورہ قنّوج میں اپنے مکان کے متّصل، موروثی باغ میں دفن ہوئے۔

سید احمد حسن عرشی شنبہ ۱۹ رمضان ۱۲۴۶ھ (۳ مارچ ۱۸۳۱ء) پیدا ہوئے۔ سید صدیق حسن جو آگے چل کر "نواب والاجاہ، امیر الملک، سید صدیق حسن خاں بہادر" کہلائے، ان سے ڈیڑھ برس چھوٹے تھے۔ عرشی نے ابتدائی تعلیم قنوج میں حاصل کی۔ پھر بدایوں، کانپور، فرخ آباد، بریلی، علی گڑھ اور دہلی میں اساتذۂ وقت کی خدمت میں رہ کے تکمیل کی۔ علومِ کتاب و سنت کی سند مولانا سید عبدالغنی مدنی سے لی۔

کمالاتِ معنوی کے علاوہ فنونِ سپہ گری میں بھی طاق تھے۔ شہسواری، شمشیر زنی اور نشانہ بازی میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ گھوڑوں کی شناخت اور ہتھیاروں کے حسن و قبح پر بھی بڑی گہری نظر تھی اور اُن کا معقول ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انھوں نے قنوج کے باشندوں کے جان و مال کی حفاظت میں بہت قابلِ تعریف کام کیا۔ شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔

عرشی نے دو تین بار حج کا قصد کیا، لیکن ان کی والدۂ ماجدہ چاہتی تھیں کہ سب مل کر ایک ساتھ اس مقدس فریضہ سے سبکدوش ہوتے۔ اس لیے یہ رُکے رہے۔ مگر جب دیکھا کہ سب لوگوں کے لیے سفر کا سامان درست ہونے میں ابھی وقت لگیگا، تو زیارتِ بیت اللہ کے شوق میں ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء) میں اکیلے چل کھڑے ہوئے۔ بڑودہ پہنچ کر غلام حسین قنوجی کے مکان پر ٹھہرے۔ ارادہ تھا کہ چندے آرام کر کے آگے روانہ ہو جائینگے۔ اثنائے سفر میں خارش کی شکایت پیدا ہو گئی تھی، بڑودہ پہنچ کر تپ اور اسہال کی شدید تکلیف بھی لاحق ہو گئی۔ اسی حالت میں بیس روز بیمار رہ کر بروز جمعہ ۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۳ نومبر ۱۸۶۰ء) واصلِ حق ہوئے۔ وہیں بڑودہ میں تکیہ ماتریہ[5] میں مدفون ہیں۔ وفات کے وقت عمر تیس برس سے کچھ زیادہ تھی۔ لاولد فوت ہوئے۔ مولوی محمد عباس رفعت نے قطعۂ تاریخ لکھا:

عرشیِ عالی گہر احمد حسن — در طفیلِ مصطفےٰ مغفور باد

رخت بربست از جہاں سوئے بہشت — زیرِ طوبیٰ ہمنشینِ حور باد

گفت رفعت از پئے تاریخِ او — "با امام المتقین محشور باد" (۱۲۷۷ھ)

---

۵ بعض اصحاب نے کہا ہے کہ شاید یہ لفظ 'ماتریدیہ' ہے؛ یہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ بڑودہ کے باہر تالاب 'ماتریہ' آج تک موجود ہے۔ اسی کے قریب ساداتِ ترمذی (اخلافِ سید یحییٰ ترمذی مرید مخدومِ جہانیاں) کے مقابر ہیں (نیز دیکھیے: خاتمہ مرأتِ احمدی: ۶۲)

عرشی کو مطالعۂ کتب اور پڑھنے لکھنے کے سوا اور کوئی شغل نہیں تھا۔ بہت پُرگو اور زُود نویس تھے۔ ایک ایک نشست میں طولانی قصیدے اور ہر طرح کی نظم لکھنے پر قادر تھے۔ اُردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اس کے باوجود سچ تو یہ ہے کہ نسبتِ شاعری اُن کے دُون مرتبہ ہے۔ وہ علم و فضل اور ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث اپنے اقران و اماثل سے کہیں بڑھ کر تھے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔ اگرچہ شروع میں چندے مولانا فیض احمد رسوا بدایونی سے بھی مشورہ کیا۔ لیکن یہ تعلق زیادہ دن قائم نہیں رہا اور بعد کو اُردو اور فارسی دونوں میں غالب کا تلمذ اختیار کر لیا۔ ایک اُردو قصیدے میں یوں اعتراف کرتے ہیں ؎

مغلوب ہیں سب اہلِ جہاں میرے سخن سے — ہوں زلّہ رُبا غالبِ اعجاز رقم کا

ان کا کلام نظم و نثر، اُن کی وفات کے بعد، نواب والاجاہ نے جمع کر کے شائع کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب "شہابِ ثاقب" مذہبی مناظرہ قسم کی بھی موجود ہے۔

اُردو اور فارسی کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو۔ اُردو کی بہ نسبت فارسی میں نمک اور شوخی زیادہ ہے:

سَحر جو میں نے کہا، ہو قصورِ شب کا معاف — تو ہنس کے بولے کہ "چل دور ہو، ہوا سو ہوا"
اے وضعِ احتیاط یہ فصلِ بہار ہے — گلبانگِ شوق، زمزمہ سنجِ فغاں نہ ہو
اتنی ہی آرزو ہے ہمیں تجھ سے اے فلک! — یہ ان کی آگ نہیں بھی نہ ہو وے، جو ہاں نہ ہو
مجھے خوشی ہے ترے عشوہ ہائے پیہم کی — رہے نہ کوئی ستم عذرِ امتحاں کے لیے
کیا اک بات میں جامے سے باہر — شبِ وصل اُس نے جب مجھ سے حیا کی
خود آرائی نہ چھوڑینگے یہ کافر — خُدائی یوں تو برحق ہے خدا کی
شعلۂ عشق وہ ہے جس سے زمانہ جل جائے — یوں تو پتھر کے بھی سینے میں شرر ہوتا ہے

اب فارسی کا نمونہ دیکھیے:

چو عاشق میشود معشوق، کار از چارہ می افتد — گریباں چاکیِ گل را نباشد بخیہ گر پیدا
آبے نزند گریۂ من آتشِ دل را — فریاد کہ جانم ہمہ ایں چشمِ ترم سوخت
در راکہ بسر منزلِ جاناں نرسیدیم — سرگرمیِ شوق ایں ہمہ در رہگذرم سوخت
عرشی! چہ بلا سحر در افسانہ دمیدی — آہنگِ سخن سنجیِ تو بے شررم سوخت

گر اضطراب ندارم، ز آرمیدن نیست
شہیدِ عشق ترا، فرصتِ طپیدن نیست

کشم بزیرِ فلک، آہِ شعلہ زن تا چند
برنگِ شمع بفانوس سوختن تا چند
بیار بادہ کہ آتش زنم بکعبہ و دیر
دماغِ وسوسۂ شیخ و برہمن تا چند
بیا کہ طرحِ جنونِ دگر بیندازیم
قدم بہ پیرویِ قیس و کوہکن تا چند
زخویشتن بدر آ ہمچو بوے گل عرشیؔ!
برنگِ بلبلِ شوریدہ در چمن تا چند

مژدہ اے دل! کہ دگر سلسلہ از پا افتاد
کارِ دیوانگیم باز بصحرا اُفتاد
دلِ دیوانۂ من طاقتِ زنجیر نداشت
کار با سلسلۂ زلفِ چلیپا اُفتاد

پیش ازیں کیں گنبدِ چرخِ مدوّر ساختند
حسن را فرمانروائے ہفت کشور ساختند
ہر شرارے، کز دلِ پرشورِ من، سر بر کشید
قدسیاں بر آسماں بُردند و اختر ساختند

گر دغدغہ، تہمتِ غمّاز نباشد
از یار نگاہِ غلط انداز نباشد

چشمِ تو بیا یا سخنِ عشق سراید
از ضعف مگر طاقتِ گفتار ندارد

یارب! آرامشِ دل را ز کجا می آرم
اندریں دشت کہ بانگِ جرسے می آید
وائے بے رحمیِ صیادِ جفا کار کہ گفت
وہ چہ خوش نالہ ز کنجِ قفسے می آید
عرشیؔ امروز کہ پیمانہ بکف، می آیی
ہیچ ہیمے بدلت از عسسے می آید!

[مآثر صدیقی حصہ اوّل، شمع انجمن: ۳۲۲ - ۳۲۷؛
تذکرۂ علماے ہند: ۱۴۲۴ - ۲۵؛ حیواۃ العلما: ۷۱؛
خمخانۂ جاوید، ۵ : ۵۷۹]

عزیز (ولایت) ــــــ مولانا محمد ولایت علی خان صفی پوری

شیخ صدیقی، اولاد میں خواجہ عثمان ہارونی کی، جو پیر ہیں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے۔ یہ خاندان پہلے قنوج میں مقیم تھا۔ جب شاہان شرقی کے شاہ ابراہیم پر زوال آیا تو اس خاندان کے مورث اعلیٰ منشی فیض محمد قنوج سے ملانواں (ضلع ہردوئی) میں منتقل ہو گئے۔ یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ منشی فیض محمد لکھنؤ گئے اور ان کے وزیر امیرالدولہ مرزا حیدر بیگ کے پیش دست مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد گویا خاندان مستقل طور پر لکھنؤ کا ہو کے رہ گیا۔ فیض محمد کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے رونق علی (عزیز کے پردادا) بھی دربار شاہی سے وابستہ ہو گئے اور بتدریج ترقی کر کے نواب سعادت علی خان کے عہد میں دارالانشا کے میر منشی بن گئے۔ سعادت علی خان کو ان پر بےحد اعتماد تھا؛ انگریزوں سے جو معاملات پیش آتے یا خط وکتابت ہوتی، اس میں ہمیشہ منشی رونق علی کا مشورہ شامل رہتا۔ جب غازی الدین حیدر نے خاندانِ مغلیہ کے مقابلے میں اپنی آزاد بادشاہت کا اعلان کیا، تو انھوں نے رونق علی کو مالاے مروارید کے ساتھ ایک چاندی کی مہر عطا کی، جس پر ان کا نام کندہ تھا: امیر الانشا رونق علی خان؛ گویا عہدۂ امیر الانشا اور خانی کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔ کچھ مدت بعد انھوں نے بیماری کا عذر پیش کر کے اپنے عہدے سے سبکدوشی کی درخواست کی، تو غازی الدین حیدر نے ان کا استعفےٰ تو منظور کر لیا، لیکن ان کی پوری تنخواہ بدستور جاری رکھنے کا حکم صادر فرمایا؛ اور ان کی جگہ ان کے بیٹے (یعنی عزیز کے دادا) منشی ثابت علی خان کو دو سو روپے مشاہرے پر میر منشی مقرر کر دیا۔

غازی الدین حیدر کی زندگی تک تو منشی ثابت علی خان بے غل وغش کام کرتے رہے، لیکن جب ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر سریر آراے سلطنت ہوئے، تو وزیرِ اعلیٰ منتظم الدولہ حکیم مہدی علی

سے ان کی بنبھ نہ سکی، اور بعض دوسرے اعیان سلطنت کے ساتھ یہ بھی معتوب ہو گئے۔
یہ صورت حال جولائی ۱۸۳۷ء تک قائم رہی جب نصیر الدین حیدر کی جگہ ان کے چچا محمد علی شاہ تخت پر بیٹھے تو انھوں نے ثابت علی خان کو اپنے عہدے پر بحال ہی نہیں کیا، بلکہ ترقی دے کر پانچ سو مشاہرہ پر محکمۂ اخبار ملکی ان کے سپرد کر دیا۔
ثابت علی خان نے کام میں اپنے بڑے بیٹے یحییٰ علی خان کو بطور معاون رکھ لیا تھا۔ اس دوران میں حکیم مہدی علی جوڑ توڑ کر کے دوبارہ وزیر اعظم بن گئے۔ ثابت علی خان کے تعلقات ان سے پہلے سے خراب تو تھے ہی، انھوں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ خود ہی برضا و رغبت ملازمت سے دستکش ہو جائیں، تاکہ وزیر اعظم کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملے۔ چنانچہ انھوں نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ محمد علی شاہ نے حالات کے پیش نظر اسے منظور تو کر لیا، لیکن ایک تو ان کی خدمات کے صلے میں ان کی ڈھائی سو روپے مستقل خاندانی پنشن مقرر کر دی اور دوسرے ان کے بیٹے یحییٰ علی خان کو خلعت عطا فرما کر داروغۂ اخبار ڈیوڑھیات کے عہدے پر فائز کر دیا۔ وہ اس عہدے پر محمد علی شاہ کی وفات کے بعد امجد علی شاہ کے ابتدائی زمانے میں بھی کام کرتے رہے۔ چونکہ بتدریج دربار پر مذہبی غلو کا غلبہ ہونے لگا تھا، اور یہ فضا انھیں راس نہ آئی، اس لیے وہ مجبوراً مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد بھی یہ خاندانی پنشن انھیں واجد علی شاہ کے عہد میں انتزاع سلطنت تک ملتی رہی۔ اسی لیے ۱۸۵۷ء تک یہ خاندان لکھنؤ میں مقیم رہا۔ اس افتاد کے بعد مجبوراً انھیں یہاں سے نکلنا پڑا اور وہ آکر صفی پور (ضلع اناؤ) میں بس گئے۔
یحییٰ علی خان کی شادی صفی پور (ضلع اناؤ) کے شیخ محبوب عالم کی صاحبزادی سے ہوئی۔
ان کے بطن سے عزیز اپنی نانھیال صفی پور ۲/۶ صفر ۱۲۵۹ھ ۸/۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو پیدا ہوئے[۵]۔ تعلیم فارسی اور عربی معقول ڈھنگ سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد حسن صاحب

---

۵ ولادت کی تاریخ میں کچھ اختلاف ہے۔ ان میں سے دو قابل لحاظ ہیں: (۱) چودھری خصلت حسین نے اردو دیوان عرفان عزیز کے دیباچے میں ۲ صفر ۱۲۵۹ھ لکھی ہے (۲) ڈاکٹر احسان علی انصاری صفی پوری نے تنبیہہ المعتد المناع کے ضمیمے میں ۶ صفر ۱۲۵۹ھ۔ ان میں یقیناً ایک دوسرے کی تصحیف ہے یعنی ۶ کی جگہ ۲ لکھا گیا ہے، یا ۲ کی جگہ ۶؛ اسی لیے میں نے دونوں درج کر دی ہیں؛ جہینا بہرحال صفر ہے

بنگالی اور مولانا عبدالوالی فرنگی محلی سے پائی۔ اس کے بعد بانگرمئو (ضلع آناؤ) کے مولانا محمد رضا سے مختلف علوم و فنون کی تکمیل کی۔ ان کے والد یحییٰ علی خان کی خواہش تھی، کہ یہ بھی اپنا خاندانی پیشہ اختیار کر کے کسی ریاست سے وابستہ ہو جائیں۔ لیکن عزیز کی طبیعت نے اسے قبول نہ کیا۔

عزیز کا اپنے زمانے کے مشاہیر علم و فضل میں شمار ہوتا ہے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کلام موجود ہے۔ صرف فارسی میں غالب سے مشورہ تھا۔ چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتے ہیں:

ممنون میں نہیں ہوں کسی کے کمال کا | شاگرد اس زباں[1] میں ہوں ابن ذوالجلال کا
ہاں نظم فارسی میں ہوں غالب سے مستفید | منت گزارِ لطف ہوں، دو تین سال کا
بھیجی تھی ایک نثرِ مطوّل بھی چار جزو | ہوں معتقد میں دونوں[2] میں ان کے کمال کا
لکھا کہ اس میں حک و تصرّف کی جا نہیں | ہرگز محل نہیں ہے کسی احتمال کا
پس نثر میں بھی مجھ کو تلمذ جو ہے، تو یہ | اس میں بھی معترف ہوں خدا کے نوال کا

یہاں جس نثر کی طرف اشارہ ہے، یہ انھوں نے منشی ارادت خان عالمگیری کے پنج رقعہ کے جواب میں ۱۷-۱۸ برس کی عمر میں "پنج رقعۂ ولایت" کے عنوان سے لکھی تھی۔ لالہ سری رام کا بیان ہے کہ یہ نثر انھوں نے اپنے شاگرد منشی ٹھاکر پرشاد طالب کے لیے تصنیف کی تھی۔ (خمخانۂ جاوید ۵: ۴۰۹) غالب نے اس نثر سے متعلق اپنی رائے ایک خط میں لکھی تھی جو مطبوعہ موجود ہے۔ انھوں نے اسے ارادت خان کے پنج رقعہ کا نقشِ ثانی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ رجب علی بیگ سرور کے مشہور "فسانۂ عجائب" کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔ شاید یہ مسودہ ضائع ہو گیا۔

شروع میں تخلص ولایت تھا۔ لیکن جب حضرت شاہ مخدوم خادم صفی محمدیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو انھوں نے نام بدل کے محمد عزیز اللہ شاہ اور تخلص عزیز کر دیا۔ ابتدا میں ہر طرح کا کلام لکھا، لیکن اخیر میں ساری توجہ نعت پر مبذول رہی۔

فارسی میں چار دیوان تھے۔ دیوانِ ولایت، دیوانِ عزیز، اعجاز التواریخ، بیان التواریخ
نعت کے دو دیوان: نورِ تجلی، نعتِ محبوب۔ ان کے علاوہ مراۃ الصنائع (قصیدۂ نعتیہ)

---

[1] اُردو [2] نظم و نثر فارسی

اور متعدد مثنویاں ذکرِ جمیل۔ حسرتِ دل (نعت)، خبرِ خیبر، اعجازِ محمدی، فتحِ مبین وغیرہ۔ اُردو میں بھی تین دیوان (طورِ تجلی، نورِ ولایت، نظمِ دلفریب) موجود ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی اور اردو نثر میں بھی مختلف چیزیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک "پیشکش شاہجہانی" میں جو والیۂ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم کے حضور میں پیش کی تھی، یہ التزام کیا ہے، کہ خالص پارسی میں لکھی ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنے مضمون میں عربی، فارسی، اردو نظم و نثر میں ان کی تقریباً ۴۰ کتابوں کی نشاندہی کی ہے، زیادہ توجہ فارسی پر رہی۔ غرض کہ آخری دَور میں فارسی کے زبردست عالم، شاعر اور انشا پرداز تھے۔ افسوس کہ ان کی کماحقہ قدر نہیں ہوئی۔

۱۳ محرم، ۱۳۴۷ھ (۲ جولائی ۱۹۲۸ء) کو صفی پور میں انتقال کیا اور وہیں اپنے پیر کی درگاہ کے احاطے میں صدر دروازے کے قریب دفن ہوئے۔

شادی ان کے بچپن ہی میں ان کے والد نے اپنے پھوپی زاد بھائی منشی احمد علی کی بیٹی سے کردی تھی۔ عنفوانِ شباب میں ان کے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا، جو چھ دن بعد داغِ مفارقت دے گیا۔ اس کے بعد کوئی اولادِ جسمانی نہیں ہوئی، بلاولد فوت ہوئے۔

اے ہمہ حیرت ز تو دیدۂ بینائے ما　　صورتِ معنی نما، روئے دل آرائے ما
رحمتِ حق بہرِ ماست، گریہ ولایت چراست　　روضۂ رضواں بود، بعدِ فنا جائے ما
ہر شب فروغ بزمِ تو از ماست ہمچو شمع　　سوز و گداز دل ہمہ آمد بکارِ ما
ہر چند کہ آگاہم، شوریدہ و گمراہم　　در جوشِ اَنَا اللّٰہم، دیوانہ چنیں باید
چوں شمع برافروزد، شب تا بسحر سوزد　　گریاں بہ گداز آید، پروانہ چنیں باید
صد دیر و حرم جوشد، از ہر در و دیوارش　　در مشربِ رنداں میخانہ چنیں باید
بیا کہ عشق، بہ پیری جواں بگردانیم　　تواں بہ کالبدِ ناتواں بگردانیم
گل بہ ہزار رنگ و بوست، بلبلِ زار محوِ اوست
شاہدِ لالہ رُو کجاست، ترکِ ستم شعار کُو
گرچہ بہ تیغِ یک نظر، می فگنی ہزار سر
ہمچو ولایت، اے صنم! کشتۂ دل فگار کُو
شرابِ عشق در پیمانہ کردی　　بیک پیمانہ ام مستانہ کردی

بیک غمزہ مرا از خود ربودی — بیک عشوہ مرا دیوانہ کردی
بہ افسون نظر دادی فریبم — برسوائی مرا افسانہ کردی
بہ محفل شمع گشتی، گل بہ گلشن — ستم بر بلبل و پروانہ کردی
مرو سوے حرم اکنوں ولایت! — کہ عمرے خدمتِ بتخانہ کردی

اُردو کلام کا رنگ یہ ہے:

بُلا کے بات بھی کی، اور مسکرا بھی دیا — کیا شہید بھی قاتل نے خونبہا بھی دیا
سنبھلتے حضرتِ موسیٰ، مگر ستم یہ ہوا — دکھا کے جلوۂ دیدار، کچھ سنا بھی دیا

حلق پر خنجر چلا اور تھم رہا — جان دینے پر بھی اس کا غم رہا
ہم نے اک عالم کو چھوڑا عشق میں — لیکن اُن کا اور ہی عالم رہا
جان دی میں نے تو پائی مر کے جان — دم میں جب تک دم رہا بیدم رہا
کعبہ کیسا، سجدہ کیا، کیسی نماز — عمر بھر سر ان کے در پر خم رہا

الفتِ زندگی نہیں جاتی — جان بے عشق دی نہیں جاتی
جائیگی ایک دن فراق میں جان — کیا ہوا، گر ابھی نہیں جاتی
جان جائے، تو آرزو جائے — یہ بلا جیتے جی نہیں جاتی
ہوش جاتے ہیں، جب وہ آتے ہیں — دل کی حالت کہی نہیں جاتی
کیا کہوں، طرفہ ماجرا ہے، عزیزؔ! — دل گیا، بیخودی نہیں جاتی

ناتوانی سے نہیں اٹھتے ہیں پاؤں — دستگیری کر کرم سے ہمرہا!
کون جانے حال اس محبوب کا — خلوتِ ادنیٰ میں جو محرم رہا
پیری آئی، جاگ، توبہ کر، عزیزؔ! — اب تو جینے کا زمانہ کم رہا

[اردوے معلیٰ (علی گڑھ) اپریل ۱۹۰۴ء؛ زمانہ (کانپور)، اکتوبر ۱۹۲۷ء (۱۷۹-۱۸۶)؛ دیباچہ عرفانِ عزیز (دیوان)؛ سوانحِ اسلاف؛ دوماہی اکادمی (لکھنؤ)]

عزیز — مرزا یوسف علی خان بنارسی ثم دہلوی

بزرگوں کا وطن بنارس تھا۔ ان کے والد میرزا نجف علی خان جنوں (خلف میرزا محمد علی خان دیوانہ بنارسی) تھے جنوں بنارس چھوڑ کے علی گڑھ میں آرہے تھے اور وہاں کچھ جاداد بھی پیدا کرلی تھی۔ وہ مدتوں دہلی کے اطراف میں سررشتہ داری اور تحصیلداری کے عہدوں پر مقرر رہے۔ جب جنوری ۱۸۵۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا، تو عزیز اُن کے وارث ہوئے۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ناتجربہ کاری یا کسی اور وجہ سے یہ ساری جاداد کھو بیٹھے، اور بہت جلد انھیں روزی کی فکر لاحق ہوگئی۔ آخرکار دلّی پہنچے اور یہاں کوشش کرنے لگے۔ بیکاری کے ایام میں غالب نے ان کا کچھ ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا اور اپنے دوستوں سے بھی سفارش کرکے ان کی ملازمت کی کوشش کرتے رہے۔ چندے بلّی ماران کے ایک ہندو رئیس کے لڑکوں کو پڑھانے کا شغل بھی رہا۔

مرثیہ گوئی اور سوز خوانی دونوں کا بہت شوق تھا اور ان میں اچھی دستگاہ تھی۔ اسی واسطے سے غالب انھیں قلعہ میں لے گئے اور احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان بہادر مدارالمہام شاہی نے انھیں ابوظفر بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ وہاں سے انھیں خلعت، چارپارچہ اور گوشوارہ عطا ہوئے، "سراج الشعرا، سلطان الذاکرین" خطاب ملا اور تیس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب وظیفہ بند ہو گیا، تو محض مدرّسی ذریعۂ معاش رہ گئی۔

طبیعت میں مزاح تھا اور اپنی زباندانی کا بھی بہت خیال تھا، چنانچہ انیس اور دبیر تک کے کلام پر اصلاح دینے سے نہیں چوکے۔ آخیر عمر میں تلاش روزگار میں بھوپال گئے، اور وہیں ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ - ۱۸۷۴ء) میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

ان کے استاد بھائی قربان علی بیگ سالک نے تاریخ کہی:

کلیم مرتبہ یوسف علی عزیزِ سخن — کہ ظاہر است ز خوبی نظم او لاشش
چہ نظم، حاوی اقسامِ نظم، باید گفت — کسے نیافت چنیں دفترے نہ اشالش
معیل بود و عسیر المعاش تا تقدیر — کشید از وطن آخر بسوے بھوپالش
نگشتہ کامِ دل آں جار دا ہنوز افسوس — کہ دستِ مرگ رسا شد بدامن حالش
بفکرِ سال ہمی بودہ ام کہ سالک گفت — "عزیز یوسف مصرِ سخن" بگو سالش (۱۲۹۰ھ)

اس کے مقابلے میں خمخانۂ جاوید (۵: ۵۸۷) میں تاریخِ وفات ۱۲۸۹ھ ملتی ہے۔ بشیر نے عزیز کی وفات پر تین تاریخیں کہی ہیں:

(۱) آج کسبِ سخن تمام ہوا؛ (۲) شاعرِ بے عدیلِ لاثانی؛ (۳) امام شاعراں تاج المعلیٰ۔

ان میں سے ہر ایک سے (۱۲۸۹) برآمد ہوتے ہیں۔

غالب کی وفات کے بعد سیف الحق ادیب نے چندے انہی سے اصلاح لی تھی اور یہ ایک شاگرد ہی استاد کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

بد طالعی سے نیک نہ ہوگا مآلِ کار — بگڑی میں کوئی کام بنایا نہ جائیگا
ناصح کی ناتوانی میں ہم سُن کے کیا کریں — سر اُن کے آستاں سے اٹھایا نہ جائیگا
ہم یہ کہ اپنی مرگ کو، تم بِن طلب کریں — تم وہ، کہ ہم کو تم سے بلایا نہ جائیگا

بندہ نہیں بندہ، بُتِ بے شرم و حیا کا — امت میں محمدؐ کے ہے، بندہ ہے خدا کا

کیا کہوں، کوچۂ قاتل میں کیا کیا جاکر — ہمنشیں! خاک میں ملنا تھا مجھے، مل آیا

اب خاک گلہ خوں سے کرے دل ربطِ عشق — وہ دل نہیں، دماغ نہیں، وہ جگر نہیں
نے تو رفو کی جا ہے، نہ مرہم کا ہے مقام — کوئی علاجِ زخمِ دل، اے بخیہ گر نہیں

باغ میں سن کر غزل خوانی مری — بلبلِ شیدا ہے دیوانی مری

ہو گئے شوقِ کوئے یار میں خاک — یہ نہ دیکھا، ہوا کدھر کی ہے

[گلستانِ سخن: ۳۵۷؛ اُردوے معلیٰ: ۳۲ - ۳۳؛ نادراتِ غالب، (۲) ۵۰ - ۵۱؛ خمخانۂ جاوید، ۵: ۵۸۶ - ۵۸۸؛ گلستانِ بے خزاں: ۱۶۸ - ۱۶۹؛ "تذکرۂ بشیر" مشمولہ سہ ماہی "اُردو" کراچی، ۴۵: ۱: ۲۴۲]

عطاؔ ــــــ شیخ عطا حسین مارہروی

حضرت خواجہ حسن ملتانی سے دسویں پشت میں حکیم نجف علی مارہروی (خلف اشرف علی) کے صاحبزادے تھے۔ گھر کی چھوٹی موٹی زمینداری تھی، جس سے گذر اوقات شریفانہ وضع پر رہی۔ لیکن بعد کو حالات کی مجبوری سے معلمی کا پیشہ کر لیا تھا۔ مرزا غالب ایک خط میں چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کو لکھتے ہیں

صاحب! یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہوگئی۔ ہئے ہے اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑینگے، تب یہ تراوشِ خونابہ ظہور میں آئی ہوگی۔ مزا یہ ہے کہ عنوانِ بیان سے حق بجانب انھیں کے معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اصل کار رہبری نظر میں نہیں، اور حقیقتِ حال مجھ پر مجہول ہے، اس واسطے انجام و آغاز، اندازہ و اندازہ کچھ نہیں سمجھا حک و اصلاح کو آپ بنظرِ اصلاح ملاحظ فرمائیں۔ میں نے بجسب دستور ہر جگہ منشاءِ اصلاح لکھ دیا ہے، شیخ صاحب سے میرا اسلام کہیے گا۔ اور یہ کہیے گا کہ کیا کروں، دور ہوں، معذور ہوں، مدد نہیں کر سکتا۔ اعانت کے مراسم تقدیم کو نہیں پہنچا سکتا، خدا تمھارا نگہبان رہے۔ والسلام (اردوے معلیٰ: ۹۸)

یہاں جس مثنوی کی طرف اشارہ ہے اور جس پر غالب نے اصلاح دی تھی۔ وہ ان ہی عطا کی لکھی ہوئی تھی۔ اس کا نام "شکایتِ سعایت" ہے یہ نام تاریخی ہے؛ اس کی تاریخ تصنیف لکھی تھی:

چندے غمِ دل بدل دروں پروردم   از خوفِ جنوں کنوں بروں آوردم
اعدادِ وقوع چوں موافق افتاد   ہم نام "شکایتِ سعادت" (۱۲۷۲) کردم

اس میں انھوں نے لوگوں کی تمامی اور رسازشوں کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے ان کے خلاف یہ سب کارروائی کی تھی۔

ہوا یہ کہ عطا کے اکلوتے بیٹے حسن عسکری کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم حسنِ صوری و

معنوی سے آراستہ تھے۔ قوی ہیکل اور مردانہ کھیلوں کے ماہر کشتی، پنجہ، بانک، پٹہ، بنوٹ کے استاد۔ اس کے علاوہ موسیقی کے دلدادہ وشیدا۔ ایسے بیٹے کی جوانا مرگی سے غریب باپ کے دل پر جو گذری ہوگی، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ غم غلط کرنے کو انھوں نے ایک مکتب کی طرح ڈالی۔ بیوی کے بھانجے کو گود لیا اور اس کی اپنے بیٹے کی طرح پرورش کی، اسے پڑھایا لکھایا۔ جب یہ لڑکا سن شعور کو پہنچا تو والدین نے مطالبہ کیا کہ ہمارا بیٹا واپس ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ عطا نے بلطائف الحیل عذر معذرت کی، لیکن بیکار، وہ نہیں مانے اور ایک دن ان کی غیر حاضری میں لڑکے کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اسی واقعے کا ذکر انھوں نے اس مثنوی میں کیا ہے۔ پہلے اس مثنوی کے کچھ اقتباس دیکھیے:

اے سخن آفرینِ مارہرہ — مگسِ انگبینِ مارہرہ
خللِ اندازِ بزمِ یکجہتی — تفرقہ سازِ بزمِ یکجہتی
نمکِ خوانِ تفرقہ سازی — شورشِ اندازِ فتنہ پردازی
ناوکِ سینۂ نیازِ دروں — کاہشِ خاطرِ دلِ محزوں
زلفِ سردادۂ پریشانی — آئینہ دارِ روے حیرانی
سُرمۂ دیدۂ سخن چینی — خالِ رخسارِ زیبِ خود بینی
کاوشِ سینۂ نیاز قریں — خارشِ دیدۂ نثار آئیں
عالمِ نکتہ ہاے غمّازی — واقفِ رمزِ افترا سازی
کینہ توزِ دلِ محبّت کیش — سینہ سوزِ سرِ وفا اندیش
رونقِ مسندِ سخن چینی — آبروے نگاہِ خود بینی
باعثِ سردیِ وفا و وداد — سبب گرمیِ عناد و فساد
تو ہے کون، اور کیا ہے تیرا دیں — اہلِ دل کا تو یہ نہیں آئیں
میں تو دلدادۂ محبّت ہوں — اور گرفتارِ دامِ الفت ہوں
ہر کسی سے نیاز رکھتا ہوں — سوز کے ساتھ ساز رکھتا ہوں
گل ہوں میں گلستانِ الفت کا — سرو ہوں گلشنِ محبّت کا
رنگِ رُوے گلِ وفا ہوں میں — مستِ بُوے گلِ وفا ہوں میں
بلبلِ گلستانِ یاری ہوں — قمریِ سروِ جاں نثاری ہوں

نہ سہی خوبیوں میں افسانہ
اچھی باتوں کا ہوں تو دیوانہ

بے حقیقت ہوں جیوں شکستہ سفال
با حقیقت، ولے بہ صفِ نعال

مستمند و غریب بیچارہ
دشت ادبار میں ہوں آوارہ

دل شکستہ ہوں اور غم زدہ ہوں
خستہ تن اور ہیں ستم زدہ ہوں

دردمندِ جگر گداختہ ہوں
ایک غم سے میں زہرہ باختہ ہوں

تاب و طاقت رہینِ وحشت ہے
خواب و آرام وقفِ حسرت ہے

نہ چمن ہوں، نہ باغبانِ چمن
مرغِ گم گشتہ آشیانِ چمن

کیا کہوں، کیسا بدنصیب ہوں میں
ہوں وطن میں، ولے غریب ہوں میں

ماجرا اپنا گر سناؤں کبھو
چشمِ خورشید سے گریں آنسو

ابر کا سینہ چاک ہو جاوے
برق بھی جل کے خاک ہو جاوے

اشک سے میرے رشک جیحوں کو
آہ کی تاب کب ہے گردوں کو

غنچہ گر بیکلی مری دیکھے
نام کو بھی ہنسی کا نام نہ لے

لالہ ساں گریہ دیکھے داغِ دلی
چشمِ نرگس رہے کھلی کی کھلی

گل مرا حال دیکھ جلتے ہیں
کفِ افسوس برگ ملتے ہیں

لیک اے کینہ جو صفا دشمن!
اس قدر میرے ساتھ سوءِ ظن

دیکھ کر حالِ چرخِ دوں پرور
کی معلم گری میں عمر بسر

گرچہ کچھ اس قدر نہ تھی پروا
مقتضائے زمانہ پر یوں تھا

ایک مدت برنگِ فصلِ بہار
رہی مکتب کی گرمیِ بازار

پھر کچھ اس میں کساد آنے لگا
آخر آخر فساد آنے لگا

گو متاعِ سخن تھی بالادست
تھا ہر اک مشتری کا حوصلہ پست

نادہندی کو کام فرمایا
رسمِ دادن نہ لب تلک آیا

اور شاید جو کی طلب تنخواہ
حاصلِ امرِ خواستن تھا: "مخواہ"

جب ہوا حال ماضیِ مطلق
خواستن سے "مخواہ" کر مشتق

حرفِ مطلب پہ رکھ کے سب نے لب
متحرک کیا کہا: "مطلب"

خوب مصدر سے اشتقاق کیا متعدّی کو لازمی جانا
فعلِ مجہول سب وہ قول و قرار تھا نہ دادن قریبِ استمرار
مانگتے ہیں سمجھ کے رسوائی نہ ہوا اس کا ہیں تمنائی
دل کو اس پر بھی جب سکوں نہ ہوا پھر بھی مکتب میں تفرقہ ڈالا
کرکے اثباتِ علت و معلول فعلِ معروف کر دیا مجہول

ہوگیا خط کے آنے جانے پر
ادبستاں تمام زیر و زبر

....

ہمدموا کس لیے یہ کاوش ہے کون سے بغض کی تراوش ہے
جرم ٹھہرا کے دو سزا اس کی حرکت دیکھو یہ نہیں اچھی
میں تو تعظیم میں رہوں سرگرم تم کو اس کی بھی کچھ نہ آوے شرم
جرم کاروں کو یوں منا لانا رحم کی جا پہ غیظ فرمانا
پے آزار یہ کمر بندی اللہ اللہ رے خرد مندی
عوضِ خدمتِ زن و اطفال خوں مرا تم کو کیوں ہوا ہے حلال
اے سر سرورانِ دولتمند کون کرتا ہے یہ طریق پسند
اُٹھ کے کیوں آئے تھے لڑائی کو دیکھیے خوردی اور بڑائی کو!
گھر پہ چڑھ آنا طرفہ تھا مضموں مانیا فطرت اور تھا یہ جنوں
ورنہ یہ کیا وفورِ دانش تھا یہ تو صاحب قصورِ دانش تھا

کھو گیا عقل تھی، یہ فرماؤ!
اپنے دل میں ذرا تو شرماؤ!

مثنوی پر مخالف اور چراغ پا ہوئے اور طرح طرح کی اوچھی حرکتیں کرنے لگے۔ اس پر جل کر کہا:

کاوشِ اہلِ وطن سے ہے یہ جی کی حالت کہ مشبک ہے جگر، خانۂ زنبور صفت
جیتے جی ہے یہ ارادہ کہ اتاریں ٹوپی بعدِ مردن ہے مگر اخذ کفن کی نیت
اے عزیزِ دلِ استاد فلاں سلمہ تا بکے در جگر این نشتر کین نقمت

عطا کی عربی اور فارسی کی استعداد بھی بہت اچھی تھی۔ نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ لیکن اکلوتے بیٹے کی جوانا مرگی سے ایامِ زندگانی تلخ ہو گئے۔ اسی حال میں، ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ (۲۲ نومبر ۱۸۷۹ء) کو انتقال کیا۔

کچھ اور کلام دیکھیے:

کہیں جو شیشۂ مے ساقیا ذرا ٹوٹا تو جانیو کہ مرا دل ہزار جا ٹوٹا
مصاحب آیینہ ٹھہرا ہے اس خود آرا کا اب اپنی دید کا بھی اس کا آسرا ٹوٹا
کسی کا بال بھی ٹوٹے تو سانس لیتا ہے یہ میرا شیشۂ دل تھا کہ بے صدا ٹوٹا
مری شکستہ دلی کی دلیل ہے یہ عطا! کہ ہے ردیف غزل میں بھی جا بجا ٹوٹا

تھی نکہت عیش سے یہ دل کو فرحت خنداں خنداں سدا تھے ہم گل کی صفت
کیا بادِ خزاں چلی چمن میں کہ عطا! شبنم کی طرح سے اب ہے روتی صورت

یہاں ایک بات لکھنا بے محل نہیں ہوگا۔

غالب کے محولۂ فوق خط بنام چودھری عبدالغفور سرور سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی خود عطا نے نہیں، بلکہ سرور نے بغرضِ اصلاح غالب کے پاس بھیجی تھی؛ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ - ۱۸۵۶ء) کی بات ہے، جیسا کہ مثنوی کی تاریخ (شکایت سعایت) سے ظاہر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عطا کی غالب سے ملاقات نہیں تھی اور غالب ان کے حالات سے ناواقف تھے۔ اس مثنوی کے علاوہ عطا کا اور کلام نہیں ملتا، صرف چند شعر ایک آدھ تذکرے میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اس مثنوی کے علاوہ غالب سے اور کتنا استفادہ کیا۔

[المشاہیر: ۲۳۶ - ۲۳۹؛ نیز ۲۸۰؛ قومی زبان (کراچی)، جولائی ۱۹۶۶ء: ۲۴ - ۳۰]

علائیؔ ـــــ نواب علاء الدین احمد خان بہادر والی لوہارو

ان کے خاندان کا مفصّل حال نیّر رخشاں کے ترجمے میں لکھا گیا ہے۔ نواب احمد بخش خان بہادر کے چار صاحبزادے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جائداد کی تقسیم یوں کی تھی کہ ان کے بعد فیروز پور جھرکہ سب سے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خان کو ملے اور لوہارو دونوں چھوٹے لڑکوں ـــ امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کے حصّے میں آئے۔ نواب احمد بخش خان کی وفات (اکتوبر ۱۸۲۷ء) کے بعد بھائیوں میں آپس میں اختلاف پیدا ہو گیا، اور شمس الدین احمد خان نے چاہا کہ کسی طرح لوہارو بھی مجھے مل جائے۔ بہرحال بہت کچھ مناقشے کے بعد لوہارو ان ہی دونوں بھائیوں کے پاس رہا۔ بعد کو سرکارِ انگریزی نے لوہارو پر نواب امین الدین احمد خان کا قبضہ بلا شرکتِ غیرے تسلیم کر لیا؛ اور چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خان کے لیے ریاست کے خزانے سے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

امین الدین احمد خان ۱۲۲۹ھ (خندہ از لطفِ الٰہی زد بہنگامِ سحر) یعنی ۱۸۱۴ء (دولت و اقبال و بخت و سال ایں بادا جواں) میں فیروز پور جھرکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی وفات بروز جمعہ ۲۷ رمضان ۱۲۸۶ھ (۳۱ دسمبر ۱۸۶۹ء) آدھی رات کے وقت ہوئی۔ وفات کی تاریخ آیتِ قرآنی "سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلا" سے نکلتی ہے۔ قطب صاحب میں نواب ضیاء الدین احمد خان کی ہڑواڑ (کوٹھی مرزا بابر) کے دالان میں دفن ہوئے۔ لوح پر کندہ تھا: "مدفن امین الدین احمد خان بہادر" (۱۲۸۶ھ)۔

نواب امین الدین احمد خان کا نکاح نواب غضنفر الدولہ مغزز الملک متقل جنگ عرف مینڈھو خان رسالدارِ سلطنتِ اودھ کی صاحبزادی دلی النساء بیگم سے ہوا تھا۔ ان بیگم سے علاء الدین احمد خان ۴ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ (۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء) کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم شروع



نواب علاء الدین احمد خان علائی دہلوی

سے غالب کی نگرانی میں ہوئی اور میرزا انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ فارسی، ترکی اور عربی کی استعداد عالمانہ تھی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی سے اردو کی بہ نسبت زیادہ مزاولت اور شغف تھا۔ چنانچہ فارسی میں کلام بھی زیادہ ہے۔ غالب نے انھیں ایک سند میں اپنے بعد فارسی اور اردو دونوں میں اپنا خلیفہ اور جانشین بھی مقرر کیا تھا۔ ناظم ہروی کا مشہور قطعہ ہے جس میں عنصری سے لے کر جامی تک تمام سربرآوردہ شعراء کا ذکر کیا ہے۔ اس کا آخری شعر ہے:

زخسرو چو نوبت بہ جامی رسید
زجامی سخن را تمامی رسید

غالب نے ایک شعر کا اضافہ کرکے اس سلسلے کو اپنے تک یوں منتہی کیا تھا:

زجامی بہ عرفی و طالب رسید
زعرفی و طالب بہ غالب رسید

علائی نے اسی سندِ جانشینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس پر مزید ایک شعر کا اضافہ کرتے ہوئے کہا:

علائی چو برجاے غالب نشست
ورق بر درید و قلم در شکست

غرض کہ انھیں پڑھنے لکھنے کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ لوہارو میں ایک چھاپہ خانہ بھی فخر المطابع کے نام سے قائم کیا تھا، جہاں سے علمی اور ادبی کتابیں شائع کرتے رہے۔ ایک پندرہ روزہ اخبار بنام "امیر الاخبار" بھی یہیں سے چھپتا تھا۔

اس کے علاوہ شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔ ریورنڈ وہٹلی صاحب جب دلی آگئے تو انھوں نے شہر کے ان اصحاب سے راہ و رسم پیدا کی، جنھیں شطرنج سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ یکم نومبر ۱۸۶۶ء کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کے بعد ایک شطرنج سوسائٹی (یا جلسۂ شطرنج) کی بنا ڈالی گئی۔ فیصلہ ہوا کہ بلا ناغہ بروز دوشنبہ مغرب کے بعد سوسائٹی کا جلسہ ہوا کرے گا۔ یہ جلسے علائی کے مکان (بلی ماران) میں ہوا کرتے تھے۔ رات کے دس دس بجے تک یہ کھیل اور خوش گپیاں جاری رہتیں۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر سوسائٹی کے عہدہ داروں کے نام یہاں لکھ دیے جائیں:

شیخ وارث علی پریذیڈنٹ یعنی میر مجلس

میرزا علاء الدین احمد خان بہادر	سکرٹری	یعنی	منصرم
جناب ریورنڈ روبنٹلی صاحب بہادر	ممبر	"	رکن
جناب سمت وایٹ صاحب بہادر	"	"	"
میرزا قربان علی بیگ خان سالک	"	"	"
میرزا غلام حسن خان محو	"	"	"
میرزا شمشاد علی بیگ خان رضوان	"	"	"

یہ جلسے بہت دنوں جاری رہے۔ اس سوسائٹی کی رُوداد اکمل الاخبار دہلی میں چھپتی رہتی تھی اور انگریز ممبروں کے ذریعے سے کھیل کے نقشے یورپ بھی بھیجے جاتے تھے۔

آخری ایام میں نواب امین الدین احمد خان بہت بیمار رہنے لگے تھے، بلکہ کچھ دماغ پر بھی اثر تھا؛ علائی ۳۷ برس کی عمر میں اپنے والد کی حیات ہی میں لوہارو کی گدّی پر بٹھا دیے گئے تھے۔ "ریاست خداداد" اس کی تاریخ ہے (۱۲۸۵ھ)۔ ۱۵ اگست ۱۸۷۴ء کو لارڈ نارتھ بروک وائسرائے کے عہد میں البتہ پورے اختیارات اور خاندانی خطاب "فخر الدولہ، دلاور الملک، رستم جنگ" ملے۔ "خطاب خوب ملا" (۱۲۹۱ھ) اس کی تاریخ ہے۔ لیکن علمی سرگرمیوں اور دوسری مشغولیتوں کے باعث انھوں نے ریاست کے کاروبار کی طرف پوری توجہ نہ دی، جس سے معاملات روز بروز بگڑتے گئے۔ خرچ میں بھی اعتدال قائم نہ رہ سکا اور ریاست کی مالی حالت بہت سقیم ہو گئی۔ ۱۸۸۱ء میں ریاست پر ایک لاکھ سے زیادہ کا قرض تھا۔ آخر کار حکومتِ انگریزی نے مداخلت کی، جس پر انھیں انتظامِ ریاست سے دستبردار ہو کے فرخ نگر میں مقیم ہونا پڑا۔ اٹھارہ ہزار روپیہ سالانہ ان کا وظیفہ مقرر ہوا اور ریاست کا انتظام ان کے بڑے صاحبزادے امیر الدین احمد خان (عرف فرخ مرزا) کے سپرد کر دیا گیا۔

علائی کا نکاح نواب جلال الدین خان (نبیرۂ نواب نجیب الدولہ) کی صاحبزادی شمس النساء بیگم سے ۳۰ جمادی الاول ۱۲۷۱ھ (۱۸ فروری ۱۸۵۵ء) کو نجیب آباد میں ہوا۔ اس بیوی سے ان کے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ علائی کی وفات جمعہ ۱۱ محرم ۱۳۰۲ھ (۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء) کو ہوئی۔ اپنی خاندانی ہڑواڑ قطب صاحب ہی میں اپنے چچا نیر رخشاں کے پہلو میں دفن

ہوئے۔ امیر مینائی نے تاریخ کہی:

مزارِ سایۂ یزداں علاء الدین احمد خاں

کلام کو مدوّن کرنے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی اور واقع یہ ہے کہ اپنے علم و فضل کے شایانِ شان کوئی قابلِ قدر علمی یادگار نہیں چھوڑی۔ قلمی بیاض سے کچھ کلام انتخاب کر کے ذیل میں درج کرتا ہوں:

الطافِ حق کو وقتِ مصیبت تو یاد رکھ
ہرگز نہ ہو بلا و عنا میں تو ناصبور

روتا ہے، وقتِ رنج و بلا بھول کیوں گیا
آرام و عافیت وہ تمام عیش اور سرور

کُتّا بھی دَر سے اپنے خداوند کے کبھی
دو چار فاقوں میں کبھی ہوتا نہیں ہے دُور

بس شرم کر، کہ تھوڑی سی زحمت میں ہائے ہائے
کر یاد لطفِ سابقہ، اے بندۂ کفور!

اللہ ری بے ثباتیٔ عمرِ فنا پسند!
بجھتا ہے یہ چراغ پلک کی ہوا کے ساتھ

شکوہ ہے کیوں قبول میں، گر ہو مضائقہ
آخر کسی کا نام تو لوں میں دعا کے ساتھ

درماں پذیر درد اگر ہے، تو خاک ہے
دیں جان کیوں نہ درد کے بدلے دوا کے ساتھ

مشتِ خاکستر ہے وہ بلبل کہ گلشن میں نہیں
داغ ہے وہ دل کہ خوں کے ساتھ دامن میں نہیں

دنیا کی خیر و خوبی میں لیل و نہار کو
کب جانتی ہے خلق کہ کیوں کر گذر گئے

راتیں جو تھیں تمام ہوئیں نائے و نوش میں
یوں دن کٹے کہ گھر سے اِدھر کو اُدھر گئے

جب عافیت کا قافیہ ہوتا ہے تنگ تر
روتے ہیں ان دنوں کو کہ ہے ہے، کدھر گئے

آوارگانِ گل کدۂ آرزو!
حاشا، اگر تمھیں سرِ سیر و فراغ ہے

دیکھو سنبھل کے پاؤں، جو بینا ہو چشمِ دل
کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے

وہ گل جو آج ہے قدحِ موج خیز رنگ
وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے

کل چور ہوگا، سنگِ جفائے سپہر سے
گویا کہ غمکدے کا شکستہ ایاغ ہے

اور لالہ، تُند بادِ حوادث سے خاک و خوں
گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے

جس جا کہ تھا، ترانۂ بلبل نشاط خیز
اس جا پہ آج دلشکن آوازِ زاغ ہے

مغرورِ جاہ سے یہ کہو تم، علائیا!
کل ایک سطحِ خاک ہے جو آج باغ ہے

فارسی کلام یہ ہے:

پیدا نبود پیشِ ازیں خود عیانِ ما
برداشت پردہ گریہ ز رازِ نہانِ ما

مشکل ببیں چگونہ ز خویشش خبر دہیم — کاتش بنامہ در زدہ سوزِ بیانِ ما
از سوزشش است رونقِ ما چوں نہالِ شمع — عین بہارِ ماست، ہما نا خزانِ ما
ساز و جرس ز نالہ سرشکم بہ کوے دوست — محتاج رَا ہبر نشود کاروانِ ما
پروانہ نیستیم کہ از تاب جاں دہیم — بر شاخ شعلہ بستہ فلک آشیانِ ما
تلخی دردِ ہجر، ز بس در تنم نشست — زیں پس ہما ہمی نخورد استخوانِ ما
لیلیٰ کند ملامتِ ما زاں سبب کہ قیس — گم کردہ راہِ شوق، ز شورِ فغانِ ما

گوئی کہ مجمراست، علائیؔ! دلِ حزیں
ریزد شرارہ جاے سخن از زبانِ ما

روزے نشد، کہ اشک ز فرقم گذر نکرد — از سر گذشت و دامنِ افلاک تر نکرد
در مرگ نیست بر سرِ من منت، از اجل — تیرِ تو کارِ کرد، دعاے سحر نکرد
تا سہل تر بمیرم و بسمل تپم بخاک — از غمزہ کُشت، لیک بسُویم نظر نکرد

ہاں خدارا! زود تر گوبید با جانانِ من — کے رسی آخر؟ کہ جاں بر لب رسید اے جانِ من
دعویٔ الفت مکن، اے قیس! کاندر راہِ عشق — بر تو دشوار ست تمکیں، واں بود آسانِ من

نازم شبِ وصلِ صنم، مہ جلوہ جاناں در بغل — من گشتہ از خود بے خبر، اُو خفتہ آساں در بغل
زلفے وصد مشکِ ختن، چشمے و چندیں سحر و فن — روے و گل در آستیں، بوے دلستاں در بغل

رباعی

صد رہ بہ خطا ز مرد معذوری بہ — صد رہ بہ عیوبِ دوست مستوری بہ
فتویٰ کہ ز پیرِ دل گرفتم، انیست — قربے کہ بہ عادل نبود، دُوری بہ

رباعی

اے چرخ! چرا ستیزہ با ما داری — دانم کہ غلط نہ، نہ بیجا داری
خواہی کہ دہی نقشِ وجودم برباد — آرے، کہ مرا بدہر یکتا داری

[بیاضِ علائیؔ (قلمی)؛ اُردو، جولائی ۱۹۴۴ء:
۳۰۹ - ۳۲۸؛ بساطِ فرنگ]

علیؔ —— نواب علی بہادر (باندہ)

اس خاندان کی تاریخ پیشوا باجی راؤ اوّل سے شروع ہوتی ہے۔ باجی راؤ جب اپنے والد بالاجی کی وفات پر ۱۷۲۰ء میں شاہو اوّل (پسر سیواجی) کا پیشوا بناہے، تو اس وقت اُس کی عمر بمشکل ۱۹ برس کی ہو گی۔

۱۷۲۹ء میں نواب محمد خان بنگش نے راجا چھترسال بندیلہ کو جیت پور کے قلعے میں گھیر لیا۔ چھترسال کی درخواست پر باجی راؤ اس کی مدد کو پہنچا۔ ادھر محمد خان نے دلی سے کمک منگوانے کا انتظام کیا۔ لیکن باجی راؤ کی طاقت اور سیاست کے سامنے محمد خان کی ایک نہ چلی، اور بالآخر اسے مرہٹوں کی شرائط پر صلح کرنا پڑی اور اس نے وعدہ کیا کہ آیندہ وہ چھترسال سے کوئی تعرض نہ کریگا۔

چھترسال نے اس مصیبت سے چھٹکارا پایا، تو اُس نے پیشوا باجی راؤ کے ۱۷۰۱ء میں ایک شاندار دربار منعقد کیا، اسے بہت بڑی جاگیر دی، اپنے دونوں بیٹوں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ آج سے آپ ان کے سرپرست اور محافظ اور معاون رہینگے، اور تحفۃً مستانی اس کے پیش کی۔

مستانی کون تھی، اس سے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ لیکن عام راے یہ ہے کہ اسکا باپ ہندو اور ماں مسلمان تھی اور وہ خود اسلام کی پیرو تھی، رقص و سرود اس کا پیشہ تھا؛ بہر حال وہ اپنے زمانے کی حسین ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھی۔ باجی راؤ اسے دیکھتے ہی جی جان سے اس کا والہ و شیدا ہو گیا۔ اس دن سے مستانی اس کی سفر و حضر کی رفیق اور مصاحب بن گئی۔ مستانی کے بطن سے باجی راؤ کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ چونکہ مستانی مسلمان تھی اور قدامت پرست

ؔ مستانی کی شیشے پر بنی ہوئی ایک تصویر پونے کے راجہ کیلکر میوزم کی پہلی منزل (مستانی محل) میں موجود ہے۔



نواب علی بہادر علی (باندہ)

مرہٹوں نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ باجی راؤ نے اس لڑکے کو بھی مسلمان بنایا اور اس کا نام شمشیر بہادر رکھا؛ اسے بعد کو اپنی بندھیل کھنڈ کی جاگیر میں سے باندہ بطور تحفہ دے دیا۔ شمشیر بہادر بعمر تقریباً ۲۷ برس پانی پت کی تیسری جنگ (۱۷۶۱ء) میں مارا گیا، اور اس کے بعد اس کا بیٹا علی بہادر جانشین ہوا۔

علی بہادر کے مرہٹہ حکمرانوں سے بہت اچھے تعلقات رہے خصوصاً مہاداجی سندھیا سے اس کا دانت کاٹی روٹی والا تعلق تھا۔ لیکن بعد کو کسی بات پر بگڑ گئی اور علی بہادر اس سے الگ ہو گیا۔ اب اس نے اپنی طاقت بڑھانا شروع کی۔ اس نے باندہ کے اردگرد کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا اور اس کی حیثیت ایک مضبوط اور مستحکم ریاست کی ہو گئی۔ وہ کالنجر کے قلعے کا محاصرہ کیے پڑا تھا کہ معمولی علالت کے بعد ۲۸ اگست ۱۸۰۲ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ شاہ عالم ثانی نے غلام قادر روہیلہ کی گرفتاری کے سلسلے میں علی بہادر کی خدمات کے صلے میں اسے یہ حق عطا فرمایا تھا کہ اس کے خاندان کی اموات کی لاشیں درگاہ قطب صاحب دلّی میں دفن ہو سکیں گی۔ چنانچہ علی بہادر کی لاش کالنجر سے دلّی آئی، اور قطب صاحب میں دفن ہوئی۔

علی بہادر کے دو بیویوں سے دو بیٹے تھے: بڑا شمشیر بہادر اور چھوٹا ذوالفقار بہادر۔ شمشیر بہادر باپ کا جانشین اور گدّی کا وارث ہوا۔ ۱۸۰۴ء میں انگریزوں نے باندہ کی ریاست پر قبضہ کر لیا اور شمشیر بہادر اور اس کے خاندان کے گزارے کے لیے چار لاکھ سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ چندے بعد باندہ ہی کے قریب اسے سکونت کے لیے بڑی جاداد دے دی گئی، جہاں یہ لوگ آرام و آسایش سے زندگی بسر کرنے لگے۔

شمشیر بہادر (ثانی) ۳۱ اگست ۱۸۲۳ء کو لاولد فوت ہو گیا؛ اور اب اس کا چھوٹا (سوتیلا) بھائی ذوالفقار بہادر خاندان کا سربراہ تسلیم کر لیا گیا۔ غالب جب اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں ۱۸۲۷ء میں کلکتے گئے ہیں تو انھوں نے کئی مہینے تک باندہ میں ذوالفقار بہادر ہی کے وہاں قیام کیا تھا۔ ذوالفقار بہادر نے نہ صرف ان کی میزبانی کی، بلکہ مالی امداد بھی دی اور باندہ سے سفر خرچ کے لیے قرض کا بھی انتظام کیا۔ ذوالفقار بہادر کا نام غالب کے فارسی کلام میں کئی جگہ آیا ہے۔ ان کا ۵ اگست ۱۸۴۹ء میں انتقال ہوا اور وہ بھی دلّی میں دفن ہوئے۔ علی بہادر (ثانی) ان کے بیٹے وارث قرار پائے؛ یہی ہمارے صاحبِ ترجمہ

ہیں۔ اگرچہ ان کی تاریخِ ولادت کسی نے نہیں لکھی، لیکن قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ شاید ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا عُرف میاں صاحب تھا۔

غالب کے ایک خط سے جو انھوں نے نواب انور الدولہ سعد الدین خان شفق (کالپی) کے نام لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی ان سے دور نزدیک کی کچھ رشتے داری بھی تھی لکھتے ہیں:

> میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشینِ حال کا چچا تھا، اور وہ میرا ہمشیر بھی تھا۔ یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا، وہ باعث ہوا تھا۔ میرے باندہ بوندیل کھنڈ آنے کا۔ میں نے سب سامانِ سفر کر لیا، ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا، قصد یہ تھا کہ فتحپور تک ڈاک میں جاؤنگا، وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی سواری میں باندے جا کر ہفتہ بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا، آپ کے قدم دیکھتا ہوا بسبیل ڈاک دلّی چلا آؤنگا۔ ناگاہ حضورِ والا (یعنی بہادر شاہ ظفر) بیمار ہو گئے؛ اور مرض نے طول کھینچا۔ وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا اور پھر مرزا اورنگ خاں (؟ اوزبک خان) میرا بھائی مر گیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ (اُردوے معلّیٰ: ۲۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ غالب کی ممانی (یعنی عزت النسا بیگم کی بھاوج) ذوالفقار بہادر کی سگی خالہ تھیں۔ ذوالفقار بہادر کے اپنے بیٹے علی بہادر ثانی ہوئے اور ان کی خالہ کے بیٹے اورنگ خان (؟ اوزبک خان) ان کے بھائی۔ اسی لیے غالب نے اورنگ خان (اوزبک خان) کو علی بہادر کا چچا لکھا ہے۔ کیونکہ جب ذوالفقار بہادر کی خالہ کے بیٹے ان کے بھائی تھے؛ تو وہ علی بہادر کے چچا ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں اگر اورنگ خان (اوزبک خان) غالب کے ماموں کے بیٹے بھائی، علی بہادر کے چچا ہیں، تو خود غالب بھی علی بہادر ثانی کے چچا ہوئے

غالباً اسی زمانے میں غالب نے وہ غزل کہی جس کا مطلع ہے:

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اس کے مقطع میں علی بہادر ثانی کی طرف تلمیح ہے:

غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز ۔۔۔ دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ علی بہادر ثانی ہی کے زمانے میں ہوا ۔ اور وہ بھی اس سلسلے میں انگریزوں کے معتوب ہو گئے تھے ۔ ہوا یہ کہ جب جون ۱۸۵۸ء میں دیسی سپاہ نے الہ آباد میں جیل کے دروازے کھول دیے تو یہ پورا جم غفیر کوچ کرتا باندہ پہنچا ، اور یہاں انھوں نے علی بہادر کی نوابی کا اعلان کر دیا ۔ علی بہادر کو بھی طوعاً و کرہاً ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی ۔ باندہ کے انگریز کلکٹر مسٹر مین (O.MAynE) نے راہِ فرار اختیار کی اور وہ گرتا پڑتا الہ آباد پہنچ گیا ؛ لیکن مجسٹریٹ کاکرل دیسی سپاہ کے ہتھے چڑھ گیا اور اُسے انھوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔

علی بہادر اور ان کے ساتھیوں کو میجر جنرل وہٹلاک نے ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کو مدراس کی فوج کی مدد سے شکست دی ۔ علی بہادر نے دیکھا کہ اب مزید مقابلہ بیسود ہے ، تو ہتھیار ڈال دیے اور اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا ۔ جائداد تو ضبط ہونا ہی تھی ، جان یوں بچ گئی کہ علی بہادر بذاتِ خود کسی انگریز یا یورپی کے قتل میں شریک نہیں تھے ، بلکہ بعض انگریزوں کی جانیں محض ان کی وجہ سے بچ گئی تھیں ۔ حکومت نے فیصلہ کیا کہ آیندہ انھیں تین ہزار ماہانہ وظیفہ دے کر مہو چھاؤنی (اندور) میں نظر بند کر دیا جائے اور وہ حکام کی اجازت کے بغیر مہو سے باہر نہ جائیں ۔ جان بچی لاکھوں پائے ۔

نواب کی والدہ نے بھوپال میں پناہ لی تھی ؛ انھیں سیہور جانے کا حکم ہوا ۔ ۱۸۶۰ء میں انھوں نے درخواست دی کہ سیہور کی آب و ہوا مجھے راس نہیں ، میری صحت تباہ ہو رہی ہے ۔ اگر سرکار کو میرا بھوپال میں رہنا منظور نہیں ، تو مجھے آگرہ ، گوالیار ، کانپور ان تین مقامات میں سے کسی ایک جگہ رہنے کی اجازت دے دی جائے ۔ اس پر فیصلہ ہوا کہ وہ آگرے میں رہیں ۔

نواب علی بہادر نے فروری ۱۸۶۲ء میں درخواست دی کہ اندور کی آب و ہوا میرے موافق نہیں ، مجھے صوبۂ غرب و شمال (یوپی) میں الہ آباد ، کانپور یا آگرہ میں رہنے کی اجازت ہو ۔ الہ آباد اور کانپور کی اجازت تو نہیں ملی کہ یہ مقامات باندہ سے بہت قریب ہیں اور حکومت کو ان کا اپنی سابقہ سرگرمیوں کے مرکز کے اتنا نزدیک رہنا گوارا نہ تھا ۔ اور چونکہ آگرے میں ان کی والدہ پہلے سے موجود تھیں ، اس لیے ان کا بھی مستقل طور پر وہاں رہنا قرینِ مصلحت نہیں سمجھا گیا ۔ آخر تجویز یہ ہوئی کہ انھیں ڈیرہ دون بھیج دیا جائے ۔ لیکن آخری فیصلہ کرنے سے پہلے

حکومت نے مقامی ڈاکٹر کو حکم دیا کہ نواب کا طبی معاینہ کرکے رپورٹ کی جائے کہ کیا واقعی مھو کی آب و ہوا کا ان کی صحت پر بُرا اثر پڑا ہے! ڈاکٹر نے دیکھ کر رپورٹ کی کہ اس میں شبہہ نہیں کہ بے اعتدالیوں اور افیون کے کثرت استعمال سے ان کی صحت بہت کمزور ہو گئی ہے، لیکن یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی صحت کی بنا پر نقل مکانی لابُد ہے۔ اس پر حکومت نے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو جاڑے کے زمانے میں تین مہینے اپنی والدہ کے پاس آگرے چلے جایا کریں، مستقل سکونت مھو ہی میں رہیگی۔

نواب علی بہادر کا ۱۴ اگست ۱۸۷۳ء کو بنارس میں انتقال ہوا، جہاں وہ حکومت کی اجازت سے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔

نواب نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ ان کی پہلی بیوی کا نام (یا خطاب) مبارک محل تھا، جن سے باندہ میں نکاح ہوا۔ بعد کو انھوں نے ان کی چھوٹی بہن افتخار محل سے نکاح کرنا چاہا۔ لیکن چونکہ شریعتِ اسلام کی رُو سے بیک وقت دو بہنوں سے نکاح کی ممانعت ہے، اس لیے وہ کھلے بندوں نوابیانہ کر سکے، البتہ افتخار محل ان کی بیوی تسلیم کی جاتی تھی۔ آخر کار انھوں نے مبارک محل کو ۱۸۶۴ء میں طلاق دے دی، لیکن اس کے بعد بھی وہ انھیں تین سو روپے ماہانہ خرچ کے لیے دیتے رہے، حال آنکہ افتخار محل کو صرف ۲۶۰ روپے دیتے تھے۔

مبارک محل سے ان کے دو بیٹے ہوئے۔ ذوالفقار بہادر عرف نواب بہادر سب سے بڑا بیٹا، اور سردار بہادر تیسرا سب سے چھوٹا بیٹا۔ منجھلا بیٹا شمشیر بہادر عرف امراؤ بہادر اور دو لڑکیاں صغرا بیگم اور وزیر بیگم، افتخار محل کے بطن سے تھیں۔ تیسری بیوی کا نام مختار محل تھا؛ یہ دراصل رقاصہ تھیں۔ ان سے قیام اندور کے زمانے میں نکاح ہوا؛ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

علی بہادر کی وفات کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا کہ نواب کا تہائی وظیفہ ان کے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق تقسیم یوں ہوئی۔ مبارک محل ۲۰۰ روپیہ؛ افتخار محل ۲۰۰ روپیہ، مختار محل ۱۰۰ روپیہ؛ نواب بہادر (عمر ۱۹ برس) ۴۰۰ روپیہ، دوسرے دونوں بیٹوں کو سو سو روپے۔ امراؤ بہادر اٹھارہ برس کا تھا اور سردار بہادر گیارہ برس کا۔

شمشیر بہادر (امراؤ بہادر) شعر بھی کہتے تھے، دلگیر تخلص تھا۔ منیر شکوہ آبادی اور جلال لکھنوی کے شاگرد تھے، دیوان مطبوعہ موجود ہے۔

نواب علی بہادر نے اپنی زندگی میں صغرا بیگم اور وزیر بیگم کی شادی کے لیے حکومت سے درخواست کی تھی، اور کہا تھا کہ میری حیثیت اور خاندان کی پرانی روایات کے مدِنظر ان تقریبوں پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ آئیگا۔ وہاں سے جواب ملا کہ دونوں شادیوں کے لیے پانچ پانچ ہزار دیا جائیگا۔ ابھی ان کے نکاح ہونے بھی نہیں پائے تھے کہ علی بہادر چل بسے۔ ان کی شادی بعد کو ہوئی۔ ان کا نکاح نواب کدورہ (باونی) کے خاندان میں خواجہ سعد الدین خان کے دو بیٹوں سے ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ جب نواب کے انتقال کے بعد ان کے وارثوں کو ایک ہزار روپیہ بشرحِ صدر دینے کا فیصلہ کیا گیا، تو دونوں بہنوں نے بھی اپنے حصّے کا مطالبہ کیا۔ لیکن ان کی درخواست دو سبب سے رد کردی گئی۔ اوّل یہ کہ وہ ایک دوسرے خاندان میں منتقل ہو چکی ہیں، دوسرے یہ کہ ان کی شادی کے لیے دس ہزار کی "گرانقدر" رقم پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ اس لیے جائز طور پر انھیں اب امداد نہیں دی جا سکتی۔

نواب علی بہادر حافظِ قرآن تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، علی تخلص تھا۔ ابتداءً عباس بیگ عباس بریلوی سے مشورہ رہا۔ عباس بعد کو جب آتش کے شاگرد ہو گئے، تو استاد نے ان کا تخلص بدل کر نادر کر دیا تھا۔ وہ بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں باندہ میں تھے۔ بعد کو گرفتار ہوئے اور پھانسی پائی۔

اس کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ علی نے غالب سے مشورہ کیا۔ غالب نے جس خط میں ان کے کلام پر اصلاح دینے کا ذکر کیا ہے، افسوس کہ اس پر تاریخ نہیں چھپی ہے، چنانچہ معلوم نہیں ہوتا کہ علی کی غالب سے اصلاح کا کیا زمانہ ہے۔ لیکن اس خط ہی سے ظاہر ہے کہ یہ علی کی ابتدائے مشق کا دور ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

> اوراق اشعار را کہ گوئی فردِ فہرستِ گنج خانۂ معنی بود، نوردا زہم کشودم دہر دو مخمّس و مسدّس و غزلیات را فرو خواندم۔ زہے لطفِ طبع و حدّتِ ذہن و سلامتِ فکر و حسنِ بیان۔ ہرگاہ در آغاز چنیں بودہ اند، بشرطِ دوام دورزشِ و التزامِ مشق، حقّا کہ در اندک مایہ مدت علمِ یکتائی خواہند افراشت فرمان بجای آوردم و آں شاہدانِ معنوی را بحکِ و اصلاح آرایش کردم۔ ۔ ۔ الخ

افسوس کہ علی کا زیادہ کلام نہیں ملا۔ یا تو شائع نہیں ہوا یا میری نظر سے نہیں گذرا۔ نادر

نے انھیں صاحب دیوان لکھا ہے۔ صرف ان کی مثنوی 'مہر و ماہ' دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔
یہ چھپ چکی ہے (مطبع محمدی، ۱۲۹۷ء)۔ اسی کے چند اقتباسات اور غزلیات کے چند شعر
آخر میں نمونے کے طور پر دیے گئے ہیں۔
علی نے غالب کے بعد منشی سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی سے بھی اصلاح لی تھی۔ نمونۂ کلام
میں پہلے مثنوی مہر و ماہ کے چند اقتباسات دیکھیے؛ صبح کا بیان ہے:

صبح کے جب عیاں ہوے آثار ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلی اک بار
ہر طرف نور کا ہوا عالم لگی دھونے گلوں کا منھ شبنم
ہوا بے نور آسماں پہ قمر ہر طرف بولتے تھے مرغِ سحر
دل کو پروانوں کے بھی یاس ہوئی روشنی شمع کی اداس ہوئی
تھا اذاں کا کسی طرف کو غل کوئی پیتا تھا اوٹھ کے ساغرِ مل
جاگ کر کوئی آنکھ ملتا تھا گھر سے بن کر کوئی نکلتا تھا
کوئی سوتا تھا، کوئی سُبحہ بدست بھیروِیں اُڑ رہی تھی ایک طرف
کوئی محوِ نماز تھا اوس آن کوئی پڑھتا تھا اک طرف قرآں
چرخ پر ڈوبنا ستاروں کا باغ میں زمزمہ ہزاروں کا
وہ درختوں پہ طائروں کی دھوم شاخِ گل پر وہ بلبلوں کا ہجوم
یار کے ساتھ کوئی سوتا تھا غمِ ہجراں سے کوئی روتا تھا
وہ کرن آفتابِ تاباں کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا گلستاں کی

ہیروئن کی ہجرِ یار میں کیفیت بیان کرتے ہیں:

کوششیں گرچہ سب نے کیں صد ہا شاہزادی کا بڑھ گیا سودا
ہوئے عاجز طبیب بھی یکسر عاملوں کا چلا نہ کوئی ہنر
زلفیں سنبل نمط پریشاں تھیں آنکھیں نرگس کی طرح حیراں تھیں
آینہ دیکھنے سے سکتہ تھا کنگھی سے دل اولجھتا تھا اوس کا
آنکھیں سرمے سے وہ چُراتی تھی پان کو بھی نہ منھ لگاتی تھی
گہنے کو طوق اور رسن سمجھے اچھی پوشاک کو کفن سمجھے

ہیرو، شاہزادی (ہیروئن) کے والد (شہنشاہِ چین) کی خدمت میں لکھتا ہے:

بعدِ حمدِ خدا و نعتِ نبی | بعدِ شرحِ مراسمِ عُرفی
اوس کی خدمت میں گزارش ہے | جس کے ابرِ کرم کی بارش ہے
شاہِ انجم سپاہِ عرش سریر | خسروِ تاج بخش عالمگیر
عقلِ اوّل، سکندرِ ثانی | شاہِ شاہان و ظلِّ سبحانی
آسمان تخت و آفتاب کلاہ | یعنی خاقانِ چین و شاہنشاہ
خلّد اللہ مُلکہٗ کہہ کر | عرض کرتا ہے بندۂ احقر
ہے جو حضرت کا شہرۂ اخلاق | بادشاہانِ عصر ہیں مشتاق
اسی صورت یہ مبتلائے بلا | کر کے ترک اپنا مسکن و ماوا
لے کے کچھ احتیاج آیا ہے | چھوڑ کر تخت و تاج آیا ہے
ظاہرا گو کہ بے حقیقت ہوں | پر میں نقشِ نگینِ دولت ہوں
ہو اگر حکمِ حضرتِ سلطاں | چوم لوں آ کے گوشۂ داماں
طوفِ درگاہ بے ہراس کروں | مطلبِ دل کی التماس کروں
اخترِ دولتِ شہِ شاہاں | اے خدا، حشر تک رہے تاباں
پڑھیں حضرت، حقیر کی عرضی | ہے یہ مہرِ منیر کی عرضی

ان اقتباسات سے واضح ہو گیا کہ اگرچہ اس مثنوی کو اردو کی مشہور اور صفِ اول کی مثنویوں کے ساتھ تو نہیں رکھ سکتے، لیکن شاعر کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ قابلِ قدر ضرور ہے۔ اس کی زبان بہت پختہ ہے، حشو و زوائد سے بالکل پاک ہے، بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر خاص طور پر ایجاز و اختصار کی کوشش کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ کم سے کم الفاظ میں اپنا مطلب بیان کر دے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس میں کامیاب رہا ہے۔

آخر میں غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

خیالِ زلف میں ہے رنجِ بیحساب میں رُوح | بلا میں ہے دلِ آشفتہ پیچ و تاب میں رُوح

ہمیں سمجھتے ہیں اس رنگِ سُرخ کی تہ کو | عتاب چہرے سے ظاہر ہے پیار ہے دل میں
بغیر ابر کے برسے نہ جائیگی گرمی | رُلاؤ شوق سے مجھ کو، بخار ہے دل میں

قلق نہیں، جو غمِ بےشمار دل میں ہے
ہزار بھیڑ ہو، پر جائے یار دل میں ہے

کدورت آئینۂ صاف کی چھپے کیونکر
عیاں ہے منھ سے صفائی، غبارِ دل میں ہے

ہمیشہ اس کی زیارت کو آتی ہے حسرت
کسی شہیدِ جفا کا مزار دل میں ہے

مزاجِ پاک مکدّر نہ ہو، میں ڈرتا ہوں
نکھر کے آپ نہ آئیں، غبارِ دل میں ہے

علی بھرا ہے یہ عطرِ بہشت شیشے میں
تصوّرِ عرقِ رُوے یار دل میں ہے

[آجکل (ماہنامہ دلّی) فروری ۱۹۵۸ء: ۳۳-۳۷؛ ایضاً مئی ۱۹۵۹ء: ۳-۷؛ خمخانۂ جاوید، ۳: ۲۰۱-۲۰۳؛ تذکرۂ نادر: ۱۱۴؛ تاریخ بوندیل کھنڈ، ۲: ۸۴-۸۵ نیز ۴: ۶۱-۶۵]

غفور ـــــ عبدالغفّار خان

جنوری ۱۸۹۲ء کے شمارۂ ۶ "پیامِ یار" میں یہ اندراج ملتا ہے:

"جنابِ عبدالغفّار خان صاحب غفور از جلیسر شاگردِ جنابِ غالب"

ادا سے قتل کرکے لاش کو عاشق کی ٹھکرایا
ملا کر خاک میں بولے کہ کچھ حسرت نہیں نکلی

[پیامِ یار، جنوری ۱۸۹۲ء: ۱۳]

فتنہ — بی شاماں جان

"بی شاماں جان طوائف ساکنۂ کلکتہ متخلّص بہ فتنہ خوشہ چینِ خرمنِ غالب"

انجمن میں دل کو ڈال دیا ہے دکھا کے ہاتھ
زلفِ سیاہِ یار کے ہیں کس بلا کے ہاتھ
ہے ایسی موجِ اشکِ ندامت بڑھی چڑھی
افسردہ دل ہیں آتشِ رنگِ حنا کے ہاتھ
ہاتھ آ گیا مگر کسی پہلو سے نقدِ دل
پھولے نہیں سماتے ہیں دُزدِ حنا کے ہاتھ
بیچینیوں سے ہوا ابھی پامال دل مرا
دکھلائے گر وہ فتنۂ محشر ادا کے ساتھ

[گلدستۂ نتیجۂ سخن، کلکتہ اپریل ۱۸۵۵ء
بحوالہ دوماہی "اکادمی"، لکھنؤ، ۲: ۱۰: ۴۹]

فداؔ و جمالیؔ — سیّد احمد حسن سہسوانی ثم بڑودوی

ان کا اصلی وطن سہسوان تھا، جہاں کے وہ عمائد میں سے تھے۔ سیّد احمد حسن حسینی سادات میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی اور امام علی نقی کے واسطے سے شہیدِ کربلا حضرت امام حسین تک پہنچتا ہے۔ ان کے بزرگوں میں خواجہ سیّد محمد خطیر، سلطان غیاث الدین بلبن کے ولی عہد شاہزادہ محمد کے اتالیق اور معتمدِ خاص تھے جب شاہزادہ محمد ملتان (پنجاب۔ پاکستان) میں مقیم تھا، سیّد محمد خطیر ہی اس کی جاگیر کے منتظم تھے۔ امیر خسرو بھی اسی زمانے میں شاہزادے کے ندیم اور مصاحب تھے۔ تاتاری حملے میں شاہزادۂ موصوف ملتان ہی میں ہلاک ہو گیا تھا؛ امیر خسرو نے اس کا دردناک مرثیہ لکھا ہے۔ شاہزادے کے حینِ حیات سیّد محمد خطیر نے اپنے فرائضِ منصبی کی ادائی میں ایسی دیانت اور فرض شناسی کا مظاہرہ کیا تھا کہ اس سانحے کے بعد غیاث الدین بلبن نے انھیں اپنا وزیر مقرر کر دیا، بلکہ سیّد صاحب کی درخواست اور سفارش پر سلطان نے مرحوم شاہزادے کی جگہ اسی کے بیٹے کیخسرو کو اپنا ولیعہد بھی مقرر کر دیا لیکن بلبن کی وفات کے بعد امرائے مملکت نے اس تقرر کو نظر انداز کر دیا اور معز الدّین کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا۔ قدرتاً اس کے بعد خود سیّد محمد خطیر بھی معتوب قرار پائے اور ان کے دار الخلافہ میں داخلہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ حکم بہت دن بعد کہیں جلال الدّین خلجی کے عہد میں منسوخ ہوا؛ جلال الدّین نے بھی انھیں خلعتِ وزارت عطا کیا تھا (تاریخِ فرشتہ۔ مقالہ دوم)

انھیں سیّد محمد خطیر کی ساتویں پشت میں قاضی محمد اسمٰعیل بعہدِ سکندر لودی سہسوان کے قاضی مقرر ہوئے۔ انھیں مرتبہ، منصب، جاگیر اور معافیات موروثی (۸۴ گانوں) کے حقوق

بھی عطا ہوئے۔ اس پر خاندان نے سہسوان کی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شاہی فرامین آج بھی ان کے خاندان میں موجود ہیں۔ قاضی محمد اسمٰعیل کے صاحبزادے قاضی عبدالشکور اپنے والد کے خلفِ رشید ثابت ہوئے۔ تیس سال قضائت کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۰ محرم ۹۴۷ھ (۱۷ مئی ۱۵۴۰ء) کو بعض مخالفوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ (بے شبہ شہید شد = ۹۴۷) ان کے پانچ صاحبزادے تھے۔ سب سے بڑے قاضی محمد صالح تھے، پھر مفتی محمد فاضل، خواجہ صدر الدین محمد حاکم الملقب بہ شاہ ولایت بندگی، اور مولانا محمد قاسم، سب سے چھوٹے کا نام محمد ہاشم تھا۔ پانچوں کی نسل انھیں کے نام کی نسبت سے صالحی، فاضلی، حاکمی، قاسمی، ہاشمی کہلائی۔

سید احمد حسن صالحی شاخ کے نام لیوا تھے۔ وہ قاضی محمد عبدالشکور شہید سے آٹھویں پشت میں تھے۔ ان کے والد محمد حسن صالحی (بن قاضی فضل امام بن احسن اللہ بن فیض اللہ بن سلطان اللہ بن نصر اللہ بن محمد صالح بن قاضی محمد عبدالشکور شہید) تھے۔ احمد حسن نے تعلیم اپنے وطن سہسوان میں پائی تھی۔ لیکن وہ اس پر قانع نہ رہ سکے، تکمیل کے لیے دلّی پہنچے، جو اس زمانے میں گویا علوم و فنون کے اساتذۂ باکمال کا مرکز تھی۔ وہ قیامِ سہسوان کے زمانے ہی میں شعر بھی کہنے لگے تھے۔ اصلی تخلص تو فدا تھا، لیکن کبھی کبھی اپنے پیر و مرشد حضرت سید جمال الدین حسین خاں (ف: ۳ رمضان ۱۲۷۷ھ) کی نسبت سے جمالی تخلص بھی کر لیتے تھے۔ لیکن ایسا کلام جس میں تخلص جمالی ہے، بہت کم ہے؛ بالعموم فدا ہی ملتا ہے۔ بہرحال جب وہ دلّی آئے تو یہاں وہ میرزا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے مشورہ کرنے لگے۔ فدا کو فارسی نظم و نثر سے بھی خاصی مزاولت تھی، اور در اصل یہی شوق انھیں غالب کی خدمت میں لے گیا۔ اگرچہ انھوں نے بالخصوص اپنے کلام فارسی پر غالب سے اصلاح لی، لیکن اردو میں بھی یہ مشورہ رہا۔

دلّی سے وطن واپس چلے جانے کے بعد ان کی استاد سے خط و کتابت رہی۔ ان کے نام چند خطوط اُردوے معلّیٰ میں شامل ہیں۔

ان کے خاندان کے بعض اصحاب کا تعلق ریاست بڑودہ سے تھا۔ انھیں کی ترغیب پر احمد حسن فدا نے بھی بڑودہ کی راہ لی۔ یہاں انھوں نے اس زمانے کے نامور ماہر حکیم ہاشم علی خاں موہانی (ف: ۱۲۸۳ھ) سے طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور تکمیل کے بعد بڑودہ ہی میں

اپنا مطب قائم کر لیا۔ چونکہ کئی اعزّہ پہلے سے اسی ریاست میں ملازم تھے، ان کی سفارش پر انھیں ریاست کے بعض عمائد کی سرپرستی حاصل ہو گئی اور یوں با عزّت اور باوقار زندگی بسر کرنے کے وسائل پیدا ہو گئے۔ اب انھوں نے اپنے بیشتر اہلِ خاندان کو بھی بڑودہ بلا لیا اور ریاست میں مختلف عہدوں پر تقرری میں ان کی مدد کی۔

فدا بڑے سیر چشم اور مہمان نواز تھے۔ چونکہ روزگار کے پہلو سے کوئی تشویش نہیں تھی، بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کی آمدنی ان کی ضرورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی، اس لیے وہ نہ صرف اپنے اقربا اور خاندان کی مدد کرتے، بلکہ دوسرے اربابِ فضل و کمال، شعراء و ادبا بھی ان کے خوانِ نعمت سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہے۔ وہ دامے، درمے، قدمے ہر ایک کی خدمت کرتے، اور ان کی حاجت روائی میں ہمیشہ مسرت محسوس کرتے۔ اور یہ کچھ مقامی حضرات ہی پر موقوف نہیں تھا، بلکہ باہر سے بھی کوئی صاحبِ علم وارد بڑودہ ہوتا تو وہ بےتکلّف ان کا مہمان ہو جاتا اور جتنے دن چاہتا، ان کے ہاں مقیم رہتا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

اس زمانے میں حج پر جانے والے بالعموم سورت سے جہاز پر سوار ہوتے، اور سورت تک کا سفر منزل بمنزل خشکی سے طے کرتے تھے۔ بڑودہ رستے میں پڑتا تھا۔ یہ مسافرینِ حج سُستانے کو چندے یہاں ٹھہرتے اور تازہ دم ہو کر آگے روانہ ہو جاتے۔

غالب کے ایک دوسرے شاگرد سیّد احمد حسن عرشی قنوجی بھی تھے۔ یہ والا جاہ امیر الملک سیّد صدّیق حسن خان بہادر (بھوپال) کے بڑے بھائی تھے۔ عرشی نے ۱۸۶۰ء میں حج کا عزم کیا۔ وہ بھی اثنائے سفر میں بڑودہ میں رُکے اور یہاں اپنے ایک ہم وطن مولانا غلام حسین قنوجی کے مہمان ہوئے۔ بدقسمتی سے وہ یہاں پہنچ کر بیمار ہو گئے۔ خارش کی کچھ شکایت دورانِ سفر میں پیدا ہو چکی تھی۔ قیامِ بڑودہ کے زمانے میں حالت اور زیادہ خراب ہو گئی اور اس پر مزید تپ اور اسہال کی موذی بیماریاں بھی لاحق ہو گئیں۔ علاج میں کوئی فروگذاشت نہیں ہوئی۔ سیّد احمد حسن فدا ان کے معالج تھے۔ وہ خود بھی اچھے طبیب تھے، تاہم انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی اور اپنے استاد حکیم ہاشم علی خان سے بھی ان کے علاج میں استمداد کی۔ لیکن عرشی کا وقتِ اخیر آ چکا تھا۔ بیس دن بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ) وہیں تکیۂ ماتریہ کے قبرستان میں دفن ہوئے، جہاں سیّد یحییٰ ترمذی کا مزار

ہے۔
سیّد احمد حسن فدا نے جس دلسوزی اور محبّت اور توجّہ سے عرشی کا علاج کیا تھا اور ان کے بڑودہ کے قیام کے زمانے میں ان کی خدمت کی تھی، اس کی اطلاع جب نواب والا جاہ کو بھوپال پہنچی، تو انھوں نے شکریہ کا اظہار کیا، اپنی متعدّد کتابیں انھیں تحفۃً بھیجیں اور جب اتحاف النبلاء میں اپنے مرحوم بھائی کے حالات لکھے، تو وہاں سیّد احمد حسن کا بھی خاص طور پر ذکر کیا۔

سیّد احمد حسن کا بعمر ۶۵ سال ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۴ء) میں انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے سیّد محمود حسن افسر نے تاریخ کہی:

از مرگِ پدر یتیم گشتم، صد حیف! | بُد صاحبِ دینِ داعتقادِ صادق
افسر تاریخِ فوت در معجمہ گفت | اے سوے اِرم رفتہ حکیم حاذق ۱۳۱۰ھ

اور استاد داغ نے کہا:

حکیم و طبیب و سخن آفریں | عدم کو گیا، تھا جو اصلی وطن
سرِ آہ سے داغ! تاریخ لکھ | "بنی تربتِ سیّد احمد حسن"
(آ + ۱۳۰۹ = ۱۳۱۰)

گمان بدرجۂ یقین ہے کہ وہ تکیۂ ماتریہ، بڑودہ کے قبرستان ہی میں دفن ہوئے تھے، لیکن مُرورِ زمانہ کے باعث قبر کا نشان مٹ گیا ہے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

غالب نے اپنے سفرِ کلکتہ کے دوران میں کچھ دن بنارس میں قیام کیا تھا۔ وہ وہاں کے نظاروں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے بنارس کی تعریف میں ایک مثنوی "چراغِ دیر" کے عنوان سے لکھی۔ فارسی شاعری کے وسیع دامن میں اس پایے کی بہت کم نظمیں ہونگی۔
معلوم ہوتا ہے کہ قیامِ بنارس کے دوران میں، وہ وہاں کے کسی "قیامت قامت" اور "مژگاں دراز" سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہاں کے جانے کے بعد بھی وہ اُسے نہیں بھول سکے۔ ایک مقطع میں کہتے ہیں:

کاش، کاں بُتِ کاشی در پذیردم، غالب!
بندۂ تو ام، گویم، گویدم ز ناز: آرے

فدا نے بھی بنارس کا سفر کیا تھا، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاد کی سنّت پر عمل

کرتے ہوئے اپنا نقدِ دل و جان وہاں کسی بُت کی بھینٹ چڑھا آئے تھے۔ شعر کہا ہے:

دکھائیں جا کے بتانِ دکن کو اب کیا منھ!
جو نقدِ دل تھا فدا، لٹ گیا بنارس میں

یہ پوری غزل دلی واردات اور ذاتی تجربات کی آئینہ دار ہیں۔ دیکھیے!

یہاں ہیں لینے کی دل کے نئی نئی رسمیں
مسافر آئے نہ یارب! کوئی بنارس میں

وہ قوسِ ابرو و تیرِ نگہ سے کستے ہیں
کسی کا دل نہ الٰہی! کسی کے ہو بس میں

ندیم! بوسہ پیاپے نہ بھیجیے کیونکر
کہ جوشِ شوق کا ہوتا ہے ان کی نس نس میں

اثر جو خاکِ درِ دلربا میں پایا ہے
وہ بات پائی ہے اکسیر میں، نہ پارس میں

ثنائے ابرو و مژگانِ یار کیا کیجے!
زیادہ تیر و کماں سے ہے زور میں، کس میں

وہ یاد آتا ہے، اس کا بچشمِ نم کہنا
"سفر سے جلد پھر آنے کی کھائیے قسمیں"

دکھائیں جا کے بتانِ دکن کو اب کیا منھ
جو نقدِ دل تھا، فدا! لٹ گیا بنارس میں

۱۲۹۷ (نومبر ۱۸۸۰ء) میں حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کیا، تو اس کی تاریخ کہی:

عزمِ حج با دلِ مشغول مبارک باشد
فوزِ سرمایۂ مامول مبارک باشد

اے فدا! کن رقم از روی وقوفِ عرفاں
"حجِ اکبر شدہ مقبول، مبارک باشد"

(۶ + ۱۲۹۱ = ۱۲۹۷ھ)

۱۹۲۷ء میں بڑودہ میں بڑا ہولناک سیلاب آیا تھا جس سے شہر میں بہت مکانوں کو زبردست نقصان پہنچا تھا۔ اسی میں ان کا قدیم سکونتی مکان بھی بیٹھ گیا۔ اس حادثے میں قیمتی اثاث البیت کے ساتھ پہلا دیوان بھی دریا بُرد ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کلام جو ان کی بیاضوں اور مختلف پرانے رسائل سے جمع ہو سکا اُسے ان کے پرپوتے سید واجد حسین صاحب نے شائع کر دیا ہے (عثمانی پریس، مدراس: ۱۹۷۹ء)

ان کے بڑے صاحبزادے سید محمود حسین تھے۔ وہ بروز بدھ ۱۴ محرم ۱۲۹۱ھ (۳ مارچ ۱۸۷۴ء) صبح صادق کے وقت بڑودہ میں پیدا ہوئے۔ فدا نے بیٹے کے تین تین تاریخی نام رکھے: اصغر؛ ظہور علی مودودی؛ سید اظہار علی (ان میں سے ہر ایک سے ۱۲۹۱ برآمد ہوتے ہیں) گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا اور خاندان کی روایت بھی علمی تھی؛ عربی اور فارسی

اور اُردو کے علاوہ گجراتی میں بھی بہت اچھی دستگاہ حاصل کی۔ ہر طرح سے فارغ ہو کر طب کی طرف متوجّہ ہوئے۔ پھر اپنے والد کی طرح اسے بطور پیشہ اختیار کیا اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

شعر گوئی کا شوق بھی ورثے میں پایا تھا۔ اولاً اپنے طور پر چند غزلیں ضامن علی جلال لکھنوی (ف: ستمبر ۱۹۰۹ء) کو دکھائیں۔ لیکن جب والد کو ان کے اس رجحان کا علم ہوا، تو انھوں نے میرزا اکر حسین یاس لکھنوی (والد سیّد انور حسین آرزو لکھنوی) سے مشورہ کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ اس کے بعد یاس کے حلقۂ تلمّذ میں شامل ہو گئے۔

افسر کی بدولت بڑودے میں اردو کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مقامی شعرا کی کثیر تعداد نے ان سے اصلاح لی اور تکمیل کے بعد خود دنیائے ادب میں نام پیدا کیا۔ اپنی کہنہ مشقی اور مہارتِ علم وفن کے باعث انھیں شہر کے اکثر مشاعروں کی صدارت کے فرائض سرانجام دینا پڑتے تھے۔ ۴ دسمبر ۱۹۴۸ء کو بڑودہ میں ایک مشاعرے کی صدارت کی۔ مصرع طرح تھا:

اُٹھ، رہرو خوابیدہ! ہنگام سحر آیا

پیرانہ سالی، صوفیانہ مزاج اور مذہبی افتاد؛ اس پر طرح اتنی معنی خیز انھوں نے بڑی دردناک غزل کہی۔ اس کے بعد متواتر مضمحل اور اداس رہنے لگے، جیسے واقعی (ہنگام سحر) کا احساس تیز تر ہو گیا ہو۔ مشاعرے سے بارہ دن بعد ۱۶ دسمبر کو اچانک فالج کا شدید حملہ ہوا۔ ہفتہ بھر بسترِ علالت پر رہ کر جمعہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۸ء (۲۲ صفر ۱۳۶۸ھ) صبح کے وقت داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے شاگرد عثمان خان عاشق القادری بڑودی نے ہجری میں صوری تاریخ کہی:

تیرہ سو اڑسٹھ، صفر بائیسویں اور جمعہ کو　　حضرتِ افسر نے، اے عاشقؔ عدم کی راہ لی
فاتحہ پڑھنے کو جب شہرِ خموشاں میں گئے　　بولا ہاتف: دیکھ لو، ہے تربتِ افسر یہی

انھیں نے دوسری عیسوی تاریخ صنعتِ توشیح میں کہی:

غم تو یہ ہے کہ شاعرِ معجز بیاں گیا　　ظاہر ہے سب پہ، ہند کا شیریں زباں گیا
مجھ کو ہے یہ ملال کہ افسر سا نامور　　حاجی، حکیم و حافظ و قرآن خواں گیا

قبرستان ماتریہ، بڑودہ ہی میں اپنے والدِ ماجد کے جوار میں سپردِ خاک ہوئے۔ اِنّا للّٰہ وَاِنّا اِلیہ راجعُون۔ دیوان چھپ گیا ہے۔ (مدراس: ۱۹۸۳ء)

آخر میں فدا کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

ہوش اڑے، کالے ڈسے، خنجر پھرے بس دیکھ کر
چشمِ میگوں، زلفِ پیچاں، ابروے خمدار آج

چھپائے سے نہیں چھپتی محبت — جو ہو دل میں، وہ آتا ہے زباں پر

ہنس کر، نہیں، کہنا، نہیں انکار کا انداز — سچ یہ ہے کہ ہے صاف یہ اقرار کا انداز
مُردوں کو جلائے وہ، یہ زندوں کو کرے قتل — گفتار کا وہ ڈھنگ، یہ رفتار کا انداز
شیدا ہے کوئی رُخ پہ، کوئی شیفتۂ زلف — یکساں ہے یہاں کافر و دیندار کا انداز
بیداریِ شب آپ کی آنکھوں سے عیاں ہے — چھپتا ہے کہیں دیدۂ بیدار کا انداز

نہ وہ ادا، نہ وہ غمزہ، نہ وہ کرشمہ ہے — نظر وہ کیا ہوئی، اور وہ کہاں گیا اخلاص

توسنِ عمرِ رواں گو کس قدر چالاک ہے — پر نہ اس سے بھی ہوا طے یہ بیابانِ فراق
آہِ سرد و اشکِ گرم و رنگِ زرد و چشمِ تر — رفتہ رفتہ کیا بہم پہنچے ہیں سامانِ فراق

دشت گردی، چاک دامانی و ترکِ نام و ننگ — کام وہ ہم سے ہوئے ہیں، جو کہ تھے شایانِ عشق

عشق سے جس کا دل گداز نہیں — درِ عرفاں بھی اس پہ باز نہیں

فدا چشمِ بصیرت ہو تو دیکھو ہر جگہ اس کو — کہاں کا لائے ہو جھگڑا، یہ مسجد ہے، یہ بتخانہ

ہمیں دونوں جہاں میں ایک خواہش ہے فقط تیری
نہ غم دوزخ کا رکھتے ہیں، نہ ہم کو شوقِ جنت ہے

نہ نکلے فرق اصل و نقل کا اس میں یہ کیا ممکن
یہاں جنت کا سنتے ہیں، ترے گھر کی سی صورت ہے

[مقدمۂ دیوانِ فدا؛ جواۃ العلما: ۱۷؛ خزینۃ الانساب]

فدا ــــــ صاحبزادۂ فدا علی خان بہادر رامپوری

یہ رامپور کے حکمران خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد نواب محمد کاظم علی خان بہادر روالیِ رامپور جنّت آرامگاہ نواب محمد سعید خان (۲۰ اگست ۱۸۴۰ء - یکم اپریل ۱۸۵۵ء) کے چھوٹے صاحبزادے تھے، گویا فدا نواب فردوس مکان محمد یوسف علی خان بہادر ناظم کے بھتیجے ہوئے۔ انھوں نے شاعری گویا ورثے میں پائی، کیونکہ ان کے والد محمد کاظم علی خان بھی شعر کہتے تھے اور سروری تخلص کرتے تھے۔ فدا نے شروع میں چندے نواب مرزا خاں داغ

۱۔ داغ۔ نواب مرزا خان نام، نواب شمس الدین احمد خان لوہارو کے بیٹے تھے۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ (۲۵ مئی ۱۸۳۱ء) کو محلہ بلی ماران میں پیدا ہوئے۔ جب ان کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم نے مرزا فخرو سے نکاح کر لیا، اور نواب شوکت محل خطاب پایا، تو یہ بھی اپنی والدہ کے ساتھ قلعۂ معلّٰی میں آ گئے۔ یہاں مرزا فخرو کے تعلق سے انھیں جملہ علوم و فنون بہترین اساتذہ سے حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ جب شاعری کا شوق ہوا تو غالباً پہلے عارف سے اصلاح لی۔ بعد کو ذوق کے شاگرد ہوئے۔ غدر کے بعد اپنی خالہ عمدہ خانم کے پاس رامپور چلے گئے اور نواب خلد آشیاں کی زندگی بھر وہاں سے نہیں نکلے۔ جب وہ فوت ہو گئے تو یہ ۱۸۸۶ء میں دلی آئے۔ پھر مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۷ اپریل ۱۸۸۸ء کو حیدر آباد پہنچے۔ قسمت یاور تھی۔ ساڑھے تین برس کی امیدواری کے بعد فروری ۱۸۹۱ء میں نواب محبوب علی خان بہادر آصف جاہ ششم نے نوازش کی اور اوّل روزِ ورودِ حیدر آباد سے چار سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر دیا۔ جو اضافے کے بعد ایک ہزار تک پہنچا۔ نظامِ دکن شاگرد ہوئے، اور صلہ و ستایش کی کمی نہ رہی۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں "بلبلِ ہندستان، جہان استاد، دبیر الدولہ، فصیح الملک بہادر داغ دہلوی ناظم جنگ" خطاب عطا ہوا۔ وہیں حیدر آباد میں ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء (۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) کو بعارضۂ فالج وفات پائی۔ یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ ان کے نام "نواب مرزا خان داغ" ہی سے تاریخ نکلتی ہے۔

سے اصلاح لی۔ پھر غالب سے فیضیاب ہوئے۔ ان کے صرف تین شعر ملے۔ دو ایک قصیدے کے جو نواب کلب علی خان کی مدح میں کہا گیا تھا اور ایک غزل کا۔

تازگی ہے یہ ہوا میں کہ برنگ تنبول — سبز ہو جائے جو گلشن میں گرے دانۂ بیل
شرف افزائے جہاں، صاحب تخت و اکلیل — حکم کی جس کے فلک کو بھی ہے واجب تعمیل
یاد آتی ہے جب کاوشِ مژگاں مرے دل کو — دیتا ہے تسلّی ترا پیکاں مرے دل کو

[انتخابِ یادگار (۲) ص ۲۸۲]

فسوںؔ ـــــ میر فسوں، فرخ آبادی

ان کا نام معلوم نہیں ہو سکا، لیکن غالباً مجذوب تھے اور مستان شاہ کے نام سے مشہور تھے۔ غالب کے دوسرے شاگرد صوفی منیری نے اپنی کتاب "راحتِ روح" میں استطراداً ان کا ذکر کیا ہے اور یہ شعر ان کے نام سے لکھا ہے:

اشک اُلٹے جو بہے، دل کو ڈبا کر چھوڑا
آہ کے تیر جو پلٹے، تو جگر پر بیٹھے

(راحتِ روح: ۶۷)

(بقیہ گزشتہ) چار دیوان اور ایک مثنوی فریادِ داغ یادگار ہیں۔ بے پالک بیٹا مرزا احمد صغر سنی ہی میں داغ دے گیا، تو پھر ایک لڑکی لاڈلی بیگم کو گود لے لیا۔ داغ کی بیوی تین بہنیں تھیں فاطمہ بیگم، داغ کی بیوی (ف: ۱۸۹۷ء / رجب ۱۳۱۶ھ) دوسری اولیا بیگم یہ میرٹھ میں عبد القدوس صاحب سے بیاہی گئیں۔ ان کے بطن سے کلثوم بیگم پیدا ہوئیں، جن کا عقد بھی وہیں میرٹھ کے ایک مختار (وکیل) میر تصدق علی سے ہوا۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں، صغرا بیگم، اور لاڈلی بیگم، یہی لاڈلی بیگم داغ کی لے پالک بیٹی تھیں۔ جو اپنے پہلے شوہر بہاء الدین احمد خان آہ کے انتقال کے بعد ان کے بھائی نواب سائل دہلوی کے عقد میں آئیں۔ تیسری بہن عزیز النسا بیگم تھیں۔ جن کا نکاح ایک نومسلم انگریز محمد جان سے ہوا۔ (جان کا اصلی نام تھا) لاڈلی بیگم کا بدھ ۲۵ ستمبر ۱۹۶۳ء بعمر ۹۳ برس لاہور میں انتقال ہوا۔

(خمخانۂ جاوید، ۳: ۱۰۴ - ۱۳۶؛ داغ)

فراق (رشکی) ــــ قاضی محمد عنایت حسین بدایونی

صدیقی شیخ تھے۔ سلسلۂ نسب محمد بن ابوبکر صدیق (خلیفۂ اول) سے ملتا ہے۔ والد کا نام محمد نقی حمیدی تھا۔ ۱۵ شوال ۱۲۴۷ھ (۱۸ مارچ ۱۸۳۲ء) کو پیدا ہوئے۔ فارسی اپنے والد سے اور عربی اپنے نانا قاضی عبدالسلام سے پڑھی۔ قاضی عبدالسلام شعر بھی کہتے تھے، سلام تخلص تھا۔ اردو، فارسی کی دیگر کتابوں کے علاوہ منظوم تفسیر قرآن اردو میں "زادالآخرت" ان کی یادگار ہے۔ ۱۵ رجب ۱۲۸۹ھ (۱۸ ستمبر ۱۸۷۲ء) کو انتقال کیا۔

فراق پہلے سرکارِ انگریزی میں سر رشتہ دارِ عدالتِ بدایوں رہے۔ پھر نواب محمد علی خان رئیس ٹونک کی مصاحبت اختیار کی۔ جب دسمبر ۱۸۶۷ء میں انگریزی حکومت نے ٹھاکر ان لاادا کے قتل کے جرم میں نواب صاحب موصوف کو معزول کرکے بنارس بھیج دیا تو رشکی نے بھی حقِ رفاقت ادا کیا۔ اُن کی وفات[۱] کے بعد وکالت کرنے لگے اور اسی سلسلے میں مختلف مقامات خورجہ، جودھپور اور سب سے آخر حیدر آباد میں مقیم رہے۔ جب موسی ندی میں طغیانی آئی (ستمبر ۱۹۰۸ء) اور ان کا گھر نذرِ سیلاب ہوا، تو اسی میں کلام بھی ضائع ہو گیا (تاریخ طغیانی از اکبر: حیدر آباد دکن غرق شد" اکبر نے کہا)۔ پہلے تخلص رشکی تھا (تذکرہ بہارِ بوستانِ شعرا: اشکی۔ یہ سہوِ کتابت ہے) غالب کے بعد بدایوں کے مشہور شاعر سید مولوی دلدار علی مذاق (ف: ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ / ۱۱ اکتوبر ۱۸۹۴ء) سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ غالباً انھیں کے کہنے پر رشکی ترک کرکے

[۱] نواب محمد علی خاں کا ۲۸ سال بعد اسی جلاوطنی کے عالم میں بمقامِ بنارس شب جمعہ ۱۶ صفر ۱۳۱۳ھ (۹ اگست ۱۸۹۵ء) انتقال ہوا (تاریخ ٹونک: ۳۳۰) [۲] دکن ریویو: نومبر ۱۹۰۸ء۔



فراق (رشکی) ـــــ قاضی محمد عنایت حسین بدایونی

فراق کرلیا۔ ان کی جدّتِ ذہن اور مضمون آفرینی اور جملہ فنونِ شاعری میں مہارت کا ذکر ان کے معاصرین نے کیا ہے۔

سلسلۂ چشتیہ میں خواجہ اللہ بخش تونسوی (نبیرۂ خواجہ سلیمان تونسوی) سے بیعت تھے۔ طبیعت پر تصوّف کا غلبہ تھا۔ یہی کلام سے بھی ظاہر ہے۔ ۶ صفر ۱۳۳۷ھ (۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء) کو بدایوں میں انتقال ہوا۔

رشکی نے دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے صرف ایک بیٹی تھی۔ دوسری بیوی سے دو لڑکے ہوئے: عطا حسنین اور حبیب حسنین محمد اکبر۔ ثانی الذکر کی اولاد آج کل محلۂ سوتھ بدایوں میں سکونت پذیر ہیں۔

دیوان غالباً شائع نہیں ہوا، بہرحال نظر سے نہیں گزرا۔ تذکروں سے یہ چند شعر ملے:

آئینہ دیکھا تو یہ حیرت ہوئی — آپ وہ محوِ تماشا ہو گیا
دیکھ کر اغیار کو، کی آنکھ بند — پردے پردے میں اشارا ہو گیا
دل میں رہتا ہے کسی بُت کا خیال — کعبۂ دل بھی کلیسا ہو گیا

ہم گنہگار ہیں، مانا، واعظ! — لطفِ داور نہیں دیکھا جاتا

وقت آخر ہے، جو آنا ہو تو آؤ صاحب! — اب نہیں ہے ہمیں جینے کا بھروسا دم بھر

مدینہ میں نہیں جو دل، وہ کیا دل — مدینہ ہے چمن، دل ہیں عنادل
مٹے جو الفتِ خیر الوریٰ میں — ہمیں ایسا کہیں دے دے خدا دل

دل دیا جان بھی دی، وصل کا سائل ہوا — اور بھی آپ نے کچھ میری خطائیں دیکھیں؟

وہ آئیں پس از مرگ اُمید کیا ہے؟ — ہم اپنے نصیب آزمائے ہوئے ہیں

یہ مانا، ہم نہ کریں شکوۂ ستم، لیکن — خدا کے سامنے ہونا کبھی حساب بھی ہے

دیس کے گانے کی اس محفل میں لَے ہونے لگی
یاد ہم کو بھی وطن کی، پَے بہ پَے ہونے لگی

روز گردش ہے نئی، جَور کے انداز نئے
پیس ڈالے نہ یہ چرخ ستم ایجاد مجھے
آگ سی آگ ہے، بیتاب ہوں، دیکھو خواجہ!
خاک کر دے نہ کہیں، اب مری فریاد مجھے

وہ آئیں بے بلائے میرے گھر یوں ہو تو بہتر ہے
ہماری آہ کا اُن پر اثر یوں ہو، تو بہتر ہے
کسی کی یاد دل میں ہو، کسی کا نام لب پر ہو
ترا رشکیؔ! اگر آخر سفر یوں ہو، تو بہتر ہے

پاؤں سے جاتے ہو کوُےِ یار میں
سر اُٹھا رکھا ہے کس دن کے لیے!

تمھارا قامتِ موزوں ہے گویا مصرعِ اولیٰ
اور اس کا سایۂ دلچسپ ہے مصرع برابر کا
ملاؤ دل جو مجھ سے تم، تو مالا مال ہو جاؤں
تمھارا دل ہے پتھر کا، مگر پارس کے پتّھر کا

وہ ایک رات جلی، میں جلا کیا دن رات
کمال مجھ میں ہے یا شمعِ انجمن میں ہے!
کسی نے آنکھ سے دیکھا نہیں، اے خضر!
سُنا ہے آبِ شفا یار کے دہن میں ہے
قاصد! ذرا سنبھال کے تو دیجو ان کو خط
سیماب وار دل مرا خط کی شکن میں ہے
مانا کہ مانی کھینچیگا تصویر یار کی
پر ہاں کلام ہم کو مگر اور دہن میں ہے
اُس کی زبان منھ میں جو لی ہے فراقؔ نے
شیرینی اس سبب سے اب اس کے دہن میں ہے

مرا مطلع ہے غالب آتش و ناسخ کے دیواں پر
نہ کیوں احسنت تحسیں ہو زبان ہر سخنداں پر
نہ آیا ہاتھ کچھ جز حسرت و اندوہ و حیرانی
دیا دل مفت اس پیماں شکن کے عہد پیماں پر
نہ تڑپے زیر خنجر اس ادب سے اس ستمگر کے
نہ پڑ جاوے کہیں قطرہ مرے قاتل کے داماں پر
نہ بولے زندگی میں خیر، لیکن بعد مرنے کے
قدم رنجہ کبھی فرمایئے گورِ غریباں پر
یہ پہلا مرتبہ ہے، آگے آگے دیکھیے، کیا ہو
ابھی زورِ جنوں کا ہاتھ پہنچا ہے گریباں پر

میری آنکھوں میں جو رہنا او نہیں منظور نہیں
آ رہیں دل میں، دل آنکھوں سے بہت دور نہیں

تو نالہ سحر بھی اثر کر کے رہ گئے
وہ آتے آتے غیر سے کچھ ڈر کے رہ گئے
فصّاد نے جو فصد لی میری، تو کیا ہوا
ٹکڑے ہی ٹوٹ ٹوٹ کے نشتر کے رہ گئے
جب ان کی بزم ہی سے نکالے گئے فراقؔ!
کہیے تو منھ دکھانے کے کس دَر کے رہ گئے

[دیوان نظامی بدایونی (تجلیاتِ سخن)؛ ۲۹؛ تذکرۃ الواصلین: ۲۶۶-۲۶۷؛
مکتوب قاضی غلام سجّاد بسمل بدایونی بنام مؤلف؛ بہارِ بوستانِ شعرا: ۳۲-۳۴]

فگار ـــــ منشی سیّد آلِ نبی شاہجہانپوری

ان کا خاندان ساداتِ بلگرام سے تھا ۔ ان کے والد سیّد نیاز علی محافظِ دفترِ کلکٹری مقرر ہو کر شاہجہانپور آئے اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے ، قاضی شہر سیّد امانت علی کی ہمشیر سے شادی کر لی تھی ، محلّہ قاضی خیل ہی میں سکونت بھی تھی ۔

سیّد نیاز علی ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے ۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے زمانے میں وہ مراد آباد میں تعینات تھے ۔ وہ بھی بغاوت کے الزام میں ماخوذ ہو گئے تھے ؛ اسی میں پھانسی کی سزا پائی ۔ ان کے زہد و ورع اور پابندِ شریعت ہونے کی شہرت تھی ۔

سیّد نیاز علی کے دو بیٹے تھے : بڑے سیّد واجد علی اور چھوٹے یہی سیّد آلِ نبی ۔ دونوں کی تعلیم معقول پیمانے پر ہوئی تھی ۔ سیّد واجد علی تحصیلدار مقرر ہو گئے تھے لیکن بیچارے تپِ دق کا شکار ہو کر جوانا مرگی کا داغ دے گئے ۔

سیّد نیاز علی نے دونوں بیٹوں کو مرزا غالب کا شاگرد بنا دیا ۔ افسوس کہ سیّد واجد علی کا تخلص معلوم نہیں ہو سکا ۔ سیّد آلِ نبی نے فگار تخلص اختیار کیا ۔ سیّد نیاز علی کے پھانسی پا جانے کے بعد ان کی جاداد بھی بحقِ سرکار ضبط کر لی گئی تھی ۔ چنانچہ شاہجہانپور میں جو مکانات وغیرہ تھے ، ان پر بھی حکومت نے قبضہ کر لیا ۔ سیّد آلِ نبی کو والد کے ترکے میں سے کچھ نہ ملا ، اور انھیں ملازمت کی تلاش ہوئی ، تو پولیس میں تھانیدار (سب انسپکٹر) بھرتی ہو گئے ۔ جلد ہی ترقی کر کے اوّلاً سر رشتہ دار محکمۂ بندوبست اور اس کے بعد سر رشتہ دار پولیٹکل ایجنٹ نیا گاؤں بنا دیے گئے ۔ ریاست کدورہ کے سرکاری انتظام کے زمانے میں وہاں بھی تعینات رہے تھے ۔

کدورہ کے قیام کے بعد ملازمت کو خیر باد کہا اور وطن شاہجہاں پور آ گئے ۔ حکومت نے

ان کے ضبط شدہ مکانات یا تو نیلام کر دیے تھے، یا انعام میں اپنے خیر خواہوں کو عطا کر ڈالے تھے۔ سید آلِ نبی نے ان لوگوں سے مکانات خرید لیے اور انھیں از سرِ نو اپنے شایانِ شان تعمیر کرایا، اور امیرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

چندے بعد، خدا معلوم کیا خیال آیا کہ حیدر آباد (دکن) کی راہ لی۔ بارے نصیبا یاور تھا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد چار سو مشاہرے پر تعلقہ دار درجۂ دوم مقرر ہو گئے۔ نو دس برس تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ (نومبر/دسمبر ۱۸۹۳ء) میں وہیں حیدر آباد میں انتقال کیا۔ لاولد فوت ہوئے۔ دوسرے اثاث البیت کے ساتھ کلام بھی ضائع ہو گیا۔ ان کے بھانجے سید محمد محسن حیدر آباد گئے کہ ان کے سامان میں سے جو کچھ مل سکے وہ لے آئیں۔ لیکن انھیں بھی بے نیلِ مرام واپس آنا پڑا۔ معمولی چیزوں کے سوا کچھ دستیاب نہیں ہوا۔

سید آلِ نبی بڑے خوش مزاج، خلیق اور سیر چشم، عالی حوصلہ اور بلند ہمت شخص تھے۔ پتنگ بازی اور بٹیر بازی کا بھی شوق تھا۔ وہ ہمیشہ رنگین کپڑے پہنتے۔ شاہجہاںپور آتے تو اپنے قیام کے دوران میں ضرور مشاعرے کا انتظام کرتے۔

نمونۂ کلام میں یہ چند شعر ملے:

مسکرا کر جسے دیکھا، اُسے تسخیر کیا — پتلیاں سحر کی رکھتی ہیں تمھاری آنکھیں

آتا کیوں مصر میں کنعاں سے نکل کر یوسف — جذبۂ شوقِ زلیخا جو نہ کامل ہوتا

فکرِ عقبیٰ ہے، نہ کچھ خواہشِ دنیا دل میں — ہے فقط یار کے ملنے کی تمنا دل میں

گر ایک شب بھی وصل کی لذت نہ پائے دل — پھر کس امید پر کوئی تم سے لگائے دل

ہم اپنا حال آپ ہی کہہ کر سنائیں گے — خامے کا منھ نہیں، جو کہے ماجرائے دل

ضبطِ فغاں فراق میں ممکن نہیں، نگار! — جس کو خدا خراب کرے، وہ لگائے دل

[تاریخ شاہجہاںپور: ۲۵۷ - ۲۵۹ بحوالہ مضمون "تلامذۂ غالب" از تحسین سروری مشمولہ صحیفہ (سہ ماہی، لاہور)، جولائی ۱۹۷۰ء: ۴۶ - ۵۱]

فگار ـــــ میر حسین علی دہلوی

میر فقیر اللہ فقیر کے نواسے تھے، جو ہندی میں مہارت رکھتے تھے؛ وہ شاہ عالم آفتاب (۱۷۵۹ء-۱۸۰۶ء) کے دربار سے منسلک تھے اور انھیں کی طرح اُردو کے علاوہ ہندی میں بھی دوہے اور کبت کہتے تھے۔

فگار یار باش قسم کے آدمی تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶ء-۱۸۳۷ء) کے دربار کے متوسّل تھے۔ ایک مقطع میں کہتے ہیں:

ہوئے نہ فگار! اوس کی عنایت کا ادا حق ـــــ پلکوں سے کروں گر شہِ اکبر کے چرن صاف

لیکن خیال ہوتا ہے کہ یہاں اطمینان نصیب نہ ہوا، اور کسی زمانے میں گردشِ روزگار انھیں جے پور لے گئی، جس سے یہ خوش نہیں تھے:

شہر جے پور سے بھلا کیا کام تھا ہم کو فگار! ـــــ ہاں، مگر دہلی سے لایا اپنا آب و دانہ تھا

کلام پر بظاہر پہلے ممنون (ف: ۱۲۶۰ھ) سے اور پھر غالب سے اصلاح لی۔ ان کا معتدبہ انتخاب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتابخانے کے ذخیرۂ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی ایک بیاض میں محفوظ ہے؛ وہیں سے لے کر محمد اکرام چغتائی نے اسے شائع کیا ہے۔ (کتابیات۔ لاہور: ۱۹۶۸ء) مندرجۂ ذیل انتخاب اسی سے ماخوذ ہے:

یہ تمنّا ہے، فگارِ خستہ دل کی روزِ حشر ـــــ ہاتھ میں دامن ہو اس کے حیدرِ کرّار کا

نہ تو دنیا کی تمنّا ہے، نہ دیں کی خواہش ـــــ ہے ہوسہائے جہاں سے مرا ارمان نیا

کیا یہ دلچسپ سرا ہے کہ ہمیشہ جس میں ـــــ ایک جاتا ہے، تو ایک آ رہے مہمان نیا

مدّاحی اوس کی فخر ہے کونین کا، فگار! ـــــ تھا جس کے ہاتھ سے درِ خیبر اولٹ گیا

جاتے ہی اوس کے، آیا پیغام یہاں قضا کا ـــــ دیکھا نہ روزِ فرقت، احسان ہے خدا کا

ہیں اور تو ادائیں لاکھوں، پہ ہے قیامت — غصّہ میں مسکرانا، اوس شوخِ دلربا کا
کیا کیا حسین خاک میں یہاں تو نے ملا دیے — کچھ رحم تجھے گردشِ ایّام نہ آیا
کوئی جام بادۂ وصل کا جو پیا تو کیا، نہ پیا تو کیا
نہیں عیش کو بھی سدا بقا، جو کیا تو کیا، نہ کیا تو کیا
میرا جیب صورتِ جیبِ گل، یونہی چاک ہوئیگا ناصحا!
اسے تو نے سوزنِ لطف سے جو سیا تو کیا، نہ سیا تو کیا
عشق کا اخفا ہے گر منظور، تو پہلے فگار! — خشکیِ لب، رنگِ رُوے اور چشمِ تر چھپا
بیقراری یہی کہتی ہے کہ ہونا ہو، سو ہو — حلقۂ [در] تو ذرا یار کے گھر کا کھٹکا
ہے سحر نزدیک، ایسا سو نہ غافل، اے فگار! — غور کر، تجھ کو سفر درپیش ہے کیا دُور کا!
کیا تجاہل ہے کہ ہنس کر مجھ سے کہتا ہے وہ شوخ — کس کا غم ہے تجھے، رہتا ہے جو چہرا اوترا
شب کو گھر میں تیرے بزمِ دلکشا تھی، میں نہ تھا — جاے حسرت ہو کہ کیا ملنے کی جا تھی، میں نہ تھا
کھول مُونھ شیشہ کا ساقی! ہاتھ میں ساغر اوٹھا — دیکھ، تو کس جوش سے ہے آج ابرِ تر اوٹھا
تفرقہ پڑ جائیگا اک مصر کے بازار میں — دیکھنا جس دم نقاب چہرۂ دلبر اوٹھا
خاک مجنوں کو جو ڈھونڈا ہیں [نے] دشت نجد میں — ایک بگولہ سامنے کھاتا ہوا چکر اوٹھا
ضعف کی شدّت یہاں تک ہے، بہنگام خرام — صورتِ نقشِ قدم ہر گز نہ میں گر کر اوٹھا
شہر جے پور سے، بھلا کیا کام تھا ہم کو فگار! — ہاں، مگر دہلی سے لایا اپنا آب و دانہ تھا
اگرچہ خوب ہے کارِ محبّت — کسی کو ہو نہ آزارِ محبّت
بتانِ دہر کو دیکھا جو ہم نے — تو ہے ہر یک دل آزارِ محبّت
مزہ پایا نہ اوس نے زندگی کا — ہوا [جو] شخص بیمارِ محبّت
جس کے ہر ذرّہ میں ہے کحلِ جواہر کا اثر — مرتبہ رکھتی ہے یہ خاکِ درِ میخانہ آج
بارِ تن تھا سر، سو قاتل نے کیا اوس کو قلم — روح کرتی ہے ہماری سجدۂ شکرانہ آج
باعثِ رنج فقط ہے یہ ظہورِ ہستی — ہوتے کب سیپ کے اندر رہیں گہر میں سوراخ
ملیح دیکھ کے اوس عزتِ چمن کا رنگ — چمن میں اوڑ گیا نسرین و نسترن کا رنگ
رہا نہ ساقی و مطرب، نہ مے، نہ شیشہ و جام — بدل گیا تیرے اوٹھتے ہی انجمن کا رنگ
عدم سے قافلہ ایک دل جلوں کا آیا ہے — نہ پوچھ لالۂ پُر داغ کے چمن کا رنگ

موئے زرد ہے، دم آنکھوں میں، اور آہ لبوں پر
ہے دید کے قابل ترے ہجور کا عالم

اتنا شبِ تنہائی میں گھبرا نہ فگار، اب
دیکھیگا ابھی تو تو شبِ گور کا عالم

اب اس جہاں میں خرابی مری فگار، نہ پوچھ
بسانِ طائرِ گم گشتہ آشیاں ہوں میں

کچھ ہاتھ پھر عدو کے گریباں ہے ان دنوں
ثابت ہوا کہ فصلِ بہاراں ہے ان دنوں

جلوہ افروز ہو جس بزم میں وہ غیرتِ شمع
ہم بھی پروانے سے ہونے کو نثار آتے ہیں

خود بخود ہاتھ گریباں پہ جو اٹھ جاتا ہے
آہ، شاید کہ پھر ایامِ بہار آتے ہیں

دھیان میں لاکر ترے ربطِ گذشتہ ہر دم
دلِ ناشاد کو ہم شاد کیا کرتے ہیں

سفارش مری کی کسی نے تو بولا
کہ یہ ایک ہے، آپ کیا جانتے ہیں

وہ عشق میں ہو گئے ہیں جو فانی
تو وہ اوس فنا کو بقا جانتے ہیں

دہر میں مجبور اور لاچار ہوں بھی اور نہیں
اپنے میں افعال کا مختار ہوں بھی اور نہیں

فرقۂ عشاق میں ہوں عاشق معشوق طبع (ق)
خوبرویوں کو میں کرتا پیار ہوں بھی اور نہیں

تم اگر چاہوگے مجھ کو، تو میں چاہونگا تمھیں
آپ کا میں طالبِ دیدار ہوں بھی، اور نہیں

صفحۂ جدول پہ مثلِ خطِ جدول، اے فگار!
غور گر کیجے تو میں بیکار ہوں بھی، اور نہیں

اُس مہ لقا کو مہِ کنعاں سے نہ بدلوں
حوروں سے نہ بدلوں کبھی، غلماں سے نہ بدلوں

گر بند وے زلف اس کی بنا دے مجھے کافر
اوس کفر کو، زاہد! کبھی ایماں سے نہ بدلوں

ہوئی دل پر فگار! اب کثرتِ شوقِ وطن غالب
بس اس جہاں سے اپنا ہم بستر اوٹھاتے ہیں

ان کو جو ہے بخار، تو ڈرتا ہوں میں، کہیں
اس میری آہِ گرم کی تاثیر سے نہ ہو

محشر میں یہ شفیع ہیں دونوں فگار کے
کیوں عشق اس کو شبر و شبیر سے نہ ہو

کرتا ہے غنچہ تیرے دہاں کی برابری
شاید یہ اپنے بھول گیا ہے دہن کی بو

پھرتا نہیں ہے، ہو کے وہ مایوس، اے فگار!
جو بابِ شہرِ علم کے پھیلائے در پہ ہاتھ

غمِ دنیا ہی رہا ہم کو، نہ فکرِ عقبےٰ
واقعی عشق نے ہم پر کیے احساں کتنے

جی میں ہے گورِ غریباں میں سکونت کیجے
کچھ تو تجھ کو دلِ غفلت زدہ عبرت ہوگی

کیا غم ہے مجھ کو، سچ یہ کسی نے کہا تو ہے — جس کا یہاں کوئی نہیں، اس کا خدا تو ہے
غصّہ ہی کی نظر ہو، تو ہو مجھ کو غم نہیں — ہے یہ بھی جائے شکر کہ، تو دیکھتا تو ہے

ہجر کی شب کو نہ تھا اک دم یقینِ زندگی — صبح تک جیتا رہا ہیں، سخت جانی دیکھیے
شمع کی مانند یکسر خود نہ جل جا نافگار! — کیا کریگی یہ تری آتش زبانی دیکھیے

سُن کے تقریرِ مطوّل مری، بولا قاصد — کہیے پیغام وہ مجھ سے، جو ذرا یاد رہے
اُبھرے اے غافلو! اس بحر میں کیوں مثلِ حباب — گر تمھیں لطمۂ امواجِ قضا یاد رہے
بادۂ میکدۂ عشق پلا دوں، تو نہ پھر — خضر کو ذائقۂ آبِ بقا یاد رہے

گرچہ ہے ہوشربا نقش و نگارِ دنیا — کچھ اُدھر کی بھی، یہ واجب ہے، دلا! یاد رہے
گھونٹ پانی کے نہ کیونکر ہوں لہو اوس کو فگار! — جس کے دل کو عطشِ آلِ عبا یاد رہے

ہم میں اور اوس میں جو صحبت تھی کبھی، اب وہ کہاں — ہاں، مگر کہنے کو ایک بات چلی جاتی ہے
غیر سے کرتے ہو باتیں، مجھے دکھلا دکھلا — تم کو کیا چھیڑ مرے سات چلی جاتی ہے
کیونکر ارشاد سنیں آپ کا، حضرتِ ناصح! — جان یہاں، قبلۂ حاجات چلی جاتی ہے
کب تلک آئینہ میں دیکھو گے سج دھج اپنی — آپ چلتے نہیں، اور رات چلی جاتی ہے

معشوقِ ستم، سچ ہے کہ کیا کیا نہیں کرتے — جو ظلم کیا تو نے پری، ایسا نہیں کرتے
ہے موسمِ گل، ابرِ بہاری بھی ہے، زاہد! — مے پی لے کہ غافل! غمِ فردا نہیں کرتے

ہوئی بس اوٹھتے ہی یوں اوس کے انجمن خالی — کہ جیسے روح نکل کر رہے بدن خالی
ہم ایک جام پہ کب میکدہ میں قانع ہوں! — نہ جب تلک کہ ہو خمِ بادۂ کہن خالی

اخلاص زمانے سے ہے اوس شوخ پری کو — ایک ہم سے فقط اوس سے لڑائی نہیں جاتی
اوس دستِ حنائی کے تصوّر سے جگر میں — یہ آگ لگی ہے کہ بجھائی نہیں جاتی
فکرِ دو جہاں بھول گیا دل کو ہمارے — پر یاد، فگار! اوس کی بھلائی نہیں جاتی

یہاں کونسی گرہ تھی، نہ جو سربسر کھلی — یارانِ رفتگاں کی نہ لیکن خبر کھلی

[گلشنِ بیخار: ۱۵۱، ۱۵۲؛ سخنِ شعرا: ۳۷۰، ۳۷۲؛ بزمِ سخن: ۹۳؛ طبقات الشعرائے ہند: ۱۴۱، ۳۸۰؛ عمدۂ منتخبہ: ۴۸۳]

فوقؔ ــــــ زین العابدین

"میاں، کل زین العابدین فوقؔ کا خط' مع اشعار کے، ٹکٹ دار لفافہ کے اندر رکھ کر بہ سبیلِ ڈاک بھجوا دیا ہے"۔

(عودِ ہندی: ۱۰۱۔ خط بنام مرزا یوسف علی خاں عزیز)

فوقؔ ــــــ عبد الصمد میرٹھی

میرٹھ کے عمائد میں سے تھے پہلے ذوق سے مشورہ رہا؛ ان کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے۔

(ماہنامہ اردوے معلیٰ، دہلی، نومبر ۱۹۲۷ء)

غالباً یہ وہی صاحب ہیں جن کا ذکر نساخ نے شاگردِ گرم کی حیثیت سے کیا ہے۔ گرم کا نام مظفر علی خان تھا اور وہ رامپور کے رہنے والے تھے؛ وہ ذوق کے شاگرد تھے اور نواب عبداللہ خان کی رفاقت کے باعث میرٹھ میں مقیم ہو گئے تھے۔ نساخ نے فوق کے یہ چند شعر لکھے ہیں:

دل مضطر نہیں ہے قابو میں ۔۔۔ ڈھنگ سیکھا ہے اوس ستمگر کا
شورِ محشر سے بھی نہ اوٹھتے ہم ۔۔۔ کام تھا یہ تمھاری ٹھوکر کا

دھوکے میں آکے کرتا ہوں ناحق شکایتیں ۔۔۔ میری ہی آہ کا ہے دھواں، آسماں نہیں
نالے اگر یہی ہیں ہمارے تو دیکھنا ۔۔۔ یا ایک روز ہم نہیں، یا آسماں نہیں

[سخن شعرا ۳۷۲۔۳۷۳]

فوق ــــ ڈاکٹر میرزا محمد جان اکبر آبادی

میرزا شجاعت علی بیگ کے بیٹے تھے۔ اگرچہ رہنے والے اکبر آباد کے تھے لیکن نقلِ مکان کر کے میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹری کا پیشہ ذریعۂ معاش تھا۔ انگریزی حکومت میں ملازمت تھی، جہاں سے پنشن پائی۔ غالب کے علاوہ صہبائی سے بھی سلسلۂ تلمذ رکھتے تھے۔ ۱۳۰۳ھ میں زندہ تھے۔

سر پٹکتا ہوں ایک مدت سے ــ دارُوے دردِ سر نہیں ملتی
صبح سے شام تک ہے غش اتنا ــ نبض دو دو پہر نہیں ملتی
دیکھتے وہ جو ہیں، کنکھیوں سے ــ کیوں نظر سے نظر نہیں ملتی
وائے افسوس، نوجوانی پر ــ جب گئی عمر، پھر نہیں ملتی
ترکِ الفت ہی کیوں نہ کر دو فوق! ــ ہاں، طبیعت اگر نہیں ملتی

[یادگارِ ضیغم۔ ص ۲۷۶]

فیضی ــــ فیض الحسن سردھنوی

دیکھ انداز اس کے قامت کے ــ فتنے سو سو گئے قیامت کے
جیسے رخسارِ یار ہیں، زاہد! ــ پھول ایسے کہاں ہیں جنت کے
آخرش لے چلے بہا کے مجھے ــ مثلِ خاشاک اشکِ حسرت کے
کاش کہ، فیضیا! بروزِ ازل ــ حرف مٹ جاتے میری قسمت کے

[پیامِ یار، لکھنؤ۔ ستمبر ۱۸۸۴ء بحوالہ ساہی صحیفہ، لاہور، جولائی ۱۹۷۰، ص ۵۵]

قدرؔ ـــــ سیّد غلام حسنین بلگرامی

زیدی سیّد تھے۔ زید بیٹے تھے حضرت زین العابدین سجّاد بن حضرت حسین علیہ السّلام کے۔ قدر کے والد سیّد خلف علی بن سیّد کرامت علی بلگرام (محلہ سلہڑہ) کے رہنے والے بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ قدر جمادی الآخر ۱۲۴۹ھ (اکتوبر ۱۸۳۳ء) میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ "غلام حسنین" تاریخی نام ہے، جو ان کے چچا سیّد سلطان علی نے رکھا تھا بعد کو خود قدر نے اپنے نام کا ذکر ایک قطعہ میں کیا ہے:

سو جان سے ہیں فدائے نام حسنین ہے چشم و دل و جگر مقامِ حسنین
ہم روزِ ولادت سے ہوئے نام آور تاریخی نام ہے: "غلام حسنین" (۱۲۴۹)

یہ خاندان دراصل واسط (عراق عرب) کا رہنے والا تھا جہاں سے ان کے جدِ اعلیٰ سیّد محمد الدعوۃ الصغریٰ نے ہجرت کی اور یہاں آ کے بلگرام میں مقیم ہو گئے۔

قدر کی شادی قصبۂ کوانتھ (ضلع شاہ آباد) میں ہوئی تھی، جو آرہ سے ۲۵ - ۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ شادی کے بعد بلگرام اور پھر وہاں سے لکھنؤ گئے اور شیخ امان علی سحرؔ کے شاگرد ہوئے۔ قدر تخلص انھیں نے دیا تھا۔ انھیں ایام میں فتح الدولہ مرزا محمد رضا برقؔ سے عروض اور قافیے کی تکمیل کی، اس کے بعد غازی الدین حیدر کی بیگم سرفراز محل کی ڈیوڑھی میں ملازم ہو گئے۔ اتنے میں سحر اور برق دونوں استاد اللہ کو پیارے ہو گئے اور اب یہ امداد علی بحرؔ سے اصلاح لینے لگے۔ چنانچہ ایک رباعی میں اپنے چاروں استادوں کا ذکر کیا ہے:

سیکھے سحرؔ و برقؔ سے بندش کے بند پھر غالبؔ و بحرؔ نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدرؔ! "بدنام کنندۂ نکو نامے چند"

۱۸۵۶ء میں لکھنؤ پر تباہی آئی تو یہ بھی یہاں سے نکلے؛ لیکن قسمت کے دھنی تھے، کہیں سر چھپانے

کا آسرا تک نہ ملا پھرتے پھراتے بلگرام آئے۔ غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ ان دنوں یہاں تھے۔ نواب غلام حسنین خان حسین اور مرزا قادر بخش صابر بھی یہیں آپہنچے، یہ بھی ان کے جلیس رہے۔ قیامِ امن کے بعد یہاں سے پنجاب گئے اور چندے فوج میں منشی گری کی، لیکن دل نہ لگا، اور واپس دلی چلے آئے۔ انہی ایام میں غالب سے تلمّذ کا سلسلہ قائم ہوا۔ غرض ہر طرف ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بھی کہیں مستقل ٹھکانے کا سامان نہ ہوا۔ آخرش مرزا عباس بیگ کی سفارش پر سرکاری محکمۂ تعلیم میں ملازمت ملی اور ہردوئی ہائی اسکول میں مدرس فارسی ہوگئے۔ یہ ہر وقت فکرِ شعر میں غرق رہنے والے، لڑکوں کو بھی ان کی دیکھا دیکھی شعر گوئی کی عادت پڑ گئی۔ ہیڈ ماسٹر نے اشاروں میں توجہ دلائی کہ یہ روش ٹھیک نہیں، لیکن بےسود۔ آخر کار اس نے رپورٹ کی کہ انھیں ریاضی نہیں آتی۔ اس پر ریاضی کی تعلیم کے لیے مجبوراً نارمل اسکول میں داخلہ لینا پڑا۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو تحصیلی اسکول، مہونہ (ضلع لکھنؤ) کے صدر مدرس ہوئے اور جلد ہی ان کے بعد کالن براؤننگ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم کی مہربانی سے پھر ہردوئی اسکول میں مدرس فارسی مقرر ہوگئے۔ سال بھر بعد کیننگ کالج لکھنؤ کے مدرس فارسی ظہیر الدین بلگرامی کا انتقال ہوگیا۔ مرزا عباس بیگ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور اب لکھنؤ ہی میں مقیم ہوگئے تھے۔ وہ کالج کی انتظامی کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے سفارش کی اور یہ کیننگ کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوگئے۔ یہاں وہ دسمبر ۱۸۸۳ء تک ساڑھے سات برس کام کرتے رہے۔ یوں ساری عمر مدرسی اور عسرت میں کٹی، چنانچہ ایک مرتبہ بطور تفنّن صفیر بلگرامی سے کہا، کہ میری قسمت میں صرف مدرسہ پڑھانا لکھا ہے، کیونکہ مدرّس اور تقدیر کے اعداد برابر ہیں۔

جب ربیع الاول ۱۳۰۱ھ (جنوری ۱۸۸۴ء) میں نواب محبوب علی خان بہادر آصف جاہِ ششم کلکتہ نمائش دیکھنے آئے، تو نواب آغا مرزا سرور الملک بہادر کے ایما پر قدر نے ایک قصیدۂ غرّا کہ کر بنارس میں شرفِ حضوری کے موقع پر خدمتِ والا میں گزرانا، جس پر نظامِ دکن انھیں اپنے ساتھ حیدر آباد لے گئے۔ چار سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ لیکن افسوس، عید ہوئی ذوق وے شام کو۔ یہ فارغ البالی انھیں راس نہ آئی۔ حیدر آباد پہنچتے ہی بہت بیمار ہوگئے۔ ضیق النفس اور ضعف معدہ کی پرانی شکایت تھی، یہ عود کر آئی۔ جب طبیعت کسی طرح رو براہ نہ ہوئی، تو اسی سال کے اواخر میں علاج کے لیے واپس لکھنؤ آئے۔ یہاں پہنچے تو پہلو میں دنبل نکل آیا۔

اسی تکلیف میں یکشنبہ ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ (۱۴ ستمبر ۱۸۸۴ء) کی سہ پہر کو رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ لاولد فوت ہوئے۔ ان کا اکلوتا بیٹا ان کی زندگی میں فوت ہو چکا تھا۔ کربلائے خدا بخش میں دفن ہوئے۔ وفات کے وقت صرف ۵۲ برس کی عمر تھی۔ لوحِ مزار پر محمد محمود حمد کا کہا ہوا حسبِ ذیل کتبہ ملتا ہے:

روزِ یکشنبہ بُد و بست و سوم ذی قعدہ را
بردو پہر روز سہ ساعت چو نازیبا بشد
آوخ از واژونیِ چرخ و ز آہنگِ نتژند
کانِ علم از دہر یعنی اوستادِ ما بشد
زد رقم سالِ وفاتش حمدؔ صوری معنوی
در ہزار و سہ صد و یک قدر از دنیا بشد

ان کی اپنی ایک مشہور غزل کا مقطع ہے:

بہار آخر ہوئی، قدرؔ کی تربت پہ میلا ہے
یہاں بیڑی بڑھانے کو ہر اک دیوانہ آتا ہے

اس کے مصرع ثانی سے تاریخ وفات (۱۳۰۱) برآمد ہوتی ہے۔ ان کے شاگرد ارشد بلگرامی نے استاد کی تاریخِ وفات لکھی:

حضرتِ قدر غلام حسنین اسمِ شریف
بلگرامش وطن و سیدِ رتبہ و جاہ
روز یکشنبہ و بست و سوم ذی القعدہ
فوت کرد آں شہِ اقلیمِ سخن، واویلاہ
سنۂ رحلتِ او ارشدِ مغموم نوشت
"شد رواں قدر بسوئے ارم، اِنّا لِلّٰہ!"
(۱۳۰۱ھ)

ان کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ایک شعر میں اپنے بعض شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔

واہ وا وجد و جواں، صلِ علیٰ ارشد و صبح
انھی لوگوں سے ہوئی ہے مری شہرت کیسی

(وجد کا نام خلیل صاحب تھا، جواں کا ہزاری لال بنارسی، ارشد کا غلام حیدر اور صبح کا منشی

شنکر پرشاد)
ان کی بیوی محبّت فاطمہ بنت محمد تقی تھیں ۔ قدر کی وفات کے بعد وہ حیدر آباد گئیں اور وہاں کوشش کی کہ ان کے مرحوم خاوند کا وظیفہ کسی طرح ان کے نام جاری ہو جائے ۔ بد قسمتی سے قدر کی تقرّری وغیرہ کے کاغذات ہی دستیاب نہ ہو سکے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قدر کو حضور نظام دکن کلکتہ سے ساتھ لے آئے تھے اور خود ہی ان کا چار سو مشاہرہ مقرر کر دیا تھا۔ ابھی تک دفتر میں اس کی کوئی باقاعدہ مسل وغیرہ نہیں کھلی تھی کہ چھ مہینے کے بعد علالت کے باعث علاج کے لیے واپس لکھنؤ چلے گئے، جہاں ان کا انتقال ہو گیا ۔ بڑی تگ و دو کے بعد جناب محبّت فاطمہ کو صرف ۲۳ روپے آٹھ آنے مہینا کا حینِ حیات وظیفہ ملا[۵]۔

کلیات (مطبع مفید عام، آگرہ ۱۳۰۸ھ) کے علاوہ ایک مثنوی قضا و قدر بھی موجود ہے "قواعد العروض" میں عروض و قوافی کے اصول بیان کیے ہیں ۔ اس کا نام تاریخی ہے، جس سے ۱۲۸۸ برآمد ہوتے ہیں ۔ اس کے علاوہ چند درسی رسالے اور بھی ہیں ۔ مثلاً "مجموعہ سخن اور اس کی شرح عطر مجموعہ"، "رسم عرفی"، "شرح قصائدِ عرفی"، "نظم الارکان" (تقطیع ابیاتِ گلستاں) ؛ "مصطلحاتِ اردو" وغیرہ ۔ بعض اور چیزیں بھی لکھی تھیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ حلیۂ طبع سے مزیّن نہیں ہوئیں ۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں :

اتنا تھوڑا ہے، مجھے تو کسی قابل سمجھا | نہیں جنّت نہ سہی، خیر جہنّم ہی سہی
جو دل میں آیا کہہ دیا، جو کچھ کہا کیا | اے قدر! ایسا آدمی اپنی پسند ہے
غم یہی ہے میری شہرت جا بجا تھی ہیں تھا | قدر! ان مردہ پرستوں نے مجھے تڑپا دیا
یہ گلی دلچسپ ہے کیسی بیانِ کوئے دوست | آنکھ سے دل تک جلو خانہ ہے اس کے حسن کا
کوئی نکالے تو مجنوں کے وقت کا کاغذ | ہمارا نام بھی داخل ہے کب سے دفتر میں

---

۵ اسی سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا غلام قادر گرامی جالندھری کا تقرر انھیں قدر کی جگہ پر ہوا تھا، لیکن ان کا وظیفہ صرف دو سو روپے ماہانہ مقرر ہوا ۔ گرامی نے درخواست دی کہ قدر کو چار سو روپے ملتے تھے، مجھے بھی وہی تنخواہ ملنا چاہیے ۔ اس پر تلاش شروع ہوئی کہ قدر کی مسل کہاں ہے ۔ چونکہ یہ دستیاب نہ ہو سکی، اس لیے گرامی ثابت نہ کر سکے کہ قدر کی تنخواہ چار سو تھی ۔ چنانچہ ان کی تمام کوششیں بیکار گئیں اور انھیں آخر تک دو سو ہی ملا کیے ۔

وصل ہو جائے تو جانوں سچ ہے، اے وعدہ خلاف! ورنہ یہ ہوں ہوں غلط، ہاں ہاں غلط، اچھا غلط

کوئی حکمت نہیں چلتی، خدا کے کارخانے میں دھری رہتی ہے سب تدبیر، جب تقدیر پھرتی ہے

وہ مجھے دیکھ کے ہنس دیتے ہیں آنکھ چھپتی نہیں ہے یاری کی

ابھی تھا وصل کا اقرار، اور ابھی انکار چلو ہٹو، انھیں باتوں سے قدر جلتے ہیں

تم اسی سمت کو جاؤ، تو خدا کو پاؤ جس طرف لوگ بتائیں، کہ ادھر کچھ بھی نہیں

تو میرے بوسہ لینے پہ، اتنا خفا ہوا! بوسہ بھی کوئی چیز ہے، تو سو بار لے

یہ عشق یہ جوانی، کیا روگ لگ گیا ہے! ہم بھی کبھی کہینگے، ہم بھی کبھی جوان تھے

[دیباچۂ کلیاتِ قدر: ۲ - ۸؛ جلوۂ خضر، ۲: ۲۲۶ - ۲۳۶؛ تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم: ۱۴۲ - ۱۴۳؛ دو ماہی اکادمی، لکھنؤ. شمارہ ۱۰: ۳۴، ۳۵؛ تحریک (ماہنامہ) اپریل ۱۹۵۹ء: ۳۲؛ ادیب اُردو، جون ۱۹۲۲ء مضمون پُورب کے مردم خیز قصبات" از مظفر حسین سلیمانی]

کاشف (سالک، فقیر) سیّد بدرالدین احمد عرف فقیر صاحب دہلوی

یہ بیٹے تھے، امتیاز الدولہ، افتخار الملک نواب سیّد احمد میر خان بہادر منصور جنگ وزیر عالمگیر ثانی کے۔ سیّد وحید الدین احمد بیخود دہلوی انھیں کے پوتے تھے۔

[سہ ماہی صحیفہ، لاہور جولائی ۱۹۷۰ء ص ۵۶]

کرم ــــ شیخ کرم الٰہی فیروز پوری

نہر جمن میں کسی حیثیت سے ملازم تھے ؛ اور گڑھی عبداللہ خان میں قیام تھا "پیام یار" میں ان کی غزل کا عنوان ہے :

جناب شیخ کرم الٰہی صاحب کرم فیروز پوری شاگرد جناب غالب دہلوی

وہ بھی اب بیچین رہتے ہیں ہماری یاد میں
یہ اثر آیا ہمارے نالہ و فریاد میں

چین یاں ہم کو نہیں ہے واں نہیں ان کو قرار
ہم ہیں اُن کی یاد میں اور وہ ہماری یاد میں

آپسے باہر ہوں میں فرطِ خوشی سے اے صنم!
تم اگر آجاؤ میرے خانۂ برباد میں

بے سبب خون رگِ گردن نہیں ہے موجزن
باڑھ رکھوائی ہے اس نے خنجرِ فولاد میں

تم اُدھر دشمن کے گھر میں چین سے سوتے رہو
ہم ادھر روتے رہیں شب میں تمھاری یاد میں

غیر کے آگے یہ پوچھا اس نے مجھ سے "اے کرم!"
تم بھی کیا بیچین رہتے ہو ہماری یاد میں؟

آب حیواں کا مگر چشمہ ہے میخانوں میں
پی کے کچھ جان سی آجاتی ہے انسانوں میں

شکر، صد شکر کہ مے ہوگئی زاہد کو حرام
ورنہ قطرہ بھی نہ ملتا ہمیں میخانوں میں

میکدے میں ہے کرم، دیکھ لو جاکر اس کو
اتقا جس کا ہے مشہور مسلمانوں میں

[ماہنامہ "پیام یار" لکھنؤ ؛ فروری ۱۸۸۸ء (ص ۱۴) بحوالۂ غالبیات : چند عنوانات ۱۹۸ - ۱۹۹ ؛ سہ ماہی اردو (کراچی)، ۴۵ : ۲ : ۲۳۲]

کلیم ـــــــ مولانا عبدالصمد علی گڑھی ثم اجمیری

علی گڑھ کے رہنے والے شیخ فاروقی تھے۔ ان کی تعلیم پرانے ڈھنگ پر ہوئی، چنانچہ دینیات اور فقہ کی قابلیت بہت اچھی تھی۔ اسی مذہبی لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ عین شباب میں ترکِ وطن کیا اور جاکے اجمیر میں بس گئے۔ مسکن خاص اجمیر سے ۱۴ میل دور نصیر آباد چھاؤنی میں تھا، جو جرنیل اختر لونی کا اپنے خطاب (نصیر جنگ) کی رعایت سے بسایا ہوا شہر ہے۔ دینی شغف کے باعث زیادہ طور پر نعتِ نبوی لکھا کیے، اور کبھی کبھی اسی باعث عام لوگ انھیں "عاشق رسول" کے نام سے پکارتے تھے۔

بہت لمبی عمر پائی۔ یکشنبہ، ۱۷ رجب ۱۳۱۰ھ (۵ فروری ۱۸۹۳ء) تقریباً ۱۰۵ برس کی عمر میں اجمیر میں انتقال کیا۔ ملوسر (متصل آسا گنج، شرقی اجمیر) میں مزار ہے۔ ان کے شاگرد سید شائق علی شائق دہلوی نے تاریخ وفات کہی:

شاعرِ نعت گو، جنابِ کلیمؔ — فیض میں جو کہ بادشاہ ہوئے
روز یکشنبہ تھا، بماہِ رجب — راہیِ دارِ فنا سے آہ ہوئے
ہاتفِ غیب نے کہا: شائقؔ! — کیسے شاگرد اب تباہ ہوئے
حرفِ منقوط میں ہے سالِ وفات — داخلِ قصرِ خلد واہ ہوئے
۱۳۱۰ھ

مجموعۂ کلام "بہارستان کلیم موسوم بہ گلزار بہشت" مطبع رضوی میں چھپا تھا۔ اس کے علاوہ (۱) قصائدِ بہارِ جنت" (یہ گلزار بہشت الموسوم بہ قصیدۂ بہارِ جنت" کے نام سے بھی شائع ہوا)، (۲) گلدستۂ معرفت" (حصۂ دوم بہارستانِ کلیم) (۳) "صمصام الاسلام مثنوی یعنی تذکرہ میران شہید حسین خنگ سوار رضی اللہ عنہ" (۴) گلدستۂ کلیم کے نام سے مختلف کلام شائع ہوا۔

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو:

مار ڈالا اک نظر میں عاشقِ دلگیر کو
اے مصوّر! تو اگر دل کے ورق پر کھینچ دے

اب وطن میں نہیں لگتی ہے طبیعت میری
اب کہاں ہیں جنھیں کہتے تھے شہِ ملکِ سخن

پرتو اسی کا ہے، یہ مہ و آفتاب میں
تو ہے رحیم! اور تری رحمت ہے بےحساب

رو یا کیا ہوں حال پر اپنے تمام عمر
داغِ جگر دیے ہیں تو یارب! دعا یہ ہے
اہلِ غرض ہیں هارجِ اوقات، اے کلیم!

ہے میری عمر کا پیمانہ، ساقیا! لبریز
ہے گلرخوں کو عبث نازِ حسنِ صورت پر
ہمیشہ میں تو رہونگا جو اس جہاں میں کلیم!

پہنچا مرقد میں، تو یارانِ عدم میں گذری
دیکھ کر وجد مرا، گل نے گریباں پھاڑا!

کیا ملتا دل کو زیست میں آرام، رم کے ساتھ
بھر بھر کے تو نے جام دیے سب کو، ساقیا!
اب منحصر ہے وعدۂ دیدار حشر پر
دو دن کی زندگی پہ، ہے ساقی! عبث غرور
بھاگ اس سے، ہے بلائے سیہ دامِ اجل کا دام
کیونکر قرار آئے مرے دل کو اے کلیم!

تعیّنات نے گو ایک کو ہزار کیا
کیا نہ خوار و ذلیل اپنے نفس کو جس نے
دکھا کے آئینۂ گل میں کس نے رنگِ جمال
بقا کا جامہ نہ کس طرح تن پہ زیبا ہو

ہے مریدِ گیسوئے شبرنگِ احمد پیرِ صبح

کیا نشانے پر لگا ہے، آفریں اس تیر کو
رات دن دیکھا کروں دلدار کی تصویر کو

چل مدینہ کو، یہی کہتی ہے وحشت میری
نوبتِ فتح بجا ڈنکہ ہے نوبت میری

جلوہ دکھا رہا ہے وہ لاکھوں حجاب میں
یارب! ہیں پھر گناہ مرے کس حساب میں

مرجاؤں میں، تو میرا کوئی نوحہ گر نہ ہو
مرہم نہ ہو، علاج نہ ہو، چارہ گر نہ ہو
چل بیٹھیے کہیں کہ کسی کو خبر نہ ہو

ہنوز ہے ہوسِ ساغر و سبو باقی
ہے چار روزہ فقط، گل میں رنگ و بو باقی
رہیگی مجھ سے جہاں میں یہ گفتگو باقی

بعد مرنے کے ملا خانہ آباد مجھے
سروِ خود رفتہ ہوا دیکھ کے آزاد مجھے

سودائے زلفِ یار رہا دام، دم کے ساتھ
ہم تیری بزم میں رہے ناکام، کم کے ساتھ
قاصد خوشی کا لایا ہے پیغام، غم کے ساتھ
جم چل دیا، مگر نہ گیا جام، جم کے ساتھ
ہر پیچ اس کی زلف کا ہے خام، خم کے ساتھ
آرام لے گیا وہ دل آرام، رم کے ساتھ

موحّدوں نے مگر ایک ہی شمار کیا
تو اس کو نفسِ لعیں نے ذلیل و خوار کیا
چمن میں بلبلِ بیدل کو بیقرار کیا
کہ ہم نے جامۂ ہستی کو تار تار کیا

مستفیض اس روئے روشن سے ہوئی تنویرِ صبح

چہرۂ پُر نور شہ سے میں نے جب تشبیہ دی
ہوگئی بیدار کیسی یک بیک تقدیرِ صبح
مرقدِ پُر نور پر جاکر، جلاتا شب کو شمع
گر نہ ہوتی پاؤں میں خورشید کے زنجیرِ صبح

آپ آئے، نگہِ حور کا ہو عرش پہ فرش
آپ ہیں نورِ خدا، نور کا ہو عرش پہ فرش
جلوہ گہِ مظہرِ نورِ ازلی ہو جو کلیم
لمعۂ شمعِ سرِ طور کا ہو عرش پہ فرش

فارسی کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:

جانی و غارتگرِ جانی ہنوز
جلوہ ہا دادی و پنہانی ہنوز
گرچہ سر جاہست منزلگاہِ تو
در دلم، اے ماہ، مہمانی ہنوز
ابر می گرید بحالِ زارِ من
تو شاں برق خندانی ہنوز
زلف بکشادی و بُردی جان و دل
ہم بہ فکرِ دین و ایمانی ہنوز
گر نہ در خود گشتہ فانی، کلیم!
سِرِّ عرفانی نمی دانی ہنوز

بیک گردش ز چشمِ مستِ اُو میخوار می گردم
زجامِ بیخودی در عشوۂ سرشار می گردم
نقاب از روئے خود بکشا، خدا را جلوۂ بنما
زماں باشد کہ در کویت پے دیدار می گردم
بہر دم گردشِ چشمش عجب کیفیتے دارد
بگردِ اُو دمے مست و دمے ہشیار می گردم
بیا زاہد! بکش جامے کہ دورِ میکشاں آمد
صراحی در بغل مستانہ در بازار می گردم
پے گلگشتِ باغِ قدس بکشادم درِ دل را
برائے طوفِ آں گل اندریں گلزار می گردم
طوافِ کعبہ را موقوف فرصت داشتم اکنوں
بگردِ نقشِ پائے احمدِ مختار می گردم
چہ می پرسی کلیم! از قربِ آں شاہنشۂ خوباں
غلامِ شاہ جیلانم، سرِ دربار می گردم

زغمزہ بر جگرم تیرِ خونچکاں زدہ
درونِ دل ہمہ خوں شد، چہ بر نشاں زدہ
چہ طرفہ طائرِ اوجِ حقیقتی، اے روح!
بسانِ گلشنِ لاہوت آشیاں زدہ
بنارِ عشقِ تو مانند عشق سوزانم
زحسنِ خویش عجب آتشے بجاں زدہ
متاعِ صبر و خرد، جملہ رفت در غارت
بفوجِ عشقِ نو بر جانِ ناتواں زدہ
نہادۂ بدرِ خواجہ خوش جبینِ نیاز
کلیم: سر بزمیں، پا بر آسماں زدہ

[اردو ادب: ۱۹۶۳: ۳ مضمون سیّد فضل المتین]

کوکبؔ ـــــ محمد تفضّل حسین خان دہلوی

افسوس کہ ان کے حالات نہیں ملے، اور جو کچھ معلوم ہوا، وہ بھی ان کے خواجہ تاش اور یارِ غار میرزا قربان علی بیگ خان سالک دہلوی کے کلام سے؛ یہ بھی غنیمت ہے۔ کوکب کی وفات پر سالک نے بہت سے قطعاتِ تاریخ کہے تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

چوں تفضل حسین خان افسوس — دہرِ ناپایدار را بگذاشت
"آغا مرزا" کہ نام تاریخی (۱۲۵۰) — بہرِ سالِ ظہورِ خود می داشت
ہم بسالِ وفاتِ او آں را — کلکِ سالک بہر مزار نگاشت (۱۲۵۰ + ۴۰ = ۱۲۹۰)

اس سے معلوم ہوا کہ ان کا تاریخی نام "آغا مرزا" تھا جس سے (۱۲۵۰) برآمد ہوتے ہیں۔ گویا ان کا ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ - ۱۸۳۵) سالِ ولادت ہے۔

ان کی اولاد میں تین یا چار اولادوں کا پتا چلتا ہے: دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ایک بیٹے کا نام افضل حسین تھا؛ اس کا صغر سنی میں ۱۲۸۵ (۱۸۶۸ - ۱۸۶۹ء) میں انتقال ہوگیا۔ سالک نے تاریخِ وفات کہی:

غمِ مرگِ پسر دادی بہ کوکب — نہ کردی رحم اے گردوں بحالش
ثمر خوردن ندادا از باغِ ہستی — بہ خاک آوردہ از پا نونہالش
گلے نو رستہ از شاخ و خزاں دید — چہ طالع نہ گشت و شد زوالش
شبِ تاراست، روزِ او تو گوئی — نہاں گشت از نظر مہرِ جمالش
خرامش چیست، زیں ہم بیخبر بود — شگفتہ رُو نمودہ انتقالش
چوں خوابِ مرگ آں بے شیر را برد — مبارک باد بر کوثرِ زلالش
چہ می پرسی ز سالک سالِ ایں غم — کہ جمعیت نہ باشد در خیالش
مگر از غیب می آید صدائے — "بمرد افضل حسین" انیث بیالش (۱۲۸۵)

ایک بیٹا ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء - ۱۸۶۶ء) میں پیدا ہوا تھا۔ سالک نے اس کی تاریخِ ولادت کہی ہے:

یافت فرخ پسرے کوکبِ فرخندہ نژاد　　بختِ خوش، طالعِ مسعود مبارک باشد
زاتشِ مجمرِ دلہاے حسوداں امروز　　بزم را سوختنِ عُود مبارک باشد
سالِ ایں مژدہ بگفتم ز سرِ شورِ سرور　　جلوۂ شاہد[۵] مقصود مبارک باشد
(۶۰ + ۶۰ + ۱۱۶۲ = ۱۲۸۲ھ)

میرا گمان ہے کہ اوپر جس بچے کی تاریخِ وفات دی گئی ہے، یہ وہی بچہ تھا۔ تاریخِ وفات کے الفاظ "گلِ نورستہ"، "مہرِ طالع گشت" بھی اسی پر دال ہیں۔ واللہ اعلم۔

لڑکیاں دو تھیں۔ ایک کا نام احمدی بیگم تھا۔ اس کا ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء - ۱۸۶۴ء) میں انتقال ہوا، تو سالک نے قطعۂ تاریخ کہا:

سالک ز وفاتِ احمدی بیگم آہ　　ہر لحظہ دمے شرر فشانست مرا
تاریخِ وفاتِ او سروشے از غیب　　گفت "آہ دریغ" بر زبانست مرا
(۱۲۲۰ + ۶۰ = ۱۲۸۰)

ابھی اس حادثے کو ایک مہینا بھی نہیں گزرا تھا کہ غریب کو دوسری بیٹی کا صدمہ سہنا پڑا۔ سالک نے پھر ایک قطعہ کہا:

زفضل اللہ خاں باید کہ پرسی　　چہ می پرسی ز سالک حالِ ایں غم
دو دختر مُرد کوکب را بہ یک ماہ　　"شدا ندوہِ دو دختر" سالِ ایں غم
(۱۲۸۰)

کوکب نے جیساکہ شروع میں ذکر ہوا، بعمر ۴۰ برس ۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا۔ سالک نے تاریخِ وفات میں کئی قطعے کہے تھے؛ ان میں سے ایک اوپر دیا جا چکا ہے، ایک اور یہ ہے سالک کا ایک طویل مرثیہ بھی ان کے کلیات میں موجود ہے:

---

۵ کلیات میں "شاہد" اور "مقصود" کے درمیان عاطفہ ہے جو وزن میں تو ٹھیک ہے لیکن زبان کے لحاظ سے کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔ اس لیے میں تے عاطفہ کو حذف کر کے (۱۲۸۲) عدد محسوب کیے ہیں۔

زیں جہاں رفت و بجا شد، سالک! | طاعتی یافتہ قصر فردوس
حقِ او بود کہ گفتم "تاریخ | "متقی" یافتہ "قصر فردوس"

(۱۲۹۰ = ۷۴۰ + ۵۵۰)

ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ فغانِ دہلی، کی تقریظ نوشتۂ سالک سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی با استعداد اور صاحبِ علم تھے، اور مختلف علوم میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے خونین ہنگامے کے بعد جب شہر میں امن و امان قائم ہو گیا، تو دلّی والوں نے غالباً ایک مشاعرہ کیا تھا، جس میں اس وقت کے بیشتر اساتذہ نے شہر کی تباہی کا رونا رویا تھا۔ ان سب منظومات کا مجموعہ کوکبؔ نے مرتب کر کے "فغانِ دہلی" کے نام سے ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں اکمل المطابع سے شائع کیا تھا۔ "فغانِ دہلی" میں کوکبؔ کی بھی ایک طرحی غزل ہے۔ اسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

مٹ گئے ہائے مکیں، اور مکانِ دہلی | نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی
سہمے سہمے نہ رہیں کیونکہ مقیمانِ فلک | کہ فلک ہے ہدفِ تیرِ فغانِ دہلی
ہم تو انسان ہیں، جی کیونکہ رہے بن روئے | کہ فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی
جیسی فارس میں خلاصہ ہے زبانِ شیراز | ویسی ہی ہند میں ہے پاک زبانِ دہلی
دور سے دیکھ کے ہو کیونکہ یقیں دلّی کا | آ کے دل میں ہو جب یوں ہی گمانِ دہلی
فرطِ کاہیدگیِ درد سے یارب، اب تو | سب کے سب ہو گئے ہیں پیر، جوانِ دہلی
اس کی ویرانی میں اک بات ہے دیکھو بانکپ | مٹ گئے پر بھی تو باقی رہی آنِ دہلی
جسدِ چرخ نہ انجم سے بنے آبلہ دار | گر نہ ہو درپےِ بربادیِ شانِ دہلی
بسکہ ہنگامہ طلب تھا یہ سکاں پہلے | فتنۂ حشر بھی ہو وے گا میانِ دہلی
جو مکیں رہ گئے بے گور و کفن مر مر کر | ڈھانپنے پردہ کرے ان کا مکانِ دہلی

غالبؔ و ثاقبؔ و سالکؔ ہی نہیں ہیں غمگیں
کوکبِؔ خستہ بھی کرتا ہے فغانِ دہلی

[کلیاتِ سالک؛ فغانِ دہلی: ۱۹۱-۱۹۲، ۲۰۵]

گوہر ـــــ گوہر جان

کلکتہ کی رہنے والی تھی اور غالباً اربابِ نشاط میں سے۔ اس کی یہ غزل گلدستہ "شکوۂ یار"، بجنور میں شائع ہوئی ہے:

دل میں بےچینی سرِ بسترِ راحت ہوگی
اس قدر وصل کی مشتاق طبیعت ہوگی

لاکھ ارمان بھرے حشر میں ہونگے پامال
چھوٹے سے سن میں بھی رفتار قیامت ہوگی

دو بھی بوسے جو مجھے نامِ خدا بردوگے
اس سے کچھ کم تو نہیں حسن کی دولت ہوگی

چٹکیاں نے کے جو پہنچی کبھی وہ زلفِ سیاہ
دردِ دل اُٹھنے کی ضامن شبِ فرقت ہوگی

قیصرِ ہند لقب بخشیگی گوہر اسدؔ؟
ہم کو تفویض جو ملکہ کی وزارت ہوگی

[شکوۂ یار، بجنور شمارۂ جون ۱۹۱۰ء: ۳۷ بحوالہ مضمون "گلدستہ شکوۂ یار، بجنور" از ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، مطبوعہ قومی زبان، کراچی، فروری ۱۹۶۷ء]

لطیفؔ ــــ شیخ لطیف احمد عثمانی

بلگرام کے مولوی زادوں میں سے تھے۔ ان کے والد کا نام کفایت اللہ تھا، اور دادا شیخ باد اللہ۔ بادؔ، غلام علی آزادؔ کے ہمعصر بتائے جاتے ہیں۔ لطیفؔ نے عربی کی تحصیل لکھنؤ میں کی تھی۔ فنِ مناظرہ سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے مرید تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں کانپور میں بھی ایک مدت تک رہے۔

پہلے سرورؔ لکھنوی کے شاگرد رہے، پھر غالبؔ سے اصلاح لی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ کلام میں صرف یہ اردو غزل ملی:

جب تلک جان میں ہے جان، یہی دھیان رہے — دل رہے یا نہ رہے، یار کا ارمان رہے
یا خدا! موردِ جورِ اپنی سدا جان رہے — دل میں اُس بت کے نہ باقی کوئی ارمان رہے
حسن اور عشق کا اٹھ جائے کہیں جلد حجاب — پردہ لیلیٰ کا، نہ مجنوں کا گریبان رہے
یا الٰہی! وہ کسی دن تو ہوں محوِ دیدار — خود بھی حیران ہوں، آئینہ بھی حیران رہے
کس سے وعدہ کیا؟ کی رات کہاں جا کے بسر؟ — ہم تڑپتے رہے، تم غیر کے مہمان رہے
جی میں ہے ریت لوں، خود اپنے گلے پر خنجر — میری گردن پہ نہ جلاد کا احسان رہے
بھڑکے سینے میں مرے آتشِ موسیٰ یا رب! — اور آنکھوں سے رواں نوح کا طوفان رہے
واہ کیا فہم! کہ بندے تو بتوں کے ہو لطیفؔ! — اور خدا سے ہے مناجات کہ ایمان رہے

[ہندستانی، ۳ : ۴۸۱ - ۴۸۳]

مائلؔ ـــــ میر عالم علی خان سہسوانی

میر مودود بخش خان کے صاحبزادے تھے۔ بزرگوں کا وطن سہسوان تھا۔ لیکن میر مودود بخش نقل مکان کر کے بڑودہ میں مقیم ہو گئے؛ وہاں کے عمائد میں شمار کیے جاتے تھے۔ ریاست میں بڑے بڑے عہدوں پر متمکن رہے اور سردار بہادر کا خطاب پایا۔ انگریز نے بھی ان کی خدمات کے انعام میں خانی کا خطاب دیا تھا۔ مائل نے عین جوانی میں سہسوان میں گھوڑے سے گر کر ۱۲۹۴ھ اور ۱۲۹۷ھ کے درمیان انتقال کیا۔ لاولد فوت ہوئے۔

چند شعر ملے، بطور نمونہ وہی درج ذیل ہیں:

گلپوش بعدِ مرگ ہمارا مزار ہے
کیا لطف ہے کہ عین خزاں میں بہار ہے

پستاں انار، رشکِ گلِ تر عذار ہے
پھولا پھلا ہوا چمنِ حسنِ یار ہے

اتنا غرورِ حسنِ دو روزہ پہ کس لیے
غافل! عروجِ نشہ کو آخر خمار ہے

چھاتی سے کیوں لگائے نہ رکھوں میں روز و شب
ناسورِ سینہ دل کا مرے یادگار ہے

کیفیتیں نئی ہیں خراباتِ دہر کی
جو ہوش میں نہیں ہے، وہی ہوشیار ہے

ظالم! کدورتوں کی تری انتہا ہے کچھ
ہم خاک ہو گئے، ترے دل میں غبار ہے

انکارِ بادہ ساقی سے، ناصح نہ ہو سکا
معذور ہوں کہ طبع مروّت شعار ہے

کیونکر اٹھا سکے وہ مسی کی دھڑی کا بار
اپنا ہی رنگ جس لبِ نازک پہ بار ہے

حیلہ سے مہندی ملنے کے ہاتھ اس کے چھو لیے
مائل بھی اپنے فن کا بڑا دستکار ہے

منھ رکھ کے میرے منھ پہ، وہ کہتے ہیں پیار سے
مائل! ہے اب بھی جی میں ترے کچھ ہوس رہی

خطا ثابت کرینگے اپنی ہم، اور اُن کو چھیڑینگے
سُنا ہے، ان کو غصّے میں چمٹ جانے کی عادت ہے

دلِ مائل کی چندے آپ کو لازم رعایت ہے
یہ میرا ناز پرور نو گرفتارِ مصیبت ہے

کہتے ہیں وہ مدام کہ ہیں "تابعِ رضا"
مائل! ہے جی میں آج انھیں آزمائیے

تاریخ طباعتِ "چمنستانِ جوش" (دیوان احمد حسن خان جوش)

ہر اک شعر ہے جوش کا رشکِ شعری
زمینِ غزل غیرتِ اوج پروین
چھپا جب کہ دیوان، عطارد پکارا
یہ تاریخ ہے: "برقِ جلوہ مضامیں"
(۱۲۸۷ھ)

تاریخ انطباعِ مثنوی سعدین (از منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی)

مثنوی کے سب ہیں خوش اسلوب شعر
چلبلے مضمون ہیں، محبوب شعر
دل یہ کہتا ہے کہ سالِ دلفروز
آپ لکھیں جلد: "موزوں خوب شعر"

گل پوش بعدِ مرگ بھی، اپنا مزار ہے
کیا لطف ہے کہ عین خزاں میں بہار ہے

[طور کلیم، ص ۸۸؛ بزمِ سخن، ص ۱۰۲؛ سخنورانِ گجرات:
۲۲۹؛ دو ماہی اکادمی، لکھنؤ، شمارہ ۱۰ ص ۳۷-۳۹]

مجروح ـــــ میر مہدی حسین دہلوی

میر حسین نگار کے بیٹے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کا خاندان ولایتی تھا۔ شاہی میں مورچہ جنبانی کی خدمت ان کے سپرد تھی۔ میر فقیر اللہ فقیر جو شاہ عالم ثانی کے عہد میں درباری شاعر تھے، ان کے جد امجد تھے۔ نگار ان سے دوسری پشت میں تھے (ان کے حالات کے لیے دیکھیے، کتاب ہذا!) مجروح کی پیدائش ۱۸۳۳ء کے لگ بھگ ہوئی۔ شاہی زمانے کے اردو بازار میں جسے انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد مسمار کر دیا تھا، اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں پانی پت چلے گئے تھے۔ یہاں غالب کے ایک دوسرے شاگرد خواجہ الطاف حسین حالی کی محلۂ انصار میں سکونت تھی۔ مجروح انھیں کے ایک مکان میں مقیم رہے۔ جب فساد فرو ہوا تو پانچ سال بعد دہلی چلے آئے، لیکن "ہم نے یہ مانا رہیے دلّی میں، پر کھائینگے کیا!" اب یہ وہ دلّی نہیں تھی، جسے چھوڑ کے وہ پانی پت گئے تھے۔ ناچار تلاش روزگار میں نکلے۔ الور میں مہاراجہ شیو دھیان سنگھ قدر دانِ کمال و اہلِ کمال موجود تھے۔ چند دن کے لیے وہاں ٹھکانا مل گیا۔ پہلے نائب تحصیلدار اور بعد کو تحصیلدار رہے۔ لیکن ۱۸۷۳ء میں شیو دھیان سنگھ کی معزولی کے بعد یہاں سے نکلنا پڑا۔ خوش قسمتی سے سوائی رام سنگھ مہاراجہ جے پور نے دستگیری کی۔ یہ جے پور پہنچے اور وہاں نائب کوتوالِ شہر مقرر ہو گئے۔ لیکن فلکِ ناہنجار کو ان کا اتنا اطمینان و سکون بھی نہ بھایا۔ ۱۸۸۰ء میں مہاراجا رام سنگھ کا انتقال ہو گیا اور انھیں دلّی واپس آنا پڑا۔ بارے، قسمت نے یاوری کی؛ نواب حامد علی خان بہادر والیِ رام پور نے قدر دانی کی اور اپنے پاس بلا لیا۔ یوں ان کے آخری ایام آرام سے بسر ہو گئے۔

عقیدے کے لحاظ سے اثنا عشری شیعی تھے۔ قدرتاً کربلا اور دوسرے مقاماتِ مقدسہ



میر مہدی حسین مجروح دہلوی۔

کی زیارت کا شوق تھا۔ لیکن خرابیِ صحت اور اضمحلالِ قواء کے باعث یکّہ وتنہا سفر کرنے سے گھبراتے تھے۔ آخر جب نہ رہ سکے، تو ایک ملازم کو ساتھ لیا اور روانہ ہو گئے، اور زیارتِ عتباتِ عالیہ سے فارغ ہو کر واپس آئے۔

صحت جو پہلے سے خراب تھی، اس سفر کی کھکھیڑ کے باعث خراب تر ہو گئی۔ بینائی جو پہلے کمزور تھی اب بالکل زائل ہو گئی۔ کسی سہارے کے بغیر نقل و حرکت تک دشوار ہو گئی۔ اسی بے بسی اور تکلیف میں بروز جمعہ ۱۷ صفر ۱۳۲۱ھ (۱۵ مئی ۱۹۰۳ء)[۱] وفات پائی۔ اتفاق کی بات، کہ وفات سے پہلے چند بار "اغفرلی الٰہی" کہا اور اسی حالت میں جان، جان آفریں کے سپرد کر دی یہی "اغفرلی" ان کی تاریخ وفات ہے۔ درگاہِ قدم شریف، دلّی کے صدر دروازے کے باہر فصیل کے متّصل جنوب میں قبر ہے۔ لوحِ مزار پر ان کے شاگرد نواب احمد سعید خان طالب کا کہا ہوا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے:

یادگارِ غالبِ معجز بیاں	میر مہدی، سیّدِ والا تبار
بُد کلامش سر بسر آہ و فغاں	چوں تخلص بود مجروحِ فگار
کرد از دنیا، چو آہنگِ سفر	گفت "اغفرلی الٰہی" چند بار
طالبا! دیگر مرنجاں فکر را	سالِ فوتش خود ز "اغفرلی برار"

(۱۳۲۱ھ)

انھوں نے شادی بہت دیر سے، کوئی ۴۰ برس کی عمر میں کی۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادے سیّد عباس حسین کا نام ملتا ہے، جو ۱۹۰۹ء میں زندہ تھے۔

اُستاد کے نہایت محبوب شاگردوں میں سے تھے۔ اُردوے معلّٰی اور عودِ ہندی میں بیسیوں خط ان کے نام ہیں۔ مرزا کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا، وہ خاص پایے کی چیز ہے۔ ان کا دیوان ان کے جگری دوست میر فضل علی عرف میرن صاحب کی کوشش سے جولائی ۱۸۹۹ء میں "مظہرِ معانی" (۱۳۱۶) کے تاریخی نام سے پہلی بار چھپا تھا (سرفراز پریس، دہلی)۔ اس میں بیشتر غزلیں ہیں۔ اس کے علاوہ دو نثری رسالے بھی یادگار چھوڑے۔ ایک حضرت رسول کریم کے معجزات کے بیان میں "انوار الاعجاز" اور دوسرا شیعی اعتقادات کے مطابق حضرت رسول کریم کے حالات میں "ہدیۃ الائمۃ"۔ دونوں اب کمیاب ہیں۔ ایک تذکرہ بھی طلسم راز لکھا تھا، یہ بھی اب نایاب ہے۔

---

[۱] شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے تاریخ ۱۵ اپریل ۱۹۰۳ء لکھی ہے؛ یہ سہو ہے؛ ۱۵ اپریل کو ۱۷ محرم تھی اور دن چہار شنبہ تھا۔

کچھ چیزیں غیر مطبوعہ بھی رہ گئیں ۔ "گنجِ غرائب" میں کہانیوں اور قصّوں کی شکل میں پند ونصائح ہیں؛ اسے ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں مرتّب کیا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری، رامپور میں موجود ہے۔ ایک اور رسالہ پانچسو صفحات کی کتاب "آیاتِ جلی فی شانِ مولیٰ علی" میں ان آیاتِ قرآنی کا ترجمہ اور تفسیر دی ہے، جو شیعی عقیدے کے مطابق حضرت علی کی شان میں نازل ہوئی تھیں؛ اس کا خطی نسخہ آغا محمد سلطان مرحوم سابق سشن جج، لاہور کے خاندان مقیم کراچی کے پاس ہے۔

مجروح کا کلام دلّی کی صاف ستھری نکھری ہوئی زبان میں ہے، جس میں کوئی اینچ پینچ اور گنجلک نہیں خصوصاً چھوٹی بحروں میں جو غزلیں لکھی ہیں وہ بہت دلآویز ہیں۔ اگرچہ موضوع اور طرزِ ادا وہی ہے جو اُن سے پہلے رائج تھا اور جدّت بھی اُن کا طرۂ امتیاز نہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے کلام کی سادگی اور پختگی دلنشیں ہے۔

کلام کا مختصر انتخاب درج کیا جاتا ہے:

نہ وہ نالوں کی شورش ہے، نہ غل ہے آہ وزاری کا
وہ اب پہلا سا ہنگامہ نہیں ہے بیقراری کا

طلب کیسی، بلانا کیا، وہاں خود جا پہنچتے ہیں
اگر عالم یہی چندے رہا بے اختیاری کا

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو بُرا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

کچھ عرضِ تمنّا میں، شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے تو کہا کیا تھا اور آپنے کیا جانا

ہجر کے رنج، وصل کی راحت
لطف ہر ایک کا جدا دیکھا

جان بھی مفت میں گئی مجروح!
دل لگانے کا کچھ مزا دیکھا

بھُولے بھُولے سے جو رہتے ہو، کہو خیر تو ہے؟
یہ تو کچھ عشق کا انداز ہے پایا جاتا

ایذائیں یہ پائی ہیں، مقدور اگر ہوتا
میں رسمِ تعشق کو دنیا سے اٹھا جاتا

اچھا ہوا، محفل میں مجروح نہ کچھ بولا
وہ حال اگر کہتا، تو کس سے سُنا جاتا

تُو تو کچھ اور ہو گیا مجروح!
دل تو اٹکا نہیں کہیں، اے یار!

یہی انداز تو ہیں، دل کے اڑا لینے کے
اُن کی تم نیچی نگاہوں پہ نہ جانا ہرگز
اس کا انجام کس نے دیکھا ہے!
جانِ جانا ہے، عشق کا آغاز

یوں ہی گذرا بہار کا یہ برس
ہم اُسی طرح ہیں اسیرِ قفس
اس میں طولِ اَمَل ہزار ہزار
زندگی کا مدار ایک نفس

کیوں میری بود و باش کی پُرسش ہے ہر گھڑی
تم تو کہو، کہ رہتے ہو دو دو پہر کہاں

کچھ کچھ چلن ہے حشر میں رفتارِ یار کا
ہے وہ بھی فتنہ خیز، مگر اِس قدر کہاں

جوشِ وحشت میں مزا، کچھ سر و ساماں میں نہیں
اُس گریباں کی کیا قدر، جو داماں میں نہیں

دل کو شاید تری مژگاں کا تصوّر نہ رہا
اب وہ پہلی سی کھٹک کاوشِ مژگاں میں نہیں

در و دیوار کو توڑا ہے، ترے وحشی نے
اب تو گھر میں وہ مزا ہے، جو بیاباں میں نہیں

دل کی بیچینیاں گئیں نہ کہیں
اک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں
پھر کیا چیز ہے؟ وفا کیسی؟
یہ تو باتیں ہی اب رہیں نہ کہیں
بزمِ مے کب ہیں چھوڑنے والے
ہونگے مجروح، یاں کہیں نہ کہیں

یہ جو چپکے سے آئے بیٹھے ہیں
لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں
یہ بھی کچھ جی میں آ گئی ہو گی
کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں

دل میں قوت، جگر میں تاب کہاں!
اب وہ پہلا سا اضطراب کہاں،
وہ سمائے ہوئے ہیں نظروں میں
اپنی آنکھوں میں جائے خواب کہاں!
اس تغافل شعار کو ہمدم!
خط تو لکھوں، مگر جواب کہاں!
درِ میخانہ پہ رہا مجروح!
آپ جاتے ہیں، اے جناب کہاں!

جانا زبس ضرور تھا، اس جلوہ گاہ میں
ہم دیر و کعبہ چھوڑ گئے دونوں راہ میں
اس نے ملائی آنکھ، نہ گھر میں نہ راہ میں
کیا کیا سُبک ہوا ہوں عدو کی نگاہ میں

مجروح! کہیے میں ہنسوں بولوں تابہ کے! — تم تو سدا رہو گے اسی آہ آہ میں
اس دل ہی نے سب کام بگاڑے ہیں وگرنہ — وہ راہ پر آجائے،[1] اگر صبر کیا جائے
مجروح نہیں خوش ہوتا ہوں یوں آپ میں ہو کر — اک کھوئی ہوئی چیز کو جیسے کوئی پا جائے
کسی سے عشق اپنا کیا چھپائیں — محبت ٹپکی پڑتی ہے نظر سے
کہاں کی پیروی جب قصد یہ ہو — کہ آگے بڑھ کے چلیے راہبر سے
مری ٹوٹی ہوئی توبہ کے ٹکڑے — نہ کوئی لادے در پیر مغاں سے
کہ ان کو جوڑ کر میں توڑ ڈالوں — پھر اک جام شراب ارغواں سے
میں اس بیگانگی سے خوش ہوں مجروح! — کہ فارغ ہو گیا سود و زیاں سے
اک کام ہمارا ہے، کہ بن جائے تو بگڑے — اک غیر کا مطلب ہے کہ بگڑے تو سنور جائے
اچھا ہے، جو مجروح کو روکے کوئی اُٹھ کر — یہ جینے سے بیزار ہے، کیا جانے کدھر جائے[1]
رہ کے مسجد میں کیا ہی گھبرایا — رات کاٹی خدا خدا کر کے[2]
سب ہی کرتے ہیں محبت، پہ یہ شورش کیا ہے — رحم اے عشق! نہ کر جینے سے بیزار مجھے
دل میں مجروح کے کچھ درد سوا ہے شاید — آج تو اس نے پکارا ہے کئی بار مجھے

[گلِ رعنا: ۴۳۱-۴۳۶؛ گلدستۂ مذاقِ سخن مئی ۱۹۰۳؛ ماہِ نو (ماہنامہ) کراچی (جنوری-فروری ۱۹۶۹ء): ۷۴-۸۷ (مضمون میر مہدی مجروح، (غالب کا سب سے چہیتا شاگرد) از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)؛ ماہنامہ زبان، دہلی اپریل ۱۹۰۹ء ص ۲۲۶]

۱ہ ہم سے بھی مل کر گیا، روتا ہوا سالک ابھی
کیا ارادہ ہے خدا جانے، کدھر جانے کو ہے
(قربان علی بیگ سالک)

۲ہ کل جو مسجد میں جا پھنسا مومن
رات کاٹی خدا خدا کر کے (مومن)
اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ طرح رہی ہو۔

محشر و خانم جان ـــــ مرزا عبداللہ خان رامپوری ثم دہلوی

فقیر منش اور دریا دل آدمی تھے۔ جو آتا لٹا دیتے، یا کسی کو دے ڈالتے۔ تاریخ میں مہارت تھی۔ افیون بلکہ شراب تک سے دلچسپی تھی۔

اصل میں ریختی کے شاعر تھے اور اس میں خانم جان تخلص کرتے تھے۔ اور پڑھتے بھی خوب بنا بنا کے تھے، ایسا کہ دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ مدتوں شمالی ہند کے شہروں میں گھوما کیے اور آخر میں کلکتے گئے، جہاں عبدالغفور نساخ سے ملاقاتیں رہیں۔ نساخ لکھتے ہیں کہ ان میں یہ بہت بڑا عیب تھا، کہ دوسروں کے کلام کو اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے۔

ہجر میں تسکین دیتا ہیں کہ سر کو پیٹتا ایک دل پر ہاتھ تھا میرا، جگر پر دوسرا

کہیں تم چپ چلے میں، بھید کچھ ان سے نہ کہہ دینا
مری اچھی بوا، یہ مردوے مطلب کے ہوتے ہیں

کیا برے ہیں یہ، جلے دل کو جلانے والے
اور یہ آگ میں، آگ آئے لگانے والے

ہاتھ باندھا کرو، مہندی نہ لگاؤنگی کبھی
پاؤں پڑ پڑ کے، یہ ہیں رنگ جمانے والے

جاؤ گے ٹنڈیاں کسوا کے، ذرا چھو دیکھو
لو بڑے آئے مرے ہاتھ لگانے والے

کہنے سننے میں کسی کے نہ تم آنا، خانم!
آگ پانی میں لگاتے ہیں لگانے والے

[سخن شعرا: ۴۲۰-۴۲۱؛ مقدمۂ دیوان جان صاحب: ۴۳-۴۵؛ مقدمۂ دیوان باقر: ۱۱۱، ۱۴۰؛ تذکرۂ ریختی: ۳۷]

محمد نجیب خان

ان کا ذکر اور ان کا اپنے اشعار برائے اصلاح غالب کی خدمت میں بھیجنا، غالب کے خطوط بنام منشی حبیب اللہ خان ذکا، حیدر آباد سے معلوم ہوتا ہے۔ اور کچھ تفصیل نہیں مل سکی۔ نہ تخلص معلوم ہوا۔

[اردوے معلیٰ : ۲۷، ۳۱]

محمود ــــ محمد حسین نہٹوری (بجنوری)

ضلع بجنور (یوپی) کے مشہور قصبے نہٹور کے رہنے والے تھے۔ وہاں کے محلہ کلالاں میں ان کے مکانات تھے۔ ان کی "بارہ دری" ہنوز اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ ان کے والد امیر اللہ بن محمد وارث تھے۔ خاندان کے لوگ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ محمود رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد والیِ ریاست کپورتھلہ مہاراجا رندھیر سنگھ بہادر کے برادران خُرد کنور سوچیت سنگھ بہادر اور کنور بکرمان سنگھ بہادر اہلو والیہ (سی ایس آئی) رئیسِ جالندھر کی جاداد اور ریاست کے ناظم مقرر ہو گئے تھے۔

غالب کی زمینوں میں ان کے بیشتر شاگردوں نے کم و بیش غزلیں کہی ہیں لیکن یہ امتیاز محمود ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے استاد کی ۵۸ غزلوں پر غزلیں کہیں اور اپنا یہ دیوان اس اہتمام سے شائع کیا کہ پہلے غالب کی غزل دی، اور اس کے بعد اپنی۔ اسی لیے اس کا نام

"دو آہنگ" رکھا؛ ایک آہنگِ غالب کا، دوسرا محمود کا۔ یہ دیوان چار مرتبہ شائع ہوا۔ پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء میں؛ اس کے ۶۰۰ نسخے محکمۂ تعلیم پنجاب نے خرید کر صوبے کے کتابخانوں میں تقسیم کیے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ مطبع مہر نیمروز بجنور میں چھپا (۱۸۹۲ء) تیسری اشاعت سے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ چوتھی مرتبہ یہ دیوان کریم المطابع بجنور میں چھپا؛ اسی اشاعت کا نسخہ مجھے ڈاکٹر نجم الاسلام (شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔ پاکستان) کی مہربانی سے دیکھنے کو ملا۔ چونکہ کتاب بہت کمیاب ہے اور محمود کا کلام بھی عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا، اس لیے اس کا معتد بہ انتخاب شامل کر رہا ہوں۔

کنور بکرمان سنگھ شہر میں گیارہ مدرسے اپنی جیبِ خاص سے چلاتے تھے۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں انھوں نے محمود سے فرمایا کہ کیا اچھا ہو، اگر اردو کے طالب علموں کے نصاب کے لیے ایسا نسخہ جدید مرتب ہو، "جس کا مضمون دلچسپ اور مطلب شریف و لطیف ہو۔" اس پر محمود نے فارسی کتب اخلاق کی مدد سے ایک مختصر رسالہ قلمبند کیا اور اس کا نام "حلوائے بے دُود" رکھا۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۲۸۸ھ میں مطبع نولکشور، کانپور میں چھپا تھا۔ رسالہ نثر میں ہے؛ اس میں مختلف اخلاقی موضوعات پر حکایات اور چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں۔ جگہ جگہ محمود نے اپنی غزلوں اور اشعار کا اضافہ کیا ہے، اس کی زبان سلیس اور بامحاورہ ہے، "تاکہ پڑھنے والے طالبعلموں کو جہاں اخلاق کی تعلیم ملے، وہیں انھیں صحیح زبان بھی سکھائی جا سکے۔" ان کی ایک مثنوی "تحفۂ محمود" بھی موجود ہے (مطبع آفتاب ہند، جالندھر ۱۸۹۱ء) ایک مختصر منظوم تصنیف "محمود نامۂ اردو" بھی ملتی ہے (مطبع گلزار محمدی، لکھنؤ۔ یکم رجب ۱۲۹۰ھ) یہ دراصل بیت بازی کے سلسلے کی چیز ہے جس کے مقابلے میں ایسے اشعار کی ضرورت پیش آتی ہے جو کسی حرف سے شروع ہوں یا ختم ہوں۔ البتہ اس سے محمود کے بارے میں ایک بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ غوث علی شاہ کے مُرید تھے، ان کا شعر ہے:

غلام غوث علی ہوں، اسد کا ہوں شاگرد
ہو کس طرح نہ مرے نعرۂ جگر کو فروغ

انھوں نے اپنے اشعار میں جابجا غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے:

حق تو یہ ہے کہ ترازوے سخن میں محمود! | کوئی ہم پلّۂ غالب نہ سخنداں نکلا
غالب بھی ہے وہ گنجِ معانی کا اک طلسم | محمود جس کے شعر پہ ہے نعرہ زن ہنوز

ان کے کلام سے تصوّف اور مذہبی شغف اور اولیاے کرام سے گہری عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ عام غزلوں میں بھی حمد و نعت کے اشعار ملتے ہیں۔

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

نقش ہے شوریدہ کس کی تابشِ تحریر کا
مشعلِ سوزاں ہے ہر تارِ نظر تصویر کا

کبھی ہم نہ جمع کرتے یہ متاعِ زہد و طاعت
ترے عشق راہزن کا جو نہ انتظار ہوتا

کیا بتاؤں عشق کی آتش میں کیا کیا جل گیا
مزرعہ، دل جل گیا، تخمِ تمنا جل گیا

شکر واجب کیوں نہ ہو، برقِ نگاہِ یار کا
جس کی اک چشمک میں وہمِ لا و الا جل گیا

ہو کے مجنوں جو ترے عشق میں اے جاں نکلا
چشمِ گریاں، دلِ بریاں، تنِ عریاں نکلا

ثنا خواں ہوں نہ کیونکر کاوشِ بیدادِ مژگاں کا
مزا ہے درد میں دل کو، نہیں طالب یہ درماں کا

جگر و دل میں یہ جھگڑا ہے کہ سب سے اوّل
کس کا حق ہے ہدفِ ناوکِ مژگاں ہونا

نالۂ شعلہ فشاں بند جو ہوتا ہے کبھی
چاہتا ہر بنِ مو ہے شرر افشاں ہونا

عمر فرقت میں ہی کٹنی ہے، تو گھبرائینگے کیا
آرزوے وصل میں بن آئی، مر جائینگے کیا

دین و دنیا کے بکھیڑے جیتے جی کے ہیں فقط
واں سے کیا لائے ہیں ہم، اور یاں سے لے جائینگے کیا

ذرّہ ذرّہ ہے ترے حسن کی رویت کا گواہ
روزِ روشن ہے ترا مہر لقا ہو جانا

ہے یہی نسخۂ اکسیر، میسّر ہو اگر!
کشتۂ خنجرِ تسلیم و رضا ہو جانا

نکتہ سنجی سے ہے مقصود ثنا خوانیِ دوست
نہ عبث شاعرِ آشفتہ نوا ہو جانا

اس کے ہر رنگ میں، محمود! نمایاں ہے جھلک
چشم کو چاہیے مشتاقِ لقا ہو جانا

الزامِ سخت جانی تھا محمود پر، مگر
قاتل کی تیغِ ناز کا بھی کچھ قصور تھا

نہیں معلوم، ہے یہ ماجرا کیا
کہ میں کیا شے ہوں، اور تو ہے بھلا کیا

جو اب تک ہو چکا اور ہو رہا ہے
کیا کیا میں نے، اور تو نے کیا کیا

جو حادث ہے ظہورِ ہر دو عالم
تو اوس کی ابتدا اور انتہا کیا

خدا ہے نام جس کا، ہر زباں میں
وہ کیا شے ہے، اور اوس کا ہے پتا کیا

کوئی بتلا سکا اتنا نہ اب تک
کہ بندہ چیز کیا ہے، اور خدا کیا

اگر لا شے ہے وہ، جس سے ہے ہر شے
تو پھر ہر شے ہوئی اس سے جدا کیا

کوئی صانع نہیں ہوتا ہے لا شے
تو صانع صنعتوں سے ہے خفا کیا

حباب بحر اگر بولے: انا الماء — تو پھر اُس کی جز اکیا اور بڑا کیا
کہو محمود! جو کچھ ہے، وہی ہے — نہ پوچھو عکس کیا ہے، آئینہ کیا

نہ ہوتا گر تنِ خاکی میں جلوہ اس کی قدرت کا — بتِ آدم کے آگے سر جھکانا کب روا ہوتا
بنایا اس نے جب بندہ، تو بندہ نے کہا زیبؔ — اگر بندہ نہ ہوتا، تا مز دیکھو نکر خدا ہوتا
وہ ہمدم بن کے میرا، مجھ کو اب ملزم بناتا ہے — "ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا"

گر ظہور اپنا نہ ہوتا اسے منظور تو کیوں — مظہرِ ذات پہ یوں شیفتہ انساں ہوتا
بے محبت نہیں ہو سکتی ہے نیکی و بدی — اس سے خالی جو وہ ہوتا، تو نہ انساں ہوتا
اک تجلّی میں یہ ہو جاتا نہ یوں خاک سیاہ — طُور، محمود! جو ہم رتبۂ انساں ہوتا

واعظ! نہ اوس کی دید کا فردا پہ رکھ مدار — دیکھیگا کل وہ کیا جو بشر بے بصر ہے آج
محمود! بعدِ مرگ یہ ثابت ہوا ہمیں — کہتے تھے جس کو گور، وہی اپنا گھر ہے آج

وائے افسوس، یہ کس دل میں رہینگے مہماں — ناوکِ غمزہ و پیکانِ ادا میرے بعد
کون اب محفلِ خوباں میں غزلخواں ہوگا — کون کہلائیگا آشفتہ نوا میرے بعد
بحر سے نکلا، ہوا بحر میں گم مثلِ حباب — نہ رہا اُس کا، نہ کچھ میرا پتا میرے بعد

ہے شورِ ہوس پیشگیِ عشقِ بتاں اور — ہے سوزِ گرانمایگیِ سوختہ جاں اور
خالی کیا سینہ پہ کماندار نے ترکش — صیدِ جگر و دل یہی کہتے رہے "ہاں اور"
لے بادۂ الفت، ہے دمِ زندگی بے لطف — دے جام کوئی ہوشربا، پیرِ مغاں! اور

مژگان و زلفِ یار سے ہے دل کو رابطہ — ہے تو بھی "تازہ خواہشِ دار و رسن ہنوز"
بیداری میں زمیں پہ ہیں، رویا میں عرش پر — ثابت ہوا نہ ہم کو ہمارا وطن ہنوز

سوزِ جانبازیِ پروانہ ہے اک چشمکِ برق — شمع جاں دیتی ہے جل جل کے سحر ہونے تک
منع رونے سے نہ کر، ناصحِ ناداں! مجھ کو — آبروِ عشق میں ہے دیدۂ تر ہونے تک

حق پرستی ہے یہی، رکھ خود شناسی کا خیال — خود بخود مٹ جائیگا یہ نقشِ ہستی ایک دن

نظّارہ کو ہو مژدہ کہ صحنِ چمن میں آج — وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ قبائے گل
محمود! نغمہ سنجی میں ہو لطف اپنی کیا — جب عندلیبِ دل ہی نہ ہو آشنائے گل

مہر ہر ذرّہ و ہر قطرہ ہے دریا لیکن — رازِ سر بستہ کے اظہار کا مقدور نہیں
ہے خود آرائی میں اس جانِ جہاں کا یہ طلسم — کوئی کثرت نہیں، وحدت سے جو معمور نہیں

نحنُ اَقرب کا سمجھنا نہیں ممکن، لیکن — وہم ہستی کو فنا ہو تو وہ کچھ دُور نہیں

پیدا ہو دل میں دردِ محبت نہ جب تلک — لذت سوال میں ہے نہ مزا ہے جواب میں

محمود! لطفِ زندگی و مرگ اس میں ہے — حاصل اگر ہو اک دلِ بے مدعا مجھے

عاصی ہوں میں، پاداشِ عمل پر نہیں نازاں — ہو فضل سے کم اوس کے جو انعام بہت ہے
پیتے ہیں مے عشق کے کم ظرف نہیں ہیں — محتاط مگر ساقیِ گلفام بہت ہے

کیا کہوں جینے کو کیا کیا چاہیے — ہے اگر مرنا، تو پھر کیا چاہیے
سنگِ طفلاں کے مزے چکھنے کو کچھ — عاشقی کا سر میں سودا چاہیے

ایسی بسی ہے دیدۂ و دل میں شبیہِ یار — آباد ہی نظر، جدھر اپنی نظر گئی

اربابِ جہل منکرِ فیضِ مُغاں رہے — اور بادہ نوش صاحبِ ادراک ہو گئے

ماجرا حسن و عشق کا کیا ہے — دل ہے کیا چیز، دلربا کیا ہے
کیا ہے تنزیہہ و عالمِ تشبیہ — عکس کیا شے ہے آئینہ کیا ہے
اصل ہے ظاہر اور ظہور کی کیا — مظہرِ شانِ کبریا کیا ہے
کیا ہے مقصودِ اینما کُنتُم — نحنُ اَقرب کا مقتضا کیا ہے
مَنْ عَرَفَ نفسہ سے کیا ہے مراد — کون جویا ہے، گم ہوا کیا ہے
گر نہیں ذات کا صفات میں دخل — اَمرِ ربّی سے مدعا کیا ہے
نہ کھلا، اور نہ کھل سکیگا یہ طلسم — پردۂ ساز میں صدا کیا ہے
معرفت میں خدا کی، اے محمود! — یاد رکھ قولِ پیشوا کیا ہے

شکایت ستمِ چرخِ کینہ جو کیا ہے — جو تجھ سا دوست ہو، پھر حاجتِ عدو کیا ہے
ہماری ہستی، یہ مانا کہ کچھ نہیں، نہ سہی — جو تو ہی تو ہے، تو پھر حکمِ جستجو کیا ہے

نہ نہاں ہے، نہ عیاں جلوۂ جاناں مجھ سے — ہے وہ ہر شان میں الآن کما کان مجھ سے

کرم میں جس کے ستم کی ادا نکلتی ہے — ستم میں دیکھیے بات اس کی کیا نکلتی ہے
چلے رقیب پہ خنجر ترا، مرے ہوتے — وفا میں بھی تری، قاتل! جفا نکلتی ہے

خون گھٹا اپنا، نہ جوشِ ستمِ یار گھٹا — کُند کیوں ہو کے دمِ خنجرِ خونخوار گھٹا
نطق میں ہے مرے، کیا فیضِ زبانِ منصور — دارِ مژگاں پہ انا الحق کا نہ اقرار گھٹا
یادِ گیسو میں جو دل اپنا اُمنڈ کر آیا — بن گئی آہ بھی اک رشکِ شبِ تار گھٹا

عین باراں میں جو ساقی نے دکھائیں آنکھیں ہوگئی مے کے پیاسوں کی ۶۰ادار گھٹا

داخلِ خلد ہوئے حضرتِ آدم، محمود!

پر شر و کینۂ ابلیس نہ زنہار گھٹا

[اکمل الاخبار، ۴: ۳۴: ۲۵ اگست ۱۸۶۹ء؛ دو آہنگ؛ ہماری زبان ہفتہ وار دلّی: ۲۲ نومبر و ۲۲ دسمبر ۱۹۶۴ء؛ دیباچۂ تحفۂ محمود؛ خطوط ڈاکٹر نجم الاسلام بنام مؤلف]

محمود ــــ حکیم مولوی محمد محمود الحق دہلوی

پرتاب گڑھ میں تحصیلدار تھے۔ ملازمت کے اختتام پر سرکارِ انگریزی سے پنشن پاتے رہے۔ عالم آدمی تھے اور طب میں بھی اچھی دستگاہ تھی ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵۔ ۱۸۸۶ء) میں زندہ تھے۔

بنا ہے گریہ مری چشمِ خونفشاں کے لیے کبھی بہار کو روئے، کبھی خزاں کے لیے

ہوئی ہے الفتِ دل، دُخترِ رز سے اے ساقی! شراب جانتے ہیں جاتے نہیں مُغاں کے لیے

فراقِ یار میں محمود کا وصال ہوا تو ہم بھی روئے بہت مرگِ نوجواں کے لیے

[یادگارِ ضیغم: ۳۰۴]

محوؔ ــــــ نواب غلام حسن خان دہلوی

نواب الٰہی بخش معروف کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی امراؤ بیگم غالب کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ چھوٹی صاحبزادی بنیادی بیگم کا نکاح نواب غلام حسین خان مسرور سے ہوا تھا، لیکن بد قسمتی سے ان میاں بیوی میں بنھ نہ سکی اور نا چاقی ہو گئی۔ چنانچہ ان سے علیٰحدگی کے بعد مسرور نے ایک عورت سنّی بیگم سے نکاح کر لیا۔ اس بیوی سے ان کے چار صاحبزادے ہوئے؛ غلام حسن خان محوؔ ان میں سب سے بڑے تھے۔ اس طرح گویا یہ زین العابدین خان عارفؔ کے علاتی بھائی تھے۔ انھیں سرکارِ انگریزی سے سو روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ محوؔ نے ذوقؔ اور غالبؔ دونوں سے استفادہ کیا۔ شطرنج کا بھی شوق تھا۔ یہ بھی اس سوسائٹی کے رکن تھے، " جو "جلسۂ شطرنج" کے نام سے نواب علاء الدین احمد خان نے ۱۸۶۶ء میں قائم کی تھی۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق ایک کتاب "نصرت نامۂ گورنمنٹ" کے نام سے لکھی تھی۔ اسی کا خلاصہ خواجہ حسن نظامی نے "غدر کا نتیجہ" کے عنوان سے چھاپا ہے۔ (انھوں نے غلطی سے اسے ان کے والد کے نام سے منسوب کر دیا ہے)

دل لگانے کا مزا دیکھ لیا آخرِ کار ــــ ہم نہ کہتے تھے کہ اے محوؔ! پشیماں ہوگا

قیدِ ہستی سے رہائی غیر ممکن تھی ہمیں ــــ آج دم دے کر اجل کو ہو گئے آزاد ہم

گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں، اب بام پہ وہ بھی ــــ اتنا تو ہوا ہے مرے نالوں کے اثر سے

اندازِ جنوں کون سا ہم میں نہیں، مجنوں! ــــ پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

[غدر کا نتیجہ: ۶-۷؛ بزمِ سخن: ۱۰۴؛ سخن شعرا: ۴۲۲-۴۲۳]

مدہوش ـــــ منشی سخاوت حسین انصاری بدایونی (خان بہادر)

نسباً انصاری تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ کے جن مسلمانوں نے حضرت رسول کریم صلعم کی نصرت اور حمایت کی تھی، وہ مہاجرینِ مکّہ کے مقابلے میں انصار کہلائے؛ مدہوش انھیں میں سے کسی خاندان کے نام لیوا تھے۔ ان کے بزرگوں میں سے کوئی صاحب خاندانِ غلامان کے دوسرے بادشاہ التتمش کے عہد میں ہندستان آئے اور بدایوں میں بس گئے۔

مدہوش کے دادا میاں جی عبدالملک انصاری مارہرہ کی درگاہِ برکاتیہ (سرکارِ کلاں) کے سجّادہ نشین شاہ آلِ احمد اچھے صاحب (ف: ۱۷ ربیع الاوّل ۱۲۳۵ھ/ ۳ جنوری ۱۸۲۰ء) کے مُرید اور خلیفہ تھے۔ ان کے زُہد و ورع اور مجاہدات کے پیشِ نظر پیر و مرشد نے انھیں سندِ خلافت عطا فرمائی تھی، جس پر تاریخ ۱۷ محرم ۱۲۱۵ھ (۱۰ جون ۱۸۰۰ء) ثبت ہے۔ میاں جی عبدالملک کا پیر کے دن ۱۲ رمضان ۱۲۵۸ھ (۱۷ اکتوبر ۱۸۴۲ء) بدایوں میں انتقال ہوا اور وہ قاضی حوض، جانبِ غربِ شہر کے قریب قبرستان میں دفن ہوئے۔ مدہوش مدّتوں ان کا عُرس کرتے رہے۔ ہر جمعہ کو ان کے مزار پر ختمِ قرآن ہوتا؛ مزار پر ایک حافظ مقرر تھا۔ یہ سارے اخراجات مدہوش کرتے۔ خدا معلوم۔ اب کیا حال ہے!

میاں جی عبدالملک کے تین بیٹے ہوئے۔ امان اللہ حسینی عرف خلیفہ تلّو؛ میاں امداد حسین؛ شیخ محمد عنایت حسین۔ منشی سخاوت حسین مدہوش انھیں چھوٹے صاحبزادے محمد عنایت حسین کے خلفِ ارشد تھے۔ مدہوش ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم حسبِ دستور ہوئی، اگرچہ اس کی تفصیل یا جن اساتذہ سے استفادہ کیا، اس سے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ انھوں نے ایک جگہ منشی عزیز الدین عزیز و صادق کے بڑے بھائی



منشی محمد سخاوت حسین انصاری مدہوشؔ بدایونی

حکیم محمد سعید الدین کا بحیثیت استاد ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان دیا، اور اس میں کامیاب ہو کر یہی پیشہ اختیار کیا۔ کام کا آغاز شاہجہاںپور کی عدالتِ ججی سے ہوا، جہاں کے حلقے میں اس زمانے میں ضلع بدایوں شامل تھا۔ شاہجہاںپور کے قیام کے زمانے میں انگریزی سے بھی اچھی واقفیت پیدا کر لی تھی۔

ان کی وکالت خوب چمکی۔ اس سے جہاں مال دنیا حاصل ہوا، وہیں ہمچشموں میں عزّت اور راج دربار میں وقار بھی ملا۔ حکومت نے خطاب "خان بہادر" سے نوازا۔ وہ غالباً بدایوں کے پہلے خان بہادر تھے۔ برسوں شاہجہاںپور میونسپل کمیٹی کے نائب صدر رہے۔ آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔

وہ سر سید اور ان کے مشن کے سرگرم مؤید تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (جو پہلے کانگریس کہلاتی تھی) کے بانیوں میں تھے۔ سر سید کی وفات کے بعد بھی وہ اس تحریک کے معاون رہے، اور دامے، درمے، قدمے اس کی ترقی اور فروغ کے لیے کام کرتے رہے۔

غالب کا ایک خط ان کے نام ملتا ہے۔ افسوس کہ ان کا منظوم کلام ضائع ہو گیا۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ "رقعاتِ مدہوش مسمّٰی بہ شراب الکوثر" کے عنوان سے ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا (مطبع افضل المطابع وسعید الاخبار، بدایوں - ۱۸۷۹) اس کا دوسرا ایڈیشن ان کے نواسوں نے ۱۹۶۳ء میں نظامی پریس بدایوں میں چھپوا کر شائع کیا۔ اس کے شروع میں مدہوش کے حالات بھی ہیں۔ ایک اور رسالہ بھی ملتا ہے جس میں "سررشتۂ تعلیم" کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد کے کتابخانے میں موجود ہے۔

مدہوش کا ۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا۔ وہ شاہجہاںپور سے بدایوں آ رہے تھے کہ عرض راہ میں آنولہ (ضلع بریلی) کے ریلوے اسٹیشن پر (بظاہر حرکتِ قلب بند ہو جانے سے) فوت ہو گئے۔ لاش بدایوں آئی، اور یہاں اپنے دادا کے قریب دفن ہوئے۔

مدہوش نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکا (شیخ میاں جان) پیدا ہوا تھا؛ اس کا مدہوش کی زندگی میں انتقال ہو گیا۔ دوسری بیوی سے ایک لڑکی (نیاز رسول) ہوئی؛ تیسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نیاز رسول کا نکاح فانی بدایونی کے چچازاد بھائی منشی عبدالحمید خان سے ہوا تھا۔ ان

کی اولاد میں چار بیٹے (حامد سعید خان لودی؛ عابد سعید خان فنا لودی؛ میجر زاہد سعید خان لودی۔ کرنیل لیاقت سعید خان) اور ایک بیٹی امتیاز رسول ہوئی۔ خاندان کے پس ماندگان ہندستان اور پاکستان میں مقیم ہیں۔

عابد سعید خان فنا نے اپنے کلام پر فانی سے اصلاح لی اور ان کی وفات (۱۹۴۱ء) کے بعد مجتہد الدین عیش بدایونی سے رجوع کیا؛ کچھ دن جعفر علی خان اثر لکھنوی سے بھی مشورہ رہا۔ دیوان "زنگار رنگ" چھپ چکا ہے (نظامی پریس، بدایوں۔ ۱۹۵۹ء)۔ ۳۰ نومبر ۱۹۷۲ء کو رحلت کی۔

[رقعاتِ مدہوش؛ غالب اور عصرِ غالب: ۱۴۶-۱۵۴؛ خاندانِ برکات: ۹-۱۰؛ تذکرۃ الواصلین: ۲۴۵؛ دید و دریافت: ۴۵-۴۸- نیز ۱۶۹-۱۷۲؛ ماہنامہ آجکل، دلی (فروری ۱۹۶۰): ۴۳-۴۴؛ مکتوبِ فنا لودی مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۶۰ء]

مشتاق ـــــ منشی بہاری لال دہلوی

خاندان کے کائستھ ماتھر تھے۔ والد کا نام رائے من بھاون لال تھا، جن کا فروری ۱۸۶۸ء میں انتقال ہوا۔ مشتاق ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی امین الدین (مؤلف قاطع القاطع) سے حاصل کی اور غالباً شاعری شروع کرنے کے بعد کچھ دن تک اُن سے مشورہ بھی کرتے رہے۔ فن خوشنویسی میں بھی مہارت تھی اور اس میں مرزا عباداللہ بیگ "زمرد رقم" و "اعجاز رقم" کے شاگرد تھے۔ حکیم محمود خان اور حکیم غلام رضا خان دونوں کی خدمت میں آنا جانا تھا۔ اسی واسطے سے غالب کے پاس پہنچے۔

حکیم محمود خان نے ایک اخبار ہفتہ وار "اکمل الاخبار" کے نام سے جاری کیا تھا۔ مشتاق اس میں کاتب اور ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۸۷۰ء میں یہاں سے علاحدہ ہوئے تو لالہ سری کرشن داس گڑوالے کے ہاں حساب کتاب رکھنے پر منشی مقرر ہو گئے۔ گڑوالے دلّی کا مشہور اور متموّل کاروباری خاندان تھا۔ ۷۲، ۷۳ برس کی عمر تھی، جب ستمبر ۱۹۰۸ء میں انتقال کیا۔

مشتاق کے نانا منشی گھنشام لال بھی اچھے شاعر تھے۔ عاصی تخلص تھا اور شاہ نصیر کے ممتاز شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، دہلی کائستھ اردو سبھا کی طرف سے ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اسی سبھا نے ۱۹۳۸ء میں مشتاق کے دیوان کا مختصر انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ مشتاق کے چھوٹے بھائی منشی گوری شنکر قصیر تھے، اور بیٹے منشی چندو لال شفق۔ مشہور اخبار نویس منشی رام رچھپال سنگھ شیدا، ان ہی مشتاق کے شاگرد تھے۔

مشتاق نے غالب کی وفات کے بعد حالی سے بھی اصلاح لی۔ اردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے۔



منشی بہاری لال مشتاق دہلوی

ہیں بیوفا کہ غیر! یہ چپکے سے کیا کہا — کھُل کر کہو، کہ تم نے کسے بیوفا کہا
سب جانتے ہیں ان کے اشاروں کو بزم میں — کہنے کی بات ہے کہ کوئی راز داں نہ تھا
اٹھے شوق میں یوں قدم تیز تیز — کہ رہبر کا میں رہنما ہو گیا
غیروں نے بیٹھنے نہ دیا، جب کہیں مجھے — میں انجمن میں، منتظمِ انجمن ہوا
تم ہو اپنی طرف کیے جاتے — ذکر کرتا ہوں میں زمانے کا
یہ کہنا اور یہ کہنا، یہ کہتے ہوئے ہم آپ — قاصد کے ساتھ ساتھ گئے، تا بکوئے دوست
مشتاق لاکھ ضبط کرو، رازِ عشق کو — چہرے سے ہے تمھارے عیاں جستجوئے دوست
مدعا گر یہ ہے، کچھ عشق کا اظہار نہیں — کیا کہوں تم سے، کہ کہنے میں دلِ زار نہیں
سب طرح سے تو وہ اچھے ہیں، پر اچھے کیا ہیں — اک یہی عیب ہے کیسا کہ وفادار نہیں
یاں یہ منظور، کہ مطلب کو زباں پر لائیں — واں ہے انگشت بلب پر کہ خبردار نہیں
سچ تو یہ ہے کہ، ہے مشتاق عدو سے اچھا — ورنہ بندہ تو کسی کا بھی طرفدار نہیں
تو ساتھ ہو ہمارے، تو دوزخ بہشت ہے — گر تو نہیں، تو خلد جہنّم سے کم نہیں
ساتھ مشتاق کے چلتے ہو، رفیقو! لیکن — دشتِ وحشت میں کہنا، کہیں منزل آئے
تم اپنی تیزیِ رفتار دیکھو — نہ پوچھو کچھ مری عمرِ رواں کی
وہ میرے رازِ دل کو جانتے ہیں — نہیں مشتاق! کچھ حاجت بیاں کی

فارسی کا نمونہ یہ ہے:

رموزِ عشق و اسرارِ مے و معشوق پُرس از من — حدیثِ زہد و تقویٰ را نمی دانم، نمی دانم
غم مخور از حشر، پیش از مرگ واویلا چرا — بر امیدِ بخششِ حق، شاد باید زیستن
بدیں امید خود را خاک کردم — کہ خاکم گردِ صحرائے تو باشد

[دیباچۂ دیوانِ مشتاق؛ صحیفۂ خوشنویساں: ۹۵، ۱۲۲؛
تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود: ۱۲۱]

مظہر ـــــ حاجی محمد اسحاق عرف مظہر الحق دہلوی

ہریانہ کے رہنے والے اور مولوی محمد ظہور علی ظہور کے چھوٹے بیٹے تھے۔ سلسلۂ نسب والد کی طرف سے محمد بن ابوبکر صدیق خلیفۂ اول سے اور والدہ کی جانب سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ ان کی والدہ مولوی فضل علی کی دختر نیک اختر تھیں، جو حضرت شیر محمد قادری برہانپوری کے اخلاف میں سے تھے۔

ان کے جدِ امجد شیخ کریم الدین سب سے پہلے بخارا سے ہندستان آئے۔ وہ چند دن روہتک میں قیام کے بعد پہلے جھجر میں اور بالآخر دادری میں ساکن ہو گئے۔ ظہور خود شاہ نصیر دہلوی اور احسان اور مومن کے شاگرد تھے۔ غالب نے مظہر کے تذکرۂ شعرائے فارسی پر جو تقریظ قلمبند کی تھی، اس میں ان کی علمی استعداد اور قلمی خدمات کا اعتراف کیا ہے؛ لکھتے ہیں:

> بمقتضائے فحوائے اَلوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیہِ مولانا محمد ظہور علی صاحب زاد مجدہ آں کہ بر نثر ہائے پیشینیاں چناں حاشیہ ہائے خرد افزا نوشت کہ ہر ماتن در کنجِ لحد آفریں گوے اوست۔ شرح نگاری ایں چنیں ہمہ داں را سزد، نہ آں خیال راز چنار شناساں را کہ چوں خواہند، در شرحِ کلام سلف، کوسِ شہرت زنند۔ پنج رقعہ وزنار بازار ارادت خان واضح را تراوید رگ بر دیں نگارو برن بار مولانا نور الدین ظہوری وانمایند

ظہور علی کے والد فتح علی خان (۱۱۶۵ - ۱۲۴۴ھ) تھے خود ظہور کا نام تاریخی ہے جس سے سالِ ولادت ۱۲۲۱ھ نکلتا ہے۔ ان کا مطبوعہ دیوان موجود ہے بہادر شاہ ظفر نے انھیں خطاب "شمس الشعرا" عطا کیا تھا۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ مفتی صدر الدین آزردہ کی مشہور تاریخِ وفات انھیں کی کہی ہوئی ہے۔ ان کی ۱۲۸۶ھ میں وفات ہوئی؛ "غفور" مادۂ تاریخ ہے۔

مظہر ان ظہور کے منجھلے بیٹے تھے۔ یہ دلّی میں ڈپٹی کلکٹر ریٹی گن صاحب کے منشی تھے۔ معلوم نہیں کیسے ریٹی گن صاحب کو شعرائے ہند کا تذکرہ انگریزی زبان میں لکھنے کی سوجھی۔ وہ غالب کو جانتے تھے کیونکہ انھیں ہر مہینے اپنی خاندانی پنشن وصول کرنے کے لیے ان سے بحیثیت مہتمم خزانہ ملنا ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر انھوں نے تذکرہ مرتّب کرنے میں غالب سے مدد چاہی؛ اور مظہر کو ان سے مواد حاصل کرنے پر تعینات کر دیا۔ غالب نے نیز رخشاں سے لے کر سات کتابیں (غالباً حالاتِ شعرا پر مشتمل) ان کے پاس بھیج دیں اور پھر خود ان کی فرمایش پر ۱۶ اشعرا کے حالات، نام، تخلص، تلمذ وغیرہ لکھ کر بھیج دیے۔ غالب نے اپنے حالات بھی تفصیل سے ایک جگہ لکھے ہیں؛ یہ ان کے اپنے خط میں چھپ چکے ہیں؛ گمان غالب ہے کہ یہ حالات بھی انھوں نے اسی تذکرے کے لیے قلمبند کیے تھے۔

ریٹی گن نے غالباً یہ کتاب اشاعت کی خاطر ولایت بھیج دی تھی، لیکن اس کا مطبوعہ نسخہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بہرحال ان کے بعد مظہر الحق نے اپنے طور پر اس تذکرے کا کام جاری رکھا اور اس طرح کوئی ۱۲۰۰ شاعروں کے حالات جمع کر دیے تھے اور اس کے لیے غالب سے ایک تقریظ بھی لکھوائی تھی جو ان کی کلیاتِ نثرِ فارسی میں شامل ہے۔ لیکن یہ تذکرہ غالباً طبع نہیں ہوا، اور اس کا مسودہ بھی خدا معلوم کیا ہوا!

بشیر نے لکھا ہے کہ مظہر صاحبِ دیوان بھی تھے۔ ان کا دیوان کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ انھوں نے کلام پر اصلاح اپنے والد اور غالب سے لی۔

مظہر آخیر میں نواب پاٹودی کے ہاں اتالیق ہو کر چلے گئے تھے؛ اسی زمانے میں وہاں تحصیلدار بھی رہے۔ افسوس کہ کلام نہیں ملا۔

[تذکرۂ بشیر، مشمولہ رسالہ اردو، کراچی ۱۹۵۴: ۱: ۲۴۳؛ قومی زبان (ماہنامہ، کراچی) فروری ۱۹۸۳: ۱۲ - ۱۳؛ معاصر (۱): ۱۶۰؛ معاصر (۲): ۴؛ احوالِ غالب: ۲۴ - ۲۷؛ کلیاتِ نثرِ غالب (طبع اول): ۸۴؛ اردوئے معلیٰ: ۷۲ - ۷۳]

---

۵ ریٹی گن صاحب (Rattigan) بعد کو پنجاب کے اضلاع میں ڈپٹی کمشنر اور ہائی کورٹ میں رہے۔ بڑے دبدبے اور طنطنے کے آدمی تھے۔ اگر کوئی شخص بارعب اور صاحبِ حیثیت (اور کسی حد تک نک چڑھا بھی) ہو، تو کسی زمانے میں ایسے آدمی کو پنجاب میں "راٹی کین" کہا کرتے تھے (شاید اب بھی کہا کرتے ہیں)، یہ لفظ "ریٹی گن" ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ پنجاب ہائی کورٹ کی ججی کے زمانے میں اس کے اختیار و وقار اور فیصلوں نے اس لفظ کو جنم دیا تھا۔

معجزؔ — منشی آغا علی سہسوانی

حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کی کہی ہوئی مندرجہ ذیل تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں وفات پائی۔

رفت چوں آغا علی از دارِ فانی یک بیک — زد رقم تسلیم محزوں بہر سالِ ماتمش
طبع بتیابی گرفت و نالہ را بگزید دل — "دستِ افسوس" آشنا شد بر بسرِ اندر غمش
(۸۱ + ۴۲۵ + ۸۶ + ۳۴ + ۴۶۴ + ۲۰۷ = ۱۲۹۷)

[تاریخ سہسوان، از سید اعجاز احمد معجز سہسوانی؛ بحوالۂ دو ماہی اکادمی، لکھنؤ، ۱۰۰: ۴۸]

مغلوبؔ — سید افتخار الدین رامپوری

سید کفایت اللہ کے بیٹے تھے ۱۲۸۱ھ (۶۵-۱۸۶۴ء) میں عین جوانی میں صرف ۲۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔

غالبؔ کے علاوہ میر احمد علی رساؔ سے بھی اصلاح لی تھی۔

کوئے نازکا مغلوبؔ ہے بسمل، قاتل! — جس کی ہچکی میں بھی آواز ہے قاتل قاتل
ایک مغلوب کا جھگڑا تھا، سو وہ مر ہی گیا — جس سے جی چاہے ترا اس سے تو اب مل قاتل
کس کے عارض کا تصور، دلِ ناداں ہے تجھے — آئینہ کس نے دکھایا ہے کہ حیرانی ہے
تم اگر ایک ہو صورت میں، تو وہ الفت میں — تم جو یکتا ہو، تو مغلوبؔ بھی لاثانی ہے

[انتخاب یادگار: ۳۴۵-۳۴۶]

---

۵ میر احمد علی رساؔ، جناب سید امام الدین رامپوری کے صاحبزادے تھے۔ بزرگوں کا وطن نجارا تھا، جہاں سے ان کے پردادا سید محمود علی ہندستان آئے۔ سلسلۂ نسب امام علی نقی سے ملتا ہے۔ نواب کلب علی خان کے عہد میں ریاست سے تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ تاریخ میں اچھی مہارت تھی۔ نہایت وارستہ مزاج اور شوقین طبع شخص تھے۔ کلام ترشیخ علی بخش بیمارؔ سے اصلاح لی، لیکن اپنی آزاد طبعی کے اقتضا سے دیوان مرتب نہیں کیا۔ پنجشنبہ ۶ محرم ۱۳۰۹ھ (۱۲ اگست ۱۸۹۱ء) تقریباً ۷۵ برس کی عمر میں عالمِ فانی سے کوچ کیا۔ رام پور میں حضرت جمال اللہ صاحب کے مزار کے باہر دفن ہیں۔ ان کے بیٹے سید محمد عابد حسین اوجؔ تخلص کرتے تھے۔ [انتخاب یادگار: ۱۴۶؛ مسدس بےنظیر: ۴۹-۵۲؛ دبدبۂ سکندری،
[illegible]

مفتون — پنڈت لچھمی نرائن مشران فرخ آبادی

پنڈت گوردھن داس مشران کے صاحبزادے اور فرخ آباد کے رُوسا میں سے تھے۔ ان کے بزرگ کشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے اور طوائف الملوکی کے زمانے میں وہاں سے نقل مکان کرکے ہندستان چلے آئے اور فرخ آباد میں سکونت اختیار کرلی۔ پنڈت گوردھن داس کلکٹری میں سررشتہ دارِ مال تھے۔ انھوں نے اپنی فرض شناسی اور حسن کارکردگی سے بہت نیکنامی حاصل کی۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد تجارت کرنے لگے؛ اس میں بھی بہت کامیاب رہے۔ بہادر شاہ کی طرف سے انھیں "انتظام الدولہ، ممتاز الملک مہاراجا گوردھن داس بہادر دیوانِ اعلیٰ" خطاب ملا تھا۔ چندے نواب تجمل حسین خان والیِ فرخ آباد کی سرکار میں مدار المہامی کے فرائض انجام دیے۔ یہ وہی تجمل حسین خان ہیں جن سے متعلق غالب کا شعر ہے:

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے ۔۔۔ بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

نواب تجمل حسین خان کے جانشین تفضل حسین خان بھی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے معتوب ہوئے تھے۔ انھوں نے دیارِ حجاز میں پناہ لی اور وہیں بہت عسرت کی حالت میں وفات پائی۔ ریاست انگریزوں نے ضبط کرلی۔

مفتون بھی اپنے والد کی طرح انگریزی حکام کے حلقے میں بہت معزز اور صاحبِ اثر تھے۔ اپنے زمانے میں فرخ آباد کے میونسپل کمشنر رہے۔ آنریری مجسٹریٹ کے اختیارات بھی حاصل تھے، ۱۸۷۷ء کے دربارِ دہلی میں سندِ خوشنودی عطا ہوئی تھی۔ ۶۶ برس کی عمر تھی، جب یکم نومبر ۱۸۸۷ء کو وفات ہوئی۔

مفتون کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ فارسی پر فاضلانہ نظر تھی۔ خوشنویسی اور خطِ نستعلیق میں مشہورِ زمانہ استاد میر علی بخش حسینی کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے اور غالب سے اصلاح لیتے تھے۔

ان کے صاحبزادے پنڈت شام نرائن مشران مدتوں ریاستِ بڑوانی میں تحصیلدار رہے۔ اُردو، فارسی، انگریزی کی اعلیٰ قابلیت کے علاوہ عربی اور سنسکرت میں بھی دخل تھا۔ شاعری ورثہ میں پائی؛ یکتا تخلص تھا؛ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے اور اپنے والد ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ اِن کا ۶۲ برس کی عمر میں ۲۸ اگست ۱۹۰۴ء کو انتقال ہوا۔

کلامِ مفتوں کا مختصر انتخاب یہ ہے:

لگا ہے زخمِ کاری خنجرِ ابروئے قاتل کا — تماشا خانۂ دل میں ہے رقصِ مرغِ بسمل کا
نہ سمجھو بے سبب پُر داغ ہونا ماہِ کامل کا — سفیدی پر نشاں ہوتا ہے دودِ شمعِ محفل کا
چُبھے ہیں نیشِ غم ازبس غمِ خوبانِ عالم میں — شالِ خانۂ زنبور ہے نقشہ مرے دل کا
دل افسردہ ہوا بیمہری خوباں سے اے مفتوں — نہ ہو باور، تو ہے اللہ واقف حق و باطل کا

کیا کیا نہ آئیں دل میں مرے بدگمانیاں — شب دیکھ کر کھلے ہوئے بندِ قبائے دوست
بدخواہ اپنا کون ہے، ہمدم! سوائے دل — دشمن ہمارا کون ہے مفتوں سوائے دوست

عمر گزری کہ تری راہ میں ہم بیٹھے ہیں — پر ابھی شوق یہ کہتا ہے کہ کم بیٹھے ہیں
واہ قسمت! کہ لبِ بحر پہ ہم مثلِ حباب — خالی کاسہ لیے بادیدۂ نم بیٹھے ہیں
کیونکہ بیت الصنمِ عشق سے اُٹھیں مفتوں! — اب تو اللہ کی ہم کھا کے قسم بیٹھے ہیں

سامری آخر اسیرِ دامِ الفت ہو گیا — چشمِ فتاں میں تری جادو کا سرمہ دیکھ کر

یک نفس گر بگذرد، موجِ شمیمِ زلفِ تو — خانۂ عطار گردد رخنۂ دیوارِ ما
دشت از یادِ رخِ پُر نور روشن کردہ ایم — مشعلِ طور است خارِ وادیِ پُرخارِ ما

از نویدِ وصل تا بر خویشتن بالیدہ ام — مثلِ چشمِ اغنیا تنگ است پیراہن مرا

مومن! بیا ببیں، کہ دل افروزِ قدسیاں — چوں شمعِ کعبہ است، چراغِ کنشتِ ما

روئے اُو ہر کہ دیدہ می آید — پیرہن را دریدہ می آید
دستِ من کے رسد بدامانش — اُو کہ دامن کشیدہ می آید
چہ خوشا قسمتم کہ قاتلِ من — پے قتلم دویدہ می آید
بتِ بے رحم بر سرِ مفتوں — تیغ بَرد کشیدہ می آید

جاں نثارش کنم اینک از الم، اے مفتوں! — کارِ امروز چرا باز بفردا افگنم

[بہارِ گلشنِ کشمیر، ۲: ۴۰۳ - ۴۰۸؛ ایضاً: ۱۱۷ - ۳۰۷]

مقصود — مولوی مقصود عالم رضوی پہانوی

خاندانِ سادات میں سے تھے۔ ان کے والد مولوی سید صدر عالم بھی شاعر تھے؛ مسرور تخلص تھا اور لکھنؤ کے مضافات میں قصبہ پہانی کے رہنے والے تھے۔ یہ وہی پہانی ہے جہاں کے میراں صدر جہان تھے، جو اکبر بادشاہ کے عہد میں اول ممالک محروسہ کے منصب افتا پر اور بعد کو عہدۂ صدارت پر مقرر ہوئے۔ جہانگیر نے ایامِ شاہزادگی میں ان سے چہل حدیث کا درس لیا تھا۔

مقصود نے فارسی میں اپنے والدِ بزرگوار سے اور اردو میں نواب عاشور علی خان بہادر لکھنوی سے مشقِ سخن کی۔ سنِ کہولت میں غالب کی خدمت میں اصلاح کی درخواست لے کر دلّی پہنچے۔ غالب نے انھیں "شمس الشعرا" خطاب دیا اور ان کا کلام بنظرِ اصلاح دیکھا۔ پچاس برس کی عمر میں وفات پائی۔

معلوم ہوتا ہے کہ علمی اور ادبی نوک جھونک سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں لکھنؤ میں یہ بحث چھڑی تھی کہ لفظ ابتشار (بشارت سے افتعال کا وزن) درست ہے یا نہیں؟ اس میں بہت لوگوں نے حصّہ لیا۔ ایک استفتا تیار کر کے مجتہد العلما سید محمد صاحب، مفتی میر عباس، غالب، دبیر کے پاس بھیجا گیا تھا۔ یہ سارا مجموعہ معارضۃ النثر (مرتبہ مقبول عالم مقبول) کے نام سے ۱۸۶۱ء (۱۲۷۸ھ) میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس علمی مباحثے میں مقصود سب سے پیش پیش تھے۔ غالب کے بعض خطوط بھی مقصود کے نام اس مجموعے میں شامل ہیں۔

مثنوی شکرستانِ معنی، سکندر نامہ، مقصود الصنائع وغیرہ پچاس کے قریب کتابیں لکھیں۔ بقولِ نادر "صاحبِ دواوین، ہندی و فارسی و مثنویات و انشا و عروض و شرح و دیگر تصانیف کثیرہ تھے۔ ان کے صاحبزادے سید خورشید عالم بھی شاعر تھے؛ خورشید اور عنبری دو تخلص کرتے اور

انھیں سے اصلاح لیتے تھے۔

مقصود، اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

مطلب نہ روم سے ہے، نہ کچھ شام سے غرض
ہے کام رخ سے، زلف سیہ فام سے غرض
وہ ساقی ازل نے پلائی ہمیں شراب
آغاز سے غرض ہے، نہ انجام سے غرض
کہنے سے دوستوں کے فقط یہ کہی غزل
مقصود! کچھ نہیں ہے، ہمیں نام سے غرض

بیجا نہیں ہے زلف کا ابرو سے ارتباط
اکثر رہا ہے سانپ کا بچھو سے ارتباط
مقصود! کھینچی ہے مجھے زلف کی شبیہ
رکھتا ہوں اس لیے قلم مو سے ارتباط

نہ کیوں ہو محو رخ رشک بوستاں محظوظ
گلوں کو دیکھ کے ہوتا ہے باغباں محظوظ
خرام ناز کی چالیں ہیں رشک باد بہار
برنگ شاہد گلشن ہیں باغباں محظوظ

آئے بالیں پر اگر وہ یار جانی وقت نزع
پھر نئے سر سے ہو میری زندگانی وقت نزع
زندگی تک ہے ہر اک فرد بشر کو افتخار
قیصر و فغفور بھولے لن ترانی وقت نزع

وہ ماہ جو بام پہ اپنے کبھی جلائے چراغ
تو شمع طور سے بڑھ کر فروغ پائے چراغ
مثال شمع سحر تک وہ جل بجھے، مقصود!
جو اون کے رخ سے مری طرح لو لگائے چراغ

لے چلی تھی الفت احباب محفل کی طرف
کھینچ لائی آرزوئے قتل، قاتل کی طرف
بہ گئی طوفان دریائے فنا میں، اے اجل!
کشتی عمر رواں آئی نہ ساحل کی طرف

شب کو جو مرے خواب میں بھی آتے ہیں معشوق
دیدار دکھاتے ہوئے شرماتے ہیں معشوق
رفتار سے، قامت سے، اشارے سے، نگہ سے
انداز قیامت کے دکھا جاتے ہیں معشوق
عشرت کدۂ جشن بنا ہے دل مقصود
مضمون کے ہر روز نئے آتے ہیں معشوق

سرو و شمشاد سے ہے وہ قد آزاد الگ
جیسے مضموں کسی شاعر کا خداداد الگ
دوست وہ ہے کہ رہے دوست کا مشکل میں شریک
مجھ سے فرقت میں نہ ہوا اے دل ناشاد الگ
کشور ہند میں مقصود! ہر اک شاعر سے
میرے استاد میں ہیں وصف خداداد الگ

ملائے خاک بھلا، آنکھ آدمی تم سے
خفیف ہو رہے تم سے، خجل پری تم سے
یہ کیا ستم ہے، زمانہ بنا ہے دشمن جاں
غضب میں جان پڑی، کی جو دوستی تم سے
ہنسی کی بات پہ تم، اس قدر بگڑتے ہو
تو جاؤ، آج سے موقوف ہے ہنسی تم سے

خارِ بیابانِ جنوں، خاکِ دیارِ بیکسی
گاہے زپا، گاہے زسر آں ہم گذشت ایں ہم گذشت

گاہے بہار از گلستاں، گاہے خزاں از بوستاں
ہمرنگِ آہِ بے اثر، آں ہم گذشت، ایں ہم گذشت

مقصود آں قیسِ حزیں، ویں قلبِ وحشت آفریں
در دشت بے خوف و خطر آں ہم گذشت، ایں ہم گذشت

غالب کی وفات پر دو قطعاتِ تاریخ کہے تھے:

از انتقال حضرتِ غالب مپرس حال
غمناک از الم دلِ قُدسی مطالب است

اے فکر! سپہرِ چرخِ چہارم متقدم ست
ہر سانحہ نگار پئے سال طالب است

مقصود از ندا از نجفِ عیسیٰ سر دشش
"صد سال مژدہ با اسد اللہ غالب است"

(۱۸۶۹)

دوسرے قطعے کے آخری تین شعر ہیں:

عَلَم در ہند نامش بود اوستادِ شہِ دہلی
فدائے اہلِ بیت و عاشقِ محبوبِ سبحانی

دوشنبہ روز و تاریخ دوم بودہ زذی القعدہ
زوالے بر زوال آمد زمرگِ خسروِ ثانی

بود محشور، یارب! باعلی روزِ جزا مصلح
بہجری از سرِ ایماں نشانِ رحلتش خوانی

(۱۲۸۵)

[سخن شعرا: ۴۸۴؛ خمخانۂ جاوید ۳: ۸۲؛ ایضاً ۵: ۵۷۳؛ صبح گلشن: ۴۴۰-۴۴۱؛ تذکرۂ نادر: ۱۵۰؛ گلدستۂ شعرا، لکھنؤ جلد ۱، شمارہ ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵]

منصور — حافظ مصلح الدین اکبر آبادی

ان کے والد آگرہ کمشنری میں محرّر تھے۔ مولوی رحیم الدین وکیلِ صدر دیوانی ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ منصور نے ۱۳۰۰ھ کے لگ بھگ انتقال کیا۔

اردو، فارسی دونوں میں شوق فرماتے تھے۔ اردو کلام پر اصلاح غالب سے لی، اور فارسی میں محمد امین احسن بلگرامی سے استفادہ کیا۔

منصور کیوں نہ بہکے، ذرا غور کیجیے! ٹھرّے کے پینے والے کو دے دی کڑی شراب

دار پر کھنچ کے بھی منصور کی عادت نہ گئی اب رگِ جاں سے بھی آوازِ انا آتی ہے

مرہمِ زنگار را در باغِ زخم سبزۂ بیگانہ می دانیم ما

[نہالستانِ نثار: ۲۰؛ روزِ روشن: ۶۵۶]

---

۵ مولوی محمد احسن احسن خلف محمد احمد بلگرامی، سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے ۱۲۴۴ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے، لیکن صفی پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ابتدائی تعلیم ۱۸ برس تک اپنے والدِ ماجد سے پائی اور تکمیل لکھنؤ میں کی۔ اردو فارسی نظم و نثر میں دستگاہِ کامل تھی اور ان میں علی الترتیب مولوی احسان اللہ ممتاز اناّمی اور گل محمد خان ناطق مکرانی سے اصلاح لی۔ پہلے نواب مختار الملک مدار المہام حیدر آباد کی سرکار سے وابستہ تھے، پھر بھوپال آ کے نواب صدیق حسن خان بہادر کے صاحبزادوں کی تعلیم پر مقرر ہوئے کبھی کبھی اردو میں بھی کہتے رہے، لیکن زیادہ مزاولت فارسی سے تھی (صبحِ گلشن: ۱۵-۱۶)

مونس —— پنڈت شیو جی رام دہلوی

ان کا مختصر دیوان گیان پریس دہلی سے ۱۸۸۱ء میں چھپا تھا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ جابجا غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ابتلا کے زمانے میں استاد کے ہمدرد اور جلیس رہے؛ غالب نے دستنبو میں ان کا شکریہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ہے سبب کچھ تو! پر نہیں معلوم —— کیوں ہے دل آج بیقرار اپنا
شعر کہنا سخت مشکل ہے، مگر غالب گواہ —— مونس ہے شاگرد، استادِ زماں مغفور کا!
مونس! نہیں سنا ہے، کسی کا کسی طرح —— حاصل بتوں سے دل کا کبھی مدعا ہوا
تیرے مرنے کی خبر سن کر وہ مونس! غیر سے —— کہتے ہیں، "اچھا ہوا، وہ مرگیا خانہ خراب"
یار سے ملنے کی مری کوئی تدبیر نہیں —— کیا چلے پیش وہ تدبیر، جو تقدیر نہیں
کافی نگاہِ لطف تری ہے، اگر رہے —— تو مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں
کس طرح دل کو غم و رنج سے آزاد کریں —— نہ رہی بات وہ جس بات پہ دل شاد کریں
ہم کہیں، تم نہ سنو! تم کہو، ہم دل سے سنیں —— جز تمھارے، کہو، کس شخص سے فریاد کریں
جلوہ دکھا رہے ہیں وہ بیٹھے نقاب میں —— معنی میں ظاہر ہیں وہ، بصورت حجاب میں
ہو گیا عشق میں یہ حال ہمیں —— آپ اپنا نہیں خیال ہمیں
کیا بات ہے کہ دیکھ کے دیدارِ یار کو —— رہتی نہیں ہے تاب دلِ بیقرار کو
تھیں تو سچ ناصح کی باتیں، پر وہ جوشِ عشق میں —— خوش نہ آئی ایک بھی اس نے جو سمجھائی مجھے
ہمنشیں! حالِ شبِ فرقت نہ پوچھ —— دل پہ جو گذری، گذر کر رہ گئی
ناصحا! کہہ نہ بار بار مجھے —— اس سے الفت ہے بیشمار مجھے

[بہارِ سخن: ۳۴۴ - ۳۴۵]

میکش ـــــ میر احمد حسین دہلوی

میر کرار حسین کے خلفِ رشید (روزِ روشن: کرامت حسین۔ غلط) دلّی کے سیّد زادوں میں سے تھے۔ سلسلۂ خاندان نواب شائستہ خان سے ملتا ہے۔ فارسی، عربی کی استعداد اچھی تھی۔ عربی میں اخون فیض احمد کے شاگرد تھے، جو جامع مسجد دہلی میں تعلیم دیتے تھے، شاعری میں پہلے صہبائی سے اور بعد کو غالب سے مشورہ رہا۔ چندے صدر امین اوّل دلّی کی کچہری میں عہدۂ وکالت پر کام کیا۔ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶-۱۸۲۷ء) میں پیدا ہوئے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں بعمر ۳۱ سال ایک گورے کی گولی کا شکار ہوئے۔ غالب کی مشہور تصنیف "پنج آہنگ" کا میکش کا ۱۲۵۱ھ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور، کے ذخیرۂ شیرانی میں موجود ہے۔ منشی جواہر سنگھ جوہر کے ترجمے میں غالب کی حسبِ ذیل رباعی میں میکش سے یہی مراد ہیں:

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم ۔۔۔ شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم

در میکدہ پیریم، کہ میکش از ماست ۔۔۔ در معرکہ تیغیم، کہ جوہر داریم

میکش زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

گفتمش دی: بار کہ می رفتی خراماں سوے باغ ۔۔۔ گفت: "میکش بودہ باشد، کاں گرفتارِ من ست"

ـــــــ

اے آں کہ در شب ہاے غم اندر دلِ من بگذری ۔۔۔ خون ست ایں جا موج زن، دامن نگہ دار از تری

از ہر دو جانب موے تو، آویختہ بر روے تو ۔۔۔ اے بستۂ گیسوے تو ہم زہرہ و ہم مشتری

بر اوجِ شوقت نارسا، پروازِ عالی فطرتی ۔۔۔ در ملکِ عشقت ناروا، پروانۂ نیک اختری

یادِ خرامِ نازِ تو، واں خوبیِ اندازِ تو ۔۔۔ در کلبۂ من بوریا گستردہ از بالِ پری

کبکِ دری در رہروی، ناکردہ با تو ہمسری ۔۔۔ سروِ سہی در راستی، ناختہ با تو ہمسری

[گلستانِ سخن: ۴۴۳؛ نگارستانِ سخن ۱۱۴؛ روزِ روشن: ۶۶۸-۶۶۹؛ طبقات الشعراے ہند: ۴۰۸، ۴۰۹؛ آردوے معلیٰ: ۱۶۸؛ فہرست مخطوطات شیرانی، ۲: ۲۵۱]

میکش و محوی ـــــــ ارشاد احمد دہلوی

شیخ عبدالقادر (میر قادر علی ۔ آثار الشعرا) ساکن قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر (من مضافات دہلی) کے صاحبزادے تھے لیکن میکش کی ساری عمر دلی میں گزری ۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کا شوق تھا ۔ اُردو میں میکش اور فارسی میں محوی تخلص کرتے تھے ۔ غالب کے علاوہ صہبائی سے بھی مشورہ کرتے رہے ۔ آخر عمر میں بھوپال چلے گئے تھے اور وہاں نواب نظیر الدولہ سلطان دولہ میاں احمد علی خان بہادر (علیا حضرت نواب سلطان جہان بیگم کے شوہر) کی ملازمت اختیار کر لی تھی ۔

ربطِ نہانِ غیر کا پردہ ہے ورنہ آپ ـــــــ دشمن کے ساتھ صرفہ کریں، رسم وراہ میں
ستانے میں فلک کو مشورہ ہے ـــــــ کسی بیرحم کی چینِ جبیں سے
سرشکِ گرم کی حدّت کو پوچھو ـــــــ مرے دامن سے، اپنی آستیں سے
سچ سہی فتنے سب قیامت کے ـــــــ لیکن آگے تمھارے قامت کے!

فارسی کے چند شعر بھی ملاحظہ ہوں :

بازلفِ درازِ اُو، در آویختنت ـــــــ یارب! چہ بلاست، ایں دلِ ما
بارحمتت، گناہ نکردن، گناہِ من ـــــــ دستوریِ گناہ ندادن، گناہ کیست!
واعظ! زبانِ خویش نداری نگاہ، ہاں ـــــــ انصاف می دہی، کہ بدارم نگاہِ دل
کہ کردہ است براحوالِ غیر رحم، بگو ـــــــ گرفتم ایں کہ تو سرگرِ ستم شعار نہٗ
باش، مطرب! زسرودن، کہ کشودن نتواں ـــــــ غنچۂ خاطرِ افسردہ، بزورِ نفسے

[صبح گلشن : ۳۸۸ ؛ آثار الشعرا : ۲۱۰ ؛ طور کلیم : ۱۰۷-۱۰۸]

میناؔ ـــــ مولانا احمد حسین مرزاپوری

ہوسکتا ہے کہ یہ اور تمناؔ مرزاپوری (جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ایک ہی شخص ہوں یعنی میناؔ اور تمناؔ میں تصحیف ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایک ہی نام کے دو الگ الگ شخص ہوں۔ صفدر مرزاپوری کے مرتبہ "مرقعِ ادب" میں یہ دو شعر نظر پڑے:-

اداے یوسفی ہے لوٹ قاتل کے لڑکپن پر — سوادِ دیدۂ یعقوب کے دھبے ہیں دامن پر
نزاکت اُن کی وقتِ قتل، مقتل میں یہ کہتی ہے — یہ اتنے خونِ ناحق جس سے اٹھیں اس کی گردن پر

[مرقعِ ادب ۲: ۱۹ - ۲۰]

نادمؔ ـــــ فخر الدین رام پوری

اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شوق کرتے تھے۔ اخبار الصنادید میں ان کی مندرجۂ ذیل تاریخیں نظر سے گزریں۔ نواب حامد علی خاں بہادر مرحوم والیِ رام پور کے صاحبزادے حسن علی خاں کی تاریخِ ولادت ہے:

طلوعِ اخترِ اقبال گردید — بہ برجِ خسروِ جمشیدِ دوراں
فلک شد انجمن آرائے انجم — بہ چرخِ سومیں ناہید رقصاں
عطارد، مشتری را مژدہ بخشید — "بہ برجِ مہر بیں شد ماہِ تاباں"

قلعہ رام پور کی تاریخِ تعمیر کہی:

قلعہ جو بنایا ہے سرکار نے — کہ ہر وقت جس میں برستا ہے نور
لکھی اس کی تاریخ نادمؔ نے یوں — "بنا خوب [جب] قلعۂ رام پور"
۱۳۳۰ھ

[اخبار الصنادید، ۲: ۳۸۰، ۴۵۶، ۴۵۷]

ناصر — سید ناصر الدین حیدر خان عرف یوسف مرزا لکھنوی

نواب حسام الدین حیدر خان کے نواسے اور ناظر حسین مرزا کے بھانجے تھے : ناظر حسین مرزا سے بڑی ایک بہن قدسیہ بیگم عرف حسینی صاحبہ تھیں۔ یہ سید محمد نصیر عرف نواب جان سے بیاہی گئیں (غالب نے مجروح کے نام ایک خط میں غلطی سے ان کا نام نصیر خان لکھا ہے)۔ یہ بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہوئے تھے۔ ۱۸۵۹ء میں باندہ سے گرفتار ہو کر لکھنؤ لائے گئے۔ پہلے حبسِ دوام کی سزا ملی، جو بعد کو پھانسی میں تبدیل ہو گئی (۱۸۶۰ء) یوسف مرزا انھیں کے بیٹے تھے۔

یوسف مرزا بھی ۱۸۵۷ء کے بعد بہت دن تک پریشان حال پھرتے رہے۔ آخر الور میں پناہ ملی۔ یہ مہاراجا کے مزاج میں بہت دخیل ہو گئے تھے اور وہ ان سے بہت خوش تھے پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر تھا اور اس کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ لازماً الور ہی میں رہیں۔ البتہ یہ شرط ضرور تھی کہ اگر باہر رہیں تو سال میں دو ایک مرتبہ ضرور یہاں آئیں۔ طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ ایک لطیفہ سنیے۔

ان کے ایک چچا کا نام سید محمد رضا تھا۔ ان کے ایک دوست نواب محمد رضی خان تھے۔ یوسف مرزا نے رضی کی ی کو یائے تانیث قرار دیا اور چونکہ سید محمد رضا ان کے چچا تھے، اس لیے نواب محمد رضی خان کو چچی کہنے لگے۔ غریب نواب تمام لکھنؤ میں "محمد رضی خان" چچی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲-۱۸۸۳ء) میں وفات پائی۔ نور باڑی لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ میر مہدی مجروح کی لکھی ہوئی تاریخ وفات کا آخری شعر ہے :

چنیں گفت رضواں سنِ وفات "بیا سیدم در بہشتِ بریں"
(۱۳۰۰ھ)

افسوس کہ کلام ضائع ہو گیا ; اتفاق سے ایک شعر ملا ہے :

ترشنے سے بتوں کے بڑھ گئی توقیر پتھر کی صنم بن کر ہوئی مشہور یہ تصویر پتھر کی

[خاندانی حالات (قلمی)، تذکرۂ بشیر مشمولہ سہ ماہی اردو کراچی (۱:۴۵) غالب نمبر: ۲۴۳ - ۲۴۴]

ناظمؔ ــــ نواب محمد یوسف علی خان بہادر فردوس مکان والیِ رامپور

ریاست رام پور کی بنیاد نواب علی محمد خانؒ بہادر خلد مکان کے ہاتھوں اٹھارویں صدی کے شروع میں رکھی گئی تھی۔ عہدِ محمد شاہی میں انھیں منصب پنج ہزاری ذات اور علاقہ کیٹہر کی جاگیر عطا ہوئی۔ اپنی دانشمندی اور بہادری سے اپنے ہمعصروں سے گوے سبقت لے گئے اور بہت نام پیدا کیا۔ ۴۴ برس کے تھے جب بمرضِ استسقاء ۳ شوال ۱۱۶۲ھ (۵ ستمبر ۱۷۴۹ء) کو انتقال کیا۔ آنولہ میں دفن ہوئے۔ کاظم خان شیدائی نے تاریخ وفات کہی: "ہے ہے افغان"۔

ان کی وفات کے وقت ان کے دونوں بڑے بیٹے: محمد عبداللہ خان بہادر اور محمد فیض اللہ خان بہادر قندھار میں تھے۔ اس لیے تیسرے صاحبزادے نواب محمد سعد اللہ خان بہادر، ان کے جانشین ہوئے۔ جب کچھ مدت کے بعد دونوں بھائی واپس آئے، تو بھائیوں میں آپس میں اختلافِ رائے ہونا قدرتی امر تھا۔ آخر تصفیہ یوں ہوا کہ پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر او جھیائی وغیرہ نواب عبداللہ خان بہادر کے حصے میں آئی اور اتنی ہی مالیت کا علاقہ رام پور وغیرہ نواب محمد فیض اللہ خان بہادر کو ملا؛ اور باقی حصۂ ملک پر نواب محمد سعد اللہ خان بہادر کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ جب ۲۷ برس کی عمر میں ان کا بھی بعارضۂ سل و دق ۵ شعبان ۱۱۷۵ھ (یکم مارچ ۱۷۶۲ء) کو انتقال ہو گیا تو قوم نے بالاتفاق ان کے سب سے بڑے بھائی نواب محمد عبداللہ خان بہادر

۱؎ محمد نجم الغنی مؤلفِ "اخبار الصنادید" کا بیان ہے کہ وہ نسباً حسینی سید تھے اور سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے سید الشہدا حضرت امام حسین سے جا ملتا ہے۔ اس کے برخلاف بعض تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ نواب علی محمد خان کی اصلیت معلوم نہیں۔ (دیکھیے سیر المتاخرین، دبوستان اودھ، وحیات حافظ رحمت خان وغیرہ) کاظم خان شیدائی نے ان کی جو تاریخ وفات کہی ہے: ہے ہے افغان، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خاندان سید نہیں بلکہ پٹھان تھا۔

کو رئیس تسلیم کرلیا۔ افسوس کہ ان کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور یہ بھی پانچ برس بعد سانپ کے کاٹنے سے ۵ صفر ۱۱۸۱ھ (۳ جولائی ۱۷۶۷ء) کو قصبہ اوجھیانی میں رحلت کر گئے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، عاصی اور آزاد اور مبتلا تین تخلص کرتے تھے۔ اب سب سے چھوٹے بھائی نواب محمد فیض اللہ خاں بہادر عرش منزل وسادہ آرائے حکومت ہوئے۔ ان کے عہد میں ریاست نے بہت ترقی کی اور رام پور بھی اسی زمانے میں دارالحکومت قرار پایا۔ بیس برس تک داد و دہش کے ساتھ حکمرانی کرنے کے بعد ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۱۷ جولائی ۱۷۹۴ء) کو رام پور میں فوت ہوئے۔ اور یہیں عیدگاہ دروازہ کے باہر ایک خاص مقبرے میں مدفون ہیں۔ لفظ 'غروب' سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

نواب عرش منزل کی وفات کے بعد اعیان قوم نے چاہا کہ ان کے دوسرے بیٹے غلام محمد خاں بہادر کو گدی پر بٹھادیں، لیکن وہ نہیں مانے اور سب کو ہموار کر کے اپنے بڑے سوتیلے بھائی نواب محمد علی خاں کو رئیس بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ نواب محمد علی خاں کے مزاج میں شورش بہت تھی اور کوئی بھی اُن سے خوش نہیں تھا۔ آخر کار وہ ایک سازش کا شکار ہوئے۔ مسند نشینی کے صرف ۲۴ دن بعد مخالفوں نے ان پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ بارے جان تو بچ گئی لیکن بہت زخم آئے۔ علاج معالجہ سے افاقہ اور صحت کی صورت ہو چلی تھی، کہ دوسری سازش ہوئی اور اب کے وہ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اگرچہ اس ناشدنی حادثے میں غلام محمد خاں بہادر کا کوئی ہاتھ نہ تھا اور یقین تھا کہ وہی ان کے بعد گدی پر بیٹھیں گے، لیکن ان کے حاشیہ نشینوں نے اپنی ضد اور کوتاہ اندیشی سے کام بگاڑ دیا۔ اس وقت تک رام پور کا علاقہ حکومت اودھ کے تحت تھا۔ آخر نوبت کشت و خون تک پہنچی۔ نواب آصف الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے انھیں شکست فاش دی اور فیصلہ یہ ہوا کہ مسند پر نواب محمد علی خاں بہادر کے خرد سال فرزند احمد علی خاں بہادر کو بٹھایا جائے۔ ان کی نابالغی کے زمانے میں محمد نصر اللہ خاں بہادر (خلف نواب محمد عبداللہ خاں بہادر) مدارالمہام مقرر ہوئے۔ غلام محمد خاں بہادر رامپور کی سکونت ترک کر کے بنارس چلے گئے اور وہاں سے حج بیت اللہ کے لیے کلکتہ کے رستے حجاز کی راہ لی۔ انھوں نے منگل ۶ جمادی الثانی ۱۲۳۸ھ (۱۸ فروری ۱۸۲۳ء) فالج سے انتقال کیا۔ نادون میں ایک عالی شان مقبرے میں دفن ہیں۔ "رضوان مقام" تاریخ وفات ہے۔



نواب محمد یوسف علی خان ناظم

نواب احمد علی خان بہادر کا ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۶ھ (۲۶ جولائی ۱۸۴۰ء) کو انتقال ہوا۔ وہ اُردو میں شعر بھی کہتے تھے، احمد اور رند تخلص کرتے تھے۔ چونکہ ان کے فرزندِ نرینہ نہیں تھا، اس لیے ان کی وفات کے بعد انگریزوں نے نواب غلام محمد خان بہادر عرش جناب کے فرزندِ اکبر نواب محمد سعید خان بہادر جنت آرامگاہ کو بدایوں کی ڈپٹی کلکٹری سے بُلا کے رام پور کی گدّی پر بٹھا دیا۔ ایامِ جلاوطنی میں انھوں نے بہت دن بنارس اور لکھنؤ میں بسر کیے تھے۔ اپنے خاندانی مقدمے کی پیروی کے لیے کلکتے بھی گئے۔ اس سیر و سیاحت سے بھی آپ نے بہت تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ گذشتہ کتنے زمانے سے ریاست کے معاملات بہت ابتر تھے۔ امن نام کو نہیں رہا تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول کا دور دورہ تھا۔ آپ نے آ کے از سرِ نو امن و امان قائم کیا۔ ریاست کی آمدنی بڑھائی۔ مختلف محکمے قائم کر کے لوگوں کو ایک متمدّن حکومت کی برکتوں سے مالامال کیا۔ غرض کہ ان کے عہد میں ریاست کا وقار بہت بڑھ گیا۔ آخر پندرہ برس تک دادِ جہانبانی دے کر ۷۱ برس کی عمر میں دوشنبہ ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ (یکم اپریل ۱۸۵۵ء) بعارضۂ سِل عالمِ فانی سے رحلت فرمائی۔ امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ کوٹھی خورشید منزل کے قریب اپنے تعمیر کردہ امام باڑے میں دفن ہوئے۔ "غروبِ کوکب ہے" تاریخ ہے۔ طب میں اچھی مہارت تھی۔ فارسی نثر عاری بھی خوب لکھتے تھے، اور اس میں قتیل سے مشورہ کرتے تھے۔ اپنے پیچھے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ صاحبِ تذکرہ جناب ناظم ان ہی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔

نواب سیّد فیض اللہ خان بہادر (خلفِ بانیِ ریاست) کی ایک سوتیلی بہن نیاز بیگم قوم بڑیچ کے خان زادہ شاہ محمد خان کے عقدِ نکاح میں تھی۔ ان کے صاحبزادے محمد نور خان کی دختر بلند اختر فتح النساء بیگم سے نواب محمد سعید خان بہادر نے نکاح کیا تھا۔ یہی جنابِ عالیہ فتح النسا بیگم صاحبہ، نواب یوسف علی خان بہادر ناظم کی والدۂ ماجدہ تھیں۔ ان کی وفات مارچ ۱۸۵۹ء میں ہوئی۔ غالب نے قطعۂ تاریخِ وفات کہا:

جنابِ عالیہ از بخششِ حق — بہ فردوسِ بریں چوں کرد آرام
سخن پرداز غالب سالِ رحلت — "خلوِ خلد" گفت از روئے الہام

(۱۲۷۴ + ۱ = ۱۲۷۵)

ناظم ۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ (۵ مارچ ۱۸۱۶ء) کو منگل کے دن پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں

ان کے والدِ مرحوم، جنّت آرامگاہ انگریزی علاقے میں مقیم تھے۔ ناظم زمانۂ طالب علمی میں دلّی آئے اور مرزا غالب سے فارسی پڑھی۔ ان ہی ایام میں مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا فضل الحق خیرآبادی سے عربی اور دیگر علومِ عقلیہ، منطق وغیرہ پڑھے۔ غالب کے علاوہ خلیفہ غیاث الدین رام پوری سے بھی فارسی پڑھی تھی۔

ناظم اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ ابھی اس پر مشکل سے دو برس گذرے تھے کہ مئی ۱۸۵۷ء میں مشہور ہنگامہ "غدر" برپا ہو گیا۔ ریاستِ رام پور بھی نرغے میں گھر گئی، لیکن انھوں نے نہایت حزم و احتیاط سے کام لیا اور کسی شورش میں شریک نہیں ہوئے، بلکہ انگریزوں کی بہت قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ نینی تال میں مقیم سب انگریزوں مرد اور عورتوں کی جان و مال کو آپ کی بدولت کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا۔ ان کارگزاریوں کے صلے میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے ۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو فتح گڑھ کے دربار میں بیس ہزار روپے کا خلعت عطا کیا اور سلامی گیارہ کی جگہ تیرہ توپ مقرر ہوئی، نیز "فرزندِ دل پذیر" کا خطاب ملا۔ اور سرکاری مراسلت میں القاب و آداب مقرر ہوا: "نواب صاحب مشفق، بسیار مہربان کرم فرمائے مخلصاں سلامت بعد از شوقِ ملاقاتِ مسرت آیات مشہودِ خاطرِ الطاف ذخائر می دارد۔"
اس کے بعد انہی خدمات کے صلہ میں سرکارِ انگریزی نے جون ۱۸۶۰ء میں ۱۴۶ گانو کا ایک علاقۂ جدید ضلع بریلی میں بطور جاگیر عطا کیا۔ اسی عطیے کے موقع پر نواب صاحب موصوف نے یہ قطعہ موزوں فرمایا تھا:

جب گورمنٹ سے ہوا حاصل ملک مجھ کو بصیغۂ انعام
ناظم از روے ہمتِ عالی سالِ بخشش ہے "بخششِ حکام"
(۵ + ۱۲۷۱ = ۱۲۷۶ھ)

غالب نے بھی اس عطیے کی تہنیت میں ایک قطعہ لکھا تھا، جو ان کے کلیاتِ فارسی میں شامل ہے (قطعہ ۳۰)؛ اس کے آخری تین شعر ہیں:

نواب مہر مہر، منوچہر چہر را حاصل جمالِ یوسف و قربِ کلیم باد
چوں غنچہ اگہ پہلوے گل بشگفد بباغ ملکِ جدید، شاملِ ملکِ قدیم باد
ہر دم ترا بجلوتِ راز و ببزمِ انس روح الامیں مصاحب و غالب ندیم باد

ملکۂ وکٹوریہ کے عہد میں (جولائی ۱۸۶۱ء) اسٹار آف انڈیا (تمغۂ ستارۂ ہند) کا ایک خاص

۱۸۶۰ء از قائم کیا گیا ۔ اسی سلسلے میں یکم نومبر ۱۸۶۱ء کو الہ آباد میں ایک عظیم الشان دربار مقرر ہوا تھا ۔ اس موقع پر لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور وائسرائے نے بعض دوسرے والیانِ ریاست کے ساتھ نواب یوسف علی خاں بہادر کو بھی نائٹ کا خطاب اور تمغہ دیا ۔ ۱۸۶۲ء میں کیننگ کے بعد لارڈ الگن ان کے جانشین ہوئے لیکن جلد ہی نومبر ۱۸۶۳ء میں ان کا بعارضۂ قلب انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ سر جان لارنس مقرر ہوئے ۔ ۱۸۶۴ء میں لارنس نے نواب صاحب موصوف کو اپنی مجلسِ واضع قوانین کا رکن مقرر کیا ۔ چنانچہ اسی سلسلے میں یہ کلکتہ تشریف لے گئے ۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی اور بیمار پڑ گئے ۔ مجبوراً گورنر جنرل کی رضامندی سے واپس رام پور چلے آئے ۔ لیکن مرض نے طول کھینچا اور بڑھ کر سرطان کی شکل اختیار کر لی ۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ نومبر ۱۸۶۴ء میں ان کی حالت بہت تشویشناک ہوگئی ۔ بارے، صحت ہوئی ۔ مرزا غالب نے اس موقع پر دو قصیدے کہے؛ ایک فارسی میں، ایک اُردو میں ۔

لیکن مرض پورے طور پر رفع نہیں ہوا تھا ۔ اس نے پھر حملہ کیا اور اب کے جان لیوا ثابت ہوا ۔ جمعہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ (۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء) دوپہر کے وقت خالقِ حقیقی سے جا ملے ۔ اپنے والدِ ماجد کی طرح امامیہ مذہب کے پیرو تھے، اسی مشرب کے مطابق تجہیز و تکفین ہوئی ۔ امامباڑے کے بیرونی دالان میں اپنے والدِ بزرگوار کے پہلو میں محوِ خواب ہیں ۔ تاریخِ وفات ہے :

یوسف زجہاں رفت، سکندر آمد (۱۲۸۱ھ)

امیر مینائی کا قطعۂ تاریخ ہے :

در فراقِ ناظمِ معجز بیاں یوسف لقا — جوش زد سیلابِ خوں از دیدۂ گریانِ من
تاب از دل رفت و دست از کار رفت — رفتنِ اُو جملہ برہم زد سر و سامانِ من
تیرہ شد چوں شامِ ماتم در نظر ایں خاکداں — چاک شد مانندِ دامانِ سحر دامانِ من
شکرِ منتہائے اُو، ایمانِ خود دانستہ ام — ذکرِ اُو، تا بودہ ام، بودست حرزِ جانِ من
بسکہ از شور و فغانم محشرے برپا شدہ است — می شود شورِ قیامت ہر نفس قربانِ من
گریہ ام در ماتمش رنگِ فزاوانی گرفت — می چکد طوفانِ نوح از گوشۂ دامانِ من
بہرِ سالِ آں عزیزِ مصرِ دلہا گفت، امیر! — "مسند آرائے جناں شد یوسفِ دورانِ من"

(۱۲۸۱ھ)

ناظم نے فیروز النساء بیگم عرف نواب بہو بیگم سے نکاح کیا تھا، جو ان کے چچا عبد العلی خان صاحب (والدِ بتیاب) کی صاحبزادی تھیں۔ اس بیوی سے تین بچے ہوئے، ایک ان کے جانشین نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں اور دو صاحبزادیاں۔ ان کے علاوہ تین لڑکے اور چار لڑکیاں بعض بیگمات ممتوعہ اور خواصوں کی اولاد یادگار چھوڑے۔

ناظم فروری ۱۸۵۷ء میں غالب کے شاگرد ہوئے۔ اس سے پہلے کبھی شعر نہیں کہا تھا؛ دراصل شعر گوئی غالب کی سرپرستی کا بہانہ بن گئی۔ امیر مینائی نے "انتخاب یادگار" میں لکھا ہے کہ وہ غالب سے پہلے مومن سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کیونکہ جب پہلی بار نواب صاحب نے اپنا کلام بغرضِ اصلاح غالب کے پاس بھیجا، تو اس کے ساتھ خط میں لکھا کہ مجھے آج تک کبھی ایک مصرع تک موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اگر وہ اس سے پہلے شعر کہتے ہوتے اور مومن سے اصلاح کا سلسلہ ہوتا، تو یہ بات پوشیدہ رہنے والی نہ تھی؛ اور نواب صاحب کو اس غلط بیانی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ناظم کا دیوان دو مرتبہ شائع ہوا۔ پہلے ۱۲۷۰ھ میں، دوسری مرتبہ ۱۲۸۶ھ میں۔ پہلے دیوان میں سراسر غالب کا اصلاحی کلام ہے؛ اور دوسرے میں آسیر کا دیکھا ہوا بھی موجود ہے، جن سے وہ غالب کے بعد مشورہ کرتے رہے۔ امیر مینائی لکھتے ہیں کہ ناظم نے مجھ سے بھی اصلاح لی، واللہ اعلم۔ ناظم کی طبیعت میں شوخی اور رنگینی اور مضمون آفرینی کا مادہ خوب ہے، بالخصوص جہاں وہ مکالمے کی طرز میں مصرعے موزوں کرجاتے ہیں تو بہت پُرلطف معلوم ہوتا ہے۔

یہ شبہہ عام طور پر وارد کیا گیا ہے کہ ناظم کے دیوان میں غزلوں کی غزلیں ایسی ہیں جن پر غالب کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہی اندازِ فکر، وہی اسلوبِ بیان، وہی مضمون آفرینی اور خاص خاص الفاظ اور ترکیبیں، جو غالب کے کلام کی خصوصیات ہیں؛ ہمیں ناظم کے دیوان کی کئی غزلوں میں اس حد تک ملتی ہیں کہ ہم انھیں محض استاد کی اصلاح تک محدود نہیں کر سکتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ "یہ کلامِ خوش" استاد نے خود کہہ کے شاگرد کے حوالے کر دیا تھا۔ اس شبہے کی تقویت ایک اور بات سے بھی ہوتی ہے کہ ناظم ۱۸۵۷ء کے شروع میں غالب کے شاگرد ہوئے اور ان کا خاصا ضخیم دیوان چار برس بعد ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ ایک بالکل مبتدی کے لیے جس نے اس سے پہلے کبھی ایک مصرع تک نہ کہا ہو، اتنی قلیل مدت میں

اتنے وافر کلام کا مالک ہو جانا حیرتناک ضرور ہے۔

اب مختصر انتخاب ملاحظہ کیجیے!

ہونے دیا نہ شاد، یہ دن پھر کہاں مجھے
ہے ہے تمھیں رقیب کے مرنے کا غم ہوا

تو نہ آیا، پر اجل وقت سے پہلے آئی
آدمی اس کی مگر اتنی تمنا کرتا

ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر بزم میں سب نے اُسے چلتے دیکھا
واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں، کیا بتلاؤں!
میں نے میخانے سے کس کس کو نکلتے دیکھا

کیا تم نہ جانتے تھے کہ بے خانماں ہوں میں
پھرتا ہے نامہ بر مرا گھر پوچھتا ہوا

فقیر بن کے گیا واں، تو کیا سوال کروں
مگر کہوں کہ "بھلا کر، ترا بھلا ہو گا!"

تیرے گھر وہ آئے ناظم، تو یہ اضطراب کیا ہے؟
کوئی بادشاہ آیا، کوئی شہریار آیا!

آدمی کے ساتھ سو آزار ہیں، یہ کیا کہ بس
آہ کی اور رازِ اُلفت آشکارا ہو گیا

ہوتے ہی درد، دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے
یعنی یہ ایسے ہیں، کہ نہ ان سے سُنا گیا

جب کہا اُن سے کہ ہے کچھ مجھے کہنا، تو کہا
"سُن لیا ہم نے، کوئی شکوہ بے جا ہو گا"

معتقد ہوں کعبہ کا، ناظم! مگر جا کر وہاں
عبرت آتی ہے کہ کیا بتخانہ ویراں ہو گیا

ستم میں شہرہ جو وہ آفتِ زمانہ ہوا
فلک کو عذرِ ستم کے لیے بہانہ ہوا

یہ غصہ ہے کہ دلِ مضطرب نشانہ تھا
ہوا جو تیر خطا، میں گناہ گار ہوا

انداز نیا ہے، دل لگی کا
ہنستے ہیں، پتا نہیں ہنسی کا

یہ خوشی کیا ہے کہ ہے ذکر ہمارا ہوتا
ہوتے ہم، اور ہمیں بات کا یارا ہوتا

وہی تم ہو، وہی خنجر ہے، پر انصاف کرو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

کیوں آ کے کہو در پہ کہ "وہ گھر میں نہیں ہیں"
کیا ہم نہیں پہچانتے، سرکار کی آواز

میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط، اور کس قدر غلط

کہتے ہو کہ "وہ بھی یہی کہتے ہیں، کروں کیا
کہتے ہو کہ "دل جوئی اعدا نہ کرو تم"
ہم تم کو بُرا کہتے ہیں، یا خو کو تمھاری
تو خو کے بھی اچھے سہی، جھگڑا نہ کرو تم

اب لکھینگے شکوۂ بیداد، ہم دل کھول کر
نام ان کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں

فسانۂ ستم ہجر ہے، سوال نہیں
نہ دو جواب، سنے جاؤ، کچھ ملال نہیں

---

۵ خدا کرے کہ سمجھ جائیں یہ کنایہ وہ
ابھی تو چرخِ بریں کا گلا کیے جاؤں
(سالک)

میری وفا کی داد، نہ جُرمِ عدو کی بحث
کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

سب گئے اس عمر میں ہو جاتے ہیں ایسے ہی حواس
تجھ سے کچھ شکوہ مجھے، اے فلکِ پیر نہیں

ق

ہوئے ہو ایک بُتِ دلفریب پر عاشق
زبس کہ آپ کو ناکردہ کار سمجھے ہو

صلاح و مشورہ رکھتے ہو مجھ سے اور مجھے
فنونِ عشق کا آموزگار سمجھے ہو

شریکِ دولتِ ناز و نیاز رکھتے ہو
انیسِ خلوتِ شبہائے تار سمجھے ہو

اگرچہ خوش ہوں، پر آتا ہے رحم بھی تم پر
کہ مجھ سے غمزدہ کو غمگسار سمجھے ہو

کہتے ہو کہ ہم غیر کو آنے نہیں دیتے
سچ ہو یہی، پر میں نے سُنا اور ہی کچھ ہے

وفا کی ہم نے، اور تم نے جفا کی
تم اچھے، ہم بُرے، قدرت خدا کی!

جانتے ہم بھی کہ ہے خُلد میں راحت کیسی
ملتی اس میں سے اگر ہم کو یہاں تھوڑی سی

کہیے یہ کون کہ تم کیوں وفا نہیں کرتے
وہ کیا کہینگے، مگر یہ کہ "جا نہیں کرتے"

نہ تھی تم سے توقع، یوں عدو کے دم میں آنے کی
کہاں جاتی رہی وہ خو، محبت آزمانے کی

اس سے کیا بحث کہ ہوگی شبِ فرقت کیسی
موت اس میں نہیں آتی، یہ مصیبت کیسی

نہ گذر دوست تک اپنا، نہ بغیر اُس کے قرار
کس پہ آئی ہے اور آئی ہے طبیعت کیسی

حشر کو کھینچوں ترا دامن، بھلا دیکھوں کہ تو
واں بھی جھنجھلا کے کہے "یوسف علیخاں چھوڑ دے"

جو کہیے، دردِ دل سنیے، تو کہتے ہیں کہ "ہاں کہیے!
اسی کو دردِ دل کہتے ہیں، جو گفتار میں آئے"

نالے کے مجھے طور بہت یاد ہیں، لیکن
طاقت کا گماں بھی ہو دلِ غمزدہ پر کچھ

ہو رات، تو جیتے رہیں اُمیدِ سحر پر
یہ روزِ سیہ ہے، شبِ دیجور نہیں ہے

[اخبار الصنادید؛ انتخابِ یادگار، ۱: ۶۹-۸۲؛ نقدِ غالب: ۲۸۶-۳۱۳]

نامی — دیبی دیال عرف منبے جی لکھنوی

رہنے والے لکھنؤ کے اور بلحاظِ پیشہ صرّاف تھے۔ کسبِ روزگار کے لیے کچھ مدّت گورکھپور میں بسر کی! "تذکرہ" روزِ روشن" کی تالیف کے زمانے (۱۲۹۶ - ۱۲۹۷ھ) میں گورکھپور ہی میں قیام پذیر تھے۔ لیکن ان کا جو کلام "گلدستہ "نغمۂ بہار"[۵] میں شائع ہوا ہے، اس کے ساتھ عام طور پر سکونت اکبرپور کی لکھی ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ مختصر کلام ملاحظہ ہو:

آرزو مجھ کو ہے، اے یارِ نہایت تیری
دیکھنا چاہتا ہوں چاند سی صورت تیری
ہاتھ سے اپنے، خدا نے ہے بنائی تری شکل
تو ہے ہمشکلِ حسینوں میں ہے شہرت تیری
رات دن کوچے میں عشاق کھڑے رہتے ہیں
نہیں جاتی ہے کبھی دل سے محبت تیری
ظلم و بیداد و ستم، بہرِ خدا کم کر تو!
کس نے کس سے نہیں سنتے ہیں شکایت تیری
نام پر حیدرِ کرّار کے، نامی! ہو فدا
حشر کے روز کرینگے وہ شفاعت تیری

(نغمۂ بہار: ۱۵ نومبر ۱۸۸۶ء)

دشمنِ جاں میرے پہلو میں مرا دل نکلا
جس کو میں دوست سمجھتا تھا، وہ قاتل نکلا
اے پری! عارضِ زیبا پہ ترے تل نکلا
فلکِ حسن پہ گویا مہِ کامل نکلا
نامی! اب جان کسی طرح نہیں بچنے کی
ہاتھ میں تیغ لیے گھر سے وہ قاتل نکلا

(نغمۂ بہار، ۱۵ اپریل ۱۸۸۷ء)

کبھی صبا سے معطر نہ ہو گلوں کا دماغ
طواف تیری گلی کا اگر صبا نہ کرے

(نغمۂ بہار، ۱۵ ستمبر ۱۸۸۷ء)

---

۵ یہ گلدستہ سید مہدی حسن عقیل اور یعقوب علی خاں نصرت کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ اُردو پریس میں چھپتا تھا؛ دفتر راجا بازار میں تھا۔

قہر ہے، ظلم ہے، آفت ہے عداوت دل کی
دل رُباؤں سے میں کرتا ہوں شکایت دل کی

ایک ہی آہِ شرر بار سے افلاک جلے
کہیں دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے حرارت دل کی

کھینچ لایا ہے مجھے کوچۂ دلدار میں وہ
حال پر میرے، بہت رہتی ہے شفقت دل کی

جب سے دیکھا ہے مرے دل نے ترے عارض کو
آئینہ دیکھ کے حیران ہے حیرت دل کی

جان کو کرتا ہوں قربان، میں دل پر اپنے
جان سے بڑھ کے ہے نامی! مجھے الفت دل کی

(نغمۂ بہار: ۱۵ نومبر ۱۸۸۹ء)

جنونے گو کہ با خود آرم آں طفلِ پریرو را
زندا و بر سرِ من سنگ و من بینم رُخِ اُو را

زاہد قدحے زن کہ دہم پیرِ مغاں را
بیعانۂ او مایۂ عقلِ ہمہ داں را

ندانم کشتۂ شمشیرِ ابروے کہ شد، نامی
بجاروب مژہ رو بند خوباں تربتِ اُو را

[روزِ روشن: ۶۸۱؛ تماہی صحیفہ، لاہور۔ جولائی ۱۹۷۰ء ص ۵۴؛ گلدستہ نغمۂ بہار لکھنؤ۔ ۱۵ اپریل ۱۸۸۷ء ص ۱۵؛ ایضاً۔ ۱۵ نومبر ۱۸۸۹ء ص ۱۵]

نحیف ـــــ غلام محمد خان

شوقِ وصلِ یار ہے، اور غم نہیں اغیار کا
گل سے ہم پہلو ہوں میں، کیا خار کھانا خار کا

[تذکرہ بشیر مشمولہ سہ ماہی اُردو، کراچی ۴۵: ۱: ۲۴۴]

نامی ـــــ محمد علی خان مونگھیری

مونگھیر کے رؤسا میں سے تھے۔ ان کے کلام میں صرف ایک فارسی قطعۂ تاریخ مل سکا، جو انھوں نے غالب کے ایک دوسرے شاگرد خواجہ فخر الدین حسین سخن کے دیوان کے لیے لکھا تھا:

جنابِ خواجہ فخر الدیں بہادر
کہ زندہ باز از و نامِ سخن شد
بطرزِ عاشقانہ گفت دیواں
کہ مطبوعِ دلِ ہر اہلِ فن شد
زہے شعرِ او، ہم اوجِ گردوں
نقاطش رشکِ پروینِ و پرن شد
بفکرِ تازہ، دادِ نظم دادہ
کز و متروک مضمونِ کہن شد
بہ گل بندیِ الفاظِ نگاریں
بیاضِ صفحہ صد رشکِ چمن شد
ببیں سحرِ حلالش، بہرِ حاسد
کہ در وصفش زباں قفلِ دہن شد
سرِ اعدا زدہ تاریخ گفتم
ز دل مقبولِ دیوانِ سخن شد
(۱۳۰۳ - ۱ = ۱۳۰۲ھ)

(دیوانِ سخن)

نسیم ـــــ نواب محمد حسین علی سلطان

گلدستۂ شعرا، مدراس کے جون و جولائی ۱۸۷۶ء کے دو شماروں میں دو غزلیں حسبِ ذیل عنوان کے تحت ملتی ہیں:

عالی جناب معلّیٰ القاب نواب محمد حسین علی سلطان متخلّص بہ نسیم جاگیردار ہر پور نبیرۂ ٹیپو سلطان دام اقبالہم شاگردِ غالب دہلوی از مقام مدراس۔

دونوں غزلیں طویل ہیں اور بے مزہ، بعض شعر عریاں بھی ہیں۔ بطور نمونہ چند شعر دیکھیے:

جب زلف و رخ کا چرچا ہوا ہے ‏ — ‏ شب ہوگئی ہے، تڑکا ہوا ہے
یہ گیسو ہیں جانے یا مشک، بولو ‏ — ‏ عاشق ہوا ہوں، سودا ہوا ہے
طوفاں نما ہے آنسو ہمارا ‏ — ‏ دریا سمٹ کر قطرا ہوا ہے
پہنا ہے زیور وہ سر سے پا تک ‏ — ‏ گردِ چراغاں طوبیٰ ہوا ہے
اے شورِ محشر، سونے دے دم بھر ‏ — ‏ بیچارہ مجنوں جاگا ہوا ہے
ہے ہے نسیم اب پیتا نہیں مے ‏ — ‏ زاہد بنا ہے، مُلّا ہوا ہے

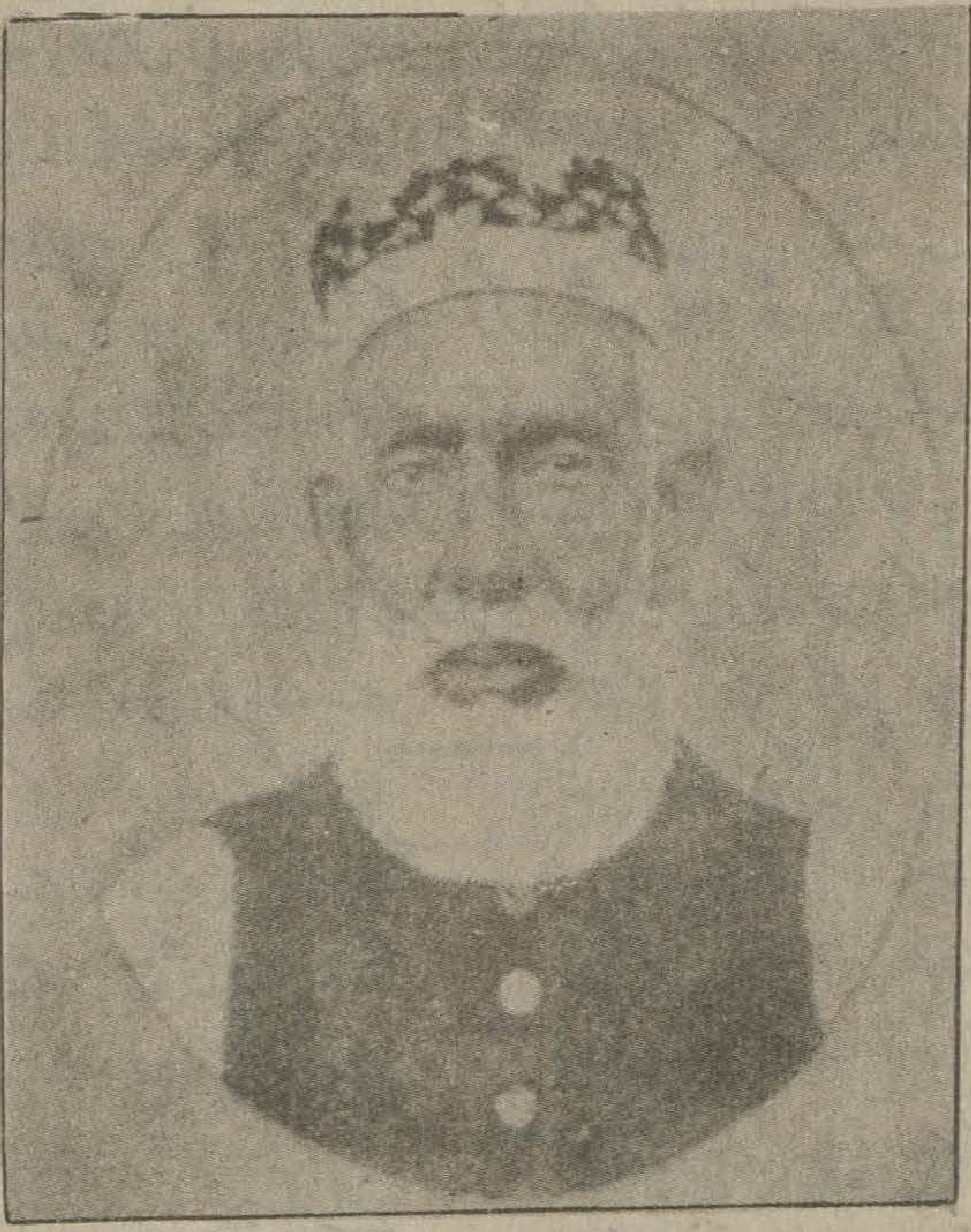
پیام بر کا ہے ناتا کسی پیمبر سے ‏ — ‏ ہے جبرئیل کو رشتہ ترے کبوتر سے
قدِ خمیدہ ہے مردودِ بزمِ دلبر سے ‏ — ‏ اشارہ ہے یہ ہمیں چشمِ حلقۂ در سے
جگائیں لیلیٰ و شیریں جو قیس و خسرو کو ‏ — ‏ اُٹھینگے حشر میں ہم بھی کسی کی ٹھوکر سے
پسینہ ابرو سے اترا تو گال لال ہوا ‏ — ‏ ہے دہکی آتشِ خورشید آبِ خنجر سے
تمھارے گال سے گلشن یہ پانی پانی ہے ‏ — ‏ رگِ سحاب خجل ہے رگِ گلِ تر سے
وہ سن کے کہتے ہیں موزوں کلامِ لطف آمیز ‏ — ‏ نسیم، آپ نظر آتے ہیں سخنور سے

[مکتوب جناب عبدالصمد خان، حیدرآباد، بنام مؤلف]

نشاط ـــــ بابو ہرگوبند سہائے اکبرآبادی

والد کا نام منشی خوب لال تھا۔ قوم کے ماتھر کائستھ تھے۔ ۸ دسمبر ۱۸۲۸ء کول ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ بزرگوں کا اصلی وطن پٹنہ تھا، لیکن ۱۸۰۳ء میں منشی خوب لال وہاں سے کول ضلع علی گڑھ آگئے۔ بعد کو یہاں سے بھی نقلِ مکان کرکے آگرے آرہے۔ ان کے والد علی گڑھ اور متھرا میں اچھی خاصی جاداد چھوڑ مرے تھے، جس میں زمین معافی، مکانات، باغات وغیرہ تھے۔ جب یہ آگرے آئے تو یہاں جان ہٹیس صاحب کی کوٹھی اور باغ خرید کر اُسی جگہ اپنے نام پر "ہرگوبند گنج" آباد کیا۔ آج کل آگرہ میونسپل کمیٹی کے دفتر اور سمن گنج اسی جگہ میں ہیں۔

پہلے پانچ برس تک دلی صدر امینی میں عہدۂ نظارت پر مامور رہے۔ لیکن ۱۸۵۵ء میں یہاں سے استعفٰے دے کر گوالیار چلے گئے اور وہاں میر منشی ہو گئے۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور انقلاب ہو گیا۔ اس لیے یہ نوکری چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے۔ یہاں ۱۸۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک عدالتِ دیوانی میں نائب سررشتہ دار رہے۔ یہیں انھوں نے انگریز سیشن جج مسٹر جان شور کے کہنے پر وکالت کا امتحان دیا جس میں کامیاب ہو گئے۔ اور پھر ۱۸۶۲ء میں وکیل دیوانی بن گئے، آگرے آئے اور یہ شہر کچھ ایسا پسند آیا کہ یہیں کے ہو رہے۔ ۱۸۶۸ء میں آگرے میں میونسپل کمشنر چنے گئے۔ اسی زمانے میں لاٹ صاحب کے درباروں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اپنے حسنِ لیاقت کے باعث ۱۸۷۵ء میں ریاست کوٹہ میں جج مقرر ہوئے تھے لیکن چونکہ صحت خراب رہنے لگی تھی، سال بھر بعد وہاں سے مستعفی ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ آخری زمانے میں خیالات زیادہ تر مذہب کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ چنانچہ دریائے گنگا کے کنارے راج گھاٹ میں ایک دھرم شالہ تعمیر



منشی ہرگوبند سہائے نشاط اکبر آبادی

کی اور اس کی غور و پرداخت اور خرچ کے لیے ایک وقف قائم کیا۔ یہاں ۱۸۷۷ء میں انھوں نے دور نزدیک سے ۸۰۰ عالموں اور پنڈتوں کو جمع کرکے بڑے پیمانے پر ایک یگیہ بھی کیا تھا۔

اسی جگہ ۳ مئی ۱۸۹۱ء کو انتقال کیا۔ اولادِ جسمانی میں کئی لڑکیاں اور دو صاحبزادے بابو رام نرائن اور بابو برج نرائن یادگار چھوڑے دونوں کی اولاد موجود ہے۔ آج کل اس خاندان کے اکثر افراد ڈیرہ دون میں مقیم ہیں۔

۱۸۹۰ء میں جب عمر تقریباً ۲۱-۲۲ برس کی تھی شعر گوئی شروع کی۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ تصنیفات میں نشاط المحاسبین، مبادی الحساب منظوم، تالیف ہرگوبند (نولکشور کانپور-۱۸۷۱ء)، تعلیمِ اخلاق اور اردو فارسی کا مشترکہ دیوان "نشاط الاحباب" (۱۸۷۷ء) کا نسخہ کتاولی وسندھیو پاسن (۱۸۷۷ء)، الہامِ ضمیر (۱۸۸۹ء) وغیرہ یادگار ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:

آہ کہ ہمسایہ کی فریاد سے
رات کا سونا بھی بلا ہوگیا

ذکر خیر غیروں کا، اور ہے گلا اپنا
بات پا گئے ہم بھی، گم ہے مدعا اپنا

درد کی حکایت ہے، وقت کی شکایت ہے
یار بیوفا اپنا، بخت نارسا اپنا

رنج ہے، عداوت ہے، حسن بھی قیامت ہے
ہوگیا حریف اپنا، تھا جو آشنا اپنا

سرگزشت کلفت ہے، جو بیانِ الفت ہے
رویدادِ حیرت ہے، آہ ماجرا اپنا

جوشش بحرِ قلزم ہے، کشتی و تلاطم ہے
ناخدا ابھی یہاں گم ہے، ہے مگر خدا اپنا

ہو نشاط یا غم ہو، اپنی اپنی قسمت ہے
چاہیے برا کس کا، گرچہ ہو بھلا اپنا

غیر کا بھی وہ آشنا نہ ہوا
یہ بھی اچھا ہوا، برا نہ ہوا

اوس کی قدرت کے ہیں یہی معنی
اوس کا چاہا ہوا، مرا نہ ہوا

ہنستے ہیں سن کے حال رونے کا
میرا رونا مگر فسانا ہوا

کہو تو، غیر نے تم سے کہا کیا؟
سناؤ تو مجھے، تم نے سنا کیا؟

تبسم گل کا ہے یا خندۂ برق
وجودِ عشرتِ اہلِ فنا، کیا؟

اون کے جاتے ہی ہوگئی کچھ اور
دلِ بے اختیار کی صورت

اک ذرا سے دل میں، یہ گنجایشیں
محو ہوں طرزِ تمنا دیکھ کر

ان لبوں سے مرا گلا نکلا
منھ کو تکتا ہوں میں، یہ کیا نکلا

ہم نے سجدے کو سر جھکایا تھا　　بارے واں اُن کا نقشِ پا نکلا

غیر سے مذکور ہمارا کیا　　خوب کیا آپ نے، اچھا کیا

———

شیشۂ مے نہاں بغل میں، نشاط!　　اور دعویٰ ہے پارسائی کا

———

نشاط انگیز ہے یہ طرزِ گفتار　　"پیو مے، اب بنو گے پارسا کیا"

———

خواہشوں کا چھوٹ جانا ہے نشاط　　روتے ہیں ناداں کو دانا دیکھ کر

یہ دلِ دیوانہ بس مسرور ہے　　اپنے گھر میں شکلِ صحرا دیکھ کر

———

وعدوں ہی کو تمھارے نہ سمجھے ہیں ہم دروغ　　تم جھوٹے، عہد جھوٹے، تمھاری قسم دروغ

آیینہ رو نمائے سکندر ہی گرچہ ہو　　ہستی باعتبارِ وجود و عدم دروغ

دشمن کی مرگ کی بھی نہ ہم آرزو کریں　　کس طرح لوحِ زیست پہ کھینچیں قلم دروغ

———

نشاط! ہم دل سے پہنچے تا درِ کعبہ، وہے واں بھی　　نشانِ یار گم پایا، پڑا تھا صاف ویرانہ

———

بے جرم پائمال عدو کو نہ کیجیے　　اتنا خیال بس، مرے سر کی قسم رہے

———

تبسم پر اگر چینِ جبیں کا فیصلہ ٹھہرے　　ادائے معنیِ دَعْ ما کدر، خذ ما صفا ٹھہرے

غم و اندوہ و حسرت یا نشاط و شادی و فرحت　　وہی تسلیم ہے ہم کو، تری جس میں رضا ٹھہرے

———

ہم نکتہ دانِ عشق ہیں، کرتے ہیں عرضِ حال　　لفظِ قلیل و معنیِ بسیار دیکھ کر

———

کیسی تقدیر اپنی بگڑی ہے　　کوئی تدبیر بن نہیں آتی

خانۂ دل کو منہدم نہ کرو　　پھر یہ تعمیر بن نہیں آتی

———

گردشِ چشم نے ساقی کی کیا ہے بدمست　　ہم بہکتے تھے کبھی نشۂ مے سے ایسے

———

مت سوچو، یہ کام کس طرح سے ہوگا　　اس طرح سے یا اُس طرح سے ہوگا

ہو ویگا وہی، جو کچھ ہے منظورِ خدا　　واقف بھی وہی ہے، جس طرح سے ہوگا

[شعر و سخن: ۱۲۴ - ۱۲۶؛ ماتھر پتر کا، اپریل ۱۹۲۶؛ آج کل، دلّی: فروری ۱۹۵۵ء؛ زمانہ، کانپور، دسمبر ۱۹۴۱ء: ۲۸۶ - ۲۸۸]

نظام (مضطر، رعنا)۔ نواب محمد مردان علی خاں مرادآبادی

قوم کے یوسف زئی افغان تھے۔ ان کا خاندان مرادآباد کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ بزرگ خاندانِ مغلیہ اور شاہانِ اودھ کے زمانے میں مناصبِ جلیلہ پر متمکن رہے۔ ان کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۸۵۰ء میں سرکارِ انگریزی کی ملازمت میں داخل ہوئے، تو سب سے پہلے راولپنڈی (حال پاکستان) میں کمشنر صاحب بہادر کے دفتر میں پیشکاری ملی۔ بتدریج ترقی کر کے تھانیداری اور پھر تحصیلداری کا عہدہ پایا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں یہ حسن ابدال (ضلع اٹک، پاکستان) میں تحصیلدار تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے مری کے علاقے کا انتظام خاطر خواہِ حکام کیا، جس کے لیے بعد کو سندِ خوشنودی عطا ہوئی۔ لیکن یہ اپنی ملازمت اور قلیل معاش سے خوش نہ تھے، اس لیے اگلے ہی برس یعنی دسمبر ۱۸۵۸ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا، جو منظور کر لیا گیا۔

سال بھر بعد ریاست مالیر کوٹلہ میں نواب صاحب کے مدارالمہام مقرر ہوئے۔ یہاں چار برس بہت نیکنامی سے رہے۔ جنوری ۱۸۶۱ء میں راجہ رندھیر سنگھ والیِ ریاست کپورتھلہ کے چھوٹے بھائی کنور بکرماں سنگھ کے سکتر بن کے چلے گئے۔ تین سال تک یہاں بھی معتمد علیہ رہے۔ اس دوران میں حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ انھیں مہاراجہ شیو دھیان سنگھ والی الور کی طرف سے توقع دلائی گئی کہ اگر آئیں تو کسی معقول عہدے پر مقرر کر دیے جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپریل ۱۸۶۴ء میں کپورتھلہ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اتفاق سے وہ توقع پوری نہ ہوئی اور یہ بے روزگار ہو گئے۔ تگ و دو کے بعد ۱۸۶۷ء میں مارواڑ میں نائب دیوان مقرر ہوئے، بعد کو وہیں دیوان ہو گئے۔ اسی زمانے میں مہاراجا بہادر کی طرف سے "نظام الدولہ، منتظم الملک نواب محمد مردان علی خاں بہادر تخت قائم جنگ"



نواب محمد مردان علی خان نظام مراد آبادی

خطاب[۵] عطا ہوا۔ ساتھ ہی جاگیر اور نقارہ و نشان کا اعزاز بھی ملا؛ اوّل درجے کے سرداروں کی تعظیم مقرر ہوئی۔ غرض کہ یہاں بہت تزک و احتشام اور اعزاز و اکرام سے رہے۔ انھوں نے ریاست کا انتظام ایسا عمدگی سے کیا کہ ہر شعبے میں ترقی ہوئی۔ شروع سے انھیں معدنیات سے دلچسپی تھی۔ پنجاب کے قیام کے دوران میں بھی چند مفید چیزیں مثلاً ثعلب مصری، سنگِ غربال، سنگِ طبع وغیرہ برآمد کیے تھے۔ لیکن مارواڑ کی دیوانی کے زمانے میں بارہ مختلف کانیں دریافت کیں؛ ان میں چاندی اور لوہا اور مس زیادہ اہم تھیں۔ اس کے علاوہ سڑکیں بنوائیں۔ ٹکسال قائم کی۔ ان کے حسنِ انتظام سے ریاست نے بہت ترقی کی۔ میو کالج اجمیر میں جو گھنٹہ ہے، وہ بھی ساڑھے تین ہزار کے خرچ پر انھیں نے لگوایا تھا۔

ریاست جودھپور کی ملازمت سے فارغ ہو کر ۱۸۷۶ء (۱۲۹۳ھ) میں حج بیت اللہ و زیارت مدینۂ منوّرہ سے مشرّف ہوئے؛ اس کی تاریخ نکالی "نظام حاجی الحرم"۔ ساری عمر مجرّد رہے۔ بروز دوشنبہ ۲ جون ۱۸۷۹ء (۱۱ جمادی الثانی ۱۲۹۶ھ) کو سری نگر (کشمیر) میں ہیضہ سے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ تاریخ مرزا محمد علی بیگ عاقل نے کہی:

تھی فکر مجھے ہو سالِ رحلت
ہاتف نے معاً مجھے بتایا
عاقل لکھو یہ بے سرِ نیم
"داغِ دلِ دوستانِ رعنا"
(۱۸۸۱-۲ = ۱۸۷۹)

علم دوست آدمی تھے۔ شروع میں مضطر تخلص کیا؛ بعد کو اُسے بدل کر رعنا کر لیا۔ جب نوابی کا خطاب ملا، تو نظام لکھنے لگے؛ چنانچہ ایک رباعی میں ان تینوں کا ذکر کیا ہے:

آغازِ سخنوری میں مضطر تھا نام
رعنا تھا شبابِ شاعری کے ہنگام
ہے زیرِ نگیں جو کشورِ نظم، تو اب
نوّاب خطاب اور تخلص ہے نظام

صاحبِ تصنیف تھے۔ علمِ جفر میں جفر جامع اور جفر کبیر کے علاوہ ایک ضخیم کتاب شاہِ ایران کے

---

۵ یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے: چونکہ یہ خطابات آصف جاہ نظام حیدر آباد (دکن) کے خطابات سے ملتے جلتے تھے، اس لیے نظام دکن اور انگریزی حکومت دونوں نے ان پر اعتراض کیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجا کے عذر معذرت کرنے پر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

نام پر ظلِ ناصری (۱۲۸۱ھ) تالیف کی۔ تاریخ میں ایک مبسوط کتاب تاریخ البلاد (۱۲۷۹ھ) لکھی۔ علم موسیقی میں بھی دو کتابیں یادگار ہیں: نغمۂ صنم (۱۲۷۹ھ) اور غنچۂ راگ۔ ریاست جودھپور کی تاریخ، تواریخِ راج مارواڑ (۱۸۶۹ء) کے نام سے لکھی۔ دو کتابیں سمر بزم کے مضمون پر لکھیں: سیرِ عجایب (۱۲۸۳ھ) اور طلسمِ نظر (۱۲۸۹ھ) اردو میں اس موضوع پر غالباً یہ پہلی کتابیں ہیں۔ انگریزی کی مشہور کتاب ٹاڈز راجستھان کا اردو ترجمہ بھی انھیں کی توجہ سے چھپا تھا۔

ان کی مدح میں مختلف شاعروں نے جو قصیدے لکھے تھے، ان کا انتخاب منشی غلام محمد خاں تپش نے مرتب کر کے "قصاید مدحیہ نظام" کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ میں ۱۸۷۱ء میں چھاپا تھا۔ اس کے شروع میں مختصر سوانحمری بھی ہے۔ ان کے اپنے اردو فارسی کلام کا مجموعہ بھی اسی مطبع سے کلیاتِ نظام کے نام سے دسمبر ۱۸۷۵ء میں چھپا۔ یہ مشتمل ہے دیوانِ اوّل و دوم اور مُہرِ نبوت (نعت، منقبت و سلام وغیرہ) اور واسوخت (مسدّس) ضبطِ عشق پر۔ اس واسوخت کا نام تاریخی ہے (۱۲۸۱ھ) اور اس میں ۳۲۴ بند ہیں۔ منشی فدا علی عیش نے ۱۸۶۹ء میں لکھنؤ سے دو جلدوں میں واسوختوں کا ایک مجموعہ شعلۂ جوّالہ کے نام سے شائع کیا تھا۔ نظام کا یہ واسوخت (ضبطِ عشق) اس کی دوسری جلد میں شامل ہے۔ یہ پہلی بار ۱۲۸۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ مذہباً شیعہ تھے۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

طالب اسداللہ کا ہوں غالب کا ہوں شاگرد
بیعت مجھے بیواسطہ ہے شیرِ خدا سے

اسی لیے جب ۱۸۷۶ء میں زیارتِ حرمین شریفین سے مشرّف ہوئے، تو واپسی میں کربلائے معلّیٰ میں بھی حاضری دی۔

کلام پر غالب کے بعد دبیر الدولہ منشی مظفّر علی خان اسیر مرحوم سے بھی اصلاح لی۔ اگرچہ بہت پُرگو تھے، لیکن کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ وہی پُرانا ناسخی رنگ ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

کٹا تھا روزِ مصیبت خدا خدا کر کے
یہ رات آئی، کہ سر پر مرے عذاب آیا
———
وہ زودرنج ہے، اس کو نہ چھیڑنا، رعنا!
مَلو گے ہاتھ، اگر بر سرِ عتاب آیا
———
ہجرِ محبوب میں کیا کیا نہ اذیت کھینچی
موت آجاتی تو اس زیست سے بہتر ہوتا
———
جلوہ ہر رنگ میں دیکھا ترا گلرو پیدا
ہر گلِ باغِ جہاں سے ہے تری بُو پیدا
———
میں دل سے بے نیاز ہوں، دل مجھ سے بے نیاز
دل میرا آشنا ہے، نہ میں آشنائے دل

یادِ آں روز کہ در کوئے تو گریاں رفتم
بہ گلستاں صفتِ ابرِ بہاراں رفتم
سر بکف، آہ بدل، بارِ ندامت بہ دوش
بر درِ جانِ جہاں، وہ بہ چہ ساماں رفتم

کھو چکے پہلے ہی ناموس کو اور نام کو ہم
پہنچے آغازِ محبت میں ہی انجام کو ہم

گذرا ہے مرا نالۂ دل چرخِ کہن سے
تھا روح کا ہمدم، نہ پھرا جا کے وطن سے
گھٹ گھٹ کے غمِ ہجر میں، جی نکلا ہے تن سے
اب جانِ حزیں چھوٹ گئی رنج و محن سے

کھو خیال ہیں کس کے اداس ہو رعنا!
کسی سے تم جو نہیں آج گفتگو کرتے

غم سوا عشق کا مآل نہیں
کون دل ہے، جو پائمال نہیں

[مقدمۂ ردو کد ملازمتِ الور (رعنا)؛ ۳۸ - ۴۰؛
مقدمۂ قصائدِ مدحیہ نظام؛ اودھ اخبار ۱۳/۱۷ جون
۱۸۷۹ء؛ مقدمۂ کلیاتِ نظام؛ شعلۂ جوالہ ۲: ۴۰۱ - ۴۰۲]

نیّر — حکیم محبّ علی کاکوروی

حضرت محمد بن الحنفیہ کی ۳۲ ویں پشت میں تھے۔ ان کے آبا و اجداد میں متعدد صوفیۂ کرام اور علمائے باعمل ہوئے ہیں۔ پردادا شیخ محبوب عالم اٹاوہ کے چکلہ دار تھے، دادا شیخ عاشق علی ملازمت کے دوران میں اور جگہوں کے علاوہ گلاؤٹھی (ضلع میرٹھ) میں بھی تھانہ دار رہے؛ ان کے والد حکیم مشتاق علی دہلوی اپنے زمانے کے مشہور اور حاذق حکیم تھے۔
حکیم مشتاق علی ۲۴ جمادی الاول ۱۲۳۷ھ (۱۶ فروری ۱۸۲۲ء) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد طب درجہ بدرجہ حسین احمد محدّث ملیح آبادی اور حکیم محبوب علی گلاؤٹھوی اور حاذق الزماں حکیم عبد القادر خان دہلوی سے پڑھی۔ تکمیل کے بعد ریاست آوا (ضلع ایٹہ) میں طبیب کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ پھر چندے بھوپال میں رہے۔ یہاں سے نکلے تو مین پوری میں مطب شروع کیا اور بقیہ عمر یہیں گزار دی۔ علم طب میں دو کتابیں 'تفریح الاطبا' اور مفرح المشتاقین' لکھی تھیں، جو غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ ۲۶ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ/ ۱۳ جنوری ۱۸۸۵ء کو انتقال کیا۔ محسن کاکوروی نے تاریخ کہی "مہتاب قرین آفتابے" (۱۳۰۲ھ) عید گاہ مین پوری میں محسن کاکوری کے والد کے پائین دفن ہوئے۔
حکیم مشتاق علی شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا کہا ہوا ایک قطعہ 'تاریخ خاندان شروانی (دتاولی) کی عمارت موسومہ بنگلہ فیض آباد کے ساتھ کی حویلی کے بڑے دروازے پر موجود ہے، جس سے (۱۲۶۹ھ) برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ معین الدین علوی (بن مشکور علی بن حکیم محب علی بن حکیم مشتاق علی) کے پاس ایک بیاض میں ان کا بہت سا کلام موجود ہے۔
ان کے تین بیٹے تھے: بڑے حکیم محب علی، منجھلے حکیم طالب علی اور چھوٹے حکیم حبیب علی۔
حکیم محب علی ۲۹ ربیع الاول ۱۲۵۴ھ (۲۳ جون ۱۸۳۸ء) کو پیدا ہوئے۔ فارسی اور

عربی اور طب کی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے پائی۔ میرٹھ میں نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ کے ہمسایے میں رہتے تھے اور ان ہی سے تلمذ بھی تھا۔ مرزا غالب دو تین مرتبہ میرٹھ بھی گئے اور نواب شیفتہ کے ہاں ٹھہرے تھے۔ نیر کی یہیں ان سے ملاقات ہوئی اور انھیں بھی اپنے مسودے دکھائے۔ لیکن شعر بہت کم کہتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں نیر میرٹھ کی عدالت میں اپنے والد کی جگہ ناظر سر رشتہ تھے۔ ہنگامے کے فرو ہونے کے بعد مین پوری میں وکالت اور مطب دونوں کرنے لگے۔

۱۸ جمادی الآخر ۱۳۲۲ھ (۳۱ اگست ۱۹۰۴ء) کو انتقال کیا اور عید گاہ، مین پوری کے صحن میں اپنے والد کے پائین دفن ہوئے۔ کلام کہیں سے نہیں مل سکا۔

ان کے چھوٹے بھائی حکیم حبیب علی بھی شعر کہتے تھے۔ حبیب تخلص تھا۔ مدۃ العمر اٹاوہ میں مطب اور وکالت کرتے رہے۔ ۶۴ سال کی عمر میں بعارضۂ فالج ۵ نومبر ۱۹۱۲ء (۲۵ ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ) کو وہیں انتقال کیا اور بادشاہ قلی کے باغ میں دفن ہوئے۔

[تذکرۂ مشاہیر کاکوری: ۴۰۳-۴۰۴؛ ایضاً: ۱۲۲-۱۲۵؛ ہندستانی (الہ آباد)، ۴؛ ۹۰، ۱۳۲]

نیّرؔ رخشاںؔ ـــــ نواب ضیاءالدّین احمد خان بہادر دہلوی

چھٹی صدی ہجری میں سادات علوی میں سے ایک بزرگ خواجہ احمد یسویؒ (ف : ۵۳۴ھ) باب ارسلان (ترکستان) کے مشہور ولی اللہ گزرے ہیں (یہ حضرت علی کے چھوٹے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ کی نسل میں سے تھے) انھوں نے سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور شیخ حضرت خواجہ یوسف ہمدانی سے اکتساب فیض کیا اور انھیں سے سند خلافت لی۔ تُرک انھیں ادب اور عقیدت سے "اتا یسوی" سے خطاب کرتے تھے۔ ان کی اولاد میں دین و دنیا کے مشاہیر پیدا ہوئے۔ انھیں میں سے ایک خواجہ محمد امین حکومت بخارا میں سلطان بیگی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ خواجہ محمد امین کے صاحبزادے خواجہ عبدالرحمٰن بلخ میں منتظم دیہات اور مہتمم دار الضرب شاہی رہے۔ اگرچہ یہ خاندان نسب کے لحاظ سے طبقۂ سادات میں سے تھا، مگر شاہی منصبدار ہونے کے باعث مؤرخوں اور تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر مرزا اور خاں کے القاب سے کیا ہے۔

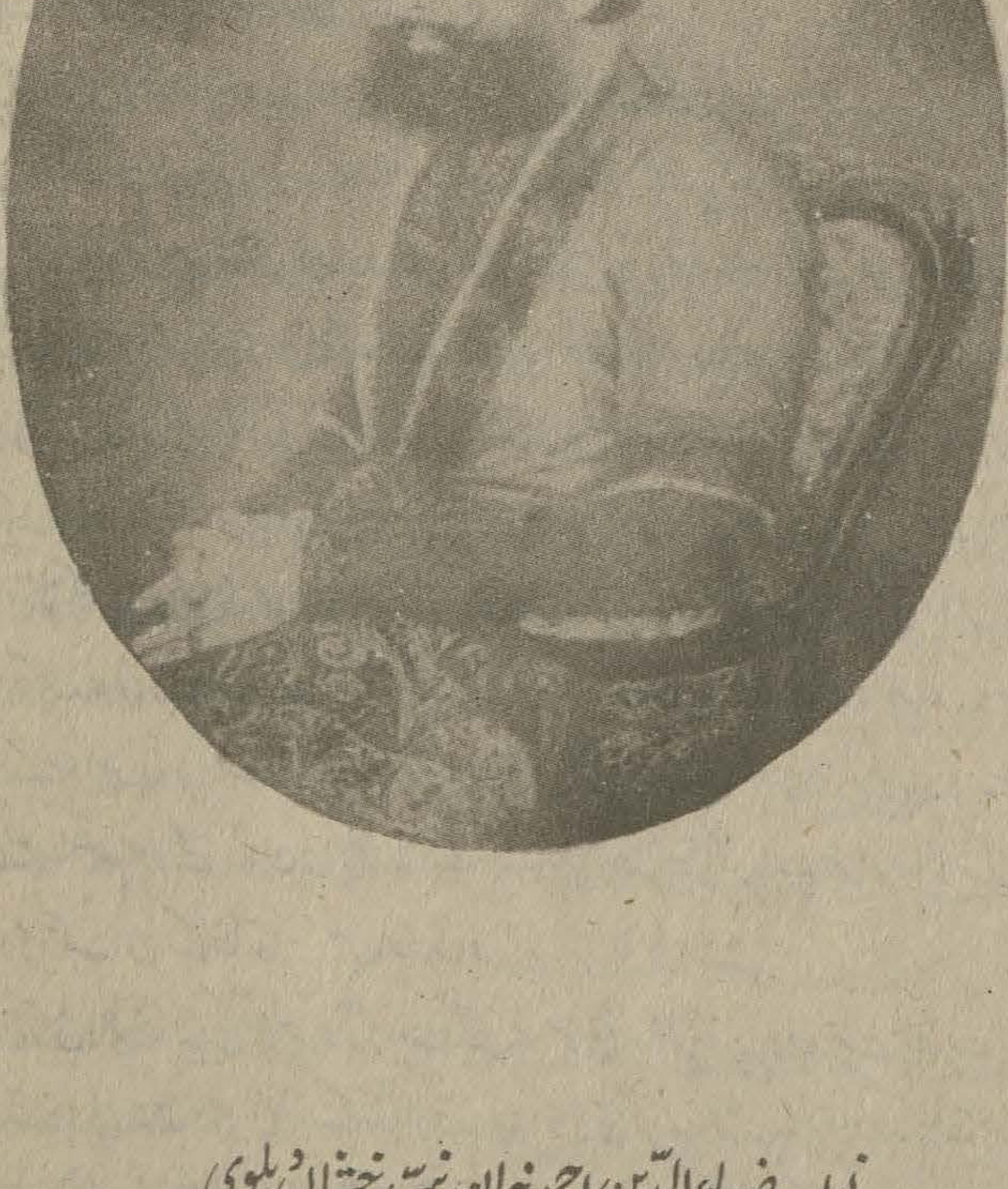
خواجہ عبدالرحمٰن کے تین صاحبزادے تھے: قاسم جان، عالم جان، عارف جان۔ مرزا عارف جان سب سے چھوٹے تھے۔ یہ تینوں بھائی احمد شاہ (۱۷۴۸ - ۱۷۵۴ء) کے عہد میں ترکوں کا ایک مسلح دستہ ساتھ لیے بخارا سے ۱۷۵۰ء کے قریب ہندستان آئے۔ اس زمانے میں وسطی ایشیا (ماوراء النہر) کی سکونت انتہائی سیاسی افراتفری کے باعث ناممکن ہوگئی تھی۔ اسی سے یہ خاندان ترک وطن پر مجبور ہوا۔ ان دنوں حکومت دہلی کی طرف سے مرزا محمد بیگ اٹک کے صوبہ دار تھے۔ یہ قافلہ چند دن ان کے پاس ٹھہرا۔ اسی اثنا میں صوبہ دار موصوف نے مرزا عارف جان کو اپنی فرزندی میں لے لیا اور اپنی دختر بلند اختر اُن کے حبالۂ عقد میں دے دی۔ اس کے بعد ایک عرصے تک مرزا عارف جان یہاں رہ کر علاقے کے نظم و نسق میں مرزا محمد بیگ کی مدد کرتے رہے۔ آخر اُن کی شجاعت اور قابلیت کی شہرت اُس دُور دست علاقے سے نکل کر پایۂ تخت دہلی تک جا پہنچی، اور یہ حسب طلب شاہ عالم کے عہد میں

(۱۷۵۹ء - ۱۸۰۶ء) دار الخلافے میں حاضر ہوئے۔

مرزا عارف جان کے چار بیٹے ہوئے۔ نبی بخش خان، احمد بخش خان، الٰہی بخش خان اور محمد علی خان۔ ان میں سے احمد بخش خان اور الٰہی بخش خان نے شہرتِ دوام کے خلعت حاصل کیے۔ یہی وہ الٰہی بخش خان ہیں جو اردو زبان میں معروف کے تخلص سے مشہور ہیں؛ وہ حضرت مولانا فخر الدین چشتی (ف: ۱۱۹۹ھ) کے مریدِ خاص اور خلیفہ تھے۔ معروف نے اگر علم و فضل اور تصوّف و سلوک کے میدان میں شہرت حاصل کی، تو اُن کے بڑے بھائی احمد بخش خان نے ریاست و جہانبانی کی دنیا میں اپنا سکّہ جاری کیا۔

احمد بخش خان اٹک میں ۱۷۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ جب خاندان دلّی منتقل ہوا، تو یہ بھی یہاں آ گئے۔ جوانی کا زمانہ یہیں گزرا۔ پہلے گوالیار میں بزمرۂ سواراں ملازم ہوئے۔ معقول بسر اوقات تھی، لیکن کسی سبب سے یہ روزگار ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس کے بعد گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ ایک دفعہ اسی سلسلے میں دلّی آ رہے تھے کہ راستے میں مہاراجہ بختاور سنگھ بہادر والیِ الور سے ملاقات ہو گئی، جس کے نتیجے میں انھوں نے دربارِ الور کی ملازمت قبول کر لی۔

مہاراجہ بختاور سنگھ ان کی فرض شناسی اور حُسنِ کارکردگی سے بہت خوش ہوئے اور انھیں دلّی میں لارڈ لیک کے یہاں اپنا وکیل مقرر کر دیا؛ یہ عہدہ آج کل کی سفارت کے مرادف تھا۔ یہاں بھی انھوں نے اپنے فرائضِ منصبی کو اس خوش اسلوبی سے ادا کیا کہ ایک طرف انگریز ان کی معاملہ فہمی کے مدّاح تھے، تو دوسری طرف مہاراجہ بہادر بھی اُن کی وفاداری سے ہر طرح مطمئن تھے۔ (۱۸۰۱ء) میں انگریزوں نے ریاست بھرت پور میں قلعۂ ڈیگ پر چڑھائی کی۔ احمد بخش کی درخواست پر دربار الور نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ یہ بڑی گھمسان کی لڑائی تھی۔ ایک موقع پر انگریز جرنیل فریزر کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ احمد بخش خان اپنی جان پر کھیل کر اُسے دشمنوں کے نرغے میں سے نکال لائے۔ میدان تو انگریزوں کے ہاتھ رہا، لیکن جرنیل فریزر کے زخم مہلک ثابت ہوئے اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ مرنے سے پہلے انھوں نے احمد بخش خان کو ایک سندِ خوشنودی لکھ دی جس میں حکومتِ انگریزی سے سفارش کی کہ احمد بخش خان کی خدمات کا مناسب صلہ دیا جائے۔ چنانچہ دلّی میں فتح کا دربار ہوا، تو لارڈ لیک نے انھیں فیروز پور جھرکہ، سانگرس، پونا ہانہ، بچھور، اور نگینہ کا علاقہ استمراری جاگیر میں عطا کیا اور فرمان میں اُن کا نام لکھوایا: "فخر الدولہ، دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر، رستم جنگ"۔ مہاراجا بختاور سنگھ نے اس پر اپنی طرف سے پرگنہ لوہارو کا اضافہ کر دیا۔



نواب ضیاء الدین احمد خان نیّر رخشاں دہلوی

نواب احمد بخش خان نے اپنے پیچھے چار بیٹے چھوڑے۔ ایک بیوی سے نواب شمس الدین احمد خان (ف: ۱۸۳۵ء) اور ابراہیم علی خان، اور دوسری سے نواب امین الدین احمد خان اور نواب ضیاء الدین احمد خان۔ شمس الدین احمد خان اپنے والد کی حینِ حیات ۱۸۲۶ء میں فیروز پور جھرکہ کے حکمران ہو گئے تھے۔ لوہارو کی جاگیر نواب احمد بخش خان نے اپنے دوسرے بیٹوں کے نام لکھ دی۔ ہماری زبان کے مشہور شاعر نواب مرزا داغ ان ہی نواب شمس الدین احمد خان کے بیٹے تھے۔

نواب احمد بخش خان اکتوبر ۱۸۲۷ء (ربیع الاول ۱۲۴۳ھ) میں فوت ہوئے۔ "بینو مقام فخر الدولہ" تاریخِ وفات ہے۔ دلّی کے باہر مہرولی میں درگاہِ حضرت خواجہ بختیار کاکی (ف: ۶۳۳ھ) میں مولانا فخر الدین کے مزار کے پائین مدفون ہیں۔

نواب ضیاء الدین احمد خان اپنے والدِ بزرگوار کی وفات کے وقت ۶ برس کے تھے؛ یہ فیروز پور جھرکہ میں اکتوبر ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ جائداد کی رُو سے پرگنہ لوہاروان کے ساتھ، ان کے بڑے بھائی نواب امین الدین احمد خان دونوں کے حصے میں آیا تھا۔ جب تک ضیاء الدین خان سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے، جائداد کا نظم و نسق بڑے بھائی کے ہاتھ میں رہا اور ان کے حصے کی آمدنی خزانے میں جمع ہوتی رہی۔ بالغ ہونے پر نواب ضیا الدین احمد خان نے مطالبہ کیا کہ مجھے بھی ریاست میں برابر کا شریک بنایا جائے۔ ورنہ ریاست دو حصوں میں تقسیم کر دی جائے۔ حکومتِ انگریزی نے یہ تجویزیں نامنظور کیں اور چونکہ بھائیوں میں کشمکش روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، اس لیے ۱۸۴۸ء میں فیصلہ کیا کہ آیندہ نواب ضیاء الدین احمد خان کو خزانۂ ریاست سے اٹھارہ ہزار روپیہ نقد سالانہ وظیفہ ملتا رہے، اور وہ ریاست کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ اس پر یہ لوہارو سے نقلِ مکان کر کے مستقلاً دہلی میں مقیم ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد یہ وظیفہ گھٹا کر بارہ ہزار سالانہ کر دیا گیا تھا، جو ملک کی آزادی تک ان کے خاندان میں جاری رہا۔

نواب ضیاء الدین احمد خان کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ علمِ تفسیر و حدیث حضرت شاہ عبدالقادر (ابن حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی) کے شاگردِ رشید مولوی کریم اللہ سے، ادب و فقہ جناب مفتی صدرالدین آزردہ سے، اور فلسفہ و منطق مولانا فضلِ حق خیر آبادی سے حاصل کیے۔ فارسی میں غالب کے شاگرد تھے اور مشق سے خود اس زبان کے استادِ بے بدل ہو گئے۔ عربی اور ترکی بھی اچھی جانتے تھے۔ ان کی فارسی میں استادانہ حیثیت کا اعتراف اُن کے معاصرین کو بھی تھا جس کا ثبوت مولانا شبلی مرحوم کی زندگی کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے

مولانا شبلی نے علی گڑھ کے قیام کے ابتدائی زمانے میں (۱۸۸۴ء) شیخ علی حزیں کی ایک زمین میں غزل کہی: حیراں چہ کنم، فراواں چہ کنم۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنے سے حاصل۔ آخر یہ ٹھہری کہ حزیں اور شبلی دونوں کی غزلیں اہلِ رائے حضرات کے پاس محاکمے کے لیے بھیجی جائیں۔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں (اور غالباً ذوالقدر خاں بہادر غلام غوث خاں بیخبر بھی) حکم ٹھہرے۔ دونوں غزلیں مقطعے حذف کرکے ان اصحاب کی خدمت میں بھیجی گئیں۔ سب نے فیصلہ کیا کہ شبلی کا کلام اہلِ زبان کی شان رکھتا ہے اور سلف کے کلام کا ہم پلہ ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نجوم اور ہیئت میں بھی اعلیٰ واقفیت رکھتے تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ میں ان کی دستگاہ کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ بالخصوص ایشیا کے مختلف ممالک کی تاریخ پر ایسا عبور رکھتا کہ حیرت ہوتی تھی۔ تمام عمر مطالعۂ کتب میں گذری۔ اُن کے کتابخانے میں مختلف علوم کی مستند اور بلند پایہ کتابیں موجود تھیں۔ افسوس کہ یہ سارا سرمایہ ۱۸۵۷ء میں وقفِ تاراج ہوگیا۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ بیس ہزار سے کم مالیت کا نہ ہوگا۔ غدر کے بعد پھر جمع کرنے لگے۔ مشہور مستشرق چارلس شیفر نے ناصر خسرو علوی کا سفرنامہ اور اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا تھا۔ اس نے فارسی مخطوطہ نیر رخشاں کے کتابخانے میں سے حکومتِ ہند کی وساطت سے حاصل کیا تھا۔ جب حکومتِ ہند کے سکرٹری ایلیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ لکھی، جس میں ہندستان کے فارسی اور عربی مؤرخوں کی کتابوں کے ترجمے شائع کئے ہیں، تو نواب ضیاء الدین احمد خاں نے انھیں فراہمیِ کتب اور ترجمے میں بہت مدد دی تھی، جس کا اعتراف صاحبِ موصوف نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔ نواب صاحب کا یہ کتابخانہ جو غدر کے بعد جمع ہوا تھا، اُن کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے نواب سعید الدین احمد خاں نے ندوۃ العلما کو دے دیا۔

غالب کے جو تعلّقات اس خاندان سے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ غالب کی بیوی امراؤ بیگم نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ جس زمانے میں نواب شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھرکہ کے حکمراں تھے، انھوں نے کوشش کی کہ کسی طرح لوہارو بھی مجھے مل جائے۔ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگئے اور یہ پرگنہ بھی انھیں مل گیا۔ اس معاملے میں غالب نے ان دونوں بھائیوں کا ساتھ دیا اور لوہارو کے نواب شمس الدین احمد خاں کی تحویل میں دیے جانے کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ اس علاقہ کی ان دونوں بھائیوں کے نام بحالی میں غالب کی مساعی کا بھی کچھ دخل

تھا۔

نواب ضیاء الدین احمد خان کی تعلیم و تربیت میں قدرتاً غالب نے بہت دلچسپی لی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں نیّرؔ اور اردو میں رخشاں تخلص تھا۔ اپنے استاد کے مایۂ ناز شاگرد ثابت ہوئے اور میرزا کو ان پر فخر تھا۔ انھوں نے ایک زوردار فارسی قصیدہ نیّر رخشاں کی مدح میں کہا ہے (قصیدہ ۶۲) غالب نے اپنی زندگی میں سندِ خلافت لکھ دی تھی۔ خلیفۂ اوّل نیّر رخشاں مقرر ہوئے، اور خلیفۂ دوم نواب علاء الدین احمد خان علائی۔ نیّر رخشاں کا تمام کلام نظم و نثر بھی غدر میں ضائع ہوگیا تھا۔ بعد کو جو کچھ جمع ہو سکا، اُسے ان کے صاحبزادے نواب سعید الدین احمد خان طالب نے "جلوۂ صحیفۂ زرّیں نیّر رخشاں" کے تاریخی نام سے شائع کرایا تھا (۱۹۱۵ء)۔

مدّت سے ضیق النفس کا عارضہ تھا جس سے آخر عمر میں بہت مضمحل ہو گئے تھے۔ "موت سے پہلے صرف دو تین روز تپ رہی، تیسرے دن شدّت اور اس کے ساتھ بے ہوشی بھی ہوگئی۔ ایک رات اور آدھے دن یہی حالت رہی۔" آخر شنبہ ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ (مطابق ۲۷ جون ۱۸۸۵ء) دوپہر کے وقت رحلت فرمائی۔ اسی دن شام کے پانچ بجے اجمیری دروازے کے باہر نمازِ جنازہ ہوئی اور مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی قدس سرہٗ کی درگاہ میں اپنے والدِ ماجد اور برادرِ بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

مولوی رضی الدین احمد خان دہلوی نے ہمشِل مادّۂ تاریخ بہم پہنچایا۔ جس پر مولانا حالی نے مصرعے لگائے۔

چون ضیاء الدین احمد خاں کشید — رخت از دنیا سُوے دار السّلام
گفت ہاتف بارضی، سالِ وفات — "روزِ شنبہ، سیزدہ شہرِ صیام"
(۱۳۰۲)

یہی کتبہ لوحِ قبر پر کندہ ہے۔ خود مولانا حالی نے اس موقع پر دو رباعیاں کہی تھیں۔

غالب ہے، نہ شیفتہ، نہ نیّر باقی — وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی، اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طنّاز — آتے ہی خزاں کے سب کر گئے پرواز
تھی باغ کی یادگار، اک بلبلِ زار — سو اُس کی بھی گل سے نہیں آتی آواز

شمس العلماء مولانا شبلی نے فارسی زبان میں مرثیہ لکھا تھا، جو اُن کے کلیات میں موجود ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خان کا نکاح شرف الدولہ قاسم جان کی پوتی اور مرزا قدرت اللہ خان کی صاحبزادی امتیاز زمانی بیگم عرف حاجی بیگم (وفات ۵ اکتوبر ۱۸۹۵ء) سے ہوا تھا۔ اولاد میں ایک صاحبزادی معظم زمانی بیگم صاحبہ اور دو صاحبزادے شہاب الدین احمد خان ثاقب اور احمد سعید خان طالب تھے۔ ثاقب زندگی ہی میں انھیں جوانا مرگی کا داغ دے گئے۔ طالب ۱۹۱۹ء تک زندہ رہے۔ دونوں کے حالات لکھے جا چکے ہیں۔ معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم کا نکاح زین العابدین خان عارف کے بڑے صاحبزادے باقر علی خان کامل سے ہوا تھا۔ اُن کا بھی ۱۰ مئی ۱۹۴۵ء کو انتقال ہو گیا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

تخلص کے لحاظ سے پہلے چند شعر فارسی کے لکھتا ہوں:

مکن ہلاک کہ شادم بہ ناروائی خویش — بروے من بکشا، چشمِ اعتبارِ مرا
دلش بسوخت چو بر کار ہاے بے مُزدم — وفا نتیجہ بہ از مُزد دادِ کارِ مرا
نمودہ سعی بہ بے برگی من و خجلم — بکیسہ نیست چو پا مُزد روزگارِ مرا
ز تیرہ روزی و آشفتگی و رنجوری — بسنج خالِ رُخ زلف و چشمِ یارِ مرا

جامِ شراب برکف و نوشیں لبے بسبر — دیگر ز حق بگو، کہ ترا التماس چیست
نیرؔ! نقاب گر نفگند از رُخش نسیم — وجہ بباد دادنِ ہوش و حواس چیست

شکستہ طرفِ کلاہ و کشودہ بندِ قبا — چہ بے خودانہ بتِ مے گسار می آید
روشِ دہر بیک گونہ نباشد نیرؔ! — نہ چنیں بود کہ ہست و چناں است کہ بود

ہر نفس تازہ سپاسے بزباں می آید — کہ غمے تازہ نوا زندۂ جاں می آید
بدروں خستگیم بیشتر ست از بیروں — کہ فزوں تر دلم از لب بفغاں می آید
اے اجل! مہلتِ نظارہ کہ اندُہ خواراں — می سرایند کہ می آید و ہاں می آید
باشد آزاد ز ہفتاد و دو ملت نیرؔ — ہر کہ در سلسلۂ پیرِ مغاں می آید

گویی کہ فضلِ حق رسد و ناگہاں رسد — خوش طالعی کہ جذبۂ شوقے بجاں رسد
بر رغمِ محتسب سرِ بازار در کشیم — گر ساغرے ز پیرِ مغاں ارمغاں رسد
نیرؔ! بہ آسماں نہ نہم بازپاے ناز — گر ایں سرِ نیاز، بر آں آستاں رسد

اشکے کہ نہ در یادِ تو، از چشمِ تر افتاد — در دیدۂ صاحب نظراں از نظر افتاد
عطار دوم دشنہ و حلاج و سرِ دار — در موقفِ تسلیم، چہ خوں ہا بدر افتاد

گردم سر پا لغزِ تو، اے ساقیِ بدمست!
نے در قدحم از دگراں بیشتر افتاد

پیشِ درِ میکدہ سر بخمیدن دہیم
نشۂ اقبال را اوجِ رسیدن دہیم

وعدہ بفرداست گر، مرحلہ بیش نیست
شوقِ سبک تاز را، گامِ دویدن دہیم

از نالہائے زار بتابم کہ دوست را
بیخواب کردہ دوش، آوا گریستن

نیرؔ بہ پردہ داریِ دردِ تو داشت سعی
افشائے راز می کند، امّا گریستن

باشم بدہر تا کجا شاد
بینیم بخواب، خواب تا کے

حرماں بامید نسیۂ شہد
از نقدِ شرابِ ناب تا کے

نشناختہ .بوالہوس ز جانباز
بے مصرفیِ عتاب تا کے

اردو کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شاید بہار آئی کہ جو پنجۂ جنوں
پھر کر رہا ہے جامۂ دستار تار تار

سر پیٹے، سینہ کوٹے، کہ افسوس میں ملے
عاشق کو ہاتھ چاہییں ناچار چار چار

رخشاں پہ غصّے قیس کے ملنے سے کیوں ہوئے
ملتے ہی ہیں بہم بُتِ عیّار یا یار

فلک گر نہ تھا، بار اٹھانے کے قابل
تو کیا تھے ہمیں، آزمانے کے قابل

حیرت میں ہوں کہ نوکِ مژہ نیشتر مثال
کُھبتی ہے گر جگر میں، تو کیوں خوں چکاں نہیں

گر انتہا نہیں، ستم و جورِ یار کو
شوقِ زیادہ جو کو مرے بھی گراں نہیں

مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا! لیجیو سنبھال ہمیں

میرے غصّے نے ایک دم میں کیا
مُردۂ صد ہزار سال ہمیں

طالع بد سے نیرِ رخشاں!
اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

دل میں مضمر ہیں معنیِ باقی
کسی صورت نہیں زوال ہمیں

نقص سے رنج کچھ نہیں، رخشاںؔ!
حق نے بخشا ہے یہ کمال ہمیں

پیری و مفلسی میں نہ لو نامِ مے کہ اب
لطف ارتکاب میں ہے، نہ اجر اجتناب میں

کیا پہنچے تو، فرشتے کا جس جا گزر نہ ہو
بیت الصنم ہے، شیخ! خدا کا یہ گھر نہ ہو

رخشاںؔ! جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک
آنکھوں میں آ گیا کوئی لختِ جگر نہ ہو

.بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہش
لے کے گُل قبر پہ رخشاںؔ کی نہ آیا کیجے

مندرجۂ ذیل غزل انڈیا آفس لائبریری کی ایک قلمی بیاض[1] سے لی گئی ہے (ص ۵۶) یہ بیاض فہرست میں بیاضِ بسمل، مرتبہ سید اصغر علی کے عنوان سے درج ہے۔ یہ غزل آج تک کہیں شائع نہیں ہوئی۔

لے خبر میری کہ اب غم کی مجھے تاب نہیں
آدمی ہوں، نہ ملک، گرچہ خور و خواب نہیں

آنکھ سے نکلے، وہیں جذب ہوئے دامن میں
بجز اشکوں کے کوئی گوہرِ نایاب نہیں

یاس ہے رجعتِ ایامِ گذشتہ سے[2] ہمیں
گردشِ دہر ہے، یہ گردشِ دولاب نہیں

خون کرنے میں[3] عدو نے کہیں وہاں دھویا ہاتھ
یاں ٹپکتا مری آنکھوں سے جز خوناب نہیں

آبِ شمشیر کے اک قطرے سے کیا تر ہو وہ حلق
سات دریا سے جو ہوتا کبھی سیراب نہیں

ایک قطرہ نہ ملیگا تمھیں، منھ دھو رکھو!
زاہدو! بادہ ہے، زمزم کا یہ شوراب نہیں

ہم ہی جب پھک چکے، پھر کیا ہمیں پروائے جہاں
نکل اے آہ کہ بس ضبط کی اب تاب نہیں

جتنے ہو نغمہ سرا، اتنے ہی خونریز بھی ہو
چھیڑ نشتر کی چلی جائے جو مضراب نہیں

اے دلِ شاد! الگ ہو، مرے سینہ میں نہ رہ
مجھ کو معلوم عزا خانے کے آداب نہیں

چلے آؤ شبِ تاریک میں، کیسی شبِ ماہ
کیا ہوا، ایک اگر کرمکِ شب تاب نہیں

نازنیں زلف کمر میں نہ لپیٹا کیجے
سرو کو کیا خطرِ پیچشِ لبلاب نہیں

نیلوفر ہے ترے خورشیدِ رخِ روشن سے
گریہ میں چشم جو بیٹھی، یہ تہِ آب نہیں

کن کو احباب سمجھتے ہیں یہ غم ہے رخشاں
یہ نہیں ہے کہ انھیں خاطرِ احباب نہیں

[دیباچۂ جلوۂ صحیفۂ زرّیں نیّرِ رخشاں؛ دیباچۂ دیوانِ معروف؛ مرقع الور؛ ذکرِ غالب؛ بیاض کتابخانہ انڈیا آفس]

واجد علی شاہجہانپوری

(دیکھیے ص ۴۴۲ کتاب ہذا)

۱۔ B-66 : I.O.L.—F 59 (B)

۲۔ بیاض میں "بھی" لکھا ہے ۳۔ بیاض: سے

وحید — وحید الدین احمد خان بہادر دہلوی ثم حیدرآبادی

بڑے عالی نسب شخص تھے۔ ان کا خاندان شاہی میں صاحبِ جاگیر و منصب اور مختلف عہدوں پر ممتاز رہا۔ وحید کے والد عمدۃ الامرا ضیاء الدولہ حافظ الملک سعد الدین احمد خان بہادر اور جدِ امجد رکن الدولہ مشیر الملک رکن الدین خان تھے۔

وحید ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ - ۱۸۵۲ء) میں دلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ حیدرآباد دکن منتقل ہو گئے۔ جہاں ان کے بڑے بھائی جناب مولوی بشیر الدین احمد خان بہادر ناظمِ جمعیت، سرکارِ نظام تھے۔ وحید بھی مدتوں اضلاع کی تعلقداری کے عہدے پر فائز رہے۔ دلی بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ ۱۳۲۱ھ میں زندہ تھے۔

شاعری بہت کم عمری میں شروع کی۔ غالب سے مشورہ کیا اور ان کے علاوہ کسی اور کو کلام نہیں دکھایا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

نہ چاہی ضبط نے رسوائیِ عشق — نہ آیا رازِ دل ہرگز زباں تک
جفا کی بھی نہ ہو جب تجھ سے اُمید — ازفا کوئی کرے آخر کہاں تک
ملامت کر نہ واعظ! میکشوں کو — یہاں بدمست ہے پیرِ مغاں تک
چمن میں حشر برپا ہو رہا ہے — بچے گا کون، پایانِ خزاں تک

تھا یوں تو غمِ عشق سے دل ریش، جگر چاک — وحشت میں ہے اب باعثِ آرایش، سر چاک
اے دشنۂ غم! کیوں شبِ فرقت میں کمی کی — سینہ نہ ہوا مثلِ گریبانِ سحر چاک
ہرچند اثرِ داغ سے محروم نہیں دل — منجملۂ اسبابِ تسلی ہے جگر چاک

کس طرح چلا آتا ہے دیکھو تو وحید آج — دامن ہے اِدھر چاک، گریباں ہے اُدھر چاک

سراپا زخم ہوں، صد آفریں اس ناوک افگن کو
سیے کیا خاک، حیرت ہوگئی ہے چشمِ سوزن کو
نہ ترکش ہو کہیں خالی، نہ رحم آجائے، یہ ڈر ہے
کبھی ناوک فگن کو دیکھتا ہوں میں، کبھی تن کو
نمودِ خاک سے بھی ہے، ہماری خستگی پیدا
غبارِ راہِ مجنوں جانتے ہیں لوگ مدفن کو
غضب ہے بے ارادہ حسرتِ دشمن نکلتی ہے
وحید! اس کی گلی میں کیوں بنایا میرے مدفن کو

مُنھ سے ہنوز اس نے اٹھایا نہ تھا نقاب — پامالِ ناز ہوگئے، ہم اک ادا کے ساتھ
ہے آرزوئے خاطرِ جاناں عزیز تر — یارب نہ ہو حصولِ تمنّا دعا کے ساتھ

[تزکِ محبوبیہ (۲) دفترِ ہفتم: ۱۷۳-۱۷۴، یادگارِ ضیغم (قلمی)]

وفاؔ و طالبؔ ـــ میر ابراہیم علی خان سہسوانی

نقوی حسینی سید تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت خواجہ قطب الدین مودودی کے واسطے سے حضرت امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ یہ خاندان سہسوان (ضلع بدایوں) کا رہنے والا تھا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں ان کے جدِ اعلیٰ میر سرفراز علی خان یہاں سے نقلِ مکان کر کے بڑودہ چلے گئے۔ یہ مہاراجا گووند راؤ گائیکواڑ کا عہد تھا۔ میر صاحب موصوف آدمی قابل اور باہوش تھے؛ بہت جلد ترقی کی، اور انگریزوں اور ریاست دونوں کے ہاں رسوخ پیدا کر لیا۔ مہاراجا نے ان کی کارکردگی سے خوش ہو کر انھیں کاٹھیاواڑ میں کھانڈیا اور دراوڑی اضلاع جاگیر دوامی میں عطا کیے۔

میر سرفراز علی خان کے دو بیٹے تھے، بڑے میر اکبر علی خان اور چھوٹے میر جعفر علی خان۔ میر اکبر علی خاں ریاست میں سلحدار تھے؛ وفاؔ انھیں کے خلفِ اکبر تھے۔ یہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں پیدا ہوئے۔ (ان کے خواجہ تاش حکیم سید احمد حسن فداؔ نے ان کا تاریخی نام "سید غلام حسن" لکھا ہے)۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اور تکمیل سورت میں جناب منشی لطف اللہ فریدی سے کی۔ جب ۱۸۶۰ء میں ان کے والد میر اکبر علی خان کا انتقال ہو گیا تو یہ ان کے جانشین ہوئے اور سلحداری کا عہدہ ان کے سپرد ہو گیا۔

وفاؔ کے پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا۔ اس پر تصوف کے شغف نے رنگ اور چوکھا کر دیا؛ وہ احمد آباد کے صوفی بزرگ محمود میاں چشتی سے بیعت تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر سال اپنے مکان پر محفل میلاد منعقد کرتے اور خود نعتیہ کلام سناتے۔ کچھ ان کی پُرسوز و اثر آواز، اور بہت حد تک ان کے حسنِ نیت کے باعث حاضرین مبہوت ہو جاتے۔

بڑودہ کے تعلق سلحداری کے باعث وہاں کے سردار درجۂ اول تو تھے ہی، انگریزی حکومت



میرابراہیم علی خان وفا سہسوانی

کی طرف سے بھی انھیں سی، آئی، ای کا اعزاز عطا ہوا تھا۔ یہ تمغہ انھیں دلّی دربارِ منعقدہ ۲۸ نومبر ۱۸۸۱ء (۶ محرم ۱۲۹۹ھ) کے موقع پر بڑودہ میں ملا۔ سید احمد حسن فدا نے تاریخ کہی:

قیصرِ ہند نے جو دہلی میں | پھر دربار سب کو بلوایا
شاہِ کلکتہ نے براہِ کرم | تمغہ بھی اکثروں کو دلوایا
دوسروں کو ملا جو واں جاکر | میر صاحب کا بخت یاں لایا
ہمسروں میں بفضلِ ربِّ وُدود | تیرا، گھر بیٹھے، بڑھ گیا پایا
کیوں نہ بڑھ جائے مرتبہ تیرا | تیرے پیروں کا تجھ پہ ہے سایا
تجھ کو کیا اعتقاد کامل کا | ہوگیا ہے نصیب سرمایا
حشمت و جاہ و عزّت و اقبال | منھ سے بن مانگے، تو نے سب پایا
فکرِ تاریخ کی ہوئی جو فدا! | ہاتفِ غیب نے یہ فرمایا
پائے محمود[۵] چوم لے اور لکھ | "آج تمغائے قیصری آیا"

(۴ + ۱۸۷۷ = ۱۸۸۱)

وفا نے بڑودہ کے منشی غلام قادر کی صاحبزادی سے عقدِ نکاح کیا۔ جس سے چار بیٹے ہوئے میر احتشام علی خاں، میر یوسف علی خاں، میر ناصر علی خاں اور میر محمود علی خاں۔ میر احتشام علیخان بہادر بھی شاعر تھے، جادو تخلص تھا اور پہلوانِ سخن مولانا نجم الدین احمد ثاقب بدایونی کے شاگرد تھے؛ ظہیر دہلوی سے بھی کچھ مشورہ کیا تھا۔

جادو یکشنبہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ (۱۶ اگست ۱۸۶۸ء) پیدا ہوئے تھے۔ جب حکیم سیّد احمد حسن فدا نے غالب کو ان کی ولادت کی خبر لکھی، تو میرزا نے اس پر ایک رباعی اور ایک قطعہ کہا۔ رباعی یہ تھی:

حق داد بہ سید زپے انعامش | فرخ پسرے کہ واجب است اکرامش
تاریخِ ولادتش بود بے کم و بیش | "ارشاد حسین خان" کہ باشد نامش

گویا غالب نے "ارشاد حسین خان" ان کا تاریخی نام تجویز کیا تھا۔ لیکن چونکہ خاندان میں سب نام "علی خاں" کے لاحقے سے چلے آرہے تھے، اس لیے کسی نے یہ نام منظور نہ کیا اور احتشام علی خان نام رکھا گیا۔ غالب نے اسی موقع پر یہ قطعہ بھی کہا تھا:

---

۵ اشارہ ہے ان کے مرشد حضرت محمود چشتی کی طرف

غالب حالِ سنینِ ہجری — معلوم کن از "خجستہ فرزند"
چوں یک صد و بست و چار ماند — این است شمارِ عمرِ دلبند

اس کی تشریح میں لکھتے ہیں: "یہ تو ظاہر ہے کہ سنہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ جب "خجستہ فرزند" میں سے ۱۲۸۵ھ لے لیے، تو ایک سو چوبیس بچتے ہیں؛ ان کو میں نے دعاے عمرِ مولود قرار دیا۔"
اسی موقع پر انھوں نے "ایک عبارتِ رنگین بھی مرتب کر کے اکمل الاخبار" میں چھپوائی تھی۔ کسی نے یہ عبارت میرزا کے نثری مجموعوں میں شامل نہیں کی؛ خدا معلوم، کیوں!
میر ابراہیم علی خاں نے اگست ۱۸۸۸ء کے بعد کسی وقت بڑودہ ہی میں انتقال کیا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

بجالاؤ وفاؔ! شکرِ خدا، ہو صاحبِ قسمت — کیا استاد اپنا تم نے غالب سے سخنداں کو
بہت دم بھی دیے، کیں التجائیں، پر نہ آئے وہ — وفاؔ! ہم کو نہایت ناز تھا، جادو بیانی پر

وہاں نہ جانے کا لیتے ہو وعدہ مجھ سے وہ لے — زباں سے لاکھ کہوں، دل پر اختیار نہیں
نہ دو دل اُس گلِ رعنا کو، اے وفاؔ! دیکھو — گلوں کے حسنِ دو روزہ کا اعتبار نہیں

کب لبوں پر مرے نالے نہیں، فریاد نہیں — کب تری وعدہ فراموشی مجھے یاد نہیں
شاد ہوں، سینے میں جب سے دلِ ناشاد نہیں — اب وہ شیون نہیں، وہ نالہ و فریاد نہیں
رنجِ عشاق سے کب چین ہے معشوقوں کو — صید کی فکر میں صیاد بھی آزاد نہیں
چھیڑنے کو یہ جفا اس کی، وفا ہے، ورنہ — طبع اُس شوخ کی کچھ مائلِ بیداد نہیں

ہوئی آخر تمھارے ہجر میں یہ جوششِ وحشت — اجاڑا ہم نے بستی کو، بسایا جا کے ویرانہ
بیانِ دردِ فرقت کر کے، تم احساں جتاتے ہو — کہانی آپ کی سن لی، مرا اب سنیے افسانہ

ارمان کچھ ارم کے نہ باغِ جناں کے ہیں — ہم تو نثارِ سیّدِ کون و مکاں کے ہیں
تیرِ نگاہِ یار کا آماجگاہ ہو ا — یہ حوصلے ہمارے دلِ ناتواں کے ہیں
کہتے ہیں آسماں پہ ملائک بھی الحفیظ — شعلے بلند یہ مری آہ و فغاں کے ہیں
بس ہے، بسر ہو عمرِ دو روزہ جو چین سے — ارمان کس کو زندگیِ جاوداں کے ہیں
کیا غم جو ہو وسیلۂ محمود حشر میں — طالب! مرید آپ تو قطبِ زماں کے ہیں

[خمخانۂ جاوید، ۲: ۴۹۱؛ معاصر، پٹنہ، ۴: ۱۴۰ - ۱۴۳؛ سخنورانِ گجرات: ۲۲۳، ۲۲۷۔ دو ماہی اکادمی، لکھنؤ، ۱۰: ۴۲ - ۴۴؛ اردوے معلیٰ: ۱۷۷]

وفاؔ و اختؔر و تبراکتؔ ـــــ خواجہ عبد الغفار جہانگیر نگری

ڈھاکہ کا خاندانِ خواجگان بہت مشہور رہا ہے۔ اس میں دین و دُنیا دونوں کے مشاہیر پیدا ہوئے۔ اصل میں یہ خاندان کشمیر کا تھا، جہاں سے یہ لوگ تجارت کے سلسلے میں نقلِ مکان کر کے ڈھاکہ میں بس گئے۔ سب سے پہلے جو شخص یہاں آئے وہ خواجہ مولوی حفیظ اللہ تھے۔ اسی سلسلۂ طلائ ناب کی ایک کڑی خواجہ عبد الغفّار تھے۔ ان کے والد کا نام خواجہ عبد الغفور تھا۔ خواجہ عبد الغفار فارسی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ پہلے چندے اپنے ایک بزرگ خواجہ عبد الرحیم صبا سے مشورہ کیا؛ دیوان بھی مرتّب کر لیا تھا، جو ضائع ہو گیا۔ پھر مرزا رجب علی اثیر کے ڈھاکے آنے کے بعد شاعری کا خفتہ شوق بیدار ہو گیا اور از سرِ نو اس میں دلچسپی لینے لگے۔ فارسی میں تخلص وفا تھا، اور اُردو میں اختر۔ غالب کے علاوہ کلام پر اصلاح حافظ اکرام الدّین احمد ضیغم سے بھی لی۔ ریختی

۵ حافظ اکرام الدین احمد ضیغم۔ حافظ میاں قطب الدین کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان سے تھے۔ ۱۲۰۳ھ (۸۹-۱۷۸۸ء) میں پیدا ہوئے۔ شروع میں حشمت تخلص کرتے تھے، بعد کو ضیغم کر لیا۔ ہزل اور ریختی اور مرثیہ میں تخلص مہمان رکھا۔ کلام پر اصلاح میاں احمد حسین راحت اور جناب رؤف احمد راحت سے لی؛ جناب راحت کے خویش بھی تھے۔ بڑے قادر الکلام شخص تھے، اور جمیع اصناف سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی، تاریخ گوئی میں بھی یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ نسّاخ نے اپنے تذکرہ میں ان کی غزل دی ہے جو متعدّد بحروں میں ہے، اور ان میں سے ۱۹ بحروں کے مطابق تو انھوں نے خود تقطیع بھی کی ہے؛ اس سے ضیغم کی عروض میں مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ شاعری کے علاوہ طب، ڈاکٹری اور دوسرے علوم و فنون میں بھی خاصی دستگاہ تھی۔ کیمیاگر مشہور تھے۔ مختلف ملکوں کی سیر بھی خوب کی تھی۔ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۰-۷۱ء) میں ڈھاکہ میں انتقال کیا۔

(سخن شعرا: ۲۹۲؛ شمیم سخن: ۱۵۷-۱۵۸؛ انتخاب یادگار: ۲۰۷؛ تذکرہ کاملانِ رامپور: ۴۹)۔



خواجہ عبدالغفّار خان وفؔا جہانگیر نگری

بھی کہتے تھے، اور اس میں نزاکت تخلّص کرتے تھے۔ آخر عمر میں نعت کا شوق پیدا ہوا اور اس میں بھی اپنی طبیعت اور عقیدت کے جوہر خوب دکھائے اور مقبول ہوئے۔ کبھی کبھی "شیخ بنگالی عاصیؔ" کے قلمی نام سے بھی لکھتے تھے۔ ان کی زندگی بھر یہ راز نہیں کھلا کہ اس پردے میں کون "معشوق" ہے۔ ان کی وفات کے بعد جب ان کا مجموعۂ کلام حکیم حبیب الرحمن (مصنّف ثلاثۂ غسالہ) نے وفاؔ کے صاحبزادے خواجہ عطاء اللہ سے دیکھنے کو لیا تو پتا چلا کہ "شیخ بنگالی عاصیؔ" یہی ہمارے وفا ہیں کیونکہ عاصی کے نام کا کلام اس غیر مطبوعہ مجموعے میں موجود تھا۔

دیوان شائع نہیں ہوا، اگرچہ ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ پچھلے دنوں ان کے نعتیہ کلام کا ایک مختصر مجموعہ "منظومۂ اختر" ڈھاکا یونیورسٹی کے کتابخانے میں دستیاب ہوا تھا۔ اسے پروفیسر کلیم سہسرامی (راجشاہی یونیورسٹی۔ بنگلادیش) نے شائع کردیا ہے۔

۱۲۹۷ھ (۱۸۸۱ء) میں انتقال ہوا۔ نسّاخ نے تاریخ کہی:

اختر آں مہرِ آسمانِ سخن — رفت چوں ازسرائے رنج و ملال
قلمِ دلفگار، اے نسّاخ! — "اخترِ نیکوئے" رقم زد سال
(۱۲۹۷ھ)

کلام کا انتخاب یہ ہے:

چشم بکشا، کہ ابرِ گوہر بار — قطرہ زن شد، بساحتِ گلزار
تیغِ کہسار، از دمیدنِ سبزہ — ہمچو فولاد، گشت جوہر دار
سبزہ صد پیرہن نجود بالا — سرو آید بوجد در رفتار

آب بخشد بحر را ایں چشمِ طوفاں خیزِ ما — تابِ آتش را دہد، آہِ شرر انگیزِ ما
جیب و داماں شد گلستاں ز اشکِ خونبہا ببیں — بوالعجب، نیرنگ ہائے دیدۂ گلریزِ ما

اے روح و رواں! دارُوے دل، چارہ گرِ جاں! — اے ختمِ رسل، قبلۂ دیں، کعبۂ ایماں
اے نور ز تو عکس فگن آیتِ توحید — در وصفِ تو اندیشہ خجل، ناطقہ حیراں
گردِ رہِ رہوارِ تو کحل البصرِ دل — خاکِ تہِ نعلینِ تو نورِ نظرِ جاں

شکوہ، بزمِ غیر میں جانے کا کیجے، تو وہ شوخ — ہنس کے کہتا ہے کہ "واں میری بلا بیٹھی تھا"
جی میں ہے، کہیے بوقتِ میکشی، منھ چوم کر — اے صنم، یہ نشّہ مے کی خطا تھی، میں نہ تھا
آئی نہ قیامت، ترے اصرار سے اب تک — جی اُٹھے نہ مُردے، تری گفتار سے اب تک

آج اُس کا رُوئے تاباں دیکھیے
دیکھیے مہرِ درخشاں دیکھیے
پرتوِ انجم پہ کیوں کیجے نظر
کیوں نہ اپنے گھر چراغاں دیکھیے

حیرت ہے اس کے آنے پر کیا پیشکش کروں
سینے میں دل رہا ہے، نہ جاں اپنے تن میں ہے
پھولا ہوا خوشی سے، ہر اک گل ہے اے نسیم!
کس نو بہارِ حسن کی آمد چمن میں ہے

نہ دل اپنا ہوا، نہ یار اپنا
دیکھیں کیا ہو مآلِ کار اپنا
آنکھیں جاتی رہینگی آخر کار
یہ دکھاتا ہے انتظار اپنا
کعبہ و بتکدے کو جا دیکھا
ہوئے کس جا بر آرِ کار اپنا
گئے صبر و قرار، تاب و تواں
نہ رہا کوئی غمگسار اپنا

کُوئے جاناں میں ہم تو جا نہ سکے
حال اپنا اُسے سُنا نہ سکے
صحبتِ بد، حجاب کار ہوئی
وہ طبیعت اِدھر کو لا نہ سکے
دل کا پوچھا نشاں تو شرمائے
جانتے تھے، مگر بتا نہ سکے
تیغ سے اس کی ہم گلے نہ ملے
اپنا جوہر اُسے دکھا نہ سکے
زورِ ناطاقتی نے دکھلایا
سر کو بالیں سے ہم اُٹھا نہ سکے

جنوں! شورش فزائی ہو چکی بس
بہارِ آشنائی ہو چکی بس
چلے میخانے کو، کعبے سے ناصح
اب ان کی پارسائی ہو چکی بس
جو ہے یہ خوشنوائی تیری، اختر!
تو پھریاں سے رہائی ہو چکی بس

رُباعیات

اک عمر یہ میں نے خوش معاشی کی ہے
اشکوں سے چمن میں آب پاشی کی ہے
دشوار ہے اب سانس بھی لینا، ہمدم!
آہوں نے مری یہ دل خراشی کی ہے

گر خضر نے عمرِ جاودانی پائی
یا آبِ حیات کی نشانی پائی
کیا ناز کرے اُس پہ کہ جب آخر کار
مرنے کے لیے نہ زندگانی پائی

دنیا ہے طلسم رنج و حسرت، اختر!
اور زندگی آئینۂ حیرت، اختر!
سب سانگ کا عالم ہے جو یاں دیکھے تو
شادی و غم و کلفت و الفت، اختر!

شکرانہ ادا حق کا کرتی ہوں دوگانہ میں
سایہ ہے مرے سر پر آج اس کی عنایت کا

رنگیںؔ کے گویا ڈھب پر یہ ریختی لکھی ہے
بنگالہ میں ہوئیگا، اب نام نزاکتؔ کا

[شمع انجمن: ۵۲۷؛ سخن شعرا: ۱۶؛ مشرقی بنگال میں اردو: ۵۰- ۵۳؛ تواریخ ڈھاکہ: ۳۴۱ - ۳۴۲؛ مشرقی پاکستان کے ادیب: ۲۹- ۳۲؛ غالب نامہ، ۴: ۲: ۷۰ - ۱۰۲]

وکیلؔ ـــــ منشی شکور احمد پانی پتی

ان کی صرف یہ ایک غزل رسالہ کمال (دہلی) سے ملی:

ملے یوں لطف میکشوں کو پیرِ میخانہ (کذا)
گرے جو بوند ساغر سے بنے تصویرِ میخانہ

بجائے خانۂ کعبہ ہوئی تعمیرِ میخانہ
زہے توقیرِ میخانہ، زہے تقدیرِ میخانہ

نظر آجائے اُس خورشیدِ وحدت کا مجھے جلوہ
کوئی ایسا بھی ساغر دے کبھی اے پیرِ میخانہ!

بلا ہے دیدۂ حق بیں جسے، وہ دیکھ لیتا ہے
نظر آتی ہے اُس کو دُور سے تنویرِ میخانہ

سمجھتے ہیں اِسی کو کعبۂ مقصود سب اپنا
کہاں تک عاشقوں کے دل میں ہے توقیرِ میخانہ

پسِ مُردن بھی اُلفت دخترِ رز سے جائیگی
مری گِل سے بنیگی ایک دن تعمیرِ میخانہ

مے گلرنگ سے دل کی دورنگی دور ہو جائے
کوئی ساغر خدا کی راہ کا دے، پیرِ میخانہ!

الٰہی! کیا ہوا پلٹی، یہ کیسا انقلاب آیا!
جہاں مسجد تھی کل تک آج ہے تعمیرِ میخانہ

[رسالہ کمال (دہلی) اکتوبر - دسمبر ۱۹۱۲ء]

ولی ـــــ مولوی آمو جان دہلوی

مدرسی پیشہ تھے پہلے مدّت تک دلّی میں ملازم رہے؛ اس کے بعد فیروزپور جھرکہ کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوکر چلے گئے۔ ۱۹۰۲ء میں پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ حضرت سید محمد غوث علی شاہ سے بیعت تھے۔ اردو فارسی دونوں میں شوق فرماتے تھے۔ ۱۸۷۷ء کے دربارِ قیصری کے حالات میں مسٹر اسٹوک نے ایک انگریزی نظم (Lay of Empress) لکھی تھی۔ ولی نے اس کا ترجمہ فارسی نظم میں "زمزمۂ قیصری" کے نام سے کیا۔ ۱۳۱۸ھ میں "رباعیات عجائبات آمو جان ولی" کے تاریخی نام سے مجموعۂ رباعیات شائع ہوا تھا۔

پردہ جبھی تلک ہے، کہ پردے میں ہے وہ شوخ
چہرہ کھلا، تو راز چھپایا نہ جائیگا
محشر میں روبرو مرے آکے کھڑا ہوا
جانا کہ اس سے شور مچایا نہ جائیگا
غم بے ستوں نہیں ہے، کہ آگے سے ٹال دوں
سینے کا سنگ ہے یہ ہٹایا نہ جائیگا

رباعی

برسوں میں جو کل رہ میں ملا وہ طنّاز
منھ پھیر چلا تیز، بصد شوخی و ناز
افسوس نہ ہم دوڑ کے، قدموں پہ گرے
سوچا کیے دنیا کے نشیب و افراز

حالِ دلِ شیدا تو چھپائے نہ بنے
سُن کر اسے بن میرے ستائے نہ بنے
کہنا بھی، نہ کہنا بھی، ہیں دونوں آفت
اب بات کوئی موت بن آئے نہ بنے

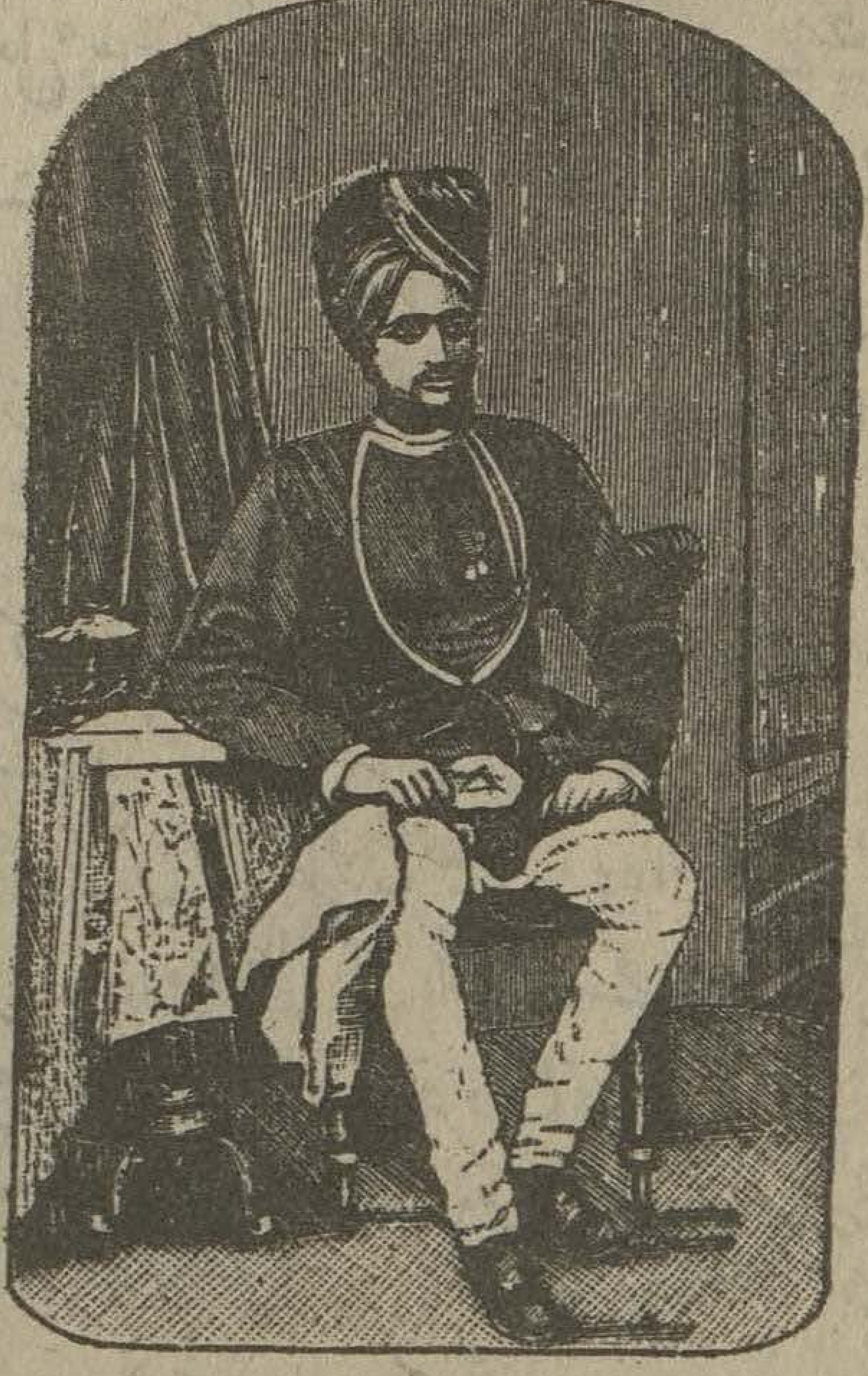
[سخن شعرا: ۵۵۷؛ دیباچۂ رباعیات ولی]

ہوشیار (بیمار) ـــــ مولوی حکیم محمد مراد علی

پنجابی الاصل اور سجادہ نشینان ڈھوڈہ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے دادا سید احسان علی طبابت کا پیشہ بھی کرتے تھے اور اسی حیثیت سے مہاراجہ صورت سنگھ والیِ بیکانیر نے انھیں مہارانی صاحبہ کے معالجہ کے لیے بیکانیر طلب کیا۔ خدا نے ان کے علاج سے مہارانی کو شفا بخشی۔ انعام میں مہاراجہ نے انھیں موضع دولت پورہ (معروف بہ رائے سنگھ پورہ) کی جاگیر عطا کی اور وہ یہیں بس گئے۔ سید احسان علی نے اپنا خاندانی پیری مریدی کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رکھا۔

ہوشیار کے والد کا نام سید کرم علی عرف میاں کریم جی تھا۔ ہوشیار سولہ سال کے تھے جب تعلیم کے لیے دلی آئے۔ عربی، فارسی نواب محمد قطب الدین خاں سے پڑھی اور اسی زمانے میں غالب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد ہندستان اور بیرونی ممالک کی سیر کے لیے نکل گئے اور اس دوران میں کشمیر اور کاشغر اور ختن تک کا چکر کاٹ آئے۔ واپس لوٹے تو محکمۂ پولیس میں سررشتہ داری اور انسپکٹری کے عہدوں پر فائز ہو گئے۔ اپنے خاندانی پیشۂ طب میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ جنگ نامۂ روم و روس، مسائلِ خمسہ اور متعدد نثری مضامین ان سے یادگار ہیں۔ اودھ پنچ اور دہلی پنچ کے نامہ نگاروں میں سے تھے۔

مراد علی جوانی کے عالم میں ۷ جولائی ۱۸۷۰ء کو اجمیر آئے اور یہاں ہفتہ وار اخبار راجپوتانہ گزٹ، کی ایڈیٹری کرنے لگے جس کے بانی کرنیل کیٹنگ (Keating) تھے۔ انھوں نے اسی زمانے میں اپنا ایک مطبع بھی "چراغ راجستھان" کے نام سے قائم کر لیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ "راجپوتانہ گزٹ" ان کی اپنی ملکیت میں آگیا تھا۔ یہ اخبار اس صدی کے



مولوی محمد مراد علی ہوشیار

شروع تک شائع ہوتا رہا۔ انھیں دنوں "انجمنِ حامیِ اسلام" کی طرف سے ایک ماہنامہ "رہنما" جاری ہوا تھا؛ اس کی ادارت بھی ہوشیار کے سپرد ہوگئی۔

ان کا طرزِ تحریر مزاحیہ بلکہ سوقیانہ اور حد درجہ جارحانہ ہوتا تھا۔ ہر ایک پر اعتراض کرنا اور معززز اور صاحبِ وجاہت لوگوں کی پگڑی اچھالنا ان کا وطیرہ تھا۔

ابتدا میں تخلص بیمار تھا اور اخیر میں اسے بدل کر ہوشیار کر لیا تھا۔ اپنی خود نوشت سوانحمری "یادگارِ مراد علی" میں لکھتے ہیں کہ میرا دیوان میرے مطبع کے ایک کاپی نویس نے چرا لیا تھا۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو۔ اشارۃً چرانے والے کا تخلص شگفتہ لکھا ہے۔ نثر میں "بوستانِ خواجہ" میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے حالات لکھے ہیں۔

۲۱ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ (۱۸ اگست ۱۹۰۰ء) میں اجمیر ہی میں انتقال کیا۔ فرحتی نے تاریخ کہی:

ہزار و سہ صد و ہژدہ گذشتہ از ہجرت
کہ کرد عزمِ حضوریِ سیّد الابرار

اجمیر کے باہر کوہ مدار کے دامن میں مدفون ہوئے۔

ان کی بیوی موتی بیگم بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں؛ وہ انتظامی امور اور صحافتی ذمّہ داریوں سے بھی خوب واقف تھیں۔ سیّد مراد علی کے انتقال کے بعد "راجپوتانہ گزٹ" انھوں نے اپنی نگرانی میں جاری رکھا، اور اسے خوب فروغ دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ بیمار کو سنجیدہ کلام کے علاوہ ہزل میں بھی مہارت تھی۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

چڑھ گئے رندوں کے ڈھب پر آج حضرت شیخ جی
کھل گیا چھٹا، میاں کے زہد بے بنیاد کا

عاشقِ زار کو ہرگز نہ ستاتا، ظالم! — خوف کچھ بھی جو تجھے ہائے خدا کا ہوتا

ہم مر گئے، تس پر بھی خطاوار ہی ٹھہرے — اندھیر یہ ہم نے تری سرکار میں دیکھا

اس ہستیِ موہوم پہ نازاں نہ ہو، ناداں! — اک دم کا بھروسا نہیں، بیمار! یہاں کا

دل نہ رکھے ہاتھ میں وہ صاحبِ دل کیا ہوا
جس کے قابو میں نہ ہو دل، پھر وہ کامل کیا ہوا!

نام والوں کے مٹائے، وائے سب نام و نشاں
اے فلک بے پیر! بتلا تجھ کو حاصل کیا ہوا!

واں اٹھی تیغِ نگاہ، یاں ہوگیا عاشق کا کام — جو نہ سمجھا اس کے تیور کو، وہ بسمل کیا ہوا!
کون تھا جو لے گیا، کیوں کر گیا، حیراں ہوں میں — تھا ابھی پہلو میں میرے، ہاے وہ دل کیا ہوا!
تیغ تو مجھ پر لگائی تھی، و لے اوچھی پڑی — پیشتر جو زور تھا تجھ میں وہ قاتل کیا ہوا!
موجزن ہے اس قدر، چاروں طرف طوفانِ اشک — پوچھتے ہیں خضر بھی گھبرا کے: "ساحل کیا ہوا!"

وہ مسیحا جب نہ آیا، ہم تڑپ کر رہ گئے
جان دینا ہم کو، اے بیمار! مشکل کیا ہو

کرتا ہے یاد ہم کو وہ صاحب جمال کب! — رہتا ہے اُس پری کو ہمارا خیال کب!
شرمندہ چاند ہے ترے چہرے کے سامنے — پایا ہے تجھ سا مہر نے حسن و جمال کب!
ڈسنے کو عاشقوں کے لیے سانپ ہیں پلے — دوشِ صنم پہ لٹکے ہیں کاکل کے بال کب!
صورت بنائے سے بھی بڑھا ہے کہیں شرف — محرابِ سجدہ ہے خمِ تیغِ ہلال کب!

بیمار مر گیا، تو رقیبوں سے یہ کہا:
"ہوتا ہے ایسی باتوں کا ہم کو خیال کب!"

ان کا ایک مختصر مجموعہ "گلدستۂ ہوشیار" (مطبع چراغِ راجستان، اجمیر، ۱۸۹۵ء) نظر سے گزرا۔ بیشتر کلام مزاحیہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

آسماں پر شور پہنچے گر مری فریاد کا — رنگ مثلِ دود، اُڑ جائے ستم ایجاد کا
باغ میں آتا ہے شاید آج وہ رشکِ قمر — قمریوں میں ہر طرف غل ہے مبارکباد کا
کوچۂ عشقِ بتاں میں آکے جو رکھے قدم — حوصلہ کیا میرے آگے قیس کا، فرہاد کا
دیکھ کر رخسارِ جاناں پر پسینے کی بہار — بہ گیا پانی میں ایماں سینکڑوں زہاد کا
تو رہا محروم زاہد، مجھ کو حوریں مل گئیں — مرتبہ آدم کا مجھ کو ہے تجھے شداد کا
جان نکلی تن سے دل دھڑکا جگر تک پھٹ گیا — تیر سینے میں لگا جب آکے تیری یاد کا
شعر گوئی سے یہ مطلب ہے کہ دل بہلائیے — ورنہ میں شاباش کا بھوکا، نہ خواہاں داد کا

اُٹھ گئے دلّی کے دل والے جہاں سے ہوشیار
نام باقی رہ گیا، شاہ جہان آباد کا

اک روز ڈرتے ڈرتے کہا میں نے جانِ من
میں تو تمھارا بندۂ بیدام ہو چکا
بولے وہ مسکرا کے، کرو ہوش کی دوا
معلوم ہوا کہ آپ کو سرسام ہو چکا

کل تک جو سامنے مرے اورنگ نشیں تھے
وہ بیٹھے ہیں اب خاک رمائے مرے آگے
ملکِ عدم سے پھر کے نہ آیا کوئی یہاں
کیا کیا حسیں زمیں میں سمائے مرے آگے

عمر بھر رویا کیے جن کے لیے
وہ نہ آئے ہائے اک دن کے لیے
کر کے وعدہ پھر "و لیکن"، واہ جی
لڑ مریں گے ہم، "و لیکن" کے لیے
زندگی دم بھر کی ہے مہماں یہاں
گھر بنائے کون، دو دن کے لیے

قابو میں کب آیا وہ دلآرام ہمارا
اس دہر میں نکلا نہ کبھی کام ہمارا
منھ پھیر ہی لیتا ہے عجب ناز و ادا سے
سنتا ہے کبھی جب وہ کہیں نام ہمارا
تیغِ نگہِ یار نے جو کام کیا ہے
کرتی نہ کبھی کام وہ صمصام ہمارا
پہنچا یا ہمیں اپنی ہی شہرت نے یہاں تک
کہتے ہیں جسے عرش وہ ہے بام ہمارا

نکلی نہ ترے منھ سے کبھی پیار کی آواز
سنتا رہا ہنس ہنس کے دلِ زار کی آواز
تیرے ہی مبتلا ہیں یہاں شیخ و برہمن
تسبیح کی جو ہے، وہی زنّار کی آواز

اڑد کی دال گلے جس سے، جلد وہ شے لا
لیا لپک کے للاین سے ہینگ کا تھیلا
پکائے رات بھجے ہم نے وہ کوفتہ بریاں
کہ جن کو دیکھ برہمن بھی موتھ کو دے پھیلا
بس اب رفو ہو کہ باتوں میں پی گیا بوتل
ہمارے ٹھرّے کی خاطر تو پاؤں مت پھیلا
کدھر چلا ہے تو رندوں کو چھوڑ کر ہشیارؔ
بنا کے چھوڑیں تجھے دیکھ دال کا تھیلا

قحط نے لٹیا ڈبو دی، جو چنا ملتا نہیں
گیہوں کیسے، اب تو موٹھ اور باجرا ملتا نہیں
میں تو مفلس بن گیا، اب ڈھونڈ لو تم دوسرا
کیا جہاں میں کوئی مجھ سا.. تیا ملتا نہیں
زیرِ راں رہتے تھے جن کے ترکی و تازی مدام
آج چڑھنے کو انھیں لنڈ اگدھا ملتا نہیں
آزمایا خوب ہے یاروں کو ہم نے ہوشیارؔ
مطلبی ملتے ہیں کوئی با وفا ملتا نہیں

قطعۂ تاریخ در تہنیت کتخدائی

مہاراج کنور عالی جناب امید سنگھ جی صاحب بہادر

ولی عہد ریاست شاہپورہ دام اقبالہٗ

ہوئی شادی مہاراجہ کنور کی — خوشی کا ہر طرف ہے جوش سا جوش
رعیت شہ پورہ کی سچ تو یہ ہے — عروسِ عیش و عشرت سے ہم آغوش
خوشی کا ہے یہ گویا دور دورہ — دکھاتی ہے مسرت غم کو پاپوش
مچا ہے تہنیت کا شور ہر سو — زباں زد ہے ہر اک کے؛ نوش، مینوش
ہر اک کوچہ ہے رشکِ میکدہ اب — کوئی مدہوش ہے، اور کوئی بیہوش
کوئی محوِ مسرّت ہو رہا ہے — کوئی مستانہ باہم دوش بر دوش
کسی کی گلرخوں سے چار آنکھیں — ترانہ پر کوئی رکھے ہوئے گوش
کلی باہم کلی سے ہے چٹختی — کھلی جاتی ہے غنچوں کی بنا گوش
مبارک ہے مہینا ماہ، شدھ چوتھ — خوشی سے ہے تنِ امید گلپوش
اٹھوں میں بھی مبارکباد کو اب — شرابِ عیش سے گرچہ ہوں مدہوش
مہاراجہ کو یہ شادی مبارک — کنور صاحب کے ہو عشرت ہم آغوش

جو پوچھے سال سمبت کوئی، ہشیار!
تو کہہ دوں میں بھی "فردِ غم فراموش"

(۱۹۵۱)

کسی مس سے الفت مدامی کرینگے — لگا ٹر کی دُم نام ٹامی کرینگے
اجی آپ کی ہم غلامی کرینگے — کبھی اس میں ہرگز نہ خامی کرینگے
رکھیں آپ در پر ہمیں اپنے دلوں — ادا آتے جاتے سلامی کرینگے
ہمارے بھی منھ سے نکل جائیگا کچھ — اگر آپ یوں بد لگامی کرینگے
گیا ہوشیار ان کے در پر ہے ناحق — بھلا کب وہ ملنے کی حامی کرینگے

ممبر بنے کمیٹی کے بابو نئے نئے
آئے جناب فیض مآب لو نئے نئے

بھرتی ہوا ہے شہر میں اک مسخروں کا غول
کھاؤ تے نئے ہیں، تو داؤ نئے نئے

ٹوٹا کرو رعایا کو، ہاتھوں سے، پاؤں سے
فرماتے ہوئے آئے، شتابو نئے نئے

ہے بخش، کوئی چند، کوئی مل ہے کوئی رائے
نظر آنے لگے روز خطابو نئے نئے

انکم پہ ٹیکس، فنڈ پولیس، چنگی سایر
پیدا ہوئے ہیں مال کے لاگو نئے نئے

کہکشاں کیونکر نہ بل کھائے بیچاری ان دنوں
مانگ اس بت نے ہے کوٹھے پر سنواری ان دنوں
ہم جدھر جاتے ہیں، اٹھ جاتی ہیں لاکھوں انگلیاں
شہر بھر میں دھوم ہے، یارو! ہماری ان دنوں

عمر بھر رویا کیے، جن کے لیے
وہ نہ آئے ہائے اک دن کے لیے

وہ عیادت کو کبھی آئے نہ ہم
ہیں گرفتارِ بلا جن کے لیے

زندگی دم بھر کی ہے مہماں یہاں
گھر بنائے کون دو دن کے لیے

چھیڑ دیکھو کہتے ہیں جلاد سے
تجھ کو بلوایا ہے بس ان کے لیے

[خمخانۂ جاوید، ۱: ۶۸۶ - ۶۸۷؛ یادگارِ ضیغم: ۷۸؛ خطباتِ گارساں دتاسی: ۷۸۲؛ ہماری زبان (ہفتہ وار، دلّی) یکم فروری ۱۹۶۳ء؛ ایضاً، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء؛ ایضاً، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۳ء]

یکتا ـــــ خواجہ معین الدّین خان دہلوی

لال کنواں، دلّی میں سکونت تھی اور یہاں کے رئیسوں میں گنے جاتے تھے۔ شاہی میں خانی کے خطاب سے مفتخر تھے۔ پہلے حافظ عبدالرحمٰن احسان سے اصلاح لیتے رہے، پھر میرزا سے مشورہ کیا۔ افسوس کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔ ۱۲۸۹ھ (۷۳-۱۸۷۲ء) میں فوت ہوئے۔ شاہ بہاء الدین بشیر نے تاریخ کہی:

شاعرِ یکتا زجہاں شد بخلد ۔۔۔ لطفِ سخن ہمرہ خویش آہ، بُرد
گفت خرد سالِ وفاتش بشیر ۔۔۔ "آہ دلا، شاعرِ یکتا بمُرد"
(۱۲۸۹)

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

دل گیا، صبر گیا، چین گیا، جی بھی گیا ۔۔۔ لب ہوا اور کا اُلفت میں ضرر اپنا سا
جو دم میں ہو کچھ، لمحہ میں کچھ، آن میں کچھ ہو ۔۔۔ ایسے سے بھروسا ہے کسے مہر و وفا کا
عالم کو کیا قتل، تری تیغ نگہ نے ۔۔۔ اور مفت میں بدنام ہوا نام قضا کا
ہے کس کو تابِ شکوۂ دشمن کہ ضعف سے ۔۔۔ لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں
جینا فراقِ یار میں، وعدے کی لاگ پر ۔۔۔ آسان گر نہیں ہے، تو دشوار بھی نہیں
برسات میں کہے ہے کہ "یکتا" نہ پی شراب ۔۔۔ واعظ! تجھے کچھ ابر و ہوا پر نظر نہیں
کیا محوِ بیخودی ہوں، کہ جنّت میں بار بار ۔۔۔ رضواں سے پوچھتا ہوں کہ اس کا تو گھر نہیں
غافل ہیں اہلِ دہر، وگرنہ ہزار بار ۔۔۔ واں مقبرہ بنا ہے، جہاں خوابگاہ تھی

[طبقات الشعرائے ہند: ۴۱۲ - ۴۱۳؛ گلستانِ سخن: ۴۸۳؛ گلستانِ بیخزاں: ۲۸۸؛ تذکرۂ بشیر مشمولہ سہ ماہی اُردو، کراچی، ۴۵: ۱: ۲۴۴]

ضمیمہ

حکیم غلام مولیٰ عرف مولا بخش قلق میرٹھی

گارسیں دتاسی اپنے ۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کے خطبے میں کہتا ہے:

سنہ ۱۸۶۴ء میں الہ آباد میں "جواہر منظوم" کے نام سے ایک مجموعۂ نظم شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں بعض انگریزی نظموں کا اُردو ترجمہ درج ہے؛ ترجمہ بھی نظم میں ہے۔ حواشی میں عروض کے مسائل کے متعلق اشارات ہیں۔۔۔ اردو ترجمہ کے مقابل اصل انگریزی بھی ہے۔۔۔ تاکہ طالب علموں کو سمجھنے میں آسانی ہو، اور وہ اردو اور انگریزی دونوں میں ترقی کر سکیں (خطبات گارساں دتاسی: ۵۲۸)

میرے سامنے جواہر منظوم کا دوسرا ۱۸۶۷ء کا مطبوعہ ایڈیشن ہے۔ اس میں صرف اُردو نظمیں ہیں؛ ۱۸۶۴ء کے ایڈیشن کی انگریزی نظمیں، جن کا دتاسی نے ذکر کیا ہے، اس ایڈیشن میں نہیں ملتیں۔

اس کے صرف ۲۲ صفحات ہیں، اور یہ ۱۵ نظموں کو محیط ہے؛ ان کے عنوانات یہ ہیں: (۱) اوصاف اخلاقِ شتر (۲) بیانِ کرمک؛ (۳) حکایتِ پسرِ ناخدا؛ (۴) بیانِ جنّت؛ (۵) میرا باپ کشتی بان ہے؛ (۶) بیانِ ہندوستان؛ (۷) داستان اندھے لڑکے کی؛ (۸) داستانِ شاہ کینیوٹ؛ (۹) قصّہ ولیم ٹیل ساکن سوٹزرلینڈ؛ (۱۰) خواہشِ طفل؛ (۱۱) عرضیٔ مُوشِ محبوس؛ (۱۲) لڑکپن کی پہلی مصیبت؛ (۱۳) در بیانِ تمیزِ حق و باطل؛ (۱۴) ذکر ابابیل بدیسی کا؛ (۱۵) سادگیٔ طبیعت کی خواہش۔

اس مختصر مجموعے کا دیباچہ یو، پی کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے ہے۔ اس کی ابتدائی سطریں مندرجۂ ذیل ہیں:

یہ ترجمہ جو طبع ہوا ہے، اس کو منشی غلام مولیٰ سابق ملازم سررشتۂ تعلیم نے حسب الحکم

صاحب انسپکٹر بہادر قسمتِ اول میرٹھ کے منتخباتِ نظمِ انگریزی حصّہ اوّل سے نظم میں بزبانِ اردو ترجمہ کیا تھا۔ اور بعد اس کے یہ ترجمہ واسطے اصلاح کے دہلی میں مرزا اسداللہ خان غالب کے پاس، جو شاعرِ نامی گرامی ہیں بھیجا گیا اور بعدہٗ واسطے ملاحظہ اور منظوری صاحب ڈائرکٹر بہادر سررشتۂ تعلیم ممالک مغربی کے پیش ہوا ... الخ

یہاں منشی غلام مولیٰ سے ہمارے آخری دور کے مشہور شاعر غلام مولیٰ قلق مراد ہیں۔ یہ کتابچہ غالباً بچوں کے نصاب کے لیے شائع ہوا تھا؛ انگریزی نظمیں تو یقیناً نصاب میں شامل تھیں۔
حکیم غلام مولیٰ قلق اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے، لیکن افسوس کہ تذکرہ نگاروں کی غفلت کے صدقے نہ ان کے تفصیلی حالات محفوظ رہے، نہ ان کو وہ شہرت ملی، جس کے وہ مستحق تھے۔
قلق ۱۲۴۸ (۱۸۳۲-۱۸۳۳ء) میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے نام غلام مولیٰ رکھا تھا، لیکن وہ اپنے عرف مولا بخش سے زیادہ مشہور ہوئے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۲ برس کی عمر میں (یعنی تقریباً ۱۸۴۴-۱۸۴۵ء میں) دلّی آگئے۔ یہاں انھوں نے نجی طور پر ملّا انتظام علی سہارنپوری سے عربی کی تعلیم پائی اور اس کے بعد "دلّی کالج" میں داخلہ لے لیا۔ مولانا امام بخش صہبائیؔ کے چھوٹے بیٹے عبدالکریم سوز ان کے ہم جماعت تھے۔ گمان بہ یقین ہے کہ وہ کالج کی انگریزی جماعت کے بھی طالب علم تھے۔
دلّی کالج میں تکمیل کے بعد انھوں نے طب کی تعلیم حکیم غلام نقشبند خان دہلوی سے پائی اور اس میں پوری مہارت حاصل کر لی۔ اسی زمانے میں ماحول سے متاثر ہو کر انھیں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ ان کے یارِ غار عبدالکریم (خلف صہبائیؔ) نے تخلص سوزؔ رکھا تھا؛ انھوں نے قلقؔ رکھ لیا اور مشورۂ سخن مومن سے کرنے لگے۔ لیکن بظاہر انھیں استاد سے زیادہ استفادے کا موقع نہیں ملا کیونکہ مومن کا ۱۸۵۲ء میں انتقال ہو گیا۔
قلق تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی دلّی ہی میں مقیم رہے۔ انھوں نے یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لیا اور بحیثیت شاعر خاصی شہرت حاصل کر لی۔
۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے کے بعد انھیں دلّی کی سکونت ترک کرنا پڑی اور وہ واپس میرٹھ چلے گئے۔ قیامِ دلّی کے زمانے سے متعلق کوئی یقینی اطلاع نہیں ملتی کہ یہاں ان کا ذریعۂ معاش کیا تھا۔ قیاس ہے کہ چونکہ وہ دلّی کالج کے فارغ التحصیل تھے، اس لیے شاید کسی جگہ مدرسی

کی اسامی مل گئی ہو۔ بہرحال میرٹھ واپس چلے جانے کے بعد وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے اور ان کا بطورِ مدرّس فارسی تقرر ہوگیا۔ اس سے پہلے وہ چندے راجا کچیسر کی ملازمت میں بھی رہے؛ یہاں پچاس روپے مشاہرہ تھا، لیکن کسی وجہ سے وہ الگ ہوگئے" اور میرٹھ آکے مدرسی قبول کرلی۔ یوں بقیۂ زندگی مدرسی اور مطب میں گزار دی۔ ظاہر ہے کہ بہت تنگی ترشی سے بسر ہوتی ہوگی

بعارضۂ سل کم عمری ہی میں یعنی تقریباً ۵۰ سال کی عمر میں پنجشنبہ، شعبان ۱۲۹۷ھ (۱۵ جولائی ۱۸۸۰) رحلت کی۔ محمد امداد حسین ظہور میرٹھی نے تاریخ کہی:

قلق شاعرِ خوش لب و خوش خیال — زدنیا سوئے دارِ جنّت برفت
بہ بیماریِ سل کہ بُد جانِ گسل — بہ تسلیم شاد و بہ ہمت برفت
سروش از پے سال گفت از ظہور — "قلق شاعر ما بجنّت" برفت
(۱۲۹۷)

قلق کا دیوان ان کی زندگی میں نہیں چھپا۔ مرنے سے پہلے انھوں نے اپنے برادرِ خرد عبداللہ (اکاؤنٹنٹ نہرِ جمن) کو وصیت کی تھی کہ میرا کلام جمع کرکے چھپوا دینا۔ چنانچہ ان کے اہتمام میں کلیاتِ قلق پہلی مرتبہ مطبعِ انصاری، دلّی میں ۱۳۰۰ھ میں چھپا۔ اس کے ساتھ حالی کی تقریظ فارسی میں اور سید احمد (مؤلفِ فرہنگِ آصفیہ) کی اردو میں شائع ہوئی ہیں؛ دونوں سے قلق کی سوانح پر بہت مفید روشنی پڑتی ہے۔

یہ کلیات نایاب تھا۔ چنانچہ جناب کلب علی خان فائق کا مرتبہ دوسرا ایڈیشن مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور نے مطبع عالیہ، لاہور میں چھپوا کر دسمبر ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔

قلق کی لکھی ہوئی ایک تقریظ غالب کی "عودِ ہندی" کے ساتھ چھپی ملتی ہے۔ جو انھوں نے ناشر منشی ممتاز علی خاں میرٹھی کی فرمائش پر لکھی تھی۔

"جواہرِ منظوم" کے دیباچے کی جو عبارت اوپر نقل ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ قلق نے نہ کسی مرحلے پر غالب کی شاگردی اختیار کی، نہ اپنے کلام پر ان سے اصلاح لی، لیکن اس کے باوجود (غالباً قلق سے استصواب کیے بغیر) غالب نے ان کے کلام پر اصلاح دی تھی۔ ان نظموں میں سے دو بطورِ نمونہ درج ذیل ہے:

سادگیِ طبیعت کی خواہش ٥

خندہ زن لوگ مسکراتے ہیں
اور ہنسی میں مجھے ستاتے ہیں

کہو، انسان کب بنو گے تم!
یا سدا طفل ہی رہو گے تم

کس قدر سال عمر کے گذرے
اور ابھی آپ ہیں وہی لڑکے

ہوں یہ بیزار ننگِ پیری سے
کہ ہوں خوش ان کی خُردہ گیری سے

وہ تبسّم جو کرتے ہیں باہم
مجکو ہوتی ہے فرحتِ بیہم

شکر اپنے خدا کا کرتا ہوں
گو میں بوڑھا ہوں، دل سے لڑکا ہوں

کیا ہے وہ چیز جس کو کہتے ہیں
کہ کروں میں حصول اب اس کو

یعنی اب میں وہ فائدہ چاہوں
جس کی نفرت سے چونک پڑتا ہوں

یعنی اک پیش و پس کا صرفِ دماغ
رنج آشفتگی و خارِ فراغ

اور دلِ سرد اگر ہوا حاصل
جُز زیاں، نفع اس سے کیا حاصل

ہیں زمانے میں دو ہی شے نایاب
حظِ طفلی و زیرکیِ شباب

غرض اک شے نصیب ہے مجکو
دل تو رکھتا ہوں، گو دماغ نہ ہو

یہی طفلانہ بیغمی ہے قبول
نہ ہو عقلِ شباب گو کہ حصول

خوش ہوں، پھنستا نہیں ہوں میں غم میں
رہنے دو مجکو میرے عالم میں

---

٥ شاعر ان ابیات میں بجائے حصولِ پیش بینی و دور اندیشی و مغالطہ دہی جو طریقۂ مردمانِ زمانہ ہے، تعریف سادہ دلی کی کر کے تمنائے خیالاتِ طفلی کی کرتا ہے۔

میرا باپ کشتیبان ہے [ٰ]

بحرِ موّاج ہولناک میں تھی — ایک کشتی بہی چلی جاتی
جملہ کشتی نشیں تھے سرتاپا — غرقِ دریاے خوفِ ہوشربا
لیک تھا ایک طفلِ کشتیبان — عین طوفاں میں بالبِ خنداں
ترش ابروے موج جو دیکھی — آئی بیساختہ کچھ اُس کو ہنسی
تب لگا اس سے کہنے اک ملّاح — یہ تو وقت، اور یہ خوف، اور یہ مزاح
طفل بولا، میں کیوں ڈروں، نادان! — جب کہ ہے باپ میرا کشتیباں
سچ ہے جب ڈوبنے لگے بیڑا — ہے سہارا خدا کے لنگر کا
مشکلیں سخت جو کرے آساں — اور دعا کو سُنے ہے جو ہر آں
دے ہے ہر رنج کے عوض راحت — گریۂ غم میں خندۂ عشرت
متوجّہ ہوا اس کی جانب جو — غرقِ دریاے رنج و غم کیوں ہو
یاد لڑکے کی مثل ہے ہر آں — کہ ہے ہم سب کا باپ کشتیبان

ٰ ان ابیات سے یہ غرض ہے جیسے اس لڑکے کو اپنے باپ پر اطمینان اور اعتقاد تھا، اسی طرح ہر انسان کو اپنے اللہ جل شانہ پر اعتقاد و توکّل رکھنا چاہیے۔

کتابیات

احوالِ غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد	دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	۱۹۵۳ء
اخبار الصنادید	حکیم محمد نجم الغنی	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۱۸ء
اخترِ تاباں	ابوالقاسم محتشم	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۹ھ
ادبِ عزیز	ڈاکٹر سالک	مشہور آفسٹ پریس، کراچی	۱۹۶۶ء
اُردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن پریس، کراچی	۱۹۵۴ء
اُردوئے معلّٰی	میرزا غالب	کریمی پریس، لاہور	۱۹۲۲ء
ارمغانِ گوکل پرشاد	مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری	انجمن پریس، کراچی	۱۹۷۵ء
اکمل التاریخ	محمد یعقوب ضیاء القادری بدایونی	مطبع قادری، بدایوں	۱۹۱۷ء
المشاہیر	فیض احمد	نامی پریس، میرٹھ	۱۹۰۰ء
انتخابِ زرّیں	سر سید راس مسعود	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۷ء
انتخابِ یادگار	منشی امیر احمد مینائی	تاج المطابع، رامپور	۱۲۹۰ء
انشائے بیخبر	مرتبہ: انتظام اللہ شہابی	مُرتضائی پریس، آگرہ	۱۹۴۰ء
انشائے نورِ چشم	یار محمد خان شوکت	مطبع نظامی، کانپور	۱۲۸۹ھ
ایک شخص، ایک کارواں	مرتبہ مجیب الرحمان شامی	مکتبۂ نشانِ راہ، نئی دلّی	۱۹۸۱ء
آبِ بقا	خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت	نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۱۸ء
آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد	سرفراز پریس، لکھنؤ	۱۹۵۴ء
آثار الشعراء	سیّد محمد ممتاز علی حافظ	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۳۰۴ھ
بزمِ سخن	سیّد علی حسن خان	مطبع مفیدِ عام، آگرہ	۱۸۸۱ء
بزمِ فروغ (دیوان)	بدری کرشن فروغ	نامی پریس، دہلی	۱۹۱۸ء
بساطِ فرنگ	میرزا شمشاد علی بیگ رضوان	اکمل المطابع، دہلی	۱۸۶۷ء
بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی	سرفراز قومی پریس لکھنؤ	۱۹۵۵ء

بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ	مؤلفہ خواجہ حسن نظامی	محبوب المطابع، دہلی	۱۹۴۷
بہار بوستانِ شعرا	محمد فضل اکرم	مطبع صبح، بدایوں	۱۲۹۹ھ
بہارِ سخن	بابو شیام سندر لال برق سیتاپوری	مطبع یو۔ پی، سیتاپور	۱۹۳۲ء
بہارِ گلشنِ کشمیر	برج کشن کول بیخبر و جگموہن ناتھ شوق	انڈین پریس، الہ آباد	۱۹۳۱-۱۹۳۲ء
بیاضِ بسمل (قلمی)	مرتبہ سید اصغر علی	(انڈیا آفس لائبریری، لنڈن مخطوطہ B.66)	
بیاضِ علائی (قلمی)	نواب علاء الدین احمد خان	رضا لائبریری، رامپور	
بیان الحقائق	محمد عامر عباس عالی عباسی	انصار پریس، کانپور	۱۹۴۸ء
تاج التواریخ	مولوی نصرت علی قیصر	نصرت المطابع، دہلی	۱۹۰۵ء
تاریخِ دلچسپ (قلمی)	ابو الفضل محمد عباس شیروانی	(مملوکہ کتب خانہ سالار جنگ ۵۴۱)	
تاریخ پٹیالہ	خلیفہ سید محمد حسن خان بہادر	سفیرِ ہند پریس، امرت سر	۱۸۷۸ء
تاریخِ شاہجہانپور	محمد صبیح الدین صاحب خلیل شاہجہانپوری	نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۳۲ء
تاریخ شعرائے بہار	سید عزیز الدین احمد بلخی راز	قومی پریس، بانکی پور پٹنہ	۱۹۳۱ء
تاریخِ عروجِ عہدِ انگلشیہ	منشی ذکاء اللہ	شمس المطابع، دہلی	۱۹۰۴ء
تجلیاتِ سخن	(دیوان نظامی بدایونی)	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۰ء
تذکرۃ النسا	درگا پرشاد نادر	اکمل المطابع، دہلی	۱۸۸۴ء
تذکرۃ الواصلین	محمد رضی الدین فرشوری	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۴۵ء
تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود	منشی دیبی پرشاد بشاش	مطبع رضوی، دہلی	۱۸۸۵ء
تذکرۂ اہلِ دہلی	سرسید احمد خان (مرتبہ قاضی احمد میاں جوناگڑھی)	انجمن پریس، کراچی	۱۹۵۵ء
تذکرۂ حالی	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	گیلانی پریس، لاہور	۱۹۳۵ء
تذکرہ ذوق مذاق (بہار بوستان شعرا)	محمد فضل اکرم	مطبع صبح، بدایوں	۱۲۹۹ھ
تذکرہ رسولپور برشطہ (المعروف برست)	سید نظیر حسنین زیدی	المسرور آفسٹ پریس، کراچی	۱۹۸۱ء
تذکرۂ ریختی	سید تمکین کاظمی	شمس الاسلام پریس، حیدرآباد دکن	۱۹۳۰ء
تذکرۂ شعرائے جے پور	مولوی احترام الدین احمد شاغل	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۵۸ء
تذکرہ شعرائے دکن (محبوب الزمن)	محمد عبد الجبار خان ملکاپوری	مطبع رحمانی، حیدرآباد	۱۳۲۹ء
تذکرہ علمائے ہند	مولوی رحمان علی	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۱۴ء

تذکرۂ غوثیہ	شاہ گل حسن (محمد اسمٰعیل میرٹھی)	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۶۵ء
تذکرۂ کاملانِ رامپور	حافظ احمد علی خان شوق	ہمدرد پریس، دہلی	۱۹۲۹ء
تذکرۂ مشاہیر کاکوری	حافظ محمد علی حیدر	اصح المطابع، لکھنؤ	۱۹۲۷
تذکرۂ نادر	کلب حسین خان (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب)	سرفراز پریس، لکھنؤ	۱۹۵۷ء
تزک محبوبیہ (۲)	غلام صمدانی خان گوہر	نظام المطابع، حیدر آباد	۱۹۰۳ء
تواریخ بلند شہر	دوارکا پرشاد	مطبع جلوۂ طور، بلند شہر	۱۸۶۲ء
تواریخ ڈھاکہ	رحمان علی طپش	اسٹار پریس آف انڈیا، آرہ	۱۹۱۰ء
جلوۂ صحیفۂ زریں نیر رخشاں (دیوان)		حقانی پریس، دہلی	۱۹۱۶ء
جلوۂ خضر	سید صفیر احمد صفیر بلگرامی	مطبع نور الانوار، آرہ	۱۸۸۵ء
جوہر	مرزا عصمت اللہ بیگ عصمت	صحیفہ مشین پریس، حیدر آباد	۱۹۵۶ء
چمن انداز	منشی درگا پرشاد نادر، دہلوی	اکمل المطابع، دہلی	۱۸۸۳ء
چند معصر	ڈاکٹر مولوی عبد الحق	ناظر پریس، کراچی	۱۹۵۰ء
حالی (انگریزی)	مالک رام	روپابھ پرنٹرز، دلّی	۱۹۸۲ء
حیاتِ اسمٰعیل	خان بہادر محمد اسلم سیفی	دیال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۳۹ء
حیاتِ بشیر (خان بہادر بشیر الدین میرٹھی)	(سید حبیب الرحمان شاہ)	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	؟
حیاتِ جاوید	مولانا الطاف حسین حالی	لطیفی پریس، دہلی	۱۹۳۹ء
حیاتِ فریاد	سید علی محمد شاد عظیم آبادی	مطبع معارف دار المصنفین، اعظم گڑھ	۱۹۲۸ء
حیواۃ العلما	سید محمد عبد الباقی سہسوانی	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۲۲ء
خاتمۂ مرأت احمدی	مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خان بہادر	مشن پریس، کلکتہ	۱۹۳۰ء
خاندانِ برکات	سید محمد الملقب بہ اولاد رسول قادری	گلشن فیض، لکھنؤ	۱۳۲۹ھ
خزینۃ الانساب	سید نظر احمد افسوں سہسوانی	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۵۹ء

خاندانی حالات نواب حسام الدین احمد خان (قلمی)	مؤلفہ اکبر مرزا	(مملوکہ خاندان مقیم کراچی)	
خطبات گارساں دتاسی		انجمن ترقی اُردو پریس، اورنگ آباد	۱۹۳۵ء
خطوطِ غالب	مرتبہ مہیش پرشاد (مالک رام)	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	۱۹۶۲
خطوط غالب (۲)	مرتبہ مولانا غلام رسول مہر	پاکستان ٹائمز پریس، لاہور	۱۹۵۱ء
خم خانہ جاوید (پانچ حصے)	لالہ سری رام و برجموہن دتاتریہ کیفی		۱۹۰۸-۱۹۴۰
خیابانِ غالب	نادم سیتاپوری	مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی	۱۹۷۰ء
دارالعلوم کے سپوت	مولوی حافظ محمد مظہر	طارق برقی پریس، حیدرآباد	۱۹۵۳ء
داغ	نور اللہ محمد نوری	اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن	۱۳۵۵ء
دید و دریافت	شمس بدایونی	اعلیٰ پریس، دہلی	۱۹۸۱ء
دودِ چراغِ محفل	سید حسام الدین راشدی	ایجوکیشنل پریس، کراچی	۱۹۶۹ء
دو نایابِ زمانہ بیاضیں	عبدالباری آسی الدنی	ہندستانی اکیڈمی (کراؤن پریس الٰہ آباد)	۱۹۴۲ء
دیوانِ باقر	شاہ باقر علی بہاری	شمس الاسلام پریس، حیدرآباد	۱۳۵۵ھ
دیوان بیدل (قلمی)	محمد حبیب الرحمٰن انصاری	(مرتبہ عقیل ندوی) مملوکہ مؤلف	
دیوان جان صاحب	مرتبہ سید محمد مبین نقوی	مطبع انوار احمدی، الٰہ آباد۔	
دیوان سخن	سید فخر الدین حسین سخن	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۸۶ء
دیوان فدا	مرتبہ سید وحید اشرف و مالک رام	عثمانی پریس، مدراس	۱۹۷۹ء
دیوان معروف	نواب الٰہی بخش خان	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۳۵ء
ذکرِ غالب	مالک رام	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۷۶ء
راحتِ روح	صوفی منیری (مرتبہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی)	اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد	
راح روح (قلمی)	ابوالفضل محمد عباس شروانی	(مملوکہ کتب خانہ سالار جنگ فارسی دیوان ۵۴۱)	
رباعیات عجائبات	امو جان ولی	تحفۂ ہند پریس، دہلی	۱۳۱۸ھ
رقعاتِ مدہوش	مرتبہ حامد سعید خان لودی	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۶۳ء
روزِ روشن	مولوی محمد مظفر حسین صبا	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۷ھ

رونق سخن	دیوان صاحبزادہ محمد احمد علی خان رونق	مطبع فاروقی، دہلی	۱۸۹۰ء
سخنِ شعرا	مولوی عبد الغفور خان نسّاخ	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۷۴ء
سخنورانِ گجرات	سید ظہیر الدین مدنی	کلدیپ آرٹ پریس، نئی دلی	۱۹۸۱ء
سخنورانِ چشم دیدہ	مولوی ترکی علی شاہ ترکی	مطبع شمس الاسلام، حیدرآباد	۱۳۳۳ھ
سراپا سخن	سید محسن علی محسن	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۶۰ء
سروشِ سخن	سید فخر الدین حسین سخن	مطبع نولکشور، کانپور	۱۸۷۷ء
سرطامس مٹکاف کی ڈائری	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	محبوب المطابع، دہلی	۱۹۵۰ء
سلسلۂ عالیہ	حکیم عنایت حسین فیض احمد مارہروی	مطبع ہاشمی، میرٹھ	۱۳۰۶ھ
سیر سیّاح	میاں داد خاں سیّاح	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۷۲ء
شعر و سخن	محمد نیاز علی پریشان	مطبع نور العلم، آگرہ	۱۲۸۶ھ
شمع انجمن	نواب سید محمد صدیق حسن خان	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۳ھ
شمیمِ سخن	محمد عبد الحی صفا بدایونی	مطبع امداد الہند، مراد آباد	۱۸۸۴ء
شہنشاہ نامہ	یار محمد خان شوکت	مطبع حسنی، رامپور	۱۲۹۲ھ
صبحِ گلشن	سید علی حسن خان	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۵ھ
صبحِ وطن	نواب محمد غوث خان اعظم	چھاپاخانۂ کشن راج مدراس	۱۸۴۲ء
صحیفۂ خوشنویساں	احترام الدین احمد شاغل عثمانی	مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ	۱۹۶۳ء
صحیفۂ زرّیں	مرتبہ پراگ نرائن بھارگو	نولکشور پریس، لکھنؤ	۱۹۰۲ء
طبقات الشعرائے ہند	مولوی کریم الدین	مطبع العلوم، دہلی	۱۸۴۸ء
طورِ کلیم	سید نور الحسن خان	مطبع مفید عام، آگرہ	۱۲۹۸ھ
عرفانِ عزیز	(دیوان محمد ولایت علی خان عزیز صفی پوری)	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۴۶ء

عقدِ ثریا	غلام ہمدانی مصحفی	جامع برقی پریس، دہلی	۱۹۳۴ء
عودِ ہندی	میرزا غالب	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۲۵ء
غالب و عصرِ غالب	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	اسحاقیہ پریس، کراچی	۱۹۸۲ء
غالبیات: چند عنوانات	کالی داس گپتا رضا	مہاراشٹر پرنٹنگ اسکول، پونا	۱۹۸۲ء
غدر کا نتیجہ	غلام حسن خان محو (مرتبہ خواجہ حسن نظامی)	المحبوب المطابع برقی پریس، دہلی	۱۹۳۰ء
فرح بخش	میاں یار محمد خان شوکت	مطبع نظامی، کانپور	۱۲۸۸ھ
فغانِ دہلی	مرتبہ تفضل حسین خان کوکب	اکادمی پنجاب، لاہور	۱۹۵۴ء
فیضانِ غالب	عرش ملسیانی	اردو لیتھو پریس، شاہدرہ، دلّی	۱۹۷۷ء
قاطع برہان	غالب	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۶۲ء
قاموس المشاہیر	مرتبہ نظامی بدایونی	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۲۶ء
قصاید مدحیہ نظام	مرتبہ منشی غلام محمد خان تپش	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۷۱ء
کارنامۂ سروری	سرور الملک آغا میرزا بیگ خان	مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ	۱۹۳۳ء
کلیاتِ خلیل و فوق	محمد ابراہیم	مطبع نور الانوار، آرہ	۱۲۹۰ھ
کلیات سالک (قربان علی بیگ)	مرتبہ کلب علی خان فائق	مطبع عالیہ، لاہور	۱۹۶۶ء
کلیاتِ شیفتہ	نواب محمد مصطفیٰ خان	نظامی پریس، بدایوں	۱۹۱۶ء
کلّیاتِ قلق (غلام مولیٰ)	مرتبہ کلب علی خان فائق	مطبع عالیہ، لاہور	۱۹۶۶ء
کلیاتِ نثر غالب (فارسی)	غالب	مطبع نولکشور، کانپور	۱۸۷۵ء
کلیاتِ نظام	نواب محمد مردان علی خان	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۷۵ء
گلدستۂ سخن	مرتبہ منشی نولکشور	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۷۵ء
گلدستۂ نازنیناں	مولوی کریم الدین پانی پتی	مطبع رفاہِ عام، دہلی	۱۸۴۵ء

گلِ رعنا	مولانا سید عبدالحی	مطبع معارف، اعظم گڑھ	۱۳۶۴ھ
گلزارِ اعظم	نواب محمد غوث خان اعظم	مطبع سرکاری، مدراس	۱۲۷۲ھ
گلستانِ بیخزاں	حکیم قطب الدین باطن	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۲۹۱ھ
گلستانِ سخن	مرزا قادر بخش صابر دہلوی	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۲۷۱ھ
گلشنِ بیخار	نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۱۰ھ
گلشنِ ناز	منشی درگا پرشاد نادر دہلوی		
گلشنِ ہمیشہ بہار	نصر اللہ خان خویشگی	انجمن پریس، کراچی	۱۹۶۷ء
مآثرِ غالب	مرتبہ قاضی عبدالودود		
مآثرِ صدیقی	سید محمد علی حسن خان	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۹۲۴ء
متعلقاتِ غالب	کالی داس گپتا رضا	اجمل پریس، بمبئی	۱۹۷۸ء
مجموعۂ نغز	میر قدرت اللہ قاسم (مرتبہ محمود شیرانی) کریمی پریس، لاہور		۱۹۳۳ء
محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن	محمد عبدالجبار خان ملکاپوری	مطبع رحمانی، حیدرآباد	۱۳۲۹ھ
مخزنِ فصاحت	(دیوان فصیح الدین رنج وطبیب)	مطبع ہاشمی، میرٹھ	۱۳۰۷ھ
مراۃ الحقائق	منشی برکت علی	مطبع عزیزی، رام پور	۱۹۰۲ء
مرقع ادب (۲)	مرتبہ صفدر مرزا پوری	مجتبائی پریس، لکھنؤ	۱۹۲۵ء
مرقع سخن (تین حصے)	مرتبہ ادارۂ ادبیاتِ اردو	مکتبۂ ابراہیمیہ مشین پریس، حیدرآباد	۱۹۳۵-۱۹۳۹ء
مسلم شعرائے بہار	حکیم سید احمد اللہ ندوی	انٹرنیشنل پریس، کراچی	
مشاطۂ سخن (۱)	صفدر مرزا پوری	میتھوڈسٹ پبلشنگ ہوس، لکھنؤ	۱۹۱۸ء
مشاطۂ سخن (۲)	صفدر مرزا پوری	گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور	۱۹۲۸ء
مشرقی بنگال میں اردو	سید اقبال اعظم	کوہِ نور الیکٹرک پریس، چاٹگام	۱۹۵۴ء
مشرقی پاکستان کے ادیب	مرتبہ حفیظ ہوشیارپوری	ناظر پرنٹنگ پریس، کراچی	۱۹۵۱ء
مضامینِ فرحت (۵)	میرزا فرحت اللہ بیگ	انتظامی پریس، حیدرآباد	
مقالاتِ حالی (۱)	مولانا الطاف حسین حالی	جامعہ پریس، دہلی	۱۹۱۴ء
مقدمہ رودکر ملازمت الور	نواب محمد مردان علی خان رعنا	مطبع نولکشور، لکھنؤ	۱۸۶۵ء
مکاتیبِ غالب	مرتبہ امتیاز علی خان عرشی	ناظم پریس، رامپور	۱۹۴۹ء

منتخب اللطایف	رحم علی خان ایمان (مرتبہ رضا نائینی و امیر حسن عابدی)	مطبع تابان تہران	۱۳۴۹ھ
میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام	مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدر آباد	۱۹۵۷ء
نادراتِ غالب	مرتبہ آفاق حسین آفاق	مشہور پریس، کراچی	۱۹۴۹ء
نزہۃ الخواطر (عربی جلد ۸)	مولوی سید عبد الحی	مطبع دائرۃ المعارف، حیدر آباد	۱۹۷۰ء
نسخۂ دلکشا (حصہ اول)	جنمیجے متر ارمان	گنیش پریس، کلکتہ	۱۸۷۰ء
نشترِ عشق (قلمی)	حسین قلی خان		
نشیدِ کاظم	شیخ کاظم حسین صدیقی کاظم	مطبع اسرار کریمی پریس الہ آباد	۱۹۰۸ء
نظمِ دلفروز	(دیوانِ امراؤ میرزا انور)	مطبع رفاہِ عام، لاہور	۱۸۹۹ء
نگارستانِ سخن	سید نور الحسن خاں	مطبع شاہجہانی، بھوپال	۱۲۹۳ھ
نقدِ غالب	مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد	دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	۱۹۵۶ء
نقشِ آزاد	مرتبہ غلام رسول مہر	علمی پرنٹنگ پریس، لاہور	۱۹۵۸ء
نورِ ایمان	مولوی عبد السمیع بسمل رامپوری	شرف المطابع، میرٹھ	۱۳۱۲ھ
نہالستانِ نثار	مولفہ محمد جمال الدین طور اکبر آبادی، آگرہ	اخبار پریس، آگرہ	۱۹۲۵ء
واقعات دار الحکومت دہلی	مولوی بشیر الدین احمد	شمسی مشین پریس، آگرہ	۱۹۱۹ء
ہنگامۂ دل آشوب (دو حصے)	مرتبہ باقر و سخن	مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ	۱۸۶۷ء
یادگارِ بریلی	محمد ایوب قادری	کراچی	۱۹۷۷ء
یادگارِ حالی	صالحہ عابد حسین	کوہِ نور پرنٹنگ پریس، دلی	۱۹۷۵ء
یادگارِ ضیغم (قلمی)	محمد عبد اللہ خان ضیغم	مملوکہ ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد (مخطوطہ ۵۶۴)	
یادگارِ ضیغم	محمد عبد اللہ خان ضیغم	مطبع قادری، حیدر آباد (دکن)	۱۳۰۳ھ
یادگارِ غالب	الطاف حسین حالی (مرتبہ مالک رام)	لبرٹی آرٹ پریس، دلی	۱۹۷۱ء

۲۔ رسائل و جراید

آج کل (ماہانہ، دہلی) نومبر، ۱۹۵۲ء؛ فروری، ۱۹۵۵ء؛ فروری ۱۹۶۰ء

ادیب (ماہانہ الہ آباد) - فروری و مارچ، ۱۹۱۳ء

اُردو (سہ ماہی، دہلی)، جولائی ۱۹۴۴ء

اُردو (سہ ماہی، کراچی)؛ جولائی ۱۹۵۰ء؛ ۱۹۵۲؛ ۱۹۵۳ء، ۱۹۶۹ء

اُردو ادب (سہ ماہی - علی گڑھ) اکتوبر/دسمبر ۱۹۵۴ء؛ جولائی/ستمبر ۱۹۶۳ء

اردوے معلّیٰ دلّی (شمارہ اول) ۱۹۶۰ء

اردوے معلی (ماہانہ - علی گڑھ) دسمبر ۱۹۱۲ء

اکادمی (دو ماہی، لکھنؤ) ستمبر ۱۹۸۱ء جنوری - فروری ۱۹۸۳ء

اکمل الاخبار (ہفتہ وار دہلی) ۴:۱۶ (۲۶ اپریل، ۱۸۶۹ء)؛ ۴:۳۴ (۲۵ اگست ۱۸۶۹ء)

العلم (سہ ماہی، کراچی) غالب نمبر ۱۹۶۹ء

اودھ اخبار (روزنامہ - لکھنؤ) - ۱۳/۱۷ جون ۱۸۶۹ء

پیامِ یار (ماہانہ گلدستہ - لکھنؤ). دسمبر، ۱۸۸۹ء

تحریک (ماہنامہ - دہلی) اپریل ۱۹۵۹ء

جامعہ (ماہنامہ، دلّی) (غالب نمبر فروری/مارچ ۱۹۶۹ء) ۵۹: ۲-۳: ۱۰۷-۱۱۳

حیاتِ نو (ماہانہ - پانی پت) ۱۹۳۴ء؛ ۱۹۳۵ء

ریاض سخن (گلدستہ) فروری ۱۸۸۵ء

زمانہ (ماہانہ - کانپور) اکتوبر، ۱۹۲۷ء؛ جولائی ۱۹۳۴ء؛ جنوری، ۱۹۴۹ء

ساقی (ماہانہ - دہلی) جنوری، ۱۹۴۶ء

سب رس (ماہانہ - حیدر آباد) غالب نمبر ۱۹۶۹ء

شاعر (ماہانہ - آگرہ) آگرہ نمبر (جون/جولائی، ۱۹۳۶ء)

صحیفہ لاہور (غالب نمبر (۴۸) اکتوبر ۱۹۶۹ء

صلاے عام (ماہانہ - دہلی) - دسمبر، ۱۹۲۹ء

کمال (ماہانہ ۔ دہلی) جنوری، اکتوبر، دسمبر، ۱۹۱۲

ماتھر پترکا (ماہانہ انگریزی ۔ آگرہ) دسمبر ۱۹۲۵؛ جنوری، فروری، اپریل ۱۹۲۶ء

مذاقِ سخن (ماہانہ گلدستہ ۔ دہلی) مئی ۱۹۰۳ء

معارف (ماہانہ ۔ اعظم گڑھ) جون، ۱۹۳۲ء؛ اپریل، ۱۹۴۸؛ اپریل، ستمبر ۱۹۵۴

معاصر (پٹنہ (۳) و (۴)

نقوش (ماہانہ لاہور) جون، ۱۹۵۶ء

نگار (ماہانہ ۔ لکھنؤ) جنوری/فروری، ۱۹۴۱؛ اپریل، ۱۹۵۳ء

نوائے ادب (سہ ماہی ۔ بمبئی) جولائی ۱۹۵۰ء

ہندستانی (سہ ماہی ۔ الہ آباد) ۱۹۳۵ء؛ ۱۹۳۷ء۔

کتاب میں ہجری اور عیسوی تاریخوں کے تطابق کے لیے **Indian Ephemeris**

مصنفہ **Diwan Bahadur**
L.D. Swamikannu Pillai (Madras : 1915)

استعمال کی گئی ہے۔ میرے نزدیک موجودہ جنتریوں میں یہ سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔